خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— شادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور

بلقیس کھٹی

تزئین ——— عدنان

انتظام ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

اگست 2016

جلد 44 شمارہ 4

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W نارتھ ناظم آباد کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: Info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

برصغیر کی تاریخ میں 14 اگست 1947ء کا دن وہ مبارک دن ہے جب فضا میں پہلی بار پاکستان کا پرچم لہرایا۔ دنیا کے نقشے پر ایک نئی، نظریاتی ریاست نمودار ہوئی۔ یہ دن محض آزادی کا دن نہیں، یہ دن تو ہمارے نظریاتی اور اسلامی تشخص کی نشوونما اور بقا کے لیے معرض وجود میں آنے والے وطن کے قیام کا دن ہے۔ اس تاریخ ساز اور حیات آفرین دن کے پیچھے کتنی ہی خونچکاں داستانیں ہیں۔

ایک نسل نے اپنے خون جگر سے جس انقلاب کو منزل تک پہنچایا۔ لاکھوں سر دے کر آزادی کے خواب کو حقیقت کے روپ میں ڈھالا۔ آرزوؤں اور تمناؤں کو ہمیشہ کی نیند سلایا۔ تب ہمیں وہ وطن نصیب ہوا جہاں آج ہم سکون سے رہتے ہیں۔ بے دھڑک اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جہاں ہماری ثقافت، ہماری مذہبی رسومات اور ہمارے تہوار ہر دباؤ، ہر خوف سے آزاد ہیں۔ یہ دن انعام ربانی کا شکر ادا کرنے کا دن ہے۔ اپنے اجداد کی قربانیوں کو یاد رکھنے کا دن ہے۔

قارئین کو جشن آزادی مبارک۔

اللہ تعالیٰ پاک وطن کو رہتی دنیا تک قائم و دائم رکھے۔ اور اس کے خلاف سازشیں کرنے والے ناکام و نامراد ہوں۔ آمین۔

عید سروے

ستمبر کا شمارہ عیدالاضحیٰ سے پہلے آئے گا اور عید نمبر ہوگا۔

عید نمبر میں حسب روایت عید کی تحریروں کے ساتھ قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ دونوں ہمارے مذہبی تہوار ہیں۔ آپ کو زیادہ تر کس عید پر مزا آتا ہے؟

2۔ عیدالاضحیٰ پر آپ کے گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے یا آپ خود کسی کے ہاں مہمان بن کر جاتی ہیں؟ گھر پر دعوت ہو تو آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ کوئی خصوصی ڈش جو مہمان شوق سے کھاتے ہیں؟

3۔ گوشت کی کوئی ایسی ڈش جسے آپ کے گھر، خاندان اور علاقے کی خاص ڈش کہا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب بھی لکھیں۔

4۔ کہتے ہیں کہ میٹھی عید لڑکیوں کا تہوار ہے۔ اور عید قرباں مردوں کا۔ قربانی اور گوشت بنوانے کے علاوہ کیا پکانے میں بھی آپ کے گھر کے مرد آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟

5۔ عیدالاضحیٰ سے جڑا کوئی ایسا واقعہ جسے یاد کرکے آپ آج بھی مسکرا دیتی ہیں؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 22 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- آب حیات۔ عمیرہ احمد کا ناول،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ بہار کی دستک،
- عائشہ ناز علی کا مکمل ناول۔ زندگی اک کہانی،
- صدف آصف کا ناولٹ۔ کبھی عشق ہو تو،
- حاجرہ ریحان، صباحت یاسمین، شازیہ الطاف ہاشمی، حیا بخاری، عطیہ خالد، فریدہ فرید اور بنت سحر کے افسانے،
- مشہور نیوز اینکر محمد جنید سے ملاقات،
- گلوکارہ سارہ رضا خان سے باتیں،
- حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ۔ مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا۔ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیادیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداود' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

حرام

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

''بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت' بدکار عورت کی کمائی اور کاہن کی شیرنی سے منع فرمایا ہے۔''

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ کتے کی قیمت کی ممانعت کا مطلب ہے کہ کتے کی خرید و فروخت حرام ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم عام ہے جو ہر قسم کے کتے کو شامل ہے' چاہے وہ شکاری کتا ہو یا سدھایا ہوا ہو یا کھیتوں وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے لیا گیا ہو جن کا رکھنا جائز ہے۔ اس لیے کہ کتا مطلقاً ''نجس'' ہے' چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو۔

بعض علماء کے نزدیک ان کتوں کی خرید و فروخت اور ان کی قیمت جائز ہے جن کتوں کو رکھنے کی اجازت ہے' جیسے شکار اور حفاظت کے لیے رکھے جانے والے کتے۔ دلائل کے اعتبار سے جمہور کا قول راجح ہے کیونکہ حدیث میں مطلقاً ''منع کیا گیا ہے۔

2۔ بدکار عورت جو کچھ کماتی ہے' اسے مہر صرف اس کی ظاہری شکل کی وجہ سے کہا گیا ہے' ورنہ یہ حرام ہے۔ اس کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اسی طرح کاہن' نجومی' عراف اور جو لوگ بھی ان کی طرح مستقبل کی خبریں بتا کر عوام کو بے وقوف بناتے اور ان سے پیسے بٹورتے ہیں' ان کی کمائی بھی حرام ہے۔

3۔ ان کی کمائی کی طرح ان کو دینا بھی حرام ہے' اس لیے کہ جب ان کے لیے لینا جائز نہیں تو دینے والے کا دینا بھی جائز نہیں۔

بدشگونی لینے کی ممانعت کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگ جانا اور بدشگونی لینا کوئی چیز نہیں۔ اور مجھے فال اچھی لگتی ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا "فال کیا چیز ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اچھی بات (کا سننا اور اس سے خیر کی امید وابستہ کرلینا۔)" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ "بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگ جانا نہیں" میں اس بات کی نفی ہے کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے تندرست آدمی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یا نفی، نہی کے معنی میں ہے، یعنی تم کسی بیماری کو اس معنی میں متعدی مت سمجھو کہ یہ خیال کرو کہ فلاں شخص فلاں کی بیماری کی وجہ سے بیمار ہوا، بلکہ جس طرح پہلا شخص اللہ کی مشیت سے بیمار ہوا، دوسرا بھی اللہ کی مشیت ہی سے بیمار ہوا۔

بعض بیماریاں، جو متعدی سمجھی جاتی ہیں، اس میں ان کے متعدی ہونے کا انکار نہیں ہے بلکہ صرف عقیدے کی درستی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس میں بھی اصل چیز اللہ کی مشیت ہی کو سمجھنا چاہیے نہ کہ کسی بیماری کو کیونکہ اگر بیماری ہی اصل سبب ہو تو پھر ایک گھر میں متعدی مرض میں مبتلا ایک شخص کی وجہ سے گھر کے تمام افراد کو اس بیماری میں مبتلا ہونا چاہیے جب کہ واقعتاً ایسا نہیں ہوتا۔ صرف ایک دو شخص ہی بیمار ہوتے ہیں، سب کے سب بیمار نہیں ہوتے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ متعدی مرض میں بھی اصل سبب بیماری نہیں، اللہ کی مشیت، اس کی تقدیر اور فیصلہ ہی ہے۔

بیوہ کہاں عدت گزارے

حضرت زینب بنت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں، انھوں نے فرمایا۔

"میرے شوہر اپنے کچھ (بھاگے ہوئے) غلاموں کی تلاش میں نکلے۔ (آخر) "قدوم" جگہ کے قریب انہیں جالیا۔ غلاموں نے انہیں شہید کردیا۔ جب مجھے میرے خاوند کی وفات کی خبر ملی تو میں اپنے خاندان کے محلے سے دور انصار کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھی۔ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے خاوند کی وفات کی خبر اس حال میں ملی ہے کہ میں ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہوں جو میرے خاندان کے محلے سے بھی دور ہے اور میرے بھائیوں کے گھروں سے بھی دور ہے اور اس نے کوئی مال بھی نہیں چھوڑا جس سے میرا خرچ چلتا رہے، نہ کوئی مال چھوڑا ہے جو مجھے ترکے میں ملے، نہ ان کی ملکیت میں کوئی گھر تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اجازت دے دیں کہ میں اپنے اقارب اور اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤں۔ مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے اور اس سے میرے (روزمرہ کے) کام بہتر طور پر چلتے رہیں گے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو یوں ہی کرلو۔"

وہ فرماتی ہیں: میں باہر نکلی تو مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے حق میں فیصلہ فرمایا۔ میں ابھی مسجد ہی میں تھی یا گھر کے صحن ہی میں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (دوبارہ) طلب فرمالیا، پھر فرمایا۔

"تم نے کیسے بیان کیا؟"

میں نے دوبارہ صورت حال پیش کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تک اللہ کی مقرر کردہ مدت (موت کی عدت) پوری نہیں ہو جاتی، اسی گھر میں رہائش رکھو جہاں تمہیں اپنے خاوند کی وفات کی خبر پہنچی۔" چنانچہ میں نے چار ماہ دس دن تک وہیں عدت گزاری۔

فوائد و مسائل : عورت کو عدت اسی مکان میں گزارنی چاہیے جہاں وہ اپنے شوہر کی ساتھ رہائش

پذیر تھی۔

خاوند کی وفات پر عدت چار مہینے دس دن ہے۔ اور اگر عورت حاملہ ہو تو عدت وضع حمل (بچے کی پیدائش) ہے اگرچہ خاوند کی وفات کے چند لمحے بعد ہی ولادت ہو جائے۔

2۔ اسی طرح بدشگونی لینے کا معاملہ ہے' اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے' اس لیے کچھ دیکھ کر دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا بھی ہو تو اسے اہمیت دو اور نہ اس کے مقتضیٰ پر عمل کرو کیونکہ اس سے یہ بداعتقادی پیدا ہوتی ہے کہ فلاں چیز کی وجہ سے کام خراب ہو گیا' جب کہ فاعل اور موثر حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے' اس لیے بدشگونی لینا حرام اور ناجائز ہے۔

اچھی بات سن کر فال لینے کو جائز قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح ایک انسان اللہ تعالیٰ سے حسن ظن قائم کر لیتا ہے جو ایک مستحسن امر ہے۔ اس میں گویا اس امر کی بھی ترغیب ہے کہ انسان کو اپنی زبان سے اچھی بات ہی نکالنی چاہیے اور اچھی بات ہی سننی چاہیے جس سے لوگ نیک فال اخذ کریں اور ایسی بات کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے ان کے دلوں میں بدفالی کا خدشہ ہو۔

فائدہ: بہتر یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں بدشگونی نہ لی جائے۔ تاہم اگر دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہو تو اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کیا جائے۔

آرزو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے ادنیٰ جنتی کا یہ مرتبہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا" آرزو کر۔ چنانچہ وہ آرزو کرے گا' پھر آرزو کرے گا (کہ میرے لیے فلاں چیز ہو' فلاں چیز ہو' وغیرہ۔) اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے اپنی ساری آرزوؤں کا اظہار کر دیا ہے؟ وہ کہے گا "ہاں۔ چنانچہ اللہ اس سے کہے گا' تیرے لیے جو کچھ تو نے آرزو کی ہے' وہ بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی۔" (مسلم)

نماز میں لمبا قیام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز (تہجد) پڑھی۔ آپ اتنا عرصہ کھڑے رہے کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کر لیا۔

(ابووائل فرماتے ہیں) میں نے کہا۔ "وہ کون سا کام تھا؟"

فرمایا "میں نے ارادہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا رہنے دوں۔" (بخاری)

فوائد و مسائل: 1 نماز تہجد باجماعت جائز ہے۔

2 نماز تہجد میں طویل قرات افضل ہے۔

3 شاگردوں کو تربیت دینے کے لیے ان سے مشکل کام کروانا جائز ہے اگرچہ اس میں مشقت ہو۔

4 استاد کا خود نیک عمل کرنا شاگردوں کو اس کا شوق دلاتا اور ہمت پیدا کرتا ہے۔

5 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیکی کا اس قدر شوق رکھتے تھے کہ افضل کام کو چھوڑ کر جائز کام اختیار کرنے کو انہوں نے "برا کام" قرار دیا۔

6 حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا تھا' اب اتباع اور محبت کا تقاضا ہے کہ اس نیکی میں آخر تک ساتھ دیا جائے' اس لیے بیٹھ جانے کو انہوں نے برا سمجھا کہ یہ محبت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

مردے کی خوبیاں بیان کرنا

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پر بے ہوشی طاری ہو گئی تو ان کی بہن رونے لگی اور کہنے لگی۔

"ہائے اے پہاڑ! ہائے ایسے اور ایسے!"
ان کی خوبیاں شمار کرتی تھی۔ چنانچہ جب انہیں ہوش آیا تو فرمایا۔
"تو نے جو کچھ کہا' تو مجھ سے پوچھا جاتا تھا: تو اس طرح ہی ہے؟" (بخاری)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ بین کرنے پر گرفت ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر ایسی خوبیاں بیان کرنا جو مرنے والے میں نہ ہوں تو فرشتے اس پر اسے سرزنش کرتے ہیں کہ کیا تو واقعی ان خوبیوں کا حامل ہے' درآں حالیکہ وہ ان سے محروم ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے ملامت اور توبیخ کا باعث ہے۔

کثرت سے سجدے

حضرت ابو فاطمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"میں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی عمل بتائیے جس پر میں قائم رہوں اور اسے کیا کروں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کثرت سے سجدے کیا کر' کیونکہ تو اللہ کے لیے جو بھی سجدہ کرے گا اس کی وجہ سے اللہ تیرا ایک درجہ بلند کردے گا اور تیری ایک غلطی معاف کردے گا۔" (طبرانی)

فوائدومسائل : 1 نماز کے تمام اعمال ہی اللہ کے قرب کا باعث ہیں' لیکن سجدے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے' کیونکہ یہ اللہ کے سامنے عاجزی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور یہ عجز ہی عبادت کی روح ہے۔

2 طویل قیام کی فضیلت تلاوت قرآن کی وجہ سے ہے اور سجدے کی فضیلت عجز و نیاز کی وجہ سے' اس لیے طویل سجدہ بھی ایک عظیم عمل ہے' جیسے کہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل سجدوں کا بھی ذکر ہے۔

3 سجدے سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں اور گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رب العالمین کے نزدیک یہ شخص سب لوگوں سے زیادہ بڑی شہادت والا ہو گا۔" (مسلم۔ اور بخاری نے بھی اس مفہوم کی بعض روایات بیان کی ہیں۔)

فوائدومسائل :

1۔ اس میں ایک مومن کی عزیمت و استقامت اور پھر شہادت کا ذکر ہے جس کا مظاہرہ اس کی طرف سے دجالی فتنے کے مقابلے میں ہو گا۔

2۔ اس میں اس کی گردن کے اس حصے کو تانبا بنا دینے کا جو ذکر ہے' جس کو تلوار مار کر انسان کے جسم سے الگ کردیا جاتا ہے' تو یہ "حقیقتاً" بھی ہو سکتا ہے' اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بعید نہیں اور بعض لوگ اسے کنائے پر محمول کرتے ہیں کہ دجال اس کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکے گا۔ حقیقت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

3۔ اسی طرح آخر میں دجال کی آگ کو جنت بتلایا گیا ہے۔ یہ یا تو انجام کے اعتبار سے ہے' یعنی اس آزمائش کا نتیجہ جنت ہے۔ یا جنت بمعنی امن و سکون ہے کہ مومن کو اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے آگ میں بھی امن و سکون محسوس ہو گا' یا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح وہ آگ اس کے لیے گلزار بن جائے گی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ دجال کے فتنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنے سوال میں نے کیے' اتنے کسی نے نہیں کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا:
"وہ تجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"
میں نے عرض کیا "لوگ کہتے ہیں: اس کے پاس روٹی کا پہاڑ اور پانی کی نہر ہوگی؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہل ایمان کو

بچالینا اللہ کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔"
(بخاری و مسلم)

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ دجال کے پاس اگرچہ گمراہ کرنے کے بڑے وسائل ہوں گے لیکن اہل ایمان کو اس کے شر سے بچانا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

کان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو بھی نبی آیا، اس نے اپنی امت کو کانے، جھوٹے (دجال) سے ضرور ڈرایا۔ خبردار! وہ دجال کانا ہے اور تمہارا رب کانا نہیں ہے۔ اس دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان (ک ف ر) لکھا ہوا ہوگا۔"
(بخاری و مسلم)

کانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے دجال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے۔ یاد رکھو! مسیح دجال، دائیں آنکھ سے کانا ہے گویا کہ اس کی آنکھ ابھرا ہوا انگور ہو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ دجال اور اس کی فتنہ انگیزی کی بابت جو حدیثیں بیان ہوئی ہیں، یہ صحت اور درجہ استناد کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم کی، جن کی صحت و قطعیت پر علمائے امت کا اتفاق ہے، اس لیے اس کی بابت کسی قسم کا شک صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول بھی ایسی متواتر احادیث سے ثابت ہے جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت کے قریب یہ علامات کبریٰ یقیناً "ظہور پذیر ہوں گی جن پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

2۔ دجال "یہودی الاصل شخص ہوگا۔ فتنہ پردازی میں ممتاز ہونے کی وجہ سے اس کا نام ہی دجال ہے، بہت دجل و فریب سے کام لینے والا۔ اللہ تعالیٰ بھی اہل ایمان کی آزمائش کے لیے اسے بعض خرق عادت امور پر قدرت عطا فرمائے گا، وہ الوہیت کا مدعی ہوگا، یہودیوں کا ایک بہت بڑا گروہ اس کے ساتھ ہوگا، اس کو حدیث میں مسیح الدجال بھی کہا گیا ہے، لیکن یہ مسیح الضلالۃ ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسیح الھدیٰ ہیں۔ مسیح کے معنی اور اس کے ساتھ اسے لقب کرنے کی وجہ میں بہت اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ اس کا ممسوح العین ہونا ہے، بعض، کہتے ہیں کہ وہ مکہ و مدینہ کے علاوہ روئے زمین پر پھرے گا، اس لیے اسے مسیح کہا گیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی لیے مسیح کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے جب نکلے تھے تو ان کے جسم پر تیل ملا ہوا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ جس بیمار پر ہاتھ پھیر دیتے تھے، صحیح ہو جاتا تھا۔ وغیرہ (فتح الباری، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء قبل السلام)

برکت کے ساتھ مال کی زیادتی کے لیے

ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انس آپ کا خادم ہے اس کے لیے اللہ سے دعا کیجیے۔"
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔
"اے اللہ! اس کے مال و اولاد میں زیادتی کر اور جو کچھ تو اسے دے اس میں برکت عطا فرما۔"

بیان ایک سائنس داں کا

انشا جی

ابھی میں نے لیکچر ختم کیا ہی تھا کہ وہ لپک کر میرے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل اور کھلی ہوئی نوٹ بک تھی۔ اس نے کہا۔

"معاف فرمایئے... آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ آج آپ نے جو تقریر کی ہے۔ اس میں اہم نکتے کیا کیا تھے؟ دراصل میں ابھی ابھی پہنچا ہوں جب آپ تقریر ختم کرکے میزبانوں کا شکریہ ادا کررہے تھے۔"

"کیا بات ہے؟ آپ کو آنے میں کیسے دیر ہوگئی؟"

"جی... وہ ادھر ہاکی کا میچ ہو رہا ہے نا! میں ذرا اسے دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"آپ کھیلوں کی رپورٹنگ بھی کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں اس قسم کی رپورٹنگ نہیں کرتا۔ ادبی، سیاسی، ثقافتی اور اس قسم کی دوسری سنجیدہ تقریبات کی رپورٹنگ میرے ذمے ہے۔ کانٹے کا کھیل تھا آج ہاکی کا۔ ایک طرف اس میں یتیم خانہ حمایت اسلام کی ٹیم تھی اور اپنے اللہ دتا نے کھیل کا آغاز کیا تھا۔ دوسری طرف، لیکن آپ کی تقریر کا موضوع کیا تھا؟"

"سائنس"...

خوب... بڑی اچھی چیز ہے سائنس۔" اس نے فوراً" پنسل سے کاپی میں کچھ نوٹ کیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ "معاف فرمایئے۔ فتوحات "ط" سے ہے یا "ت" سے ہے۔ اور آگے چھوٹی "ہ" ہے یا بڑی "ح" ہے حلوے والی؟

میں نے بتایا کہ ط اور چھوٹی ہ نہیں ہے۔

"اچھا... اب فرمایئے کہ لیکچر کا مرکزی خیال کیا تھا؟"

"آج میں نے اس مسئلے کو لیا تھا کہ ریڈیائی لہروں کا ایٹمی تشکیلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

"ٹھہریئے۔" اس نے کہا۔ "ریڈیائی کے کیا ہجے ہوتے ہیں... ریڈیائی... ریڈیو... خیر میں سمجھ گیا۔"

اب اس نے اپنی نوٹ بک بند کرنے کی تیاری کی... اور پوچھا۔

"آپ کا پہلے بھی کبھی ہمارے شہر وزیر آباد سے گزر

ہوا ہے؟"

"نہیں۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہ پہلا اتفاق ہے۔"

"یہاں کی چھریوں، قینچیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا کچھ خیال نہیں۔"

"آپ سلطان ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے۔ کیسا پایا اسے؟"

"اچھا خاصا ہے۔ ذرا مکھیاں زیادہ ہیں۔"

"مکھیاں۔۔۔ تو گویا گڑ کی منڈی کو شہر میں نہیں ہونا چاہیے؟"

"اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے یہاں کا نیا مذبح گھر دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا۔"

"بڑا اچھا بنا ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو اچھا ہی ہوگا۔"

اس نے جلد جلد اپنی ڈائری میں کچھ قلم بند کیا۔ پھر بولا۔

"یہاں کی میونسپلٹی کی کارگزاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں تو آج ہی آیا ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"کیا یہ میونسپل کمیٹیوں والے نالائق نہیں ہوتے۔ کوڑے کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں۔"

"ہاں اکثر شہروں میں تو نالائق ہی ہوتے ہیں۔ کوڑا نہ اٹھانے کی شکایتیں عام ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟ یہاں چنگی والے' لوگوں سے رشوت نہیں لیتے؟"

"مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ کا خیال کیا ہے؟"

"بہت جگہ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی لیتے ہوں۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے"

وہ یہ محاورہ سن کر بہت خوش ہوا اور فوراً "نوٹ بک میں چڑھایا" اور بولا۔

"آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ عام طور پر تو تقریریں کرنے والے خصوصاً" سائنس پر بولنے والے بڑے بور ہوتے ہیں۔ بلکہ کوڑھ مغز۔ اچھا تو خدا حافظ۔ ہاں ایک سوال اور ہے۔ یہ جو نیا ریلوے کا پل بنا ہے۔ اس میں گول مال ہوا ہے۔ سنا ہے سیمنٹ بہت تھوڑا ڈالا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ بہتر جانتے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "بہت جگہ ایسا ہو رہا ہے۔ ٹھیکیدار اور افسر ملی بھگت کیا کرتے ہیں۔"

اس نے خوش خوش سلام کیا اور چلتا بنا۔

اگلے روز میری روانگی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے میں نے اخبار خریدا اور کھولا تو سامنے ہی بڑی سی سرخی نظر آئی۔

"گڑ منڈی کو شہر سے باہر منتقل کیا جائے۔"

مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش کی رائے

وزیر آباد۔۔۔ آج وزیر آباد کے سٹی ہال میں مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش نے ریڈیو کے موضوع پر تقریر کی اور بتایا کہ ریڈیو کی کیسے حفاظت کرنی چاہیے اور کیسے اس کے سیل بدلتے رہنا چاہیے۔ تاکہ فتوحات حاصل ہوں۔ پروفیسر مولا بخش نے وزیر آباد کی خوب صورتی کی تعریف کی، لیکن چھری، قینچیوں کے بارے میں تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ پروفیسر موصوف نے نئے مذبح خانے کو بھی سراہا، لیکن کمیٹی کی مذمت کی جو کوڑا نہیں اٹھاتی۔ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ وزیر آباد کے چنگی والے رشوت لیتے ہیں اور ریلوے پل میں سیمنٹ کم ڈالا گیا ہے۔ بلکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے جو سلطان ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ مطالبہ کیا کہ شہر سے گڑ کی منڈی کو فوراً "ہٹایا جائے۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

اس سے آگے میں نہ پڑھ سکا۔ اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا۔

(بہ شکریہ لی کاک)

✲

اور میں ہوں محمد جنید

نیوز اینکر محمد جنید سے ملاقات

شاہین رشید

کافی عرصے سے محمد جنید سے انٹرویو کرنا چاہ رہے تھے، مگر محمد جنید کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ بس... تب ایک دن ہم نے کہا کہ جس طرح اپنی دیگر ضروری مصروفیات کے لیے ٹائم نکال لیتے ہیں ہمارے لیے بھی نکال لیں... تو ہنستے ہوئے بولے... اوکے اوکے... بتاتا ہوں کب کرنا ہے... اور بات پھر دنوں پر ٹل گئی... پھر ایک دن ہم نے بھی تھوڑا رعب جھاڑا' بڑا ہونے کا فائدہ اٹھایا اور تھوڑا ڈانٹ کر کہا... انٹرویو دینا ہے یا نہیں... بات کا اثر ہوا... اور... اور پھر دوسرے دن کا ٹائم مل گیا... سوچا یہ کام پہلے ہی کر لیتے تو اتنے دن انتظار تو نہ کرنا پڑتا...

"کیا حال ہیں محمد جنید... شکر ہے کہ آج آپ نے ٹائم نکالا۔"

بج... قہقہہ... "چلیں جی... یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔ اب آپ سے ڈھیر ساری باتیں ہوں گی... میرے پاس ٹائم ہے۔ آپ میرے لیے بہت قابل احترام ہیں مگر وقت کی کمی کے باعث ٹائم نہیں دے پا رہا تھا۔"

"چلو... خیر... معاف کیا... ویسے کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟"

"دیکھیں جی... آفس شروع ہو جاتا ہے... تین بجے دوپہر سے اور رات ایک بجے آف ہوتا ہے... چھٹی ہفتے میں ایک ہی دن ملتی ہے۔"

"دیکھنے والوں کو تو لگتا ہے کہ آپ آئے' خبریں پڑھیں اور چلے گئے... کیا ایسا نہیں ہے؟"

ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ خبریں پڑھنے سے دو' چار گھنٹے پہلے آپ کو اسٹوڈیو پہنچنا ہوتا ہے۔ میٹنگ اٹینڈ کرنی پڑتی ہے' تمام خبروں کا' اہم معاملات کا جائزہ لینا پڑتا ہے' پھر آپ تیار ہوتے ہیں اور پھر آپ اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہیں... کافی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"مشکل کام ہے خبریں پڑھنا؟"

"جی مشکل تو ہے... بڑا پریشر ہوتا ہے... بے شک خبریں ہم نہیں بناتے' مگر دیگر معاملات ہمیں دیکھنے پڑتے ہیں۔ پھر کوئی بڑا دن ہے۔ یا کوئی بڑا واقعہ ہو گیا ہے اور ہمیں لائیو جانا ہے... اور جو آپ کی اپنی معلومات ہیں اس کو بھی کام میں لانا پڑتا ہے کیونکہ سب تو لکھا ہوا نہیں ملتا۔ اچانک جو بریکنگ نیوز آجاتی ہیں اور جن کے بارے میں آتی ہیں ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہونا بہت ضروری ہوتا ہے...

صرف پی ٹی وی تھا اس وقت خبریں ریکارڈ کی جاتی تھیں۔ جو لکھا ہوا مل جاتا تھا وہ ہی پڑھنا ہوتا تھا۔ اس میں اپنے پاس سے کچھ اضافہ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ نہ کم کرنے کی۔۔۔ ایکسپریشن نہیں دیے جاسکتے تھے' تو میرا خیال ہے کہ ایسے نیوز کاسٹر کہتے تھے کہ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت پریزنٹیشن دی جاتی تھی۔

لیکن جب پرائیویٹ چینلز کا اجرا ہوا اور لائیو ٹرانسمیشن کا آغاز ہوا۔ آپ کو پوری آزادی دی گئی کہ آپ اپنے انداز میں خبریں پڑھیں۔ اپنے الفاظ اس میں شامل کریں' اپنی معلومات اس میں شامل کریں۔ اپنی طرف سے اگر کوئی سوال کرنا ہے تو کرسکتے ہیں۔ صرف لکیر کے فقیر نہ بنے رہیں۔۔۔ **مثلاً** "اگر شہر میں دھماکہ ہوا اور وزیر داخلہ صاحب سے سوال کرنے ہیں اور ہمیں تین سوال کرنے کو کہا گیا ہے کہ ایک تو یہ کہ "وزیر داخلہ صاحب یہ بتائیے کہ یہ دھماکہ کس طرح ہوا ہے؟"

دوسرا سوال یہ ہوگا کہ اس دھماکے میں کتنے زخمی ہوئے ہیں اور کتنی ہلاکتیں ہوئی ہیں اب اگر پہلے ہی سوال کے جواب میں وزیر نے کہہ دیا کہ دھماکہ ہوا ہی

اب تو اللہ کا شکر ہے کہ حالات کچھ بہتر ہوگئے ہیں مگر پہلے تو ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد کوئی بریکنگ نیوز آجاتی تھی۔"

"محمد جنید۔۔۔ آپ کو اور دیگر ساتھیوں کو ڈر تو لگتا ہوگا کہ گھر سے نکلے ہیں' کسی دہشت گرد کے ہتھے نہ چڑھ جائیں (خدانخواستہ)۔"

"کراچی میں 2009 سے لے کر 2013 تک جو حالات تھے وہ تو انتہائی برے تھے' ہر وقت جلاؤ گھیراؤ۔۔۔ شہر بند۔۔۔ ہڑتالیں۔۔۔ ٹارگٹ کلنگ۔۔۔ تو اپنے آپ کو بہت غیر محفوظ سمجھتے تھے۔۔۔ مگر اب کچھ حالات بہتر ہیں (یہ انٹرویو امجد صابری کے قتل سے پہلے لیا تھا۔۔۔ اب حالات پھر خراب ہوگئے ہیں)۔"

"آپ کہہ رہے ہیں کہ نیوز کا سارا کام نیوز پروڈیوسر کا ہوتا ہے اگر آپ نیوز پروڈیوسر ہوتے تو کیا تبدیلیاں لاتے؟"

"میں اگر نیوز پروڈیوسر ہوتا تو تین تبدیلیاں یا تین نئی چیزیں ضرور کرتا۔ ایک تو یہ کہ خبروں میں سے سنسنی اور شور شرابے کو ختم کرتا یا کم کرتا۔ دوسری یہ کہ ٹیکنالوجی اور پریزنٹیشن کو ماڈرن۔۔۔۔

۔۔۔۔ کروں گا اور تیسری تبدیلی یہ کہ زبان و بیان کو مزید اچھا کروں گا۔۔۔ اگرچہ یہ کام ابھی بھی ہو رہا ہے۔ مگر میں اپنے حساب سے اپنی سوچ کے مطابق کرتا۔"

"ماڈرن" کرنے سے کیا مراد ہے؟

"اس سے مراد یہ ہے کہ زیادہ اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہو۔ اچھی پریزنٹیشن ہو۔ واکنگ اسٹینڈنگ اسٹوڈیو ہو۔۔۔ پوری دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ اور بی بی سی ہو' سی این این۔۔۔ یہ سب بہت زیادہ ترقی کرگئے ہیں۔۔۔"

"یہ مشکل نہیں ہوتا کہ کبھی ٹہل ٹہل کے خبریں پڑھ رہے ہیں' کبھی بیٹھ کر۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ سب کچھ مکس ہوتا ہے۔"

"نیوز کاسٹر اور نیوز اینکر میں کیا فرق ہے۔۔۔"

"وہ زمانہ جب پرائیویٹ چینلز نہیں تھے اور

نہیں۔ تو نیوز کاسٹر جو لکیر کا فقیر ہو گا وہ دوسرا سوال بھی کردے گا یا کردے گی کہ "دھماکے میں کتنے لوگ زخمی یا ہلاک ہوئے۔ تو ظاہر ہے کہ وزیر ناراضی سے کہے گا کہ جب میں نے کہہ دیا کہ دھماکہ ہوا ہی نہیں تو اس سوال کا کیا جواز ہے..... تو لائیو پروگرام میں اپنی عقل سے ساری سچویشن کو ہینڈل کرنا ہوتا ہے۔

اینکرنگ ایک مختلف جاب ہے آپ کو اپنے طور پر اپنی صلاحیت کے تحت' اپنی معلومات کے تحت اور جو اسکرپٹ آپ کے پاس ہوتا ہے۔ اس میں مختلف سیچویشن کے تحت اضافہ یا کمی کرنی ہوتی ہے۔ یہ اینکر کی جاب ہوتی ہے جو نیوز کاسٹنگ سے بالکل مختلف ہے۔ کبھی کبھی نیوز پروڈیوسر آپ کو صرف یہی بتائے گا کہ ڈاکٹر عاصم کا جو کیس ہے اس کی آپ کو لائیو کوریج کرنی ہو گی جب وہ کورٹ سے باہر آئیں گے۔ کوئی بھی انسان جو اخبار اور ٹی وی سے وابستہ ہے اسے اس کیس کے بارے میں پوری معلومات ہو گی۔ اب جب وہ کورٹ سے باہر آئے گا تو آپ کو نہیں معلوم ہو گا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ لیکن آپ کو اس کے ساتھ ہونے والے چند بڑے واقعات کا علم ہونا چاہیے اور آپ اپنے ناظرین کو بتائیں گے کہ گزشتہ ایک ہفتے کے دوران یا ایک مہینے کے دوران ان کے ساتھ یہ ہوا..... کبھی کبھی انسان بلینک بھی ہوتا ہے..... مگر کبھی کبھی قسمت اسے بچالیتی ہے۔"

"یہ جو آپ کے کانوں میں آئی ایس پی لگا ہوتا ہے اس کی مدد سے بھی تو پروڈیوسر ہیلپ کرتا ہو گا؟"

"جی' پروڈیوسر اسی سے کمیونی کیٹ کرتا ہے لیکن جب اس کے پاس بھی کچھ نہ ہو بتانے کو تو پھر مشکل ہو جاتی ہے۔"

"ہماری بہت سی نیوز اینکرز اب باقاعدہ اینکرنگ کرتی ہیں۔ ٹاک شوز میں..... آپ کا دل چاہتا ہے اس طرح کے پروگرام کرنے کو؟"

"جی جتنی بھی ہماری نیوز اینکرز تھیں جو کہ اب ٹاک شو کرتی ہیں وہ سب میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی اپنے آپ کو اس طرح کے پروگرام کے قابل نہیں سمجھتا کیونکہ نہ صرف یہ ایک مشکل کام ہے بلکہ بہت بڑی ذمہ داری کا کام بھی ہے۔ آپ ہر چیز' جیسے کانٹینٹ' ریٹنگ' پریزنٹیشن کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ آپ پر اور آپ کی ٹیم پر دہری ذمہ داری آجاتی ہے۔ کہ لوگ پسند بھی کریں' پروگرام ان کے لیے قابل قبول بھی ہو۔ اور تعریف بھی ہو۔ اس طرح کے پروگرام کے لیے ہر لحاظ سے میچور ہونا ضروری ہے..... ایسا نہیں ہے کہ میں اس طرح کے پروگرام نہیں کر سکتا۔ جب ذمہ داری پڑتی ہے تو بہت احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتا ہوں۔"

"جیسے شاہ زیب خانزادہ کی عدم موجودگی میں میں نے پروگرام کیے۔ آؤٹ ڈور بلیٹن ٹرانسمیشن بھی کی ہیں میں نے۔ عطا آباد میں 2010 میں لینڈ سلائیڈنگ کا جو حادثہ ہوا گلگت بلتستان میں اس کی لائیو کوریج کی جلسے جلوس کور کیے۔ 2010 میں پنجاب اور خیبر پختون خوا میں سیلاب آیا اس کی لائیو کوریج کی۔ تو اس طرح کے کافی پروگرام کر چکا ہوں۔ لیکن ایک ہی پروگرام میں چلے جانا اور اسے فل ٹائم دینا اس کے لیے میں ابھی اپنے آپ کو تیار نہیں سمجھتا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں کام کے ساتھ انصاف نہیں کرپاؤں گا۔ بے شک ہمارے کچھ ساتھی کامیاب ہوئے لیکن کچھ اپنے کام کے ساتھ انصاف نہیں کرسکے۔ اس لیے نظر بھی نہیں آتے۔"

"آؤٹ ڈور کام کرنا مشکل ہے؟..... اور کیا ایک مشہور بندے کو دیکھ کر لوگ اپنی مشکلات بتاتے ہیں یا چھپاتے ہیں؟"

"آؤٹ ڈور کام مشکل ہے اور اخبار ہو یا ٹی وی۔ ان میں دو لوگوں کی جاب بہت مشکل ہے۔ ایک رپورٹر کی جاب اور دوسرے وہ جو ایڈیٹوریل —— میں ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی بہت ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ رپورٹنگ بہت مشکل کام ہے میں نے رپورٹرز

کے ساتھ کافی کام کیا ہے' میں رپورٹرز کا بہت احترام کرتا ہوں کیونکہ ان کا کام بہت مشکل ہے۔ اسٹوری لانا' حادثات والی جگہ پر جانا' جان ہتھیلی پر رکھ کر رپورٹنگ کرنا۔۔۔ میں نے بھی یہ کام کچھ عرصہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ لوگ پریشان بھی کرتے ہیں' غلطی ہو بھی کرتے ہیں۔"

"دل چاہتا ہے انٹرٹینمنٹ کے پروگرام کرنے کا؟"

"نہیں اس طرف کوئی خاص رجحان نہیں ہے۔۔۔ ضرور ہے کہ فلم یا ڈرامے میں میری ہی فیلڈ کا کوئی رول مجھے آفر ہو تو ضرور کروں گا لیکن مستقل طور پر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ ایک دو بار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

"اپنے ساتھی اینکرز میں یا سینئرز میں کون پسند ہیں آپ کو؟"

"ساتھی اینکرز کے بارے میں بتانا تو ذرا مشکل ہے لیکن سینئرز میں طلعت حسین مجھے بہت زیادہ پسند ہیں۔ ثنا بچہ بہت پسندیدہ ہیں' بڑی بہنوں کی طرح ہیں' ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خواتین میں ان سے زیادہ اچھا شو کسی نے نہیں کیا۔"

"ہماری اکثر خواتین اپنے ادارے کی طرف سے باہر شو کرنے گئیں' آپ کو ایسی آفر آئی؟۔۔۔ یا اگر ملک سے باہر جاب کی آفر آجائے تو؟"

"جی مجھے ابھی تک ایسی کوئی آفر نہیں ہے۔ لیکن اگر مجھے بھی ٹریننگ اور پروگرام کے لیے بھیجا گیا تو ضرور جاؤں گا۔ اور جہاں تک باہر سے جاب آفر ہونے کی بات ہے تو فی الحال تو ملک سے باہر جا کر جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"منزل کہاں ہے آپ کی؟ پلاننگ کیا ہے؟"

"میں ایک بہت ہی قابل اعتبار' قابل بھروسا اور بہت ہی قابل جرنلسٹ بننا چاہتا ہوں۔۔۔ اور اس مقام تک پہنچنا چاہتا ہوں جہاں میری بات کی اہمیت ہو۔۔۔ اور میری بات کو سچ جانا جائے۔"

"مرد کی آنکھوں میں آنسو کوئی بہت بڑے واقعے پہ ہی آتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوا کہ کسی خبر نے آپ کو رلا دیا ہو؟"

"ہاں۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ "سانحہ پشاور" اس نے بہت تکلیف دی۔ معصوم بچوں کی ناگہانی موت نے سب کو ہی رلا دیا۔ اور پھر 2008 سے مسلسل پانچ چھ سال تک جو ملک کے حالات رہے۔ جو دہشت گردی رہی۔ جو خدائی آفات آئیں۔ اس نے بہت حد تک ملک کے حالات سے مایوس کیا۔ اور ہر واقعے کے بعد لگتا ہے کہ اس سے بڑا واقعہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اس سے بھی بڑا واقعہ ہو جاتا ہے۔ بس اللہ میاں سب کچھ سہنے کا حوصلہ اور ہمت دیے رکھے۔ ہر واقعے پہ اتنی مایوسی ہوتی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گا پھر سوچتے ہیں کہ آج نہیں تو کل اچھا وقت آہی جائے گا۔"

"کبھی لائیو خبریں پڑھتے وقت کوئی حماقت یا غلطی ہوئی؟"

"ایک بار آئی ایس پی آر کے میجر جنرل سے بات ہو رہی تھی۔ میجر جنرل کو آپ جنرل کہہ سکتے ہیں مگر خالی میجر کہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔۔۔ کیونکہ میجر چھوٹا رینک ہے اور میجر جنرل بڑا۔ لیکن میں نے کوئی تین بار میجر جنرل کہنے کے بجائے صرف میجر کہا۔۔۔ جس پر مجھے کافی ڈانٹ پڑی تھی۔۔۔ اگرچہ ان میجر جنرل صاحب نے تو مجھے کچھ نہیں کہا لیکن میرے بڑوں نے مجھے خوب ڈانٹا۔۔۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ "آر آئی آر" ایک ریسرچ کمپنی ہے جو سروے کرتی ہے یہ سروے پولیٹکل ہوتا ہے اس کے موضوع پر ایک بار پرویز رشید صاحب سے بات ہو رہی تھی تو میں ایک لفظ پہ اٹک گیا اور میرے منہ سے کوئی آدھے منٹ تک صحیح لفظ نکلا ہی نہیں میں "آر آئی آر" کہنے کے بجائے آر آر کہتا رہا۔۔۔ اور سب لوگ ہنسے بھی بہت۔۔۔ اور کبھی کبھار غلط الفاظ بھی منہ سے نکل جاتے ہیں۔"

"اپنی ساتھی خواتین اینکرز کے بارے میں بتائیں... کیسی دوستی ہے سب سے؟"

"میں اپنے آپ کو بہت لکی سمجھتا ہوں کہ مجھے بہت اچھی کولیگز ملی ہیں۔ میں نے عائشہ بخش، ثنا مرزا اور ناجیہ اشعر سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے... جیو کا جو طریقہ کار خبریں پڑھنے کا ہے اس کے بارے میں بہت کچھ سکھایا اور اچھی اچھی ٹپس بھی دیں... اور جو اب ہیں، ان سے بھی میرے بہت اچھے تعلقات ہیں اور کبھی بھی کسی کے ساتھ بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔"

"چلیں جی... کام کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں... اب اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے۔"

"میری پیدائش اور رہائش لاہور کی ہے۔ میں 1984 میں پیدا ہوا، میرے والد کا تعلق لاہور کی پنجابی فیملی سے ہے۔ میری والدہ کا تعلق کراچی سے ہے۔ اکثر پنجابی فیملی کے بچوں کا لب و لہجہ صاف نہیں ہوتا لیکن یہ سب میرے والد کی بدولت ہے کیونکہ وہ طالب علمی کے زمانے میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے رہتے تھے تو انہوں نے میری ٹریننگ اور تربیت بھی اس انداز میں کی کہ لہجہ اور تلفظ خراب نہ ہو... اور مجھے اپنی آواز کا فیڈ بیک بہت ملتا ہے سب آواز کی تعریف کرتے ہیں تو یہ بھی مجھے والد کی طرف سے ملی ہے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں یعنی ہم دو بھائی اور ایک بہن... جو کہ اپنی پڑھائی مکمل کر چکے ہیں۔ میں بہن بھائی میں بڑا ہوں... میں نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا اور پورے پنجاب میں ٹاپ کیا۔"

"بچپن میں کیا خواب دیکھتے تھے کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟"

"جی بچپن میں بہت سے خواب ہوتے ہیں، ایک خواب تو میں یہ دیکھتا تھا کہ میں نے بڑے ہو کر پائلٹ بننا ہے... اور جہاز اڑانا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بچپن میں کرکٹ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا اور جب 92 میں پاکستان نے ورلڈ کپ جیتا تھا تو اگرچہ بہت چھوٹا تھا مگر عقل تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ تو سب کی خوشی اور جوش و جذبہ دیکھ کر دل چاہا کہ میں بھی کرکٹر بنوں۔ اور پھر اسکول لیول تک میں نے کرکٹ کھیلی۔ مگر پھر آگے تک نہ جا سکا، لیکن اب بھی اسپورٹس ایکٹویٹی میں حصہ لیتا رہتا ہوں اور سکندر بخت کے ساتھ کھیلنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔"

"تیسری میری خواہش تھی کہ میں فارن سروس میں جاؤں اور پاکستان کی نمائندگی کروں۔ مگر یہ خواب بھی پورا نہیں ہوا... اور پھر جب بیچلر کر رہا تھا تو صحافت کی طرف رجحان ہوا اور ایک میگزین سے منسلک ہوا... اور اگر نیوز کی سائیڈ پہ نہ ہوتا تب بھی صحافت کی سائیڈ پر ہی ہوتا۔ کچھ لکھ رہا ہوتا۔ یا پروڈکشن کی سائیڈ پر ہوتا... مطلب اس فیلڈ میں کچھ نہ کچھ کر رہا ہوتا لکھنے کا بہت شوق ہے ان شاء اللہ اس پر ضرور طبع آزمائی کروں گا۔"

"اس فیلڈ میں آنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑی یا آسانی سے سب کام ہو گئے؟"

"اللہ تعالیٰ کی مہربانی۔ والدین کی دعائیں اور پھر میری محنت... تو اللہ نے یہ مقام دیا۔ ہمارے والدین نے اپنی اولاد کے لیے بہت قربانیاں دیں جو کہ رائیگاں نہیں گئیں... ابھی میرا ماسٹرز مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں اس فیلڈ میں آ گیا... 2007 میں ایکسپریس نیوز نے لاؤنچ ہونا تھا تو میری یہاں جاب ہو گئی تھی... اور دو سال اس چینل پہ کام کرنے کے بعد 2009 میں جیو جوائن کر لیا۔ اکتوبر 2016 میں مجھے جیو جوائن کیے سات سال ہو جائیں گے۔ جیو جیسا ادارہ اور یہاں جیسی آرگنائزیشن ہے میرے خیال میں پورے پاکستان میں کہیں اور نہیں تو ان شاء اللہ اسی ادارے کے ساتھ وابستہ رہنا ہے... باقی جو اللہ کو منظور ہو..."

"ریڈیو سے بھی وابستہ رہے؟"

"پنجاب یونیورسٹی کا اپنا ایک ریڈیو چینل ہے ایف ایم 106.4 تو جب میں 2005 میں

یونیورسٹی آیا تو میں نے تقریباً "ڈیڑھ سال اس چینل سے پروگرام کیے۔ اس میں سینئرز کے ساتھ مل کر پروگرام پروڈیوس بھی کیے اور ہوسٹنگ بھی کی۔ ڈرامے بھی کیے ریڈیو کے۔"

"پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟"

"جب تک اخبارات کا دور تھا تو زیادہ پیسے نہیں ملتے تھے۔ لیکن جب چینل کا دور آیا تو پھر کافی بہتری آئی..... اور اب تو میڈیا کی جاب ایک فل ٹائم جاب ہوگئی ہے..... اور ماشاء اللہ سے بہت اچھی سیلری ہوتی ہے۔"

"جب لڑکے کماؤ پوت ہوجاتے ہیں تو پھر وہ اپنا لائف اسٹائل بدلنا چاہتے ہیں..... آپ کب بدل رہے ہیں لائف اسٹائل؟"

"قہقہہ..... "فیملی کی خواہش ہے کہ جلدی سے سب کچھ ہوجائے..... مگر فوری طور پر تو ایسا کچھ نہیں ہورہا..... لیکن آئندہ چند سالوں میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی آئے گی۔"

"آپ کی اپنی پسند ہوگی؟"

"بالکل پسند سے کروں گا مگر اپنے والدین اور اپنے بڑوں کی پسند کا بھی خیال رکھوں گا..... اور یہ بات میں ضرور کہوں گا کہ انسان جس کو پسند کرے اس کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ اور ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہے زندگی کے معاملات میں اور دیگر معاملات میں بھی۔"

"گھریلو ہو یا ورکنگ وومن ہو؟"

"ہمارا معاشرہ ہو یا دنیا کا کوئی بھی معاشرہ ہو' عورت ایک صنف نازک کہلاتی ہے' مگر یا شرے کا سب سے اہم حصہ..... مرد کی ذمہ داری کمانا اور گھر چلانا ہوتی ہے..... مگر عورت کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ وہ بیوی بھی ہے۔ بچوں کی ماں بھی ہے پھر وہ اپنا میکہ چھوڑ کر آئی ہوئی ہوتی ہے جہاں وہ بیٹی بھی ہوتی ہے' بہن بھی ہوتی ہے۔ اس کو یہ سب رول نبھانے پڑتے ہیں اور اس کا اسے کوئی معاوضہ بھی نہیں ملتا..... مرد کو معاوضہ نہ ملے تو وہ جاب چھوڑ دیتا ہے۔ جبکہ عورت کے پاس تو اور کوئی آپشن بھی نہیں ہوتا..... اور میری یہ سوچ ہے کہ ہر معاشرے میں عورت ایک کمزور حیثیت رکھتی ہے۔ تو خواتین کو اگر پاور ملتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں کامیاب ہوتی ہیں۔ انہیں وسائل ملتے ہیں ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوگی اور ایسا میں سب خواتین کے لیے سوچتا ہوں..... تو میں جس لڑکی سے شادی کروں گا اسے پوری آزادی ہوگی کہ وہ اپنی زندگی میں جو کامیابیاں حاصل کرنا چاہتی ہے کرے۔ میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

"اپنے مزاج کے بارے میں بتائیں..... اور کھانے پینے کے کتنے شوقین ہیں آپ؟"

"مجھے غصہ آتا ہے لیکن مجھے کبھی بھی اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ میرے غصے کی وجہ سے لوگ مجھ سے ناراض ضرور ہوئے ہوں گے مگر میں نے غصے میں نہ کبھی توڑ پھوڑ کی ہے اور نہ ہی کبھی کسی کا دل دکھایا ہے..... اس لیے اس معاملے میں میں دوسروں سے بہت بہتر ہوں۔ اور کھانے پینے کا شوقین ہوں۔ اپنے پاکستانی کھانے بہت زیادہ پسند ہیں۔ بریانی' چکن کڑاہی' دال چاول بے حد پسند ہیں۔ اور جاپانی کھانوں میں "شوشی" بہت پسند ہے اور فرنچ کھانے بھی پسند ہیں..... ایک شوق جو مجھے اپنی ذاتی زندگی میں بہت زیادہ رہا ہے کہ میں کھانا بنانا سیکھوں اور باقاعدہ ٹریننگ لوں..... مگر کبھی موقعہ ہی نہیں ملا۔ بے شک سب کچھ پکا پکایا مل جاتا ہے مگر کھانا پکانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے "محمد جنید" سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

فطری بات ہے ہم جن کو پسند کرتے ہیں' جن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں' ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں' ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔ اس لیے ہم نے مصنفین کے لیے ایک سروے ترتیب دیا ہے۔ جس کے سوالات یہ ہیں۔

س 1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت سے منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

س 2۔ آپ کے گھر والے' خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

س 3۔ آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو؟ اب تک جو لکھا ہے' اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟۔

س 4۔ اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟۔

س 5۔ اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں' مصنفین نے ان کے سوالات کیا جوابات دیے ہیں۔

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

نازیہ جمال

ارے بھئی کیسی مصنفہ؟ کہاں کی مصنفہ؟ وہ تو بس اپنی ذات کی کتھارسس کے لیے فرصت کے لمحوں میں چند سطریں لکھیں تو مصنفہ بن گئے؟ چلیں خیر۔ ڈیئر امتل کی بخشی ہوئی عزت افزائی کے لیے شکریہ کے طور پر قلم تھام ہی لیا ہے تو سوالات کے جوابات ایمان داری سے دینے کی کوشش کرتی ہوں۔

(1) جی نہیں' لکھنے کا شوق اور صلاحیت بالکل بھی کسی طرف سے میری جینز میں منتقل نہیں ہوئی۔ یہ سراسر اوپر والے کا کرم ہے کہ اس نے مجھے اظہار ذات کا سلیقہ بخشا۔ لیکن نارڑ صاحب سے میں بھی اتفاق کرتی ہوں کہ قدرتی صلاحیت صرف دس فیصد ہوتی ہے۔ باقی نوے فیصد آپ کا مطالعہ اور مشاہدہ ہوتا ہے اور مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ میرے لکھنے کا محرک میرا مسالا ہے۔ جی ہاں! مجھے بچپن میں اپنے بستے میں موجود کتابوں کے علاوہ ہر چیز پڑھنے کا شوق تھا۔

چاہے وہ انسانی چہرے ہوں یا مسالہ جات کو لپیٹے ہوئے اخبار کے ٹکڑے۔

دادا جان' بان کی بڑی سی چوکی پہ بیٹھے اے حمید کی "امرتسر کی یادیں" لیے گہرے استغراق سے پڑھ رہے ہیں اور میں پیچھے کھڑی رکوع میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے خاموش' بالکل چپ لفظوں پہ نظریں دوڑاتی جا رہی ہوں کہ مبادا دادا صفحہ الٹ دیں اور میں پورا صفحہ نہ پڑھ سکوں۔

ان کی دکان میں رکھا رسالوں اور کتابوں سے بھرا ڈبا میرے دل کو دھڑکانے اور منہ بھر آنے کا سبب اس وقت تک بنتا رہا جب تک دادی جان نے سردیوں میں کوئلوں سے بھری انگیٹھی دہکانے کے لیے ورق ورق کر کے نذر آتش نہیں کر دیا تھا۔

ادھر تمام افراد خانہ دادی کے چھ چوبی کھڑکیوں والے کمرے میں جمع پرائم ٹائم ڈرامہ دیکھنے میں مگن اور ادھر میں چپکے سے ڈبے سے "سونا گھاٹ کا پجاری" لے کر آنگن میں لگے زرد بلب کی روشنی میں آ

بیٹھی اور ہولتے ڈرتے ہوئے کتاب ختم کرنے کی کوشش کرتی کہ مبادا ڈرامہ دیکھ کر سب ہی باہر نہ آجائیں۔

اسکول لائف میں پاکٹ منی میں ملنے والا براؤن مٹیالے رنگ کا ایک روپیہ اسکول کے بالکل پاس لگی دکان سے پاکٹ سائز چھ صفحوں کی کہانی خریدنے میں خرچ کرویتی تھی۔ روز کا ایک روپیہ روز کی ایک کہانی حالانکہ ساتھ میں سموسوں کی دکان سے اٹھتی اشتہا آمیز خوشبو میرے "آدھی چھٹی" کے وقت 'بالکل خالی ہوئے پیٹ کو خوب لبھاتی 'بالکل ساتھ میں ٹافیوں 'ببلز کے رنگ برنگے ڈھیر بھی اپنی طرف کھینچتے مگر میری مٹھی میں دبا ہوا ایک روپیہ موٹی توند والے خوب گورے چٹے خون چھلکاتے چہرے والے پٹھان چاچا کے گلے میں ہی جاتا تھا جو چھوٹی چھوٹی ہاتھ جتنی مزیدار کہانیاں بیچ رہے ہوتے تھے۔

ایک رشتہ دار کے گھر ہفت روزہ بچوں کا میگزین آیا کرتا تھا۔ جلتی جھلساتی دوپہر میں ان کے گھر جاکر میگزین عنایت کرنے کی عاجزانہ درخواست کرڈالی۔

"مگر وہ تو پڑھ کر اسٹور روم کی شیلف میں اوپر پھینک دیے تھے۔" خاتون خانہ کا بے نیازو لاپرواہ جواب مجھے بے انتہا خوش کر گیا تھا کہ جی اسٹور میں جا کر شیلف سے میگزین کا ڈھیر اٹھانا کون سا مشکل ہے۔

مگر وہ کچے کمرے کا بنا اسٹور تقریباً" چھت تک بھوسے سے بھرا ہوا تھا۔

دور شیلف میں رکھا میگزینز کا بنڈل مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اور قربان جاؤں اپنی آتش شوق کے جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں بھوسے کے ڈھیر پر چڑھ گئی۔ آگے بڑھتا قدم کمر تک بھوسے میں دھنسا دیتا مگر خود کو نکالتی۔ گرتی پڑتی شیلف تک بالآخر پہنچ ہی گئی۔ چھت سے لٹکتے بڑے بڑے جالے میرے سر اور چہرے کو ڈھانپ چکے تھے۔ پسینے سے شرابور کپڑوں پہ بھوسہ ایسے لگا ہوا تھا جیسے میں نے کوئی بھوسے کا لباس پہن رکھا ہو۔ اپنی ہیئت کذائی کے برعکس میرا دل طمانیت سے لبریز اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی کہ پورے ایک مہینے کا پڑھنے کا مواد میرے ہاتھوں میں موجود تھا۔

گھر میں شازیہ کو میرے علاوہ لکھنے کا شوق ہے۔ شازیہ کے پاس گہرا مشاہدہ اور قوت اظہار کا سلیقہ ہے۔ امی مقابلتاً "شازیہ کو مجھ سے بہت بہتر قرار دیتی ہیں اور بالکل بجا طور پر قرار دیتی ہیں۔ شازیہ کے تیور بتا رہے ہیں کہ منزل ستاروں سے آگے ہے۔

(2) گھر میں امی میری تحریروں کو کافی شوق اور تنقیدی نظر سے پڑھتی ہیں۔ وہ میری سب سے بڑی نقاد ہیں۔ میرا لکھنا ان کے لیے باعث فخر ہے۔ لوگ جب ان سے ملتے ہیں اور میری کہانیوں کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو انہیں بہت خوشی ملتی ہے۔ لیکن امی کو میرے کم بلکہ بہت کم لکھنے کا گلہ رہتا ہے۔

"باقاعدہ لکھو اور بہت اچھا لکھو۔" ان کا حکم ہے۔ اور میں کہتی ہوں کہ اگر نایاب جیلانی 'نبیلہ عزیز اور عفت سحر طاہر جیسا نہ لکھا تو کیا لکھا؟ ہاہاہا۔ خاندان والے میری تحریریں پڑھتے ہیں یا نہیں پڑھتے 'مجھے اس کا صحیح علم نہیں ہے کیونکہ کبھی خاندان کے کسی فرد نے میرے سامنے میری کسی تحریر یا تحریر کے کردار کی تعریف 'تنقید 'کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حالانکہ باقاعدہ پڑھنے والے کافی تعداد میں ہیں مگر ان کی خاموشی 'بے نیازی یا اغماض جو بھی کہہ لیں 'میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

(3) خواتین 'شعاع اور کرن میں چھپنے والی میری تمام تحریریں میرے لیے باعث تسکین و طمانیت ہیں۔ کیونکہ ان تحریروں کی بدولت بھیڑ میں مجھے ایک نام اور پہچان ملی۔ "چاند رات مبارک" اور "یہ تو دل کی بات ہے" یہ قاری بہنوں کے تعریفی جملے میرا ڈھیروں خون بڑھا گئے تھے۔ "اب یوں کرتے ہیں" یہ ایک قاری بہن کا یہ کہنا کہ "نازیہ جمال کو میری طرف سے سلام" بے اختیار آنکھیں نم کر گیا تھا۔

لگ بھگ آٹھ سال قبل کرن میں چھپنے والا افسانہ

"یہ ذوق براہیمی" مجھے اس لحاظ سے بھی بہت پسند ہے کہ اس کے چھپنے پر مجھے سویٹ اسٹل کی تعریفی کال موصول ہوئی تھی۔

(4) گزشتہ کچھ سالوں سے میں نے باقاعدہ طور پر کچھ بھی پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ چرخ کہن نے مجھے آزمائشوں کے ایسے گرداب میں دھکیلا کہ میں خود سے بھی بہت دور ہوگئی۔ درد پیہم اور کرب مسلسل کی کیفیت جھیلتے ہوئے مجھے اپنے قریبی اور خونی رشتوں کی ایسی پرکھ ملی کہ مانو زندہ رہنے اور جی لینے کا فرق سمجھ میں آگیا۔

میں خواتین' شعاع اور کرن میں لکھنے والی تمام مصنفات کو بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتی ہوں کہ اب صرف خواتین' شعاع' کرن' میرے پیارے بھانجے محمد زین العابدین کی مسکراہٹ اور ای کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے بس خوشی کے عنوان یہی رہ گئے ہیں۔

سمیرا حمید' سائرہ رضا' اہمل رضا اور نمرہ احمد... ان چاروں کو میں ایسے پڑھتی ہوں جیسے سالانہ امتحان میں پرچہ دینے سے ایک دن قبل سلیبس کی کتاب پڑھتی تھی۔ مکمل توجہ اور کامل یکسوئی کے ساتھ مبادا انہیں کوئی لفظ یا سطر ذہن نشین ہونے سے رہ نہ جائے۔

صائمہ اکرم چوہدری... سیاہ حاشیہ' بہترین پلاٹ' مضبوط کردار نگاری' قرینے سے پرت در پرت کھلتی داستان' تجسس' دلچسپی اور توجہ کا مکمل سامان لیے۔

صائمہ! فرحانہ باجی (مرحومہ فرحانہ ناز) کی نسبت سے ہم سب گھر والوں کو بہت عزیز ہیں۔ نبیلہ ابر راجہ کے ظاہری خدوخال میں بے پناہ اہمیت رکھنے والے غیر معمولی خوب صورت اور منفرد ہیرو' ہیروئین آج کے دور آشوب میں ذہن کو ہلکا پھلکا کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔

ثمرہ بخاری' جن کے نسوانی کردار مکمل نسوانی خصوصیات سے آراستہ ہوتے ہیں۔ بہترین حس مزاح کے مالک' برجستہ اور حاضر جواب۔ مردانہ کردار جو حالات کا رخ تبدیل کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں' مجھے بہت متاثر کرتے ہیں۔ اگر فہرست میں ثمرہ کا نام ہو تو سب سے پہلے انہیں پڑھتی ہوں۔

اور بنت سحر... منفرد اور پختہ سوچ کے ساتھ فکر و نظر کے نئے نئے زاویے دکھاتی اس شوخی بالی پالی بچی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

(5) میٹرک کی فارسی کی درسی کتاب میں علامہ اقبال کی ایک نظم بعنوان "مکالمہ مابین خدا و انسان" گھر میں بڑے تحت اللفظ کے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔

جہاں را از یک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک فولاد ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائرزن را

(ترجمہ) میں نے دنیا کو ایک مٹی اور پانی سے پیدا کیا۔ تو نے اسے ایران' تاتار اور حبش میں بانٹ دیا۔ میں نے مٹی سے فولاد پیدا کیا تو نے اس سے تلوار' تیر اور بندوق بنا لیے۔ تو نے چمن کے لیے کلہاڑی بنائی اور چہکنے والے پرندے کے لیے تو نے پنجرہ بنا دیا۔

اقتباس تو اس وقت کوئی خاص ذہن میں نہیں آرہا۔ مگر سوئفٹ کے یہ الفاظ مجھے بہت پسند ہیں۔

"جب کوئی ذہین ہستی اس دنیا میں آتی ہے تو تم اس کو اس نشانی سے پہچان سکتے ہو کہ تمام کند ذہن اپنا ایک گروہ بنا کر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔"

اعتذار

بہن آمنہ ریاض علالت کے باعث دشتِ جنوں کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس لیے اس ماہ دشتِ جنوں کی قسط شامل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ بہنیں قسط پڑھ سکیں گی۔

1 "پورا نام؟"

"سارہ رضا خان۔"

2 "پیار کا نام؟"

"میرا نام اتنا چھوٹا ہے کہ اس کا کوئی نک نیم بن ہی نہیں سکتا۔ اس لیے مجھے سارہ ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش/ شہر؟"

"9 نومبر 1995ء/ لاہور۔"

4 "قد/ ستارہ؟"

"پانچ فٹ تین انچ/ اسکارپیو۔"

5 "تعلیم؟"

"انڈر گریجویشن۔ ان شاء اللہ جلدی اپنی تعلیم مکمل کروں گی کیونکہ "ٹور" کی وجہ سے پڑھائی میں خلل آجاتا ہے۔"

6 "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"

"دو بھائی اور ایک بہن بڑے ہیں۔ پھر میں ہوں اور پھر میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔"

معروف نعت خواں گلوکارہ

باتیں سارہ رضا خان سے

شاہین رشید

7 "شادی؟"

"شادی نہیں کرنی... کیونکہ میں بہت خوش ہوں الحمدللہ اور بہت سے مسائل سے دور ہوں۔"

8 "اس فیلڈ میں دریافت کرنے کا سہرا؟"

"میری "مما" کے سر جاتا ہے۔ انہیں میری آواز میں شاید میرا فیوچر نظر آتا تھا۔ یہ ساری جدوجہد انہوں نے ہی کروائی۔"

9 "باقاعدہ کب سے گا رہی ہیں؟"

"یہی کوئی آٹھ نو سال کی عمر سے۔"

11 "ٹی وی اور فلموں کے لیے گایا؟"

"بہت... ڈراموں کے ٹائٹل سونگز ڈیڑھ سو سے زیادہ گا چکی ہوں۔ بے شمار جنگلز گائے ہیں اور فلموں کے لیے بھی جیسے "رانگ نمبر" نامعلوم افراد اور "جوانی پھر نہیں آنی" وغیرہ وغیرہ اور ہجرت بھی۔"

12 "آپ ڈرتی ہیں؟"

"ہاں جی ڈرتی ہوں اللہ تعالیٰ سے کہ وہ اتنا نواز رہا ہے تو اس میں مزید برکت دے اور مجھے شکرانہ ادا کرنے کی توفیق دے اور کبھی مجھے زوال نہ دے۔"

13 "ایوارڈز ملے؟"

"الحمدللہ ملے۔ ابھی حال ہی میں لے آر وائی والوں نے بہترین پلے بیک سنگر کا ایوارڈ دیا۔ فلم نامعلوم افراد کے لیے اور باقی بھی ملتے ہی رہتے ہیں۔"

14 "صبح کب ہوتی ہے؟"

"جب مجھے کہیں جلدی جانا ہوتا ہے۔ ورنہ تو ذرا آرام سے ہی اٹھتی ہوں۔ ویسے کبھی کبھی صبح چھ بجے بھی اٹھ جاتی ہوں۔"

15 ''مما کی کوئی بات جو بری لگتی ہو؟''
''نہیں کوئی نہیں 'بلکہ میری ماں تو ایسی ماں ہیں جن کو فرشتہ کہنا چاہیے۔''
16 ''گھر کے کاموں سے دلچسپی؟''
''کوئی نہیں ہے۔ بالکل نہیں ہے مگر گھر کی تزئین و آرائش کا شوق ہے۔ کھانا پکانا بالکل نہیں آتا۔ نہ شوق ہے۔''
17 ''اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟''
''صبر و تحمل کی' مجھے ہر جلدی چاہیے ہوتی ہے اور غصہ بھی آجاتا ہے۔''
18 ''اپنی بھوک کیا کھا کر مٹاتی ہیں؟''
''مجھے گھر کا کھانا کھانا ہوتا ہے۔ باہر کتنا ہی کھالوں بھوک ختم نہیں ہوتی۔''
19 ''کس دن کا انتظار رہتا ہے؟''
''میگا شوز کا اور اسٹیج پر جا کر پرفارم کرنے کا اور میلاد پڑھنے کا۔''
20 ''فکر کا کوئی لمحہ؟''
''جب میری مما میری کسی کامیابی پہ خوش ہو رہی ہیں تو مجھے اپنے آپ پر فخر محسوس ہوتا ہے۔''
21 ''کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟''
''اسٹیج پہ پرفارم کرنے کے لیے۔''
22 ''بچپن کی بری عادت جس سے چھٹکارا نہیں پا سکیں؟''
''غصہ اور جلدی آتا ہے۔''
23 ''سائنس کی بہترین ایجاد؟''
''انٹرنیٹ۔''
24 ''سات دنوں میں پسندیدہ دن؟''
''سارے دن اچھے لگتے ہیں الحمد للہ۔''
25 ''بارہ مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟''
''ہر مہینے کی اپنی فضیلت ہے۔''
26 ''غصے میں ری ایکشن؟ زبان درازی یا توڑ پھوڑ؟''
''زبان درازی تو نہیں کرتی۔ مگر توڑ پھوڑ ضرور کرتی ہوں زیادہ نہیں۔ بس تھوڑی سی۔''
27 ''زیادہ غصہ کس پہ آتا ہے؟''
''اپنے چھوٹے بھائی پہ..... کیونکہ میں اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتی ہوں اور جب وہ کہنا نہ مانے تو.....''
28 ''مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟''
''مجھے لگتا ہے کہ مردوں کی اکثریت میں لڑکیوں کے مقابلے میں عقل بہت کم ہوتی ہے۔''
29 ''کوئی گھورے تو؟''
''لڑکوں میں..... تو اچھی خاصی سنا بھی دیتی ہوں اور اکثر نظر انداز بھی کر دیتی ہوں..... کیونکہ ہو سکتا ہے وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔''
30۔ ''بچت کا بہترین طریقہ؟''
''یہ سب مما کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ مجھے کچھ چاہیے ہوتا ہے تو میں مما سے مانگ لیتی ہوں۔''
31 ''پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟''
''یہ سب مما کے کام ہیں..... میں تو پیسہ خرچ کروں تو ٹینشن میں آجاتی ہوں۔''
32 ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''
''مجھے گھر کا کھانا پسند ہے اور گھر میں امی کے ہاتھ کا پکا ہوا پلاؤ پسند ہے۔''
33 ''برا وقت جو گزارا؟''
''اللہ میاں سب کو برے وقت سے بچائے..... جب بابا کا انتقال ہوا تھا تو ہم سب کم عمر تھے اور پڑھ رہے تھے اور مڈل کلاس سے تعلق تھا... خیر۔''
34 ''ماں کا دیا ہوا بہترین تحفہ؟''
''دعائیں..... جو کہ سب لگ رہی ہیں اور مجھے کامیابیاں مل رہی ہیں۔''
36 ''آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟''
''ہاں جی..... زیادہ تر تو چھوڑ ہی دیتی ہوں۔ پڑی نہیں رہتی (مسکراہٹ)۔''
37 ''مخلص کون ہوتے ہیں؟''
''کچھ کہہ نہیں سکتے کہ اپنے یا پرائے.....ویسے وہی مخلص ہوتے ہیں جو کسی سے حسد جلن نہ رکھتے ہوں۔ ورنہ تو حاسد لوگوں کی تعداد بہت ہوگئی ہے۔''
38 ''چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟''
''گھر پر رہتی ہوں اور سو کر گزارتی ہوں۔''

39 "ڈریسز میں کیا پسند ہے؟"
"مجھے مشرقی یا پاکستانی لباس پسند ہے۔"
40 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"سوائے ماں باپ کے کوئی سچی محبت نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کی محبت میں کچھ نہ کچھ غرض ضرور ہوتی ہے۔"
41 "مرد ذہین ہونا چاہیے یا حسین؟"
"مرد کا ذہین ہونا بڑا مشکل ہے (قہقہہ) ویسے حسین اور ذہین دونوں ہونے چاہئیں۔"
42 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"گھر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہوتا ہے اور اگر والدین کا ساتھ ہو تو وہ گھر جنت ہوتا ہے۔ پھر کونا نہیں پورے گھر میں سکون ہوتا ہے۔"
43 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"
"دوستوں اور رشتے داروں کے۔"
44 "بوریت کس طرح دور کرتی ہیں؟"
"میوزک سنتی ہوں۔ اس سے میرا فائدہ بھی ہو جاتا ہے اور دل بھی بہل جاتا ہے۔"
45 "میوزک میں آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"
"بہت ساری شخصیات ہیں، مگر مجھے "لتاجی" آشاجی میڈم نور جہاں نسیم بیگم "تیرہ نور" کافی پسند ہیں۔"
46 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"میں اس لحاظ سے لکی ہوں کہ میرا فون میرے پاس نہیں ہوتا بلکہ میری امی کے پاس ہوتا ہے.... لہٰذا پچھتانے والی بات ہی نہیں ہے۔"
47 "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟"
"مزے کی بات بتاؤں میرے پاس بیگ نہیں ہوتا.... مجھے بیگ پکڑنا پسند نہیں ہے تو یہ ذمہ داری بھی ماما کی ہی ہے۔"
48 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"مجھے میوزک سے متعلق چیزیں کپڑے اور میک اپ جمع کرنے کا بھی شوق ہے۔"
49 "اگر میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟"
"اچھا ہی تھا.... مجھے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔"
50 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"میں تو اچھی نصیحت کی منتظر رہتی ہوں.... کبھی میں نے اس چیز کو نیگیٹو نہیں لیا۔"
51 "وقت کی پابندی؟"
"جی بالکل کرتی ہوں۔ وقت کی پابندی کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"
52 "اپنی کمائی پر فخر ہوتا ہے؟"
"مجھے لگتا ہی نہیں ہے کہ میں کماتی ہوں۔ جو کچھ اللہ دے رہا ہے ماں کی دعا سے دے رہا ہے ورنہ اتنے پڑھے لکھے لوگ بے روزگار ہیں۔"
53 "کھانے کے لیے بہترین جگہ 'اپنا بیڈ' چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"ڈائننگ ٹیبل۔"
54 "ہاتھ سے کھانا پسند ہے یا؟"
"ہاتھ سے.... کبھی کبھار چمچہ استعمال کر لیتی ہوں۔"
57 "آپ کے فینز کی تعداد؟"
"میرا فیس بک پہ فین پیج ہے جس میں میرے فینز کی تعداد 26 لاکھ ہے۔"
58 "اپنے آپ کو ساتویں آسمان پہ محسوس کرتی ہیں؟"
"نہیں۔ اگر کبھی کروں بھی تو مما فوراً" نیچے گرا دیتی ہیں۔"
59 "ایک شخصیت جس کو اغوا کرنا چاہتی ہوں؟"
"سوال بہت عمدہ ہے۔ لتاجی سے ملنا ہے.... اغوا نہیں کرنا۔"
60 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"چھپکلی سے۔"
61 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"میرا نہیں خیال.... آج کل کی محبت تو خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔"
63 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"مجھے یہ رسمیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس صارفانہ کر

کسی مستحق کو دے دیں۔"

64 "فوبیا ہے؟"

"چھپکلی فوبیا ہے.... چھپکلی دیکھ کر کچھ ہونے لگتا ہے' کسی کونے میں بھی نظر آئے تو دیکھ کر بھاگ جاتی ہوں۔"

65 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"کتاب.... میوزک کے ہیڈ فون.... اگر لانگ ڈرائیو پہ جا رہی ہوں ورنہ کچھ خاص نہیں.... کیونکہ میری امی میری ضرورتوں کو سمجھتی ہیں۔"

66 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"ہاں.... ہاں بہت آسانی سے۔"

67 "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دونوں کی سنتی ہوں۔"

69 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"ہاں.... چھوڑ دیتی ہوں۔ مگر مما زیادہ دیر تک بھوکا رہنے نہیں دیتیں۔"

70 "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنیں؟"

"ہنستے ہوئے.... ایسے کام نہیں کرتی۔ یہ سب کچھ ڈراموں میں ہوتا ہے۔"

71 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"

"کبھی کبھی بن جاتی ہے۔ جب لوگ ہماری مشکلات کو نہیں سمجھتے ہیں۔"

72 "نیند جلد آجاتی ہے یا؟"

"نہیں جی.... مما اور میں جب بھی سونے کے لیے لیٹتے ہیں ہمیں بہت سارے کام یاد آجاتے ہیں۔"

73 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"

"پانی.... اور فون.... بس۔"

74 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"آنحضرت کی پیدائش مبارک۔"

75 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"ذائقہ نہ ہو' نمک مرچ کم ہو۔"

76 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"نصیب سے پیسہ ملتا ہے.... میرا ایمان تو یہی ہے۔"

79 "بدلہ لیتی ہیں؟"

"سوچتی ضرور ہوں۔ مگر مما لینے نہیں دیتیں۔"

80 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟"

"فریش ہی رہتی ہوں... اگر کوئی پرابلم نہ ہو تو۔"

81 "موبائل فون سروس بند ہو تو؟"

"تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں تو موبائل استعمال ہی نہیں کرتی۔"

82 "فقیر کو کم سے کم کتنے دیتی ہیں؟"

"کم سے کم.... میری کوشش ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ دوں۔"

83 "سینما میں سب سے پہلی فلم کون سی دیکھی تھی؟"

"انڈیا کے سینما گھر میں دیکھی تھی 1920ء فلم کا نام تھا۔"

84 "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے تجربے سے؟"

"اپنے تجربے سے بھی اور دوسروں کے تجربے سے بھی فائدہ اٹھاتی ہوں۔"

88 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"نہیں ضدی نہیں ہوں۔"

89 "شاپنگ کے لیے بہترین جگہ؟"

"مجھے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں جانے کا شوق ہے مگر کوئی لے کر نہیں جاتا۔"

90 "کبھی آن لائن شاپنگ کی؟"

"جی کئی بار.... اپنے کئی شوق آن لائن شاپنگ سے ہی پورے کرتی ہوں۔"

91 "کوئی قیمتی چیز جو اپنی کمائی سے لی؟"

"نہیں میرے پاس سب کچھ بہت قیمتی ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ مما سے کہہ کر لے لیتی ہوں۔"

94 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"ہائے.... بڑا خطرناک سوال ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے میں اور میری مما دعا کرتے ہیں کہ اللہ تو نے جو دیا اسے برقرار رکھنا۔"

عمیرہ احمد

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈکوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سولا

کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال وجواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

اکیسویں قسط

تبارک الذی

پریذیڈنٹ نے کافی کا خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں میں یہ کافی کا آٹھواں کپ تھا جو اس نے پیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنی کافی نہیں پی تھی' مگر زندگی میں کبھی اسے اس طرح کا فیصلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ آگے گڑھا اور پیچھے کھائی والی صورت حال سے دوچار تھا اور اپنے عہد صدارت میں بہت غلط وقت پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔

کانگریس کے انتخابات سر پر تھے اور یہ فیصلہ ان انتخابات کے نتائج پر بری طرح اثر انداز ہوتا۔ "بری طرح" کا لفظ شاید ناکافی تھا' اس کی پارٹی دراصل الیکشن ہار جاتی' لیکن اس فیصلہ کو نہ کرنے کے اثرات زیادہ مضر تھے۔ وہ اسے جتنا ٹال سکتا تھا' ٹال چکا تھا' جتنا کھینچ سکتا تھا' کھینچ چکا تھا۔ اب اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ کچھ حلقوں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ کچھ طاقت ور لوگ دبے لفظوں میں اپنی ناراضی اور شدید ردعمل سے اسے خبردار کر رہے تھے۔ فارن آفس اسے مسلسل متعلقہ ممالک سے امریکی سفارت خانوں کی تقریباً" روزانہ کی بنیاد پر آنے والے خدشات اور استفسارات کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا اور خود وہ دو ہفتے کے دوران مستقل ہاٹ لائن پر رہا تھا۔ امریکہ کی بین الاقوامی پسپائی ایک الیکشن ہارنے سے زیادہ سنگین تھی' مگر اس کے پاس آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے' اپنی کابینہ کے چھ اہم ترین ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل گفت و شنید کے بعد وہ جیسے تھک کر پندرہ منٹ کا وقفہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اس بریک کے آخری چند کچھ منٹ گزار رہا تھا۔ میز سے کچھ کاغذات اٹھا کر وہ دوبارہ دیکھنے لگا تھا' وہ کیبنٹ آفس میں ہونے والی پانچ گھنٹے کی طویل میٹنگ کے اہم نکات تھے۔ اس کی کیبنٹ کے وہ چھ ممبرز دو برابر گروپس میں بٹے ہوئے دو مختلف حلقوں کے ساتھ تھے۔ اس کا ووٹ فیصلہ کن قرار پاتا اور یہی چیز اسے اتنا بے بس کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی ذمہ داری ہر حال میں اسی کے سر پر آ رہی تھی۔ یہ اس کے عہد صدارت میں ہوتا اور اس کے فیصلہ کن ووٹ سے ہوتا۔ اگر ہوتا تو بھی اور اس ذمہ داری کو وہ لاکھ کوشش کے باوجود کسی اور کے سر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو ایک نظر پھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ بلٹ پوائنٹس اس وقت حقیقتاً" اسے بلٹس کی طرح لگ رہے تھے۔ بریک کے آخری دو منٹ باقی تھے جب وہ ایک فیصلہ پر پہنچ گیا تھا۔ بعض دفعہ تاریخ بنانے والے کے ہاتھوں کو خود جکڑ کر خود کو بنواتی ہے۔

اور تاریخ 17 جنوری 2030 کو بھی یہی کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہشام نے پہلی بار اس لڑکی کو سوڈان میں دیکھا تھا۔۔۔ UNHCR (اقوام متحدہ کا ہائی کمیشن برائے پناہ گزین) کے ایک کیمپ میں کسی پناہ گزین گونگی عورت کے ساتھ اشاروں میں بات کرتے اور اسے کچھ سمجھاتے ہوئے۔ وہ پاکستانی یا انڈین تھی۔۔۔ ہشام نے اس کے نقوش اور رنگت سے اندازہ لگایا تھا اور پھر اس کے گلے میں لٹکے کارڈ پر اس کا نام پڑھ کر اسے اس کا نام پتا چل گیا تھا۔

بے حد معمولی شکل و صورت کی ایک بے حد دبلی پتلی گھنے بالوں والی' سانولی رنگت کی ایک دراز قامت لڑکی۔۔۔ اس کا پانچ فٹ سات انچ قد اس کی واحد خصوصیت لگی تھی اس پہلی ملاقات میں ہشام کو۔

وہ ایک عورت سے بات کرتے کرتے ہشام کی طرف متوجہ ہوئی' ایک ساتھی کارکن کے طور پر اسے مسکراہٹ دی اور ہاتھوں کے اشارے سے ہیلو اور حال چال پوچھا' اس لڑکی نے بھی ہاتھوں کے اشارے سے اس کو جواب دیا۔ دونوں نے بیک وقت اپنے گلے میں لٹکے کارڈز پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے اور اس پر انگلی پھیرتے

ہوئے جیسے خود کو متعارف کرایا۔ وہ CARE کی ورکر تھی' وہ ریڈ کراس کا اور وہ دونوں یو ایس اے سے آئے تھے۔ رسمی تعارف اور وہاں کے حالات کے بارے میں اشاروں میں ہی بات کرنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔

ان کی دوسری ملاقات دوسرے دن ہوئی تھی۔ لکڑی کے عارضی باتھ رومز کی تنصیب و تعمیر والی جگہ پر.... وہ آج بھی اس سے پہلے وہاں موجود تھی اور کچھ تصویریں لے رہی تھی۔ وہ کچھ سامان لے کر وہاں آیا تھا۔ ایک لوڈر گاڑی میں.... دونوں نے ایک بار پھر اشاروں کی زبان میں رسمی علیک سلیک کی۔

تیسری ملاقات لمبی تھی' وہ ایڈ ورکرز کے ایک ڈنر میں ملے تھے.... ڈنر ہال کے باہر کوریڈور میں.... دونوں دس منٹ تک اشاروں کی زبان میں بات کرتے رہے.... وہ پاکستان سے تھی' وہ بحرین سے.... وہ نیویارک یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا' وہ سٹی یونیورسٹی نیویارک میں.... وہ فنانس کا اسٹوڈنٹ تھا' وہ سوشل سائنسز کی.... اور ان دونوں کے درمیان صرف ایک چیز مشترک تھی.... رفاہی کام' جس سے وہ دونوں اپنی نوعمری سے وابستہ تھے۔ ان دونوں کا نصابی سی وی اتنا لمبا نہیں تھا جتنا ان کی غیر نصابی سرگرمیاں....

کوریڈور میں گزارے ان دس منٹوں میں ان دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں ہی پوچھا اور جانا تھا.... اشاروں کی زبان میں سوالات بہت تفصیلی نہیں تھے' لیکن ہشام کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے اور بھی سوال کرتا.... وہ قوت گویائی رکھتی تو وہ کرہی لیتا.... اس کے ساتھ کھڑے اس نے سوچا تھا.... وہ اسے اس شام اتنی ہی دلچسپ لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ہمیشہ کی طرح مل کر آگے بڑھ جاتے.... اس کوریڈور سے بہت سارے گزرنے والے ایڈ ورکرز میں سے ایک جوان دونوں کو جانتا تھا اس نے انہیں بلند آواز میں دور سے مخاطب کرتے ہوئے ہیلو کہا اور ساتھ حال احوال دریافت کیا۔ وہ دونوں بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بیک وقت اس کی ہیلو کا جواب دیتے ہوئے جواباً" اس کی خیریت دریافت کی اور پھر دونوں نے بیک وقت کرنٹ کھا کر ایک دوسرے کو دیکھا.... گنگ ہو کر.... اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے تھے.... اور ہنستے ہی گئے تھے.... سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ.... اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ان کے پاس اس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا اس وقت.... ان دونوں کا پہلا تعارف "خاموشی" نے کرایا تھا اور وہ خاموشی ہمیشہ ان کے ہر جذبے کی آواز بنی رہی.... وہ جیسے ان کا سب سے دلچسپ کھیل تھا.... جب ایک دوسرے سے کچھ بھی خاص کہنا ہوتا تو اشاروں کی زبان میں بات کرنے لگتے.... ہنستے کھلکھلاتے' بوجھتے' بھٹکتے' سمجھتے.... کیا کھیل تھا....!!

وہ اس وقت یونیورسٹی میں نووارد تھے.... ہشام کو حیرت تھی ان کی ملاقات اس سے پہلے کیوں نہیں ہوئی۔ وہ دونوں ایک جیسی رفاہی ایجنسیوں کے ساتھ کام کررہے تھے' لیکن اس سے پہلے وہ صرف امریکہ کے اندر ہی طوفانوں اور سیلابوں کے دوران ہونے والے ریلیف ورک سے منسلک رہے تھے' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں امریکہ سے باہر ہونے والے کسی ریلیف کیمپ میں حصہ لینے کے لیے گئے تھے۔

نیویارک واپسی کے بعد بھی ان دونوں کا رابطہ آپس میں ختم نہیں ہوا تھا.... دو مختلف یونیورسٹیز میں ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے وقتاً" فوقتاً" مختلف سوشل ایونٹس میں ملتے رہتے تھے کیونکہ دونوں مسلمان طلبہ کی تنظیم سے بھی وابستہ تھے.... اور پھر یہ رابطہ وقتاً" فوقتاً" ان سوشل ایونٹ سے ہٹ کر بھی ہونے لگا.... وہ دونوں ایک دوسرے کی فیملی سے بھی مل چکے تھے اور اب بہت باقاعدگی سے ملنے لگے تھے۔ دونوں کے والد ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

ہشام امریکا میں بحرین کے سفیر کا بیٹا تھا' اور بحرین کے سفارت خانے میں ہونے والی اکثر محفلوں میں اسے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں ایک فلسطینی نژاد ڈاکٹر تھی اور اس کا باپ امریکہ کے علاوہ بہت سے یورپین ممالک میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بحرین کی نمائندگی کر چکا تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں وہ بڑا تھا اور اس کی بہن ابھی ہائی اسکول میں تھی۔
رفاہی کاموں میں دلچسپی ہشام کو اپنی ماں سے وراثت میں ملی تھی جو ہشام کے باپ سے شادی سے پہلے ریڈ کراس کے ساتھ منسلک تھی اور فلسطین میں ہونے والے ریلیف کیمپس میں اکثر ان امدادی ٹیموں کے ساتھ جاتی تھی جو امریکہ سے جاتی تھیں' شادی کے بعد اس کا وہ کام صرف فنڈز اکٹھے کرنے اور عطیات تک محدود رہ گیا تھا' مگر ہشام نے اپنی ماں فاطمہ سے یہ شوق وراثت میں لیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ شوق بڑھتا ہی گیا تھا۔
اس لڑکی سے ملنے کے بعد اسے اپنا شوق اور جنون بہت کم اور کمتر لگا تھا۔ وہ اپنی کم عمری میں جن رفاہی پروگراموں کے ساتھ منسلک رہی تھی' بہت کم ایسا ہوا تھا کہ ریلیف آپریشن کے بعد بہترین خدمات کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں میں اس کا نام نہ ہوتا۔
اس سے میل جول کے آغاز ہونے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ ان کے درمیان انسانیت کی خدمت کا جذبہ ایک واحد مشترک چیز نہیں تھی اور بھی بہت سی دلچسپیاں مشترکہ تھیں اور صرف دلچسپیاں اور مشاغل ہی نہیں... خصوصیات بھی... دونوں کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے اور بہت زیادہ... دونوں کو تاریخ میں دلچسپی تھی... دونوں گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور دونوں بہت زیادہ باتونی نہیں تھے... سوچ سمجھ کر بات کرنے کے عادی تھے۔
ہشام کی پوری زندگی مخلوط تعلیمی ماحول اور معاشرے میں گزری تھی... نہ اس کے لیے لڑکیاں نئی چیز تھیں' نہ ان سے دوستی... لیکن زندگی میں پہلی بار وہ کسی لڑکی سے متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس کا کبھی کوئی آئیڈیل نہیں رہا تھا' لیکن اسے لڑکیوں کی جو خوبیاں متاثر کرتی تھیں' ان میں سے کوئی بھی چیز اس لڑکی میں نہیں تھی... نہ وہ حسین تھی... نہ اسٹائلش' نہ ایسی ذہین کہ اگلے کو چاروں شانے چت کر دے' لیکن اس کے باوجود وہ اسے کسی مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی... نظر کا ایک جدید انداز کا چشمہ لگائے وہ سادہ سی جینز اور کرتیوں میں اکثر دیگر جدید تراش خراش کے لباس اور اسٹائلش جوتوں والی لڑکیوں کے سامنے ہشام کو زیادہ پرکشش محسوس ہوتی تھی... خود میں مگن' دوسروں سے بے نیاز... کالرڈ کرتیوں اور شرٹس میں سر کے بال جوڑے کی شکل میں باندھے اپنی لمبی پتلی گردن کو کسی راج ہنس کی طرح لہراتی وہ ہمیشہ اسے فون یا ٹیبلٹ ہاتھ میں پکڑے اپنے حال میں مگن ملتی تھی' ان بہت سی دوسری لڑکیوں کے برعکس' جو اسے دیکھتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ ہشام عرب تھا' عورت کی اداؤں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اداؤں ہی سے گھائل ہونے والا' لیکن اس لڑکی کے پاس کوئی ادا سرے سے تھی ہی نہیں' اس کے باوجود وہ گھائل ہو رہا تھا۔
"میرے معاشرے میں اگر مرد کسی عورت کے ساتھ کہیں جائے تو کھانے کا بل وہ دیتا ہے' عورت نہیں۔"
ہشام نے پہلی بار اسے باہر کھانے کی دعوت دی تھی اور بل کی ادائیگی کے وقت اسے پرس نکالتے دیکھ کر اس نے بڑی سنجیدگی سے روکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جواباً" مسکراتے ہوئے پرس سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے اس سے بولی۔
"اور میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کے علاوہ کسی بھی مرد کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اپنا بل خود دینا' یہ تمہیں ہر خوش فہمی اور اسے ہر غلط فہمی سے دور رکھے گا... اس لیے یہ میرے حصے کا بل..."
اس نے نوٹ میز پر رکھتے ہوئے ہشام سے کہا تھا۔ مسکرائی وہ اب بھی تھی۔ ہشام چند لمحوں کے لیے لاجواب ہوا تھا... وہ بڑا مہنگا ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ اسے لے کر آیا تھا اور وہ جب بھی کسی لڑکی کو وہاں لا کر بل خود ادا کرتا تھا تو اسے اس لڑکی کی طرف سے بے حد ناز بھرا اور مصنوعی حیرت اور گرم جوشی سے بھرپور شکریہ وصول ہوتا تھا۔ مگر

آج کچھ خلاف توقع چیز ہو گئی تھی۔

"ریسٹورنٹ مہنگا تھا' میں اس لیے کہہ رہا تھا۔" وہ جما ــــــــ ہشام کو اکیلے میں بھی دانت پیسنے پر مجبور کرتا رہا تھا ــــــــ اس نے زندگی بھر کبھی کسی عورت کو ایسی توجہ نہیں دی تھی۔

"شکریہ' لیکن میں بہت امیر ہوں۔" اس لڑکی نے جواباً" مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تم میرا بل بھی دے سکتی ہو۔" پتا نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

"بل نہیں دے سکتی' لیکن بل دینے کے لیے ادھار دے سکتی ہوں۔" وہ جواباً" اس سے بولی۔

"تو مہربانی کرو اور دے دو۔" ہشام نے اسی روانی سے کہا۔

وہ پہلی بار الجھی' اسے دیکھا پھر اس نے اپنے پرس سے بل کی بقایا رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی' ہشام نے وہ رقم پکڑ کر بل پر رکھ کر اسے تہہ کرتے ہوئے ویٹر کی طرف بڑھا دیا۔

اس لڑکی نے اتنی دیر میں اپنا بیگ کھول لیا۔ وہ اس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی' چند لمحے گود میں رکھے بیگ میں ہاتھ مارتے رہنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی ڈائری نکالی اور پھر اس کے بعد قلم۔ میز پر ڈائری رکھ کر اس نے اس ڈائری میں اس رقم کا اندراج کیا جو اس نے کچھ دیر پہلے ہشام کو ادھار دی تھی۔ پھر اس نے قلم اور ڈائری دونوں ہشام کی طرف بڑھائے۔ اس نے کچھ حیران ہو کر دونوں چیزیں پکڑیں اور پھر اس سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" لیکن سوال کے ساتھ ہی اسے پہلی نظر ڈائری پر ڈالتے ہی جواب مل گیا تھا۔ وہ اس کے دستخط اس رقم کے سامنے چاہتی تھی جہاں اس نے ادھار دی جانے والی رقم لکھی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا' وہ اب اپنے گلاسز اتار کر انہیں صاف کرتے ہوئے دوبارہ لگا رہی تھی۔ معمول کی طرح خود میں محو اور اسے نظرانداز کیے یوں جیسے یہ سب روزمرہ کی بات تھی۔

ہشام نے قلم سنبھال کر دستخط کرنے سے پہلے ڈائری کے صفحے پلٹ کر بڑے تجسس سے لیکن محظوظ ہونے والے انداز میں دیکھا۔ وہاں چھوٹی بڑی رقموں کی ایک قطار تھی اور لینے والا صرف ایک ہی شخص تھا جس کا نام نہیں تھا' صرف دستخط تھے' مختلف تاریخوں کے ساتھ' لیکن کہیں بھی ادائی والے حصے میں کسی ایک رقم کی بھی ادائی نہیں کی گئی تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم اتنی حساب کتاب رکھنے والی ہو۔ ہر چیز کا حساب رکھتی ہو؟" ڈائری پر دستخط کرتے ہوئے ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"اگر میں لکھوں گی نہیں تو بھول جاؤں گی اور معاملات میں تو شفافیت ضروری ہوتی ہے۔" اس لڑکی نے جواباً" اطمینان کے ساتھ کہا' وہ اب اس سے ڈائری اور قلم لے کر واپس اپنے بیگ میں رکھ چکی تھی۔

"ڈائری سے تو لگتا ہے تم واقعی بہت امیر ہو۔ اتنی دریا دلی سے کس کو قرض دے رہی ہو؟" ٹیبل سے اٹھتے ہوئے ہشام نے اس کو کریدا' وہ بات گول کر گئی۔ ان کے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اسے زیادہ کریدتا' مگر اس ڈائری میں کیے ہوئے اس آدمی کے دستخط اسے یاد رہ گئے تھے۔ وہ اس دستخط کے انداز سے اتنا تو اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ وہ کسی مرد کے دستخط تھے۔

ایک ہفتے بعد اس نے اس لڑکی کو وہ قرض واپس کرتے ہوئے اس کی ڈائری میں ادائی کے حصے میں اپنے دستخط "ادا شدہ" کی تحریر کے ساتھ کرتے ہوئے ایک بار پھر سے ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی۔ وہ ڈائری اس سال کی تھی اور سال کے شروع سے اس مہینے تک کسی صفحے پر کوئی ادائی نہیں تھی' لیکن ادھار لینے کی رفتار میں تسلسل تھا۔ چھوٹی بڑی رقمیں' لیکن لاتعداد بار۔

"اس سال تمہیں کوئی ادھار واپس کرنے والا میں پہلا شخص ہوں۔" ہشام نے جیسے بڑے فخریہ انداز میں کہا'

اس نے مسکرا کر اس سے ڈائری اور نوٹ دوبارہ واپس لیے' نوٹوں کو ہشام کے سامنے گنا' اپنے پرس سے چند چھوٹے نوٹ نکال کر ہشام کو واپس کیے کیونکہ اس نے بڑے نوٹوں میں رقم واپس کی تھی۔ اور اس کے کچھ پیسے بچ رہے تھے۔

''چھوڑو' اسے رہنے دو۔'' ہشام نے نوٹ واپس دینے کی کوشش کی۔ ''اتنی بڑی رقم نہیں ہے یہ۔'' اس نے جیسے لاپروائی سے کہا۔

''کافی کا ایک کپ اور ایک ڈونٹ آسکتا ہے' ایک وینلا آئس کریم آسکتی ہے یا ایک برگر۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواباً'' کہا' وہ ہنسا۔

''تم واقعی ضرورت سے زیادہ حساب کتاب کرتی ہو۔''

''میری ماں کہتی ہے پیسہ مشکل سے کمایا جاتا ہے اور اس کی قدر کرتے ہوئے اسے خرچ کرنا چاہیے۔'' اس نے جیسے ایک بار پھر ہشام کو لاجواب کیا تھا' ذرا سی شرمندگی دکھائے بغیر۔

''اس طرح تو تم واقعی بہت امیر ہو جاؤ گی۔'' ہشام نے اسے چھیڑا۔

''ان شاء اللہ!'' اس نے جواباً'' اتنے اطمینان سے کہا کہ ہشام کو ہنسی آگئی تھی۔ ہنسنے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ یہ مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

''تمہیں برا تو نہیں لگا؟'' اس نے کچھ سنبھلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا؟''

''میرا ہنسنا۔''

''نہیں... مجھے کیوں برا لگے گا... تم کیا مجھ پر ہنسے تھے؟'' ہشام نے سر کھجایا' لڑکی سیدھی تھی' سوال ٹیڑھا تھا۔

''یہ جس کو اتنے ادھار دیتی رہی ہو' یہ کون ہے؟'' اس نے بھی اس سے ایک ٹیڑھا سوال کیا تھا۔

''ہے کوئی۔'' وہ ایک بار پھر نام گول کر گئی۔

''تم نام بتانا نہیں چاہتیں۔'' وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''ہاں۔''

وہ چند لمحوں کے لیے چپ رہا پھر اس نے کہا۔ ''بہت زیادہ قرضہ نہیں ہو گیا اس کے سر؟'' اس کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''میں اسے انکار نہیں کر سکتی...''

ہشام عجیب طرح سے بے چین ہوا۔ ''پیسے کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' شاید زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو ایسا مشورہ دیا تھا۔

''پیسے ہی نہیں' میں ہر معاملے میں اعتماد کرتی ہوں اس پر۔'' اس نے بڑے آرام سے کہا تھا۔

ہشام کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے؟ وہ ان کی دوستی کا آغاز تھا اور وہ ایک دوسرے کی ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے ان کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس شخص کا تعارف بھی ہشام سے بہت جلد ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تالیوں کی گونج نے حمین سکندر کی تقریر کے تسلسل کو ایک بار پھر توڑا تھا' روسٹرم کے پیچھے کھڑے چند لمحوں

کے لیے رک کر اس نے تالیوں کے اس شور کے تھمنے کا انتظار کیا۔ وہ ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹ کا اجتماع تھا اور وہ وہاں آغاز کرنے والے مقرر کے طور پر بلایا گیا تھا۔ پچھلے سال وہ ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس میں شامل تھا۔ سیلون اسکول آف مینجمنٹ سے امتیازی کامیابی کے ساتھ نکلنے والوں میں سے ایک اور اس سال وہ یہاں گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس سے خطاب کر رہا تھا۔ ایم آئی ٹی وہ واحد یونیورسٹی نہیں تھی جس نے اسے اس سال اس اعزاز کے قابل سمجھا تھا۔ لیگ آئی وی وائی کی چند اور نامور یونیورسٹیز نے بھی اسے مدعو کیا تھا۔

چوبیس سال کی عمر میں حمین سکندر پچھلے تین سالوں کے دوران دنیا کے بہترین منتظموں میں سے ایک مانا جا رہا تھا' اس ایک آئیڈیا کی وجہ سے جو پچھلے کچھ سالوں میں ایک بیج سے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

ٹریڈ این آئیڈیا کے نام سے اس کی ڈیجیٹل فنانس کمپنی نے پچھلے تین سالوں میں گلوبل مارکیٹس میں دھوم مچا رکھی تھی۔ دنیا کے 125 بہترین مالیاتی اور کاروباری ادارے اس کمپنی کے باقاعدہ کلائنٹس تھے اور ڈیڑھ ہزار چھوٹے ادارے بالواسطہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور یہ سب تین سال کی مختصر مدت میں ہوا تھا' جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کمپنی کی بنیاد رکھنے میں بھی مصروف تھا۔

ٹریڈ این آئیڈیا کا تصور بے حد دلچسپ اور منفرد تھا اور ایک عام صارف کو وہ ابتدائی طور پر کسی ہندسوں کا کھیل جیسا لگتا۔ اس کی ابتدا بھی حمین سکندر نے بے حد چھوٹے پیمانے پر کی تھی۔ ایک ویب سائٹ پر اس نے دنیا کی بہترین یونیورسٹیز کے اسٹوڈنٹس کو ایک آن لائن چیلنج دیا تھا۔ ایسا کوئی آئیڈیا فروخت کرنے کے لیے جس کے لیے انہیں یا تو سرمایہ چاہیے تھا یا کسی کمپنی کی سپورٹ اور یا پھر وہ اپنا آئیڈیا کسی خاص قیمت پر فروخت کرنے کے لیے تیار تھے' لیکن کاروبار اور کاروباری دونوں بے حد مختلف تھے۔

اس ویب سائٹ پر تین کورز تھے۔ اے کیٹگری' بی اور سی کیٹگری۔ ہر کورز میں بیس سوالات تھے اور ویب سائٹ پر رجسٹریشن کے لیے ایک پاس ورڈ ضروری تھا جو اس کورز میں کامیاب ہونے کے بعد بھیجا جاتا اور وہی نمبر اس کاروبار کرنے والے کی ID تھی۔ کیٹگری اے کا کورز مشکل ترین تھا اور ناک آؤٹ کے انداز میں معین مدت کے لیے تھا۔ کیٹگری B اور C اس سے آسان تھے اور نہ کسی خاص مدت تک محدود تھے اور نہ ہی ان میں ناک آؤٹ ہوتا تھا۔ یہ ان تین کیٹگریز کی درجہ بندی تھی جو وہاں آنے والے ٹریڈرز کی پرفارمنس خودکار انداز میں انہیں مختلف کیٹگریز میں رکھتی تھی۔ جو A کیٹگری میں آگے نہ جا پاتا وہ B کے کورز میں حصہ لیتا اور جو B میں بھی آگے نہ جا پاتا تو وہ C میں اور جو C میں بھی آگے نہ جا پاتا تو اسے ٹریڈ این آئیڈیا کی طرف سے آؤٹ کر دیا جاتا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ ابھی اسے اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ٹریڈنگ اس کا کام نہیں۔

اے کیٹگری کے کورز میں کامیاب ہو جانے والے غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے حامل افراد ایک پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے اور پھر اگلے مرحلے تک رسائی کرتے۔ ایک ایسے ٹریڈ سینٹر میں جہاں بہترین یونیورسٹیز کے بہترین دماغ اپنے اپنے آئیڈیاز کو رجسٹر کروانے کے بعد آن لائن موجود ٹریڈرز کے ساتھ اپنے آئیڈیاز کے حوالے سے بات چیت کرتے۔ وہ گروپ ڈسکشن بھی ہو سکتی تھی اور وہ ٹریڈرز کی آپس میں گفت و شنید بھی۔۔۔

پہلے مرحلے میں حمین پانچ بڑی کمپنیز کو اس بات پر آمادہ کر پایا تھا کہ وہ اس ٹریڈ روم میں آئیڈیا لے کر آنے والوں کے آئیڈیاز سنیں اور اس پر ان سے بات چیت کریں' اگر انہیں کسی کا آئیڈیا پسند آجائے تو۔ اس کے عوض نہیں TAI کو ایک مخصوص فیس ادا کرنی تھی' اگر وہاں کوئی آئیڈیا انہیں پسند آجاتا اور وہ اسے خریدنے' اس

ہیں سرمایہ کاری کرنے یا اس میں پارٹنرشپ کرنے پر تیار ہوتے تو۔ کیٹگری بی میں پیش ہونے والے آئیڈیاز کی خرید و فروخت بھی اسی فارمولا کے تحت ہوتی تھی، لیکن وہاں ایک اضافی چیز یہ تھی کہ وہاں اپنے آئیڈیاز کے ساتھ آنے والے مختلف نوجوان افراد ایک دوسرے کے ساتھ رابطے کے ذریعہ اپنی پسند کے کسی ایک جیسے آئیڈیا پر شراکت داری کر سکتے تھے اور اگر ایسا کوئی اشتراک کسی آئیڈیے کو عملی شکل میں ڈھال دیتا تو ٹریڈ این آئیڈیا اس اشتراک کے لیے بھی انہیں ایک فیس چارج کرتا۔

کیٹگری C اس سے بھی آسان تھی، وہاں کاروبار کے لیے آنے والے ٹریڈرز اپنے آئیڈیاز کو بارٹر بھی کر سکتے تھے یعنی کسی بھی ٹریڈر کو اگر دوسرے کا آئیڈیا پسند آتا اور وہ اسے نقد سے خریدنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو پھر وہ اس آئیڈیے کے بدلے کچھ اور خدمات مہارت یا پروجیکٹ اسے پیش کر سکتا تھا۔ وہ ایک بنیادی سا فارمولا تھا جو حمین نے صرف ذہانت کو کیش کرنے کی بنیاد پر نکالا تھا اور اپلائی کیا تھا۔

پہلی بار اس کی کلائنٹ بننے والی پانچ میں سے تین کمپنیز کو وہاں پہلے مہینے میں تین ایسے آئیڈیاز پسند آ گئے تھے جن کے فروخت کنندگان کو انہوں نے hire کر لیا تھا۔

تین سال پہلے کلائنٹس اور ٹریڈرز کی ایک محدود تعداد سے شروع ہونے والی کمپنی اب ان ابتدائی کاروبار سے بہت آگے بڑھ چکی تھی، وہ اب خود ٹریڈ این آئیڈیا پر آنے والے ٹریڈرز سے ایسے آئیڈیاز اور بزنس پروپوزلز لے لیتی جس میں انہیں دم خم نظر آتا اور وہ اپنے بڑے کلائنٹس کی ضروریات اور دلچسپی کے مطابق مختلف آئیڈیاز اور پروجیکٹس انہیں شیئر کر دیتی۔

ٹریڈ این آئیڈیا نے پچھلے تین سال میں تین سو ایسی نئی کمپنیز کی بنیاد رکھی تھی جن کے آئیڈیاز ان کے پلیٹ فارم پر آنے کے بعد مختلف بین الاقوامی کمپنیز نے ان آئیڈیاز میں سرمایہ کاری کی تھی۔ ٹریڈ این آئیڈیا سے ملنے والے آئیڈیاز پر تکمیل پانے والے پروجیکٹس کی کامیابی کا تناسب نوے فی صد تھا۔

دنیا کے سو بہترین اداروں کے بہترین اسٹوڈنٹس کو ایک پلیٹ فارم پر لانے والا یہ ادارہ اب دنیا کی ہزاروں یونیورسٹیز کے لاکھوں اسٹوڈنٹس کو اپنے اپنے آئیڈیاز گھر بیٹھے آن لائن نامور اور کامیاب ترین کمپنیز کے نمائندوں کے سامنے پیش کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم نیا کاروبار شروع کرنے والوں کے لیے ایک ڈریم پلیٹ فارم تھا۔ ٹریڈ این آئیڈیا اب ان ہی کیٹگریز کے ساتھ ایک اور ایسی کیٹگری کا اضافہ کر چکا تھا جہاں کوئی بھی شخص اپنی خسارے میں جانے والی کمپنی، بزنس، اسٹیٹ اپ پروجیکٹ بیچ سکتا تھا اور آن لائن ہی اس کا تخمینہ بھی کروا سکتا تھا۔

حمین سکندر کا نام دنیا کی کسی بھی بڑی مالیاتی کمپنی کے لیے اب نیا نہیں تھا۔ اس کی کمپنی کاروبار کے نئے اصول لے کر آئی تھی اور ان نئے اصولوں پر کام کر رہی تھی۔

"اکثر لوگوں کا خیال ہے میں رول ماڈل ہوں... ہو سکتا ہے میں بہت ساروں کے لیے ہوں... لیکن خود مجھے رول ماڈل کی تلاش کبھی نہیں رہی..." تالیوں کا شور تھم جانے کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا تھا۔ "رول ماڈلز اور آئیڈیلز کتابوں میں زیادہ ملتے ہیں اور میرے ماں باپ کو ہمیشہ مجھ سے یہ شکایت رہی کہ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے اسٹوڈنٹس میں کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں اور اگلی ایک نشست پر بیٹھی امامہ بھی ہنس پڑی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں دلچسپی سے صرف ایک کتاب پڑھی ہے اور وہ میرے باپ کی آٹو بایوگرافی (سوانح عمری) تھی... وہ بھی بارہ سال کی عمر میں اپنی ماں کے لیپ ٹاپ میں سے۔" سامنے والی نشستوں پر بیٹھی امامہ کا

رنگ فق ہوگیا' وہ ہنسنا ایک دم بھول گئی تھی۔

"اور وہ واحد کتاب ہے' جس کو میں نے باربار پڑھا۔۔۔ وہ وہ واحد کتاب ہے' جو میرے لیپ ٹاپ میں بھی ہے۔۔۔ میرے باپ کی آٹوبایوگرافی کی بہترین بات یہ ہے کہ اس میں کوئی ہیرو' کوئی آئیڈیل' کوئی رول ماڈل نہیں ہے اور اسے پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ میرا باپ کتنا لکی ہے کہ اسے کسی سے متاثر ہو کر اس جیسا نہیں بننا پڑا' زندگی گزارنے کے ان کے اپنے اصول اور فارمولاز' ان کے بچپن اور جوانی گزارنے کے لیے رہنما۔۔۔ رہے۔"

وہ کہتا جارہا تھا اور وہاں بیٹھی امامہ عجیب سے شاک اور شرمندگی میں بیٹھی تھی' وہ کتاب جسے وہ آج بھی شائع کرانا نہیں چاہتی تھی' صرف اس لیے کیونکہ وہ اپنی اولاد کو ان کے باپ کے حوالے سے کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ کتاب اس کی تیسری اولاد بارہ سال کی عمر میں صرف ایک بار نہیں' باربار پڑھتا رہا تھا۔ اس کی ایک کاپی اس کے لیپ ٹاپ تک بھی چلی گئی تھی اور وہ بے خبر تھی۔

"میں نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ طے کیا تھا کہ مجھے متاثر ہونے جیسا آسان کام نہیں کرنا۔۔۔ متاثر کرنے جیسا مشکل کام کرکے دیکھنا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میرا تعارف کراتے وقت وہ ساری چیزیں گنوائی گئیں جن سے آپ سب کے سانس رک جائیں' آنکھیں جھپکنا بند ہوجائیں' منہ کھلے رہ جائیں۔۔۔ میں نے کس عمر میں کیا کردیا' اور کس عمر میں کیا۔۔۔ اس سال میری کمپنی کا ٹرن اوور کیا تھا۔۔۔ دنیا کے دس بہترین منتظم میں' میں کس نمبر پر ہوں۔۔۔ دنیا کی کون کون سی کمپنیاں میری کلائنٹ ہیں۔۔۔ آپ میں سے اگر کوئی مجھ سے اور میری کامیابی سے متاثر نہیں ہوا یہ سب سن کر بھی تو مجھے حیرت ہوگی۔۔۔" وہ رکا' جیسے مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "لیکن اس تعارف میں بہت سے ایسے حقائق شامل نہیں جن کو سن کر آپ کو مجھ میں اپنا آپ یا اپنے آپ میں' میں نظر آنے لگوں گا۔۔۔ جیسے اس تعارف میں یہ حقیقت شامل نہیں ہے کہ میں آج تک کوشش کے باوجود کبھی اپنی بہن سے لیا گیا قرض واپس نہیں کرسکا۔"

مجمع میں ہلکی تالیوں کے ساتھ قہقہے گونجے۔

حمین بے حد سنجیدہ تھا۔

"لیکن میں ایک دن وہ ساری رقم واپس کروں گا۔ یہ وہ وعدہ ہے' جو میں اس سے آٹھ سال کی عمر سے کررہا ہوں' جب میں نے اس سے پہلی بار قرض لیا تھا اور میں کبھی وعدہ پورا نہیں کرسکا۔" وہ ہنستے ہوئے مجمع کے سامنے بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "میری بہن کے پاس ڈائریز کا ایک ڈھیر ہے' جس میں اس نے ادھار دیے جانے والے ایک ایک پینی کا بھی حساب رکھا ہوا ہے۔" تالیوں کے شور میں وہ رکا۔ "اور ہر اچھے بزنس مین کی طرح میں بھی اتنی بڑی رقم فوری طور پر کسی کو نہیں دے سکتا' چاہے وہ قرضے کی واپسی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔" وہ بول رہا تھا۔

"اور میں سست ہوں' ضدی ہوں' جھوٹ بولتا ہوں' چیزیں اکثر بھول جاتا ہوں' دوستوں کو مایوس کرتا ہوں۔" اس کے ہر جملے پر وہ اسٹوڈنٹس پرجوش انداز میں تالیاں بجارہے تھے جیسے کسی راک اسٹار کو داد دے رہے ہوں۔

"اور ان تمام خامیوں کے ساتھ بھی مجھے اگر بااثر ترین افراد کی فہرست میں رکھا جاتا ہے تو یہ خوف ناک بات ہے۔۔۔ خوف ناک اس لیے کیونکہ ہم ایک ایسے زمانے میں داخل ہوچکے ہیں جہاں صرف کامیابی ہمیں قابل عزت اور قابل رشک بنارہی ہے۔۔۔ ہماری انسانی خصوصیات اور خوبیاں نہیں۔"

تالیوں کے شور نے ایک بار پھر اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔ مجمع اب اس کی حس مزاح کو نہیں اس کے ان الفاظ کو سراہ رہا تھا۔

"ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس سے یہ بات کہتے ہوئے میں احمق لگوں گا کہ ان چیزوں کا دوبارہ تعین

کریں جو ہمارے لیے متاثر کن ہونا چاہئیں.... میں دس سال کا تھا جب میرے باپ نے مجھے زبردستی پاکستان بھیج دیا.... مجھے اور میری فیملی کو.... کیونکہ میرے دادا کو الزائمر تھا اور میرے باپ کا خیال تھا انہیں ہماری ضرورت ہے.... میں نے اگلے چھ سال اپنے دادا کے ساتھ گزارے.... دنیا کی کوئی یونیورسٹی مجھے وہ تربیت اور علم نہیں دے سکتی جو الزائمر کے ہاتھوں اپنی یادداشت کھوتے ہوئے اس پچھتر سال کے بوڑھے نے اپنے دس سال کے پوتے کو دی.... ایم آئی ٹی بھی نہیں....“

سناٹے کو تالیوں نے توڑا تھا پھر اس کے لیے کھڑے ہو جانے والے ہجوم نے اگلے کئی منٹ اپنے ہاتھ نہیں روکے۔

”میں ہمیشہ سوچتا تھا اس سب کا فائدہ کیا تھا.... مجھے امریکہ میں ہونا چاہیے تھا دادا کے پاس نہیں.... لیکن پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنا شروع ہو گیا.... مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا، بات کرنا، سننا اور ان کی مدد کرنا اچھا لگنے لگا.... دس سال کا بچہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی انسان سامنے پڑی ہوئی چیز کا نام کیسے بھول سکتا ہے.... لیکن میں یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس سب نے مجھے ایک چیز سکھائی.... کل کبھی نہیں آتا.... جو بھی ہے، آج ہے.... اور آج کا بہترین مصرف ہونا چاہیے.... ”کل“ چانس ہے، ہو سکتا ہے، آپ کو نہ ملے.“

اس نے تقریر ختم کر دی تھی، وہ پورا مجمع ایک بار پھر اس کے لیے کھڑا ہو چکا تھا.... تالیاں بجاتے ہوئے۔

امامہ بھی تالیاں بجا رہی تھی، ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے.... اسے داد دیتے ہوئے.... اس کی اولاد نے اسے ایسے بہت سے فخریہ لمحے دیے تھے.... بہت سارے.... آہستہ آہستہ اس گھر کے سارے پرندے اڑ گئے تھے.... جبریل، عنایہ، حمین، رئیسہ.... مگر ہر ایک کی پرواز شاندار تھی، وہ جس آسمان پر بھی اڑ رہے تھے.... فاتحانہ انداز میں اڑ رہے تھے۔

”تم سمجھ دار ہو گئے ہو یا ایکٹنگ کر رہے تھے؟“ وہاں سے واپسی پر امامہ نے اس سے گاڑی میں پوچھا تھا۔

وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہنس پڑا۔ ”ایکٹنگ کر رہا تھا، یہ تو ظاہر ہے.... غلط سوال کر لیا آپ نے مجھ سے۔“ اس نے ماں کی بات کے جواب میں کہا۔

”تم بہت خراب ہو حمین!“ امامہ کو یک دم جیسے یاد آیا۔

”میں بھی سوچ رہا تھا، آپ بابا کی آٹو بائیوگرافی بھول کیسے گئیں؟“ حمین نے ماں کے اس جملے پر فوراً“ کہا۔

”تمہیں اسے نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔“ امامہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

”آپ ہی کہتی ہیں کتابیں پڑھنا اچھی عادت ہے۔“ اس نے ماں سے کہا۔

”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کتابیں چوری کر کے اور بغیر اجازت پڑھو۔“ امامہ نے اسی سنجیدگی سے اسے ڈانٹا۔

”زندگی میں پہلی اور آخری بار کوئی کتاب چوری کر کے پڑھی ہے۔ آپ تسلی رکھیں میں اتنا جنونی نہیں ہوں ریڈنگ کے بارے میں۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

امامہ اگر اسے شرمندہ دیکھنا چاہتی تھی تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اس کے پاس ہر منطق اور ہر بہانہ تھا۔ سالار کا بیٹا تھا تو ان چیزوں کی بہتات تھی اس کے پاس۔

”ممی آپ خوامخواہ ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں، ہم بڑے ہو چکے ہیں، آپ ہر بات ہم سے راز میں نہیں رکھ سکتیں۔“ اس نے ماں کا کندھا تھپکتے ہوئے جیسے اسے یاد دلایا۔

”باقی تینوں ہو چکے ہیں.... تم نہیں ہوئے۔“ امامہ نے اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتے ہوئے کہا۔

”دیٹس ناٹ فیئر، آپ نے میری تقریر نہیں سنی کیا؟“ اس نے بے ساختہ اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ اسپیچ عنایہ نے لکھی ہو گی۔" امامہ نے کہا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ لاجواب ہوا اور روندا اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بھی اسے امامہ کی چبھتی نظروں کا احساس ہو رہا تھا۔

"She just edited it (اس نے صرف تصحیح کی تھی)" اس نے بالآخر اعتراف کیا۔

"ایز آلویز" (ہمیشہ کی طرح) امامہ نے جتانے والے انداز میں کہتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں.... میں ساری عمر اسپیچز لکھتا رہا ہوں' کر تا رہا ہوں' یہ مشکل نہیں ہے میرے لیے' میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

"کر سکتے ہو بالکل کر سکتے ہو' لیکن بس یہ نہ کہو کہ تمہاری تقریر سن کر تمہارے سمجھ دار ہونے کا یقین کر لوں۔" امامہ مزید کچھ کہنے کے بجائے خفگی کے عالم میں خاموش ہو گئی اور روندا سکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"غصے میں آپ بہت حسین لگتی ہیں۔" اس نے یک دم بڑی سنجیدگی سے کہا' امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا

"یہ بھی میں نے بابا کی کتاب میں کہیں پڑھا تھا.... چیپٹر نمبر فائیو میں....؟ نہیں شاید فور میں۔" وہ اب اپنا بازو ماں کے کندھے کے گرد پھیلائے اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"واقعی لکھا ہے تمہارے بابا نے؟" امامہ نے جیسے بے یقینی سے اس سے پوچھا' اس کے باوجود کہ وہ یہ کتاب درجنوں بار پڑھ چکی تھی.... ایڈیٹ' ری ایڈیٹ کر چکی تھی.. اس کے باوجود ایک لمحہ کے لیے اسے واقعی شبہ ہوا۔

"لکھا تو نہیں لیکن اگر آپ کہیں تو میں ایڈٹ کر کے شامل کر دیتا ہوں.... آپ کو ویسے بھی پتا ہے میں غلط باتوں کا چیمپئن ہوں۔" اس نے بے حد اطمینان سے ماں سے کہا۔

وہ ہنس پڑی' وہ واقعی یہ بھی کر سکتا تھا۔ اس میں اسے شبہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہم کہیں مل سکتے ہیں؟" اسکرین چمکی۔

"کہاں؟" تحریر ابھری۔

"جہاں بھی تمہیں آسانی ہو' میں آجاؤں گا۔" جواب آیا۔

"اچھا سوچتی ہوں۔" لفظوں نے کہا۔

"کب تک بتاؤ گی؟" اشتیاق سے پوچھا گیا۔

"کچھ دنوں تک۔" تامل سے کہا گیا۔

"میں انتظار کروں گا۔" وعدے کی طرح دہرایا گیا۔

"جانتی ہوں۔" یقین دلایا گیا۔

اور پھر آگے کچھ بھی نہیں تھا.... یوں جیسے کوئی پہاڑ آگیا ہو یا پھر کھائی کہ نہ لفظ رہے ہوں' نہ وقت۔

عنایہ نے اپنے فون پر انگلیوں سے سکرول کرتے ہوئے ان میسجز کے تھریڈ کو دیکھا' پڑھا' یوں جیسے پہلی بار اس گفتگو کو پڑھ رہی ہو۔ یوں جیسے وہ گفتگو پہلی بار ہوئی ہو۔ اس کی مخروطی خوب صورت دودھیا انگلیاں فون کی سکرین پر نہیں' جیسے ان لفظوں پر پھسل رہی تھیں۔

سوال جواب اتنے سالوں سے کرتے آرہے تھے وہ.... اسی ترتیب میں.... اور ہر بار گفتگو وہیں جا کر رکتی تھی جہاں اس بار ختم ہوئی تھی.... اس سے آگے کے سوال و جواب دونوں کے پاس نہیں تھے یا شاید ہمت نہیں تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ پوچھتے.... لیکن مہینے میں کم از کم ایک بار کسی بھی دوسرے موضوع پر بات کرتے کرتے ان

کے درمیان اس گفتگو کا تبادلہ ضرور ہوتا۔ وہ سوال جواب کسی پرانی یاد یا میوزک کی طرح بیک گراؤنڈ میں چلتے۔ جیسے ابھی ہوا تھا... وہ کسی اور موضوع پر بات کر رہے تھے اور بات وہاں تک آگئی تھی... اور جہاں آگئی تھی وہاں رک گئی تھی... اب وہاں سے موضوع بدلنے کے لیے انہیں پھر کچھ وقت چاہیے تھا۔

وہ ایرک سے محبت نہیں کرتی تھی اور اسے شبہ تھا کہ شاید وہ بھی نہیں کرتا ہو۔ بہت سارے احساس وہم اور خوش فہمی بھی تو ہو سکتے تھے، مگر یہ بھی درست تھا کہ اتنے سالوں میں ایرک کے علاوہ اس کے سرکل میں کوئی مرد دوست نہیں تھا۔ امریکہ، پاکستان دونوں جگہ۔ اسکول، کالج... کسی بھی جگہ عنایہ کسی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنا سکی تھی، نہ وہ اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور نہ اسے ایسی کسی دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ایرک بھی ایسا ہی تھا، اور یہ زیادہ حیرانی کی بات تھی۔ کیوں کہ وہ امریکہ میں رہتا تھا جہاں طرز زندگی بہت مختلف تھا۔ اس کے باوجود عنایہ کی طرح وہ بھی ریزروڈ تھا۔ اور جب وہ عنایہ سے کہتا تھا کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں تو عنایہ کو یقین ہوتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ اور اگر وہ یہ کہتا تھا کہ اگر اس کی پچھلے کئی سالوں سے کسی لڑکی کے ساتھ دوستی ہے بھی تو وہ عنایہ ہے تو اسے اس پر بھی یقین تھا۔

اور اس دوستی کے باوجود دونوں کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی، شاید اس کی وجہ فاصلہ تھا یا کلچر یا عنایہ کا وہ مزاج جس سے ایرک بخوبی واقف تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی تقریباً" ہر روز ای میل، میسجز یا فون کے ذریعے ایک دوسرے سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے باوجود ان کے درمیان ہونے والی گفتگو مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی... کبھی بھی وہ صرف "میں اور تم" پر نہیں گئے تھے اور یہ دونوں کی طرف سے کی جانے والی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔

عنایہ ایک مہینہ پہلے رہائش کے لیے امریکہ آئی تھی اور چاہنے کے باوجود اس نے ایرک کو یہ نہیں بتایا تھا، بتانے کا فائدہ نہیں نقصان تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یہ خدشہ تھا کہ اس کے امریکہ آجانے پر وہ اس سے ملنے کی پوری کوشش کرے گا اور یہ اس کے لیے اس لیے بہت آسان ہوتا کیوں کہ وہ حمین اور جبریل کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ عنایہ ان دونوں سے یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اس کے امریکہ آنے کے بارے میں ایرک سے کچھ نہیں کہیں، ان دونوں نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ ایرک جیسے ان کی فیملی کے لیے ایک ایسی کھلی حقیقت تھا جس سے سب آنکھیں چرانا چاہتے تھے لیکن چرا نہیں پاتے۔ ایرک بہت عرصہ پہلے اس کے اور امامہ کے درمیان زیر بحث آچکا تھا۔ عنایہ جان چکی تھی وہاں اس کے لیے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اس شادی میں کیا ایشوز تھے اور کیا خدشات، کیا اندیشے تھے اور کیا مسائل... عنایہ آنکھیں بند کر کے رٹے رٹائے انداز میں گنوا سکتی تھی کیوں کہ اس نے یہ سب کچھ امامہ سے لاتعداد بار سنا تھا اور اس نے امامہ کی خواہش کا احترام کیا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ ایرک سے دور جانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود کہ امامہ نے اسے کبھی ایرک سے قطع تعلق کرنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن عنایہ کا خیال تھا اسے یہ "عادت" بدل دینی چاہیے، جو دونوں کے لیے ایک اسٹیج پر آکر آزار بن سکتی تھی۔

وہ دونوں زیادہ تر ای میلز اور ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ رابطے میں رہے تھے۔ عنایہ نے کوشش کی تھی یہ رابطہ کم ہونا چاہیے، تعلیمی مصروفیات، پروفیشنل ذمہ داریاں، اس کے پاس بہترین بہانوں کے طور پر موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود ایرک سے اس کا رابطہ ٹوٹ نہیں سکا اور یہ کمال ایرک کا تھا، وہ جڑا رہا تھا، اس کی بے اعتنائی، بے رخی، سرد مہری کے باوجود... یہاں تک کہ عنایہ کو شدید قسم کی ندامت ہونے لگی تھی... پتا نہیں اس شخص میں اتنی برداشت اور تحمل کیسے تھا کہ وہ اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے اور کم اہمیت پانے پر بھی کوئی اعتراض، کوئی احتجاج نہیں کرتا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ اسے بیٹھے بٹھائے کاموں کا ڈھیر اب ہی کیوں یاد آنے لگا تھا اور

نہ ہی یہ کہ وہ خود بھی ڈاکٹر تھا' اس سے زیادہ مصروف تھا تو کم از کم وہ پروفیشنل مصروفیات کا بہانہ اس کے سامنے پیش نہ کرے۔

وہ ہفتوں اس کی کسی ای میل کسی میسج کا جواب دیے بغیر غائب رہتی اور وہ پھر بھی اس کو ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ اپنا حال احوال' اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہتا اور پھر وہ کئی دنوں بعد اس کے بھیجے ہوئے کسی نہ کسی ٹیکسٹ' کسی نہ کسی ای میل کا جواب دینے پر مجبور ہو جاتی اور وہ اپنی غیر حاضری کا جو بھی بہانا بناتی' وہ بغیر بحث کے قبول کر لیتا' چاہے وہ کتنا ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہوتا اور اس کی یہ قبولیت جیسے اس کے احساس جرم کو اور بڑھا رہی تھی۔ وہ بچپن میں ایسا نہیں تھا جیسا بڑا ہو کر ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں میں عنایہ میں اتنی تبدیلیاں نہیں آئی تھیں جتنی ایرک میں آئی تھیں اور اس کی بہت سی دوسری وجوہات کے علاوہ ایک بنیادی وجہ اس کا قبول اسلام بھی تھا۔

وہ اٹھارہ سال کی عمر میں ایرک سے عبداللہ ہو گیا تھا لیکن وہ آج بھی اپنے سوشل سرکل میں ایرک کہلاتا تھا یا پھر ایرک عبداللہ..... ان لوگوں کے امریکہ سے آجانے کے بعد بھی ایرک ان سے رابطے میں رہا تھا' وہ اسے بھی ای میل کرتا تھا اور امامہ کو بھی اور اس کی ہر ای میل امامہ کو جیسے ایک یاد دہانی کی طرح لگتی تھی' حالانکہ اس کی ای میلز میں رسمی گفتگو کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ بھی میڈیسن میں ہی ریزیڈنسی کر رہا تھا..... عنایہ کی طرح..... ان کے پروفیشن نے دو مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بھی ان دونوں کو بڑے عجیب انداز میں ایک دوسرے سے باندھے رکھا تھا..... اس نے کنگ ایڈورڈ سے پڑھا تھا اس نے ایروزونا سے..... اسے آئی سرجن بننا تھا ایرک کو ہارٹ..... مگر ان کے مشترکہ پروفیشن نے جیسے ان کو لیے گفتگو کے بہت سارے موضوعات دے دیے تھے۔

قبول اسلام کے بعد یونیورسٹی میں گریجویشن کے دوران وہ چند سال تک گرمیوں میں پاکستان آتا رہا تھا لیکن ایک بار میڈیکل میں جانے کے بعد وہ آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔ امامہ اس بات پر خوش ہوئی تھی' وہ کبھی بھی اسے پاکستان آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ سالار سمیت فیملی کے کسی بھی شخص کو ایرک کے پاکستان آنے پر اعتراض نہیں تھا اور وہ اسے منع کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن اس طرح اس کا ہر سال ان کے پاس آنا امامہ کے خدشات بڑھاتا رہا تھا اور جس سال پہلی بار اس نے پاکستان نہ آنے کے بارے میں انہیں اطلاع دی تھی' امامہ نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا اسے یقین تھا وہ اب اپنی زندگی کی نئی مصروفیات میں سب کچھ بھول جانے والا تھا۔

کچھ ایسا ہی عنایہ نے بھی سوچا تھا۔ اسے بھی لگا تھا ایرک بدل جائے گا' اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ میڈیکل کی تعلیم مشکل تھی پھر اب اس کی زندگی میں اور لوگ آرہے تھے۔ وہ ان کے خاندان کو اور اسے اگر بھول بھی جاتا تو اس کے لیے نارمل ہوتا..... ہلکی کسک اور گلے کے باوجود..... لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے پاکستان آنا جانا چھوڑا تھا' ان سے رابطہ ختم نہیں کیا تھا۔ اور اس تعلق اور رابطے کے باوجود ان دونوں کے درمیان اعتراف یا اظہار کا کوئی کمزور لمحہ نہیں آیا تھا۔ اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اس کے لیے اسپیشل تھی لیکن یہ جملہ اس نے کبھی اس کی زبان سے نہیں سنا تھا اور یہ شاید بہت اچھا ہی تھا۔ تعلق ختم کرتے ہوئے گلے اور شکایتیں کچھ کم رہتیں..... تکلیف بھی..... یہ عنایہ سکندر کا خیال تھا۔

اس کے لیے اب رشتے دیکھے جا رہے تھے۔ ہم پلہ لوگوں کو منتخب کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اسے اندازہ تھا اس کی ریزیڈنسی کے دوران ہی اس کی منگنی یا شاید شادی ہو جائے گی اور وہ اس کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے ان فیملیز اور لڑکوں سے بھی مل رہی تھی جن سے اس کا رشتہ طے پانے کا امکان تھا اور اس

سب کچھ کے درمیان اریک عبداللہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ نہ وہ زندگی سے جاتا تھا، نہ دل سے نہ دماغ سے۔

اس دن بھی ان دونوں کے درمیان ایک چیٹنگ ایپ پر معمول کے میسجز کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاسپٹل کا کوئی مسئلہ بتا رہا تھا اور اس نے جواباً "بڑی روانی سے اسے اپنے ہاسپٹل کا نام بتاتے ہوئے وہاں کسی مسئلے کا ذکر کیا اور سینڈ کا بٹن دباتے ہوئے بے اختیار اپنی غلطی پر پچھتائی۔ اس کا ٹیکسٹ اب فون کی سکرین پر نمودار ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا اریک عبداللہ اتنا کند ذہن نہیں تھا کہ وہ اس جملے کو نظر انداز کر کے گزر جاتا۔ اس کے جملے کے بعد بہت دیر تک دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ یوں جیسے وہاں سب کچھ ساکت ہو گیا تھا۔ پھر بالآخر وہ ٹیکسٹ آیا جس کی اسے توقع تھی۔

"تم امریکہ میں ہو؟"

اس کا دل چاہا وہ لکھ دے اسمارٹ فون نے اسپتال کا نام غلطی سے لکھ دیا تھا۔ یا کوئی اور جھوٹ یا بہانا.... وہ تو مان لیتا تھا.... سوال جواب اور بحث کب کرتا تھا لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی بس دل چاہا تھا اسے "ہاں" کہہ دے اور اس نے یہی کیا تھا۔

اس کے "یس" نے اریک عبداللہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ عنایہ کا خیال تھا۔ فون ہاتھ میں پکڑے اس کی اسکرین پر نظریں جمائے وہ اس "ہاں" کے بعد کسی رد عمل کا انتظار کرتی رہی.... خوشی، حیرت، بے یقینی، غصہ.... کسی بھی رد عمل کا.... وہ آن لائن تھا اور وہاں سکوت تھا.... ایسا سکتہ اور سکوت کہ ایک لمحہ کے لیے عنایہ کو ڈر لگا۔ اس نے ہیلو لکھ کر اسے جیسے اس سکتے سے جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں؟" دوسری طرف سے اس کی تحریر ابھری تھی۔ اس بار خاموشی عنایہ کی طرف چھائی تھی۔ وہ ایک سو ایک بہانے بنا سکتی تھی لیکن ایک بھی بہانا بنانا نہیں چاہتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان شاید اب وہ لمحہ آگیا تھا جب اسے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

"تم مجھ سے ملنے کے لیے کہتے اور میں ملنا نہیں چاہتی تھی اس لیے۔" دوسری طرف بہت لمبی خاموشی چھائی تھی اس بار، اتنی ہی لمبی جتنا عنایہ توقع کر رہی تھی۔

"آل رائٹ" پھر اسکرین چمکی اور بجھ گئی....

وہ ایسے ہی کرتا تھا.... بحث کرتا ہی نہیں تھا، غصہ دکھاتا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اسی طرح ہتھیار ڈالنے والے انداز میں بات کیا کرتا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے عنایہ کو غصہ آیا کہ وہ خوامخواہ احساس ندامت لے کے بیٹھی تھی.... اچھا ہے صاف صاف کہہ دیا اور نہ ملنے سے اسے فرق کیا پڑنا تھا، وہ ویسے بھی دو مختلف ریاستوں میں تھے.... ملنے کے لیے بھی انہیں چھٹیوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ سوچ رہی تھی ساتھ ہی اپنے آپ کو توجیہات بھی دے رہی تھی۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" کچھ دیر بعد ابھرنے والے اگلے ٹیکسٹ نے اسے چونکایا۔

"کب؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"17 کو" جواب آیا۔

"کیوں؟" اس نے اب وہ پوچھا جو وہ پوچھنا چاہتی تھی۔

جواب نہیں آیا اور کئی دنوں تک نہیں آیا۔

☼ ☼ ☼

ہشام نے اسے دیکھتے ہوئے چائے کا مگ خالی کیا.... وہ اس سے کچھ فاصلے پر اشاروں کی زبان میں اپنے سامنے

بیٹھی عورتوں اور بچوں سے مخاطب ہو کر انہیں صحت و صفائی کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے اپنے بیگ سے اس سے متعلقہ چیزیں نکال نکال کر دے رہی تھی.... صابن.... ٹوتھ پیسٹ.... ٹوتھ برش ٹوتھ پک نیل کٹر' روئی کے بنڈل' شیمپو' فرسٹ ایڈ کٹ اور اس میں موجود سامان.... وہ سب عام استعمال کی چیزیں تھیں جنہیں کسی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک میں بھی بیٹھ کر کسی کو ان کا استعمال سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی.... لیکن وہ داداب تھا' کینیا کے بارڈر کے قریب UNHCR کے افریقہ میں بڑے ترین کیمپوں میں سے ایک.... جہاں افریقہ میں قحط اور خانہ جنگی سے متاثرہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔

اور ان دونوں کو وہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا.... داداب میں یہ ان کا پہلا وزٹ تھا' لیکن وہ پچھلے چار سالوں میں UNHCR کے بہت سارے کیمپس میں جا چکے تھے۔ افریقہ' ایشیا' لاطینی امریکہ.... یہ ان کی تفریح بھی تھی جنون بھی اور کام بھی۔

لکڑی کی ایک خالی پیٹی کو الٹا کر بیٹھے ویسی ہی ایک دوسری پیٹی کو میز بنائے اور اس پر چائے کے مگ رکھے' اپنی چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ شدید تھکن کے عالم میں بھی اسے دیکھتا رہا.... وہ مختلف جگہوں پر نئے آنے والے پناہ گزینوں کے ساتھ اس دن صبح سے ہونے والا ان کا اٹھائیسواں کیمپ تھا.... وہ گروپ کی شکل میں نکلے تھے اور اب دو دو کی ٹولیوں میں' لگنے نئے خیموں میں جا جا کر اندراج کرتے ہوئے صحت و صفائی کے حوالے سے سامان تقسیم کرتے پھر رہے تھے اور اب شام ہونے والی تھی.... ہشام نے اپنا کام ختم کر لیا تھا.... گرم پانی کے فلاسک اور پشت پر لدے بیگ سے مگ اور چائے کا سامان نکال کر وہ اپنی ساتھی کے واپس آنے سے پہلے ہی چائے بنا کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ ابھی بھی وہیں تھی.... اسی طرح اپنے کام میں محو.... اس نے اپنا مگ دوبارہ چائے سے بھرا۔

وہ اس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے ملکوں میں جا چکا تھا اور لوگ کوئی بھی ہوں' زبان کوئی بھی ہو اس نے اپنی ساتھی کو کبھی کسی دقت کا شکار نہیں دیکھا تھا.... وہ اشاروں کی زبان کی ماہر تھی لیکن ہشام جانتا تھا وہ اشاروں کے بغیر بھی کسی گونگے سے اس کے دل کا حال اگلوا لیتی.... ایک عجیب گرم جوشی تھی اس میں جو کسی کا بھی دل موم کر کے رکھ دیتی اور وہ اب یہی کر رہی تھی۔

ان گندے' کمزور' بیمار' قحط زدہ تباہ حال لوگوں کے بیچ بیٹھی وہ پروفیشنل مہارت سے اپنا کام کرتے ہوئے اشاروں کی زبان اور ٹوٹی ہوئی مقامی زبان میں ان سے گپ شپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی.... بچوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ' عورتوں کے ساتھ مسکراہٹوں اور معانقوں کا تبادلہ.... وہ اپنا کام ختم کرنے کے قریب تھی.... اس کے پاس موجود سامان ختم ہو چکا تھا اور اس سامان سے خالی ہونے والا بیگ اس نے ایک پانچ سالہ بچے کو اوڑھانے والے انداز میں دیا تھا' جو بار بار اس بیگ کو لینے کے لیے ہاتھ پھیلا رہا تھا اور پھر ہشام نے ایک چھوٹی بچی کو اس کے بالوں میں لگی ہوئی ایک خوب صورت ہیئر پن کو چھوتے دیکھا۔ وہ زمین پر پڑے ایک لکڑی کے کریٹ پر بیٹھی تھی اور وہ بچی اس کے عقب میں جا کر اس کے تقریباً "جوڑے والے انداز میں لپیٹے ہوئے بالوں کو چھیڑ رہی تھی اور پھر اس نے اس ہیئر پن کو اتارنے کی کوشش کی' ہشام نے اسے پلٹ کر اس بچی کو اٹھا کر اپنی گود میں لیتے دیکھا اور پھر اپنے بالوں میں لگی ہوئی ہیئر پن اتار کر اس نے اس بچی کے گھونگھریالے بالوں میں لگا دی اور اسے گود سے اتارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بالآخر ہشام کی طرف متوجہ ہوئی جو تب تک چائے کا دوسرا مگ بھی ختم کرنے کے قریب تھا۔ انہیں وہاں سے ابھی کافی دور چل کر جانا تھا' جہاں سے انہیں UNHCR کی گاڑی مل جاتی جو انہیں اس جگہ لے جاتی جہاں پر ان تمام ورکرز کی رہائش تھی۔

ہشام نے اسے بالآخر اپنی طرف آتے دیکھا' وہ دور سے مسکرائی۔ ہشام نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب

مسکراہٹ سے دیا۔
"تم ہر کام بہت جلدی کرلیتے ہو۔" اس کے قریب آکر لکڑی کے ایک اوندھے ہوئے کریٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جیسے ہشام کو سراہا۔ وہ واقعی اپنے ذمہ لگائے ہوئے تمام کام بہت تیزی سے کرنے کا عادی تھا۔
"عقل مند ہوں اس لیے۔" اس نے جواباً" مسکراتے ہوئے چائے کا وہ مگ اس کی طرف بڑھایا جس میں پڑی چائے کے ٹھنڈا ہونے پر اس نے اسے پھینک کر اس کے لیے ابھی دوبارہ چائے بنائی تھی۔
"مجھ سے بھی زیادہ۔" اس کی ساتھی نے چائے کا مگ ہشام سے لیتے ہوئے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔
"تم سے تو واقعی زیادہ۔" اس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔
شام اب آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی' پناہ گزینوں کا وہ ہجوم اب آہستہ آہستہ وہاں سے دور اپنے خیموں کی طرف جارہا تھا۔ وہ جانتے تھے آج انہیں جو کچھ ملنا تھا' مل چکا تھا۔
ایک کچی پگڈنڈی نما سڑک کے کنارے' سبزے میں لکڑی کے کریٹ الٹائے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ دونوں اپنی ٹانگیں سیدھی کیے جیسے اپنی تھکن اتار رہے تھے۔
"تمہارے لیے کچھ ہے۔" ہشام نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر مگ رکھتے ہوئے جیب سے کچھ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ رئیسہ نے اس انگوٹھی کو بے حد تعجب کے عالم میں دیکھا تھا جو ہشام نے اس کے سامنے بڑھائی تھی۔ ایک بے حد خوب صورت سبز زمردی ڈبیہ میں دھری آنکھوں کو خیرہ کردینے والی ایک ہیرے کی انگوٹھی۔
اس نے سر اٹھا کر ہشام کو دیکھا' وہ کچھ دیر کے لیے جیسے چائے پینا بھول گئی جو وہ مگ میں ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔
"یہ کہاں سے ملی؟" داداب کے اس ویرانے میں اس انگوٹھی کو دیکھ کر جو خیال کسی کو آنا چاہیے تھا' وہی رئیسہ کو بھی آیا تھا۔
"کیا مطلب کہاں سے ملی؟" ہشام بری طرح بدکا۔ "میں نے خریدی ہے۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"کہاں سے؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
"نیروبی سے" ہشام نے جواباً" کہا۔
"پھر مجھے کیوں دے رہے ہو؟" اس نے چائے پینا دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ سوال کرنے کے باوجود وہ نروس ہوئی تھی' اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔
"تمہیں پرپوز کررہا ہوں۔" ہشام نے ایک بار پھر اس انگوٹھی کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔
رئیسہ نے ایک نظر اسے دیکھا' ایک نظر اس انگوٹھی کو اور پھر گردن گھما کر اس پورے علاقے کو۔ وہ خاردار جھاڑیوں اور پناہ گزینوں کے بیچوں بیچ اسے ایک ڈائمنڈ رنگ پیش کرتے ہوئے پرپوز کررہا تھا.... وہ کسی بھی لڑکی کے لیے ایک رومانٹک لمحہ تھا' اور اس کے لیے بھی ہوتا اگر اسے یک دم ہنسی آنا شروع نہ ہوگئی ہوتی.... چائے کا مگ لکڑی کے ایک کریٹ پر رکھتے ہوئے وہ بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے بے حال ہونے لگی تھی۔
ہشام بری طرح نادم ہوا اور اس نے ڈبیہ بند کردی۔
"یہ اس طرح ہنسنے کا کیا مطلب ہوا؟" اس نے رئیسہ سے پوچھا' وہ اب اپنی ہنسی پر قابو پا چکی تھی۔
"ہم یہاں ریلیف کے کام کے لیے آئے ہیں۔" اس نے ہشام کو یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا "تم کچھ اور کیسے سوچ سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سوچ سکتا؟" ہشام نے بحث کرنے والے انداز میں کہا۔ "ہمیشہ سوچتا رہا ہوں اور بس میرا دل چاہا' میں تمہیں پرپوز کردوں تو کردیا۔"
رئیسہ نے چائے کا مگ دوبارہ منہ سے لگالیا' وہ اب سنجیدہ تھی۔ ہشام ڈبیہ ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔
"تم کچھ نہیں کہو گی؟"
"میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی (ٹوبی ویری آنسٹ)" اس نے بالآخر چائے کا مگ رکھ دیا۔ وہ اب اپنے بیگ کو کھول کر ایک ریڈیو نکال رہی تھی یہ جیسے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش تھی۔
"کیوں... ؟ تم پسند نہیں کرتیں مجھے؟" ہشام بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔
"کرتی ہوں... تمہیں کوئی بھی ناپسند نہیں کرسکتا' لیکن شادی کا فیصلہ بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے... میں خود نہیں کرسکتی... تمہیں میری فیملی کی رضامندی مجھے پرپوز کرنے سے پہلے لینی ہوگی۔" ریڈیو فریکوئنسی سیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ہشام کی طرف دیکھے بغیر اس سے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔" ہشام نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ "میں ان سے بات کرلوں گا' یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔" رئیسہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ اس کی قومیت اس کی فیملی کے لیے قابل اعتراض ہوسکتی تھی' وہ ایرک اور عنایہ کے معاملے میں امامہ کی رائے سے بہت اچھی طرح واقف تھی... وہ اپنے تمام بچوں کی شادیاں پاکستانیوں سے کرنا چاہتی تھی۔
"تم یہ رنگ اپنے پاس رکھ لو میں تمہاری فیملی سے بات کرلوں۔ تب تم اسے پہن سکتی ہو۔" ہشام نے وہ ڈبیہ ایک بار پھر اس کی طرف بڑھائی۔ رئیسہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھایا' وہ اپنے گھٹنے پر رکھے ریڈیو کے ساتھ مصروف تھی یا کم از کم یہی ظاہر کررہی تھی۔
"اس کا فائدہ نہیں... اگر میں نے رنگ لے لی اور میری فیملی نے انکار کردیا تو؟" اس نے ہلکی آواز میں خبریں سنتے ہوئے کہا۔ ہشام نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
"تمہاری فیملی انکار کیسے کرسکتی ہے؟" وہ پہلی بار کچھ بے چین ہوا تھا۔
"ہمیں ہر پوسیبلٹی سامنے رکھنی چاہیے۔" رئیسہ نے مدھم آواز میں جیسے اسے سمجھایا۔
"وہ انکار کردیں گے تو؟" ہشام نے پوچھا۔
"تو بس۔" رئیسہ نے کہا۔
"یعنی بس ختم؟" ہشام کو جیسے یقین نہیں آیا۔
"تم یہ کیسے ہونے دو گی... میرے لیے تمہاری کوئی فیلنگز نہیں ہیں؟" ہشام کو جیسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
"فیلنگز ہیں تمہارے لیے لیکن وہ میری اپنی فیملی کے لیے فیلنگز سے بہت کم ہیں... کم از کم ابھی کیا تم اپنی فیملی کی مرضی کے خلاف کچھ کرسکتے ہو؟" رئیسہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"ہاں میں کرسکتا ہوں۔ کم از کم تم سے شادی تو..." اس نے جواباً کہا تھا۔ رئیسہ کو جیسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ریڈیو کو چھیڑتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں کہا۔
"ویسے یہ جو رنگ میں ڈائمنڈ ہے' یہ نقلی ہے۔" ہشام بری طرح چونکا۔ وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔
اس نے بے اختیار ہاتھ میں پکڑی ڈبیہ کھولی اور اس میں سے انگوٹھی نکال کر اسے آنکھوں کے پاس لے

جاتے ہوئے بولا "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے۔ میری ممی کے پاس بہت سارے ڈائمنڈز ہیں میں ڈائمنڈ پہچان سکتی ہوں۔" رئیسہ نے اسی انداز میں کہا۔

وہ ویک اینڈ پر نیروبی گئے تھے اور جیولری کی مارکیٹ میں پھرتے ہوئے ایک دکان پر رئیسہ کو یہ انگوٹھی اچھی لگی تھی... جو ہشام نے اسے بتائے بغیر خریدلی تھی وہ اسے اسی انگوٹھی کے ساتھ پروپوز کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا... تم نے مجھے تب کیوں نہیں بتایا؟ میں نے تو ڈائمنڈ کی رنگ کے طور پر بہت مہنگا خریدا ہے اسے۔" ہشام حیران سے زیادہ شرمندہ ہوا۔

"مجھے یہ تھوڑی پتا تھا کہ تم اسے خریدنا چاہتے ہو... مجھے تو بس اچھی لگی تھی اور جیولر کہہ رہا تھا ڈائمنڈ ہے تو میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی یہ بتا کر کہ یہ ڈائمنڈ نہیں ہے۔" رئیسہ نے اس سے کہا۔

ہشام نے کچھ مایوسی کے عالم میں اس رنگ کو ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ بند کردی۔ رئیسہ نے اس کے تاثرات دیکھے اور ہاتھ بڑھا کر تسلی دینے والے انداز میں اس سے وہ ڈبیہ لی۔

"تمہارا بڑا نقصان ہوگیا۔" اس نے جیسے ہشام کو تسلی دی۔

"نہیں اتنا نقصان نہیں ہوا جتنی شرمندگی ہوئی ہے کہ میں ایک نقلی ڈائمنڈ کے ساتھ تمہیں پروپوز کر رہا تھا۔"

رئیسہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "پریشان مت ہو میں اسے رکھ لیتی ہوں... اگر میری فیملی مان گئی تو میں یہی رنگ پہن لوں گی۔" وہ بے اختیار ہنس پڑا...

وہ انگوٹھی جو وہ محبت میں لینے پر تیار نہیں تھی ہمدردی میں لے رہی تھی... وہ واقعی فلاحی کارکن تھی۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"خوش ہوں اس لیے۔" ہشام نے جواباً کہا۔

"مجھے پتھروں میں ڈائمنڈ کی پہچان ہو نہ ہو انسانوں میں ہے... اور میں نے ایک نقلی ڈائمنڈ ایک اصلی ڈائمنڈ کو دیا تھا کم از کم مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" ہشام نے اتنے سال کے ساتھ میں اسے پہلی بار شرم سے سرخ ہوتے دیکھا۔

وہاں اب خاموشی تھی... ہوا کی سرسراہٹ... اترتی شام اور اس میں ریڈیو پر چلنے والا نیوز بلیٹن جس میں بحرین میں ایک طیارے کے کریش ہونے کی خبر دی جارہی تھی جس پر وہ دونوں اکٹھے متوجہ ہوئے تھے۔
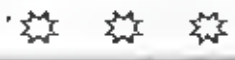
☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

آج بہت لمبے عرصے کے بعد امامہ اس کمرے میں اس باکس کو کھولے بیٹھی تھی۔ ایک ایک کرکے وہ سارے اسکیچ بکس اور اسکریپ بکس نکالے جس پر کئی دہائیوں پہلے اس نے اپنے گھر کی بنیادیں، پنسل اور رنگوں سے رکھنی شروع کی تھیں۔

وہ اس کمرے کی صفائی کروانے کے لیے ملازم کے ساتھ وہاں آئی تھی اور صفائی کراتے ہوئے اس باکس کو دیکھتے ہی اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا اور اب صفائی مکمل کرانے کے بعد وہ اس باکس کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ بڑی فرصت سے پرانی یادوں کو کھنگالنے اور جینے کے لیے....

وہ ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح انہیں کھولے کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ اتنی دہائیاں گزرنے کے بعد وہ اسکریپ بکس خستہ حال ہو رہی تھیں۔ اسکیچز میں بھرے ہوئے رنگ اڑنے لگے تھے، لکھے ہوئے لفظ مٹنے لگے تھے، کھنچی ہوئی لکیریں دھندلانے لگی تھیں.... لیکن ان دھندلی لکیروں، مٹتے لفظوں، ہلکے پڑتے رنگوں اور بھربھراتے کاغذوں میں بھی اسے ہر یاد ویسی ہی رنگین، تازہ، خوش گوار، زندہ محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ آج ہی کا قصہ تھا.... کل ہی کی بات تھی، برسوں ہونے والا واقعہ تھا۔

وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ ہر صفحہ بڑی احتیاط سے پلٹ رہی تھی یوں جیسے ذرا بے احتیاطی ہوئی تو رنگ جھڑ جائیں گے، لکیریں رگڑ کھا کر چھو منتر کی طرح غائب ہو جائیں گی، سب کچھ غائب ہو جائے گا، اپنے ساتھ اس کی زندگی کے بہترین دنوں کو لے کر....

ہر صفحے پر اس کے ہاتھ کے بنے اسکیچز تھے.... کون سا کمرہ کیسے بننا تھا.... کس دیوار پر کیا لگنا تھا.... کہاں کیسا رنگ ہونا تھا.... اس کے ہاتھ کی تحریر میں وہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں.... ہر صفحہ، ہر لکیر، ہر تصویر یک دم جیسے بولنے لگی تھی۔ اس کے اور سالار کے درمیان ہونے والی باتیں.... وہ ہر چیز بنا کر سالار کو دکھاتی تھی، اس سے رائے لیتی تھی، جب بھی جہاں بھی کسی کے گھر اسے کوئی چیز پسند آجاتی، وہ چیز اس کی اسکریپ بک میں موجود اس کے گھر کے کسی کمرے کا حصہ بن جاتی تھی۔ ان صفحات پر بنی تصویروں کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں اپنی اور سالار کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

پتا نہیں زندگی اتنی تیزی سے کیوں گزرتی ہے یا پھر بالکل رک کیوں جاتی ہے۔ جب وہ سالار کے ساتھ تھی تو سب کچھ ہوا کی رفتار سے گزر جاتا تھا۔ اب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ تو سب کچھ ایسے رک گیا تھا جیسے زندگی کو زنگ ہی لگ گیا ہو۔

اس نے ایک صفحہ اور پلٹا.... پھر ایک اور.... اس اسکیچ بک میں موجود گھر بناتے ہوئے اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندگی میں صرف یہ ہی ایک گھر بنا سکتی تھی، وہ بھی کاغذوں پہ.... حقیقت میں نہیں، وہ محنت اور وقت جو اس نے اس گھر پر لگایا تھا، شاید اتنی ہی مدت تھی جتنی کوئی اپنے گھر پر لگاتا تھا لیکن اس کا گھر اس مدت کے بعد بھی کاغذوں پر ہی رہا تھا، کبھی زمین پر حقیقت بن کر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔

اس کی زندگی کی بہت ساری خواہشات میں صرف ایک وہ ایسی خواہش تھی جو حسرت بنی تھی اور اب تو ایک مدت ہو گئی تھی اس نے "گھر" کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا.... آج بس اس باکس کو دیکھنے پر اسے یاد آیا تھا کہ اس نے کبھی ایک گھر بنانے کی کتنی خواہش کی تھی.... بچت بھی کی تھی.... کوشش بھی.... لیکن بعض چیزیں مقدر میں نہیں ہوتیں۔ ان صفحوں پر پھیلی خوابوں کے گھر کی وہ تصویریں اس کی زندگی کے سب سے اچھے دنوں کی تصویریں تھیں۔ ان کے درودیوار سے اس کی خوشیاں اب بھی چھلکتی تھیں.... اتنے سالوں کے بعد بھی....

وہ گھر حقیقت میں نہ ڈھلنے کے باوجود اسے عجیب خوشی دے رہا تھا۔ عجیب طرح سے گدگدا رہا تھا۔ جیسے کوئی ننھا بچہ اپنا دل پسند کھلونا پالینے پر کھلکھلاتا ہے۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے ان اسکیچ بکس کو بند کیا لیکن پھر باکس میں رکھنے کے بجائے وہیں سامنے پڑی میز پر رکھ دیا۔
اسے امریکہ سے آنے والے اس مہمان کے استقبال کی تیاری کرنی تھی جو تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جبریل سکندر کی ڈاکٹر ویزل برنارڈ کے ساتھ آخری سرجری تھی۔ وہ اس کے بعد ریٹائر ہو رہے تھے اور ان کے اسسٹنٹ کے طور پر وہ آخری سرجری اس کی زندگی کی سب سے اہم سرجری تھی۔
وہ پانچ سالہ ایک بچہ تھا جو سیڑھیوں سے گر کر سر پر لگنے والی ایک چوٹ کے بعد کوما میں گیا تھا۔ اور اب اسے سرجری کی ایمرجنسی میں ضرورت پڑی تھی۔ اس کے دماغ میں انٹرنل بلیڈنگ ہو رہی تھی۔
جبریل ڈاکٹر ویزل کے ساتھ پچھلے دو سالوں سے کام کر رہا تھا۔ وہ امریکہ کی تاریخ کے کامیاب ترین سرجنز میں سے ایک تھے اور جبریل ان کا پسندیدہ ترین اسسٹنٹ تھا۔ ڈاکٹرز کے سرکل میں ڈاکٹر ویزل برنارڈ کو دیوتا کی حیثیت حاصل تھی 'وہ یہودی النسل تھے اور ان کے ساتھ کام کرنا ہی خود ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ وہ مزاجاً" بے حد اکھڑ اور تیکھے مزاج کے تھے اور بے حد کم کسی کے کام سے خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ خاص طور پر کسی مسلمان کے اور وہ بھی ایشیائی نسل کے۔
اس کے باوجود جبریل سکندر ان کا چہیتا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ اس میں اپنا آپ دیکھتے تھے 'اس کی یکسوئی 'اس کی مہارت کو۔ اور یہ بات اس ہاسپٹل میں سب کو پتا تھی کہ ڈاکٹر ویزل کو ٹھنڈا رکھنے کا کام جبریل سکندر سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔
اور جتنے مہربان وہ جبریل کے ساتھ تھے 'اتنا ہی متاثر وہ ڈاکٹر ویزل سے تھا۔ نیورو سرجن کے طور پر ان کا ڈنکا اگر

دنیا میں بجتا تھا تو وہ اس قابل تھے... اپنی بدمزاجی کے باوجود... انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی... دو کتے اور دو بلیاں پالی تھیں اور ساری زندگی ان ہی کے ساتھ گزاری تھی اور انہوں نے جبریل کو بھی اپنی پہلی ملاقات میں پہلا مشورہ یہی دیا تھا۔

"تم اس فیلڈ میں بہت آگے جاسکتے ہو' اس لیے شادی مت کرنا۔ اپنے پروفیشن اور کیریئر کو فوکس کرنا... دنیا کا ہر شخص اپنی زندگی اچھی کرنے کے لیے شادی کرسکتا ہے' لیکن دنیا کا ہر شخص دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی قربان نہیں کرسکتا۔"

انہوں نے جبریل کو نصیحت کی تھی جو اس نے مسکرا کر سنی تھی اور اب اتنا عرصہ ان کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ ڈاکٹر ویریل کے مزاج کو بخوبی سمجھ اور پڑھ سکتا تھا۔

"تمہارا ہاتھ مسیحا کا ہاتھ ہے' کیونکہ تم اچھے ماں' باپ کا خون رگوں میں لیے ہوئے ہو اور قرآن کے حافظ ہو... اپنی اس مسیحائی کی حفاظت کرنا۔"

انہوں نے چند دن پہلے اس کے اپارٹمنٹ پر اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے کہا تھا جو اس کی طرف سے ان کے لیے ایک الوداعی ڈنر تھا۔ وہ ان کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک بے حد متعصب اور کٹر قسم کے یہودی تھے' ان کی زبان سے قرآن حفظ کرنے کو مسیحائی سے جوڑنا جبریل کے لیے ناقابل یقین تھا اور اس کے چہرے اور آنکھوں کی حیرانی نے جیسے اس کے تعجب کو ان تک بھی پہنچایا تھا۔

"برے مسلمان برے لگتے ہیں' اچھے نہیں۔" وہ کہہ کر اپنی ہی بات پر خود ہنسے تھے۔

"آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔" جبریل نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میں نہ بھی ہوتا تو بھی تم سیکھتے... مجھے خوشی ہے کہ مجھے بھی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تمہارے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔" انہوں نے جواباً" اس سے کہا۔

ڈاکٹر ویریل کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک صرف جبریل نے دیکھی تھی اور کوئی کبھی مر کر بھی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کسی کے لیے اتنے مہربان ہوسکتے تھے۔ جبریل کو ان کے ساتھ کام کرنا کبھی مشکل نہیں لگا تھا' لیکن اب ان کے جانے کے بعد وہ خود ایک سرجن کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کرنے جا رہا تھا۔

آپریشن ٹیبل پر لیٹے ہوئے اس بچے کے دماغ کا آپریشن کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر ویریل کے بالکل برابر میں کھڑا تھا' وہ ہمیشہ کی طرح گپ شپ کر رہے تھے' اپنے طویل میڈیکل کیریئر کے حوالے سے۔ جب ان کی گفتگو میں پہلی بار جبریل نے کچھ اداسی محسوس کی تھی۔

پھر اس نے ڈاکٹر ویریل کو اوزار سے اس بچے کے دماغ میں بلیڈنگ روکنے کے لیے ایک اور جگہ پر کٹ لگاتے دیکھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جبریل کو کچھ کھٹکا تھا' وہ ان کا ہاتھ چلتے دیکھ رہا تھا لیکن اسے لگا تھا' کچھ غلطی ہوئی تھی... اس کا احساس ٹھیک تھا' وہ بچہ ہوش میں نہیں آسکا تھا۔ ڈاکٹر ویریل کے پروفیشنل کیریئر کی آخری سرجری ناکام رہی تھی... عائشہ عابدین نے اپنی اکلوتی اولاد کھو دی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

"اف یہ عورتیں بھی نا....."

کمرہ امتحان میں داخل ہوتے ہی ذکاء اللہ کی نظر سر جوڑے کھڑی ان دو ٹیچرز پہ پڑی تو اس نے ناپسندیدگی سے سوچا۔ "موقع محل بھی نہیں دیکھتیں اور باتوں میں لگ جاتی ہیں۔"

بات وہ ایک دوسرے سے کر رہی تھیں اور نظریں

پورے ہال میں دوڑا رہی تھیں۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ چالیس کی چالیس بچیاں خاموشی سے اپنا امتحانی پرچہ حل کر رہی تھیں، مگر ذکاء اللہ... اسے بے حد تاؤ آیا۔

بس باتوں کی ہی بنی ہوتی ہیں، ان کا تو کوئی مقصد حیات نہیں، ہونہہ!!

سوچتے سوچتے ہی اس نے بورڈ کی طرف دیکھا۔ اس کمرے کی سب ہی طالبات حاضر تھیں، مگر بہرحال تسلی کے لیے حسب عادت وہ پھر سے گننے لگا۔ وہ آج کل فرسٹ ایئر کے امتحانات میں بطور کلرک فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

"تو تم سو کلومیٹر کا روزانہ سفر کرتی ہو۔" باتوں میں محو ٹیچرز میں سے نسبتاً" سینئر ٹیچر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"نہیں خیر! پورا سو تو نہیں بنتا۔" جونیئر نظر آتی ٹیچر صفائی ہی دینے لگی۔

ذکاء اللہ جی بھر کے بے زار ہوا۔ اس ٹیچر کی تعیناتی محکمے کی طرف سے انتہائی دور دراز مقام پہ ہوئی تھی۔ یہ اس نے پہلے پیپر کے دن ہی بتا دیا تھا۔ وہ یہاں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آئی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کی دیگر اسسٹنٹس اس کے ساتھ ہمدردی کرنے لگیں، تو وہ شان بے نیازی سے بولی کہ... "مجھے کون سا جاب کی ضرورت ہے۔ میں نے تو محض وقت کے اچھے استعمال کے لیے جوائن کیا ہے، وغیرہ وغیرہ...."

وہ ایگزام ڈیوٹی پہ موجود دیگر تمام ٹیچرز سے زیادہ کوالیفائیڈ اور بااخلاق تھی۔ اس لیے ذکاء اللہ نے دیکھا تھا کہ باقی سب اکثر ہی اس سے مختلف بات چیت کرتی ہیں۔

"بسوں، ویگنوں پہ پورا سو کلومیٹر نہ سہی تو جو چار کلومیٹر آتے جاتے پیدل چلتی ہو اسے ملا کہ تو ہو جاتا ہو گا نا سو کلومیٹر...." سینئر ٹیچر بھی بڑی زیرک تھیں۔ صحیح اندازہ لگا رہی تھیں۔

ذکاء اللہ نے دل ہی دل میں انہیں داد دی۔ (ذکاء اللہ چونکہ کلرک تھا اور اسے بورڈ سے تمام ٹیچرز کا ٹریول الاؤنس بھی پاس کروانا تھا۔ لہٰذا اسے تو ٹیچرز نے خود تمام انفارمیشن دی تھیں۔)

"چھ مختلف بسوں اور ویگنوں پہ سفر کرتی ہو روزانہ..." سینئر ٹیچر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آں... وہ... چھ تو نہیں... تین بدلنی پڑتی ہیں بس..." جونیئر ٹیچر کا لہجہ اب کی بار بہت کمزور سا تھا۔

"تین آتے ہوئے، تین جاتے ہوئے، چھ ہو گئیں نا؟" وہ جانے کیوں اس کو بے بس کرنے کے درپے تھیں۔

ذکاء اللہ کو برا سا لگا۔ وہ تسلی سے بچیاں گن چکا تھا اور اب فائل پہ درج کر رہا تھا۔

"تو تم یہ تو مت کہو یہ جاب تمہارا شوق ہے۔" چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ سجائے وہ بظاہر نرمی سے بولیں، مگر دوسری ٹیچر اس بات پہ یوں زرد پڑ گئی جیسے کسی راز سے پردہ اٹھ گیا ہو۔

ذکاء اللہ جواب فائل پہ ان دونوں کے دستخط لینے جا رہا تھا۔ بلاوجہ ہی رک کر ورق گردانی کرنے لگا۔ باتیں بگھارتی عورتیں اسے بری تو لگتی تھیں، مگر باتوں کا چسکا خود اسے بھی تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا کہ سینئر ٹیچر نے اچانک بہت بدلے ہوئے انداز میں جونیئر ٹیچر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بہت پیار کرتی ہو نا اپنے شوہر سے....؟" وہ اب نرمی سے پوچھ رہی تھیں، جواباً وہ بولی نہیں، بس گلال ہو گئی۔

"اس کی مددگار بنی ہوئی ہو نا؟" اب کی بار سوال کرتے ہوئے ان کے لہجے میں نرمی کے ساتھ شفقت بھی تھی۔

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا، محض سر جھکا لیا۔

"جیتی رہو..." وہ اب اسے دعا دے رہی تھیں، ساتھ کہا کہ.... "میں بھی ایسی ہی تھی.... اللہ آسانی دے گا، وہ بڑا بے نیاز ہے۔" وہ اس کی ہمت بندھا رہی تھیں۔ اسے تسلی دے رہی تھیں، مگر یکا یک ذکاء اللہ کو

ان کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی اور ایک اور قدرے مختلف آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

اسے یاد آیا کہ ہمیشہ وہ اس آواز سے بے زار ہی ہوا تھا، مگر آج یاد آئی تو محبت کا ٹھاٹھیں مارتا طوفان بپا کر رہی تھی دل میں۔۔۔

وہ اس جگہ سے ایک ٹرانس کی کیفیت میں پیچھے کو پلٹا۔ اسے دستخط لینا بھی یاد نہ رہا تھا۔ اسے تو کچھ اور ہی یاد آ رہا تھا۔

"ذکاء اللہ! جب بھی میں یا ثریا سونے کے لیے لیٹتے ہیں یہ مشین کی پھٹ پھٹ لے کر سرہانے بیٹھ جاتی ہے' تاکہ ہم ماں بیٹی دو گھڑی سو بھی نہ سکیں۔"

یہ اماں تھیں' اس کی اماں' شاہین کی شکایت لگاتے ہوئے' جواباً" اس نے شاہین کی اچھی طرح سے طبیعت صاف کی تھی۔

مگر ایک لمحے کو بھی تو یہ نہ سوچا کہ جو وقت اماں اور ثریا کے آرام کرنے کا ہے وہی وقت شاہین کے آرام کا بھی تو ہو سکتا تھا۔ وہ بھلا کیوں مشین چلاتی تھی؟ اور ذکاء اللہ کے ہاتھوں مزاج پرسی کروانے کے بعد بھی وہ باز نہ آئی تھی۔ اماں نے بتایا کہ اب اپنے کمرے کی کھڑکیاں دروازہ بند کر کے لگی رہتی ہے' اسے ضد ہے ہم سے' جو ہم منع کریں گے وہی کرے گی۔

اور اماں نے جو بتایا تو اس نے حرف باحرف حقیقت سمجھا کہ ہاں واقعی بھئی بڑی ضدی ہے۔ ایک لمحے کو بھی خیال نہ آیا کہ اس ڈربے کی اتنی شدید گرمی میں جب وہ کھڑکیاں دروازے بند کرتی ہو گی تو اس کا کیا حال ہوتا ہو گا۔

اس کا دل بری طرح سے گھبرایا' اسے لگا وہ ابھی چکرا کر گر جائے گا۔

"جانے کیا کرتی ہے ان پیسوں کا۔۔۔"

اس نے بہت بار اماں اور ثریا سے یہ الفاظ سنے تھے اور ہر بار اپنے "رد عمل" کا اظہار بھی کیا تھا۔

"جانے کیا پہاڑ سر کرے گی ان پیسوں سے۔۔۔"

اس نے یہ جملہ بھی گھر میں بارہا سنا تھا اور اسے وہ چھپاتا جگر جگر کرتا پہاڑ یاد آیا' جو اس نے کھڑا کیا تھا۔ وہ یقیناً" پہاڑ" ہی تو تھا۔ تیرہ سال ہو گئے تھے محکمہ تعلیم کی نوکری کرتے' مگر وہ پہاڑ سر نہ ہوا' شاہین کو گھر آئے محض تیرہ ماہ ہوئے تھے اور وہ پہاڑ سر ہو گیا تھا۔ لمحہ بھر میں اسے شاہین پہ بے حد و حساب پیار آیا۔ وہ جہاں تھا وہیں رک گیا اور جیب سے موبائل نکال کر اسے کال ملانے لگا۔

پہلی۔۔۔ دوسری۔۔۔ تیسری گھنٹی۔۔۔ وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس نے کلائی کی گھڑی پہ وقت دیکھا۔ اس وقت وہ مصروف ہی ہوتی تھی' ہانڈی' روٹی اور ساتھ کوئی اور کام بھی یقیناً" شروع کر رکھا ہو گا۔

شاید کپڑے دھو رہی ہو گی۔ اس نے سوچا یا شاید سی رہی ہو گی۔ وہ سوچ کر آب دیدہ ہوا اور پھر سے کال ملائی۔

"السلام علیکم۔۔۔" فریش آواز' خوش گوار موڈ ذکاء کے لبوں پہ تبسم لے آیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسی ہو؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

"میں۔۔۔" وہ حیران ہوئی۔ "میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں الحمدللہ۔۔۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وضاحت دے رہی ہو کہ میں تو ٹھیک ہی تھی۔ ٹھیک ہی ہوں۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی جو یوں حال دریافت کر رہے ہیں' اور باقی سب باتوں کی طرح یہ بات بھی ذکاء اللہ کو آج ہی محسوس ہوئی کہ وہ اس کا حال کس قدر کم معلوم کرتا تھا۔ کتنا بے خبر رہتا تھا' جبکہ اس حالت میں اسے پیار اور توجہ کی بہت ضرورت تھی۔

"تھینک یو شاہین!" اسے الفاظ منتخب کرتے ہوئے یہ لفظ بہت چھوٹا لگا اور کہتے ہوئے اپنا آپ بھی۔۔۔

"کس لیے؟" وہ حیران تھی۔

"نئے فریج کے لیے مائی ڈیئر۔۔۔" وہ بمشکل اتنا بول پایا۔ آگے لفظ ساتھ ہی نہیں آ رہے تھے

جواباً" اتنی دیر اور اتنی گمبھیر خاموشی رہی کہ لگتا تھا لائن کٹ گئی ہو، مگر ذکاء اللہ نے چشم تصور سے اسے دیکھا اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور گلا رندھ گیا۔

"مجھ سے تیرہ سالوں میں مینیج نہیں ہوسکا تھا۔ کبھی کوئی خرچ آجاتا تھا، کبھی کوئی۔۔۔ تم بہت ہمت والی ہو۔۔۔" کہتے ہوئے اسے اپنی چھوٹی حرکتیں، چھوٹی باتیں اور شاہین کی خاموشی بہت یاد آئی۔

وہ جانتا تھا کہ اب آنسو اس کے گالوں کو نم کرتے ہوئے زمین پہ گر رہے ہوں گے۔

جس دن فریج آیا اس دن بھی وہ تھوڑی سی ممنونیت محسوس کر رہا تھا، مگر پھر گھر میں سب کہنے لگے کہ۔۔۔ "بڑی تیز ہے، نیک بننا چاہتی ہے، اتنی ہی نیک ہوتی تو جہیز میں لے آتی۔۔۔"

اور اس کے دل کو لگ گئی تھی تب یہ بات۔۔۔ یہ تو سوچا ہی نہیں کہ نیک ہونا، جہیز میں فریج لانے سے مشروط تو ہرگز نہیں۔

"شاہین۔۔۔!"

اس نے اسے پکارا، لہجے میں اتنی چاہت تھی، اتنی وارفتگی تھی کہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ شاہین سے جھکی پلکیں اٹھانا ناممکن ہوگیا ہوگا۔ تیرہ ماہ میں زیادہ تر وہ پاس ہو کر بھی ساتھ نہ ہوتا تھا اور آج انداز ایسا تھا کہ شاہین کے احساسات ویسے ہی ہوگئے تھے جیسے حجلہ عروسی میں پہلی بار اس سے مخاطب ہوتے وقت تھے۔

"ج۔۔۔ جی۔۔۔" وہ گھبراتی لجاتی مشکل سے بولی۔

"آئی لو یو۔۔۔"

لاہور کا وہ چھوٹا سا کچن جس میں بیک وقت دو پیونے جلنے کی وجہ سے بے پناہ گرمی اور حبس تھا۔ یک دم ہی جیسے تازہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے ارد گرد پھیلنے لگے، کمر سے ٹانگوں تک رینگتے، چبھتے پسینے کے قطرے جیسے اچانک اسے گدگدانے لگے، دو گھنٹے سے اس کا ضبط آزماتی کم کم آتی گیس کی مقدار اچانک ہی اسے بڑی مناسب لگنے لگی۔

اس نے کہیں یہ پڑھا تھا "باتوں سے خوشبو آئے"

وہ اکثر سوچتی جانے کیسی باتیں ہوتی ہوں گی جن سے خوشبو آتی ہوگی۔ سادہ مزاج، انتہائی کم پڑھی لکھی شاہین کو تو آج زندگی میں پہلی بار کسی بات سے خوشبو آئی تھی، اتنی کہ جو اس کا پسینہ زدہ وجود معطر کر گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ چھائی نقاہت کی زردی آج چاہت کی لالی سے بری طرح ہار گئی تھی۔

"شاہین۔۔۔" اماں کی پاٹ دار آواز سارے میں گونجی، وہ نہ سہمی نہ ہی دہشت زدہ ہوئی۔

"جی اماں جی۔۔۔" اس نے مڑ کر جواب دیا تو اماں حیرت زدہ رہ گئیں۔

آج اس کے لہجے میں ڈر یا گھبراہٹ نہیں، بلکہ اعتماد تھا۔

"ابھی تک کھانا نہیں بنا، جانے کیوں اتنی سست ہو۔"

ذکاء اللہ جو لائن پہ ہی موجود تھا۔ اماں اور شاہین کی گفتگو سننے لگا۔ جب کبھی بھی اسے بہت جلدی ہوتی وہ اس ٹائم گھر کال کر کے شاہین کو کھانا پیک کرنے کو کہتا تھا۔ (ورنہ گھر پہ لنچ کرتا۔) تو اسے بھی شاہین کا لہجہ پہلی بار پر اعتماد لگا، ورنہ وہ تو رو دینے کو ہو جاتی تھی۔

"بس اماں جی! پانچ سات منٹ اور لگیں گے۔" اس نے بجائے وضاحتیں دینے کے گیس کم آرہی تھی، میں اور کاموں میں بھی مصروف تھی، طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔ کے بجائے قدرے بہتر جواب دیا، وہ بھی بنا ڈرے۔

"ذکاء اللہ آتا ہی ہوگا۔ روز دیر ہو جاتی ہے۔۔۔ بے چارے کو، پھنس گیا ہے وہ تو۔۔۔"

"آپ فکر مت کریں اماں جی! انہیں بھی تو پتا ہے کہ میں کس قدر مصروف ہوتی ہوں۔"

ایک مسکان کے ساتھ اس نے جتایا کہ اس کا شوہر اس سے بے خبر نہیں ہے۔ پہلی بار وہ بجائے ہاتھ چلانے کے، بار بار گھڑی دیکھنے کے ایک نئی بات کر رہی تھی، اسے خود اپنا لب و لہجہ اجنبی لگا۔ یقیناً "یہ چاہت تھی جو آج اسے مضبوطی سے سہارا دیے ہوئے

اس کا ڈر رفع کیے ہوئے تھی۔

ذکاء اللہ کو بہت لمبے عرصے بعد دل میں ڈھیر سارا سکون ایک ساتھ اترتے محسوس ہوا۔ کال منقطع کرکے وہ واپس پلٹا۔ سامنے سے وہی ٹیچر آتی دکھائی دی۔

"مس..." وہ قریب آئی تو اس نے انہیں روکا۔

"جی..."

"شکریہ مس..." وہ اس کے شکریہ پہ حیران ہوئی۔

"اللہ آپ کو آسانی دے۔ آپ کے راستے سہل بنائے۔" اس نے صدق دل سے دعا دی۔ یقیناً" وہ اس کی مستحق تھی' اس کی وجہ سے آج جانے کتنے عرصے بعد اس نے شاہین کا احساس کیا' اس کی گھبراہٹ اور ڈر کو دور پھینک کر اسے اعتماد کا تحفہ دیا۔ اس کی قربانیوں کو محسوس کیا' اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

"سو کلو میٹر روزانہ سفر کرنے والی ٹیچر اس دعا پہ ممنون ہوتی دکھائی دی۔ حالانکہ وہ اس کے "شکریہ" پہ ابھی تک حیران تھی۔ اچانک اس کا فون بجا۔

"السلام علیکم!" اس نے فوراً" فون بیگ سے نکال کہ کان سے لگایا تھا۔

"وعلیکم السلام... کیسی ہو؟" 48 ٹمپریچر ہو گیا ہے آج... بس اتنی گرمی میں آئندہ تم کوئی ایگزام ڈیوٹی نہیں دو گی۔"

گرمی تو اس دن واقعی تھی اور بے حدو حساب تھی' لیکن کال کرنے والے کا لہجہ ہی یوں محبتوں بھرا اور فکروں میں الجھا تھا کہ وہ بے اختیار کھلکھلا اٹھی اور بولی۔

"ارے میں کون سا دھوپ میں کھڑی ہوں' آپ پریشان مت ہوں۔"

"اف یہ عورتیں بھی نا..."

ذکاء اللہ کے لبوں سے ایک بار پھر کچھ دیر پہلے والے الفاظ ادا ہوئے۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورتیں بھی نا... چاہت سے نکھرتی ہیں' چاہت سے ہی جیتی ہیں۔ عمر بھر چاہت کے لیے مرتی رہتی ہیں اور چاہت ملے تو جی اٹھتی ہیں۔

اچانک اس کے اندر ضمیر کسمسایا' اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

"تو ہم مرد جب انہیں چاہت نہیں دیتے تو کیا ان کے مجرم نہیں بن جاتے؟ جب دھوکا دیتے ہیں' بے وفا ہو جاتے ہیں تو کیا ان کے قصوروار نہیں بن جاتے؟ ہم مردوں کی اکثریت ان کی چاہت کی چاہ پوری نہیں کرتی اور وہ جواباً" پھر بھی چاہت ہی دیتی ہیں' ماں ہو تو گود کی صورت میں' بہن ہو تو دعا کی صورت' بیوی ہو تو راحت کی صورت میں' بیٹی ہو تو مسکان کی صورت میں..."

"اف یہ عورتیں بھی نا..." وہ پھر سے بڑبڑایا۔

"سراپا چاہت ہوتی ہیں۔"

باجرہ ریحان

یوں تو سب کچھ ٹھیک ہی تھا... میں ہسپتال میں مختلف اوقات اور دن رات کی ڈیوٹی کرنے والی ایک ایک نرس... وارڈ بوائے اور یہاں تک کہ بڑے سے لے کر چھوٹے ڈاکٹر تک کو پہچان گئی تھی... مجھے اندازہ رہتا تھا کہ اب کون کس طرح کیا بتانے یا کون سی ڈرپ یا انجکشن لگانے کمرے میں داخل ہوگا... آخر کو میں بھی تو بن بلائے ڈھیٹ مہمان کی طرح ہسپتال میں مستقل ہی ڈیرہ جما کر بیٹھی ہوئی تھی... بس سانس چل رہی تھی اور تمام جسم سُن تھا... مگر بائیں ہاتھ کے کندھے سے لے کر انگلیوں تک کے پلاسٹر نے مجھے عجیب بے چینی میں مبتلا کیا ہوا تھا... خاص طور سے اس وقت جب اچانک تیز قسم کی ٹیس میری ہتھیلی میں اٹھتی تو پلاسٹر کی وجہ سے میں ہتھیلی کو ایک انچ ہلا بھی نہ پاتی اور بے بسی سے باقاعدہ آنسوؤں سے رونا شروع کر دیتی۔

"مارنے والے نے خوب دیکھ کر مارا ہے آپ کو... کہ کوئی صورت نہ رہے زندگی کی... مگر اللہ ہے... وہ نہ چاہے تو کس کی مجال..."

اسی طرح ایک دن میرے تکلیف سے رونے کے دوران اس کی چہکتی آواز آئی تو دل جل گیا۔

"آخر کیوں چلے آتے ہیں آپ ہر دوسرے دن... سخت ناگوار لگتا ہے مجھے... چلے جائیں..."

میں نے آنسوؤں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا... وہ جھٹ سے ایک ٹشو لیے آگے بڑھا مگر میرے تیور دیکھ کر سہم جانے کی اداکاری کرنے لگا۔ اداکاری اس لیے کہ اس سے پہلے بھی میں اسے بے نقط سنا چکی تھی۔ کئی بار اسے غصے سے کمرے سے نکل جانے کو کہہ چکی تھی... وہ ہر بار سر جھکا کر مجھے غصہ اتارنے کا موقعہ فراہم کرتا... اور پھر جب میں سب بول بال کر تھک ہار کر رونے لگتی تو خاموشی سے ٹشو سے میرے آنسو پونچھ کر کمرے سے نکل جاتا...

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ کمرے سے باہر جاتا اور آدھے ایک گھنٹے بعد پھر وارد ہو جاتا... جس کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ ہسپتال اسے چھوڑنے کے لیے اس کا چھوٹا بھائی آتا ہے اور لینے جب تک نہ آئے گا' وہ ہسپتال سے کیسے جا سکتا ہے۔

غصہ تو مجھے اس پر حد سے زیادہ تھا کیونکہ شاید اسی کی وجہ سے **طلحہ** نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا... مجھے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ **طلحہ** اس سے ایک دن میرے کمرے کے باہر الجھ پڑا تھا اور بیچ بچاؤ کے دوران **طلحہ** اور ڈیوٹی ڈاکٹر کی کافی تلخ کلامی ہوگئی تھی جس کے بارے میں مجھے لاعلم رکھنے کے لیے بھی اسی نے ہدایت جاری کی تھیں...

مجھے شکایت تو نہیں بس افسوس تھا کہ **طلحہ** نے کسی غیر سے الجھ کر مجھے نظر انداز کیا... اس سب کے باوجود بھی مجھے ایک دو لمحوں بعد ہی اپنے سے زیادہ اس کی حالت پر رحم آجاتا۔

کس طرح کس محنت سے اپنی وہیل چیئر گھسیٹتا وہ صرف میرا دل بہلانے ہر دوسرے تیسرے دن ہسپتال آجاتا ہے۔ ہسپتال کا پرائیوٹ وارڈ ڈاکٹروں کے رہائشی علاقے کے قریب ترین تھا جس کی وجہ سے ہسپتال سے کافی الگ تھلگ محسوس ہوتا تھا... دوپہر

سے ہی یہاں ہر طرف خاموشی چھا جاتی۔ مریض اور ان کے تیمار دار کمرے میں بند ہو جاتے تو پورا وارڈ سائیں سائیں کرتا محسوس ہوتا... اور مجھے اپنی تنہائی کا اور بھی احساس ہونے لگتا.... ایسے میں اس کی آمد بھی بھلی ہی لگتی...

لمبے لمبے راستوں کو وہیل چیئر سے عبور کرنا آسان بات نہیں، تھی ہانپتا کانپتا وہ جب کمرے میں داخل ہوتا تو میں اس کی احسان مند ہوتی۔ چند ایک اچھی میٹھی باتوں کے دوران ہی جیسے میرے اندر کا لاوا پھٹ پڑتا... اس کی جگہ میں طلحہ کو دیکھنا چاہتی تھی جس

کے لیے میں دیوانی ہوئی پھرتی تھی۔۔۔۔ طلحہ۔۔۔ بابا جانی کے جگری دوست کا بیٹا تھا۔۔۔ انکل کے انتقال کے بعد وہ اکثر ہی بابا جانی کے ساتھ دکھائی دیتا۔۔۔ بابا جانی نے اسے بہت قریب کر لیا تھا۔۔۔ اور میں اور طلحہ بچپن سے ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔

طلحہ کو پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے والد کا بزنس اب اس کے ماموں چلا رہے تھے اور دونوں ماں بیٹے اپنے الگ بنگلے میں ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ یونیورسٹی میں طلحہ زیادہ تر کھیل کے میدان میں دکھائی دیتا۔۔۔ اسے پڑھائی سے کوئی خاص رغبت نہ تھی جبکہ میں کلاس اور لیکچر کے لیے کافی سنجیدہ تھی۔۔۔ پھر بھی ہم دونوں کی دوستی کی بندھی سی تھی اور غیر ارادی طور پر ہم اکثر ہی ساتھ رہتے تھے۔

ایکسیڈنٹ کے چند دن تک تو طلحہ نے اپنی والدہ کے ساتھ آنا جانا کیا مگر اب۔۔۔ اب میرے مہمانوں میں صرف میرے بابا جانی ہی رہ گئے تھے۔ جن کی دل کی بیماری کے باعث میں خود ہی کئی بار ان کو ہسپتال نہ آنے کا کہہ چکی تھی اور بابا جانی کوشش کے باوجود بھی میرا ساتھ نہ دے پاتے تھے۔ دن تو نرس ڈاکٹرز ٹیسٹ ڈرپ۔۔۔ اور اسی طرح کے معمول میں گزر جاتا مگر دوپہر اور شام جان لیوا ہو جاتی تھی۔

کیا معلوم تھا کہ ایک ذرا سی بے خیالی میں اٹھایا ہوا قدم ہسپتال کی زینت بنا دے گا۔۔۔ آخری پرچہ دے کہ سب دوستوں نے باہر کچھ کھانے کا پلان بنایا اور اسی لیے یونیورسٹی کی بس سے جانے کے بجائے سڑک کنارے کھڑے تھے کہ کوئی ٹیکسی وغیرہ پکڑی جائے۔ لڑکے تو زیادہ تر ایک دوسرے کی بائیک پر ایک ساتھ دو چار سوار ہو گئے تھے اور انتظار میں تھے کہ لڑکیوں کو ٹیکسی ملے تو قافلہ چل پڑے کہ دور سے آتی ایک تیز رفتار گاڑی مجھے کیا سب ہی کو دکھائی جو دے رہی تھی۔۔۔ گاڑی بروڈ پر تھی اور تیز رفتاری سے گزر بھی سکتی تھی مگر ہمارے قریب آتے آتے اچانک اس گاڑی کا ٹائر پھٹ پڑا اور گاڑی تیز رفتاری سے ڈولتی ہوئی کنارے پر کھڑی ہم لڑکیوں پر چڑھ دوڑی۔

باقی سب کو تو معمولی چوٹیں آئی تھیں مگر میں بری طرح کچلی گئی تھی۔ بقول کچھ دوستوں کہ جیسے چیونگم کو بے دردی سے چبا ڈالا جائے۔ دو ہفتے مسلسل انتہائی نگہداشت میں رہنے کے بعد مجھے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور ابھی بھی مجھے مزید کئی ہفتوں تک ہسپتال میں رہنا تھا۔۔۔ اب ایک دو ہفتے کی بات ہوتی تو دوست احباب چکر بھی لگاتے۔۔۔ یہاں تو میں نے ہسپتال کو اپنا گھر ہی بنا لیا تھا۔۔۔ چلو وہ تو غیر تھے مگر طلحہ۔۔۔ اس کی والدہ۔۔۔ یہ تو مستقل مزاجی سے مجھے پوچھنے آ جاتے۔۔۔ ویسے بھی میرے گھر میں بابا جانی کے علاوہ ہے ہی کون۔ دونوں یہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ میں کیسی تنہا ہوں۔

میں نے ان دونوں کو کتنا چاہا۔۔۔ کتنی بار گھر پر دعوتیں کیں۔۔۔ تحفے تحائف دیے کہ وہ مجھے اپنا سمجھیں مگر انہوں نے مجھے دو ایک دن میں سمجھا دیا کہ میری ان کی نظر میں کیا اہمیت ہے۔

مجھے یقین تھا وہ اب بھی میرے ایکسیڈنٹ کے بارے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوں گے مگر مجھے دیکھنے کا خیال کسی کو نہیں آتا۔ ان کو تو میرا خیال نہ ہوا مگر اس کو۔۔۔ حیرت ہے۔۔۔ اس کو تو میں نے خود سے اتنا قریب کبھی بھی نہیں کیا تھا' ایسے کتنے سارے لوگ ہم سے ہماری زندگی سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں جن سے "تقریباً" روز ہی بات چیت ہوتی ہے۔۔۔ لطیف جملے۔۔۔ مزاح بھرے طنز نچھاور کیے جاتے ہیں مگر ان کو اپنی خوشی۔۔۔ غم۔۔۔ زندگی کے معمول میں شامل کرنے کا کوئی بھی جواز محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ بابا جانی کو بتاتی کہ اس کو اطلاع کر دیں مگر جب سے میں کمرے میں آئی تھی اس کا آنا جانا مستقل تھا۔

میں نے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لیا۔۔۔ دل میں شرمندگی تو تھی مگر اب معافی کیسے مانگوں۔۔۔ اور حیرت انگیز طور پر جیسے وہ میرے دل و دماغ سے گزرتی ایک

ایک سوچ تک سے واقف تھا۔
"کوئی بات نہیں آپ بہت تکلیف میں ہیں۔۔۔ ایسے میں آپ کو حق ہے۔"
اس نے پھر سے خوش دلی سے مجھے دلاسا دیا۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔
حسب معمول وہ بڑے انہماک سے اخبار کھولے بلند آواز میں مجھے خبریں سنانے لگا۔۔۔ ہر خبر کی شہ سرخی سنا کر وہ میرا ردعمل دیکھتا۔ جہاں میں بے سدھ پڑی رہتی اس خبر کو چھوڑ کر دوسری پڑھتا اور جس خبر پر میں ہونٹ بھینچ لیتی یا مسکراتی، وہ اس خبر کو آخر تک پڑھ ڈالتا۔
اخبار کے بعد کہانیوں کی باری آجاتی۔۔۔ مجھے اس کی لکھی ہوئی جاسوسی کہانیاں بہت پسند تھیں۔۔۔ وہ جانتا تھا مگر پھر بھی ڈائجسٹ میں سے پہلے دوسرے مصنفین کی کہانیوں سے شروع کرتا۔۔۔ یہاں پر میں رہ نہیں پاتی اور اسے ٹوک دیتی۔۔۔
"پہلے اپنی کہانی سنائیں پلیز۔۔۔"
وہ بڑے فخر سے مسکراتا۔۔۔ جیسے بس میرا یہ کہہ دینا ہی اس کے آنے کا حاصل تھا۔۔۔
وہ ایک مشہور جاسوسی افسانہ نگار تھا۔۔۔ یونیورسٹی میں دوستوں میں اس کی کہانیوں کا چرچا رہتا۔۔۔ جیسے ہی کہاں سے بھی اس کی نئی کہانی شائع ہوتی ہم سب ایک دوسرے سے ریس لگا کر اس کی کہانیوں کو پڑھتے تھے۔
پھر ایک کتابوں کے میلے میں اس کے پبلشر سے مل کر ہم نے اس کا نمبر حاصل کرلیا تھا۔۔۔ میری سہیلیوں نے اس کے ساتھ مذاق کرنے کا سوچا اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے فون کریں گے اور سب اپنا ایک ہی نام بتائیں گے۔۔۔ میرے نام کا رقعہ نکل آیا۔۔۔ یوں ہر روز میری ایک سہیلی اس کو فون کرتی اور اپنا نام مریم بتاتی۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ اس نے کبھی بھی کسی بھی حیرانی کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔ سب سہیلیوں پر مایوسی چھا گئی۔۔۔ اب سب نے مجھ سے ضد کی کہ میں بھی بات کروں۔۔۔
میں تو اس سے بس کہانیوں تک کا سلسلہ رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کا اس کی کہانیوں سے جو دل میں بت بنایا تھا وہ بات چیت کرکے توڑنا نہیں چاہتی تھی کیوں اکثر ہی دیکھتی تھی کہ مصنف لکھنے میں کچھ اور اصل زندگی میں کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔۔۔ بلکہ اکثر تو اس قدر الگ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ ان کے قلم ایسے شاہکار بھی اگل سکتے ہیں۔
میں بڑا کسمسائی، بہانے تراشے۔۔۔ خود کو اس تماشے سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر سب ناکام ہو جانے پر میں نے ایک شام اسے فون کیا۔
"اوہ اچھا۔۔۔ تو آپ ہیں مریم؟"
اس نے رسمی سلام دعا کے بعد میرا نام سننے کے ساتھ خوش دلی سے پوچھا۔
میں دم بخود رہ گئی اور اپنی سہیلیوں پر شدید غصہ آنے لگا۔۔۔ یقیناً "کسی نے اس کو ہمارے کھیل کی پہلے ہی خبر کردی تھی۔۔۔
"ارے چپ کیوں ہوگئیں؟ اصل میں میری وابستگی آواز سے بہت زیادہ ہے۔۔۔ میں صورتوں سے زیادہ آواز سن کر ہی لوگوں کا کردار۔۔۔ شخصیت اور ان کی اچھائی برائی کا اندازہ لگالیتا ہوں۔۔۔ لہٰذا آپ نے جس اعتماد اور روانی سے اپنا نام بتایا، بس میں سمجھ گیا کہ آپ ہی مریم ہیں۔ اس سے پہلے جتنی خواتین بھی مریم ہونے کا ڈراما کرتی رہیں، ان کی آواز نام بتاتے ہوئے ہمیشہ لڑکھڑا جاتی تھی۔۔۔ اب سمجھیں آپ۔۔۔ اب اپنی سہیلیوں پر غصہ کرنا چھوڑیں اور آگے بات کریں۔۔۔ کیونکہ اس وقت میں ایک کردار میں پھنسا ہوا ہوں اور ذہنی طور پر حاضر نہیں۔"
میں ہنس پڑی۔۔۔ اگر اس کی یہ ذہنی غیر حاضری ہے تو پھر۔۔۔
"آپ بہت مترنم آواز کی مالک ہیں۔۔۔ اور ہنسی بھی لاجواب ہے۔۔۔ زیادہ تر خواتین جن کی آواز اچھی ہوتی ہے، وہ نہایت بدصورت اور بھدی ہوتی ہیں۔"
اس کی یہ بات میرے دل پر لگ گئی۔۔۔ میں نے

جھٹ سے لقمہ دیا۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے جناب ''آپ نے تو ایک لمحے میں آسمان پر چڑھایا اور دوسرے ہی لمحے پیروں تلے سے زمین ہی کھینچ لی....؟''

یوں ہماری بات چیت چل پڑی.... اکثر ہی وہ کسی نہ کسی کہانی میں الجھا ہوتا اور مجھ سے بات کرتے کرتے غیر محسوس طریقے سے میری تعریف بھی کر جاتا.... اس کی باتوں میں دنیا جہاں کی معلومات ہوتیں.... اور مجھے اس کی شخصیت ایک خوبرو' مضبوط ڈیل ڈول والے مرد کی سی لگنے لگی تھی جو دنیا کی سیر کرتا پھرتا ہے

جس کے ہزاروں غیر ملکی دوست ہیں۔ جو ملک کے ہر بڑے ادارے کے کرتا دھرتاؤں سے راہ و رسم رکھتا ہے.... اور اس سب پر اس کے پرستاروں کی بھیڑ.... اور میں.... میں تو بس ذرا سی آپ جو ہوں.... یہ تو اس کی مہربانی تھی کہ اس قدر مصروف ہونے کے باوجود وہ میرے لیے بات کرنے کا وقت نکال لیتا تھا۔

اکثر میں طلحہ سے اس کا موازنہ کرتی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو ہنسی آجاتی ہے۔ کہاں یہ وہیل چیئر پر ادھورا انسان اور کہاں جاذب نظر' اسمارٹ طلحہ.... پہلی بار سوچنے سمجھنے کی طاقت حاصل ہونے پر میں نے آنکھ کھولی تھی تو اس کو اپنے سرہانے مسکراتے پایا.... بابا جانی اس کے ساتھ ہی کھڑے تھے انہوں نے اس کا تعارف کرایا۔

''بیٹا.... بیٹا جانی.... یہ آصف ہیں.... آصف عمیر تمہارے پسندیدہ مصنف.... دیکھو میں تم سے ملانے ان کو لے آیا.... انہوں نے تمہارے بہت دنوں سے غائب رہنے پر مجھے فون کیا تھا....''

میں حیران رہ گئی.... اپنی تکلیف پر قابو پا کر بڑی مشکلوں سے جائزہ لے سکی تھی اور پھر اس کو وہیل چیئر پر بیٹھا دیکھ کر تھوڑی پریشان ہوگئی۔

''کیا.... یہ کیا ہوا آپ کو.... کیا آپ کا بھی ایکسیڈنٹ ہوگیا....؟''

میں نے نقاہت سے گھبرا کر پوچھا تو وہ دونوں ہنس پڑے.... وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے ہدایات دینے لگا....

''مریم.... آپ ابھی بس اپنا دھیان رکھیں۔ میں آپ کو آہستہ آہستہ اپنے بارے میں سب بتا دوں گا۔ ابھی ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں....''

اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر اعلا انسان ہے.... جو بچہ پانچ سال کی عمر میں ہی کھیل کود کے دوران گر پڑے اور وہیل چیئر اس کا مستقل ٹھکانا بن جائے اس سے اس قدر ذہانت اور ہمت کی توقع رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس کی والدہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اسے تعلیم دلائی.... پھر

اس نے گھر بیٹھے کئی ملکوں کے سفرنامے اور اخبارات اور کئی طرح کی معلوماتی کتابیں پڑھ کر خود کو اس قابل کیا کہ اپنی کہانیوں میں وہ دلکشی پیدا کرسکے کہ جو پڑھے اس کا دیوانہ ہو جائے.... اس نے محض کہانیاں لکھ کر خود کو معاشرے کا ایک فعال انسان بنا لیا.... اپنے ادھورے پن کو کامیابی کے راستے میں آنے نہیں دیا۔

میں اس کے بارے میں جتنا جانتی جا رہی تھی اس کے لیے میرے دل میں جگہ بنتی چلی جارہی تھی.... میں نے اب جانا کہ بہادری صرف غیر معمولی کارناموں کا نام نہیں.... کہیں کہیں صرف معمول کی زندگی گزارنا بھی سب سے بڑی کامیابی.... سب سے بڑا کارنامہ ہوتا ہے.... میں اکثر اپنی حالت سے گھبرا کر اس سے پوچھ بیٹھتی.... اپنے خدشات بتاتی.... وہ پرسکون رہتا اور جواب میں اپنی مثال دیتا۔

''مریم.... ہم اس وقت تک ادھورے نہیں ہو سکتے جب تک ہم خود کو ادھورا.... کم تر نہ سمجھیں۔ تم سب کچھ حاصل کرکے بھی محفوظ نہیں ہو اگر تمہیں خود پر اعتماد ہے تو ہر کمی.... غریبی بھی تمہیں آگے بڑھنے سے.... جینے سے نہیں روک سکتی۔''

وہ خود تو ادھورا تھا مگر اپنے ساتھ سے مجھے مکمل کر رہا تھا.... اور اس کے اسی محبت بھرے اور ہمت دلاتے ساتھ نے مجھے پھر سے بالآخر پیروں پر کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے جواب ہسپتال کے اسٹاف کو اچھی طرح

جان گئی تھی کہ سب کو ہدایات کر دیں کہ میرے ڈسچارج کی تاریخ میرے والد کو نہ بتائی جائے۔۔۔ کہ میں بابا جانی کو اچانک گھر پہنچ کر سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ میرا سامان باندھا جا چکا تھا۔۔۔ میں بستر سے ٹکی بیٹھی تھی اور ایک نرس میرے ہاتھ میں پیوست کینولا نکالنے میں مصروف تھی کہ طلحہ کمرے میں داخل ہوا۔۔۔ میں طلحہ کو دیکھ کر کھل اٹھی۔۔۔ پتا چلا کہ آصف نے ہی طلحہ کو فون کر کے بلایا تھا کہ مجھے بہ حفاظت گھر چھوڑ دے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور اطمینان بھی کہ چلو دونوں ہی مجھے عزیز ہیں اور دونوں میں دوستی ہو جانا میرے لیے اچھا ثابت ہوگا۔

جب تک نرس مجھے فارغ کرتی طلحہ اور آصف ہلکی پھلکی بات چیت میں مصروف ہو گئے تھے۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ جب آصف کوئی بات کرتے تو نرس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیل جاتی مگر جب طلحہ کچھ جواب دیتا تو نرس کے تاثرات سخت ہو جاتے کیونکہ نرس ان دونوں کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ اس اتار چڑھاؤ کو میں ہی دیکھ سکتی تھی۔۔۔ آصف۔۔۔ طلحہ کو میرے بارے میں ہدایات دینے لگے کہ ابھی کس طرح کا معمول میرے لیے مناسب رہے گا۔ طلحہ ہر ہدایت کو بہت احتیاط سے دہراتا جس پر نرس طنزاً" مسکرانے لگی اور پھر اچانک تیز آواز میں بول پڑی۔

"دیکھ لیں طلحہ صاحب۔۔۔ آپ کی منگیتر چل پھر سکتی ہیں۔۔۔ آپ کو یہی خدشہ تھا ناں کہ کہیں یہ زندگی بھر کے لیے اپاہج تو نہیں ہو جائیں گی۔۔۔ اور اسی بات پر آپ کس قدر بدتمیزی سے سارے اسٹاف سے پیش آئے تھے کہ ہم پیسہ کھانے کے لیے حقیقت چھپا رہے ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ آپ نے آصف صاحب کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔۔۔"

مجھے اچانک طلحہ کا آصف اور ڈاکٹر سے الجھنے والا واقعہ یاد آگیا تھا۔۔۔ اور احساس ہوا کہ میری حالت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والوں میں صرف بابا جانی اور آصف ہی تھے۔۔۔ میری احسان مند نظر آصف کی طرف اٹھ گئی جو مجھ سے باقاعدہ نظریں چرا رہا تھا۔۔۔ طلحہ لاجواب سا ہو کر آگے بڑھا اور میرا بیگ اٹھا لیا کہ گاڑی میں رکھ آئے۔۔۔ اس سے پہلے کہ طلحہ باہر نکلتا میں نے کپکپاتی آواز میں پکارا۔۔۔

"آصف۔۔۔!" غیر ارادی طور پر میری آواز کافی اونچی تھی اور کمرے کے خالی پن کی وجہ سے گونج اٹھی تھی۔۔۔ آصف جو اپنی جگہ پر جزبز ہو رہا تھا متوجہ ہو گیا اور طلحہ بھی جاتے جاتے رک گیا تھا۔۔۔

"شاید آپ کو میری آواز میں اعتماد کی کمی لگے مگر آصف پلیز! میں اپنے پورے ہوش و حواس میں آپ سے درخواست کر رہی ہوں' کیا آپ مجھے گھر چھوڑ سکتے ہیں؟" طلحہ سے رہا نہ گیا اور اس سے پہلے کہ آصف کوئی جواب دیتا وہ بیچ میں بول پڑا۔

"مریم۔۔۔ آصف کیوں؟" میں نے نرس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

"اس لیے کہ میں بہ حفاظت گھر جانا چاہتی ہوں۔۔۔ اور خود کو آصف کے ساتھ زیادہ محفوظ سمجھتی ہوں۔"

☆

عائشہ ناز علی

زندگی گلزار ہے

گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور فضا اس آواز سے گونج اٹھی۔ بروقت بریکیں نہ لگتیں تو نجانے کیا ہو جاتا۔ اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ ٹکائے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ونڈ اسکرین کے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ذرا سا آگے ہو کر ونڈ اسکرین سے باہر جھانکا۔ بونٹ سے ٹکرا کر سفید گٹھڑی زمین پر گر چکی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور خود پہ قابو پاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اندھیرے میں گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی چکاچوند میں وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اس سفید چادر میں لپٹے ڈھانچے نما وجود سے مخاطب تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گاڑی اس وجود سے نہیں ٹکرائی تھی۔ گرنے والا وجود صرف خوف سے گھبرا کر گرا ہے۔ نرم آواز سن کر اس چادر میں چھپے ہوئے وجود نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مائی گاڈ!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کمزور، لاغر چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ خون تو ماتھے سے نکل رہا تھا۔ "آپ تو پہلے ہی سے کافی زخمی ہیں۔" اس نے فوراً اپنا دوپٹا اس کے ماتھے پر رکھا۔

"اُف... چلیں آپ، میں آپ کو فرسٹ ایڈ دے

دوں۔" اس نے دونوں شانوں سے پکڑ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ اسے لگا جیسے اس نے ڈھانچے کو پکڑا ہو۔ اس نے اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور پچھلی سیٹ پر سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اس کے زخم کی صفائی شروع کردی۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ کی وجہ سے وہ ماتھے کی چوٹ کی گہرائی کا اندازہ کرسکتی تھی۔

"چوٹ زیادہ گہری ہے۔ ٹانکے لگیں گے۔ ہمیں کلینک جانا ہوگا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا تھی۔ اس نے عارضی پٹی کی اور خود گہری سانس لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

وہ پندرہ منٹ پہلے کلینک سے نکلی تھی اور اب اسے واپس آتے دیکھ کر چوکیدار حیران تھا۔ اس وقت دس بج چکے تھے اور کلینک میں موجود نرسیں بھی چھٹی کرکے جاچکی تھیں۔

"سسٹر رفیقہ کو کال کرو۔ وہ نزدیک ہی رہتی ہے۔ اسے بلاؤ۔" روشنی نے زخمی عورت کی پٹی کھولتے ہوئے ہدایت دی۔ چوکیدار سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں سسٹر رفیقہ بھی آگئی تھی۔ عورت کو ٹانکے لگانے کے بعد اس نے تفصیلی چیک اپ کیا تو اسے پتا چلا کہ اس عورت کے گھٹنے پر بھی چوٹ لگی ہے اور اس کی کہنی بھی چھلی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری بیل پر ہی دوسری طرف سے فون ریسیو کرلیا گیا۔

"آج پھر کسی کو تمہاری ضرورت پڑگئی ہوگی؟" دوسری طرف سے فوراً" بڑی ناراضی سے پوچھا گیا۔

"سوری... آپ کو تو پتا ہے نا... میرا کام ہی ایسا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"فرض کی ادائیگی اچھی بات ہے مگر کچھ حقوق اپنی ذات کے بھی ہوتے ہیں۔" ممی ناراض تھیں۔

"جی... آپ نے کھانا کھالیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں... ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ میں کھانا کھالیتی ہوں۔" وہ جیسے چڑ کر بولیں۔

"پلیز ممی! آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ کھانا کھالیا کریں۔ میری تو روٹین ہی ایسی ہے۔ اب مجھے آپ کی فکر لگ گئی ہے۔ آپ پلیز میرا انتظار مت کریں اور کھانا کھا کر سوجائیں۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"خدا کے لیے روشنی! تم اپنے اس سوشل ورک کو قابو میں رکھو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔"

"ممی! میں دودھ پی لوں گی۔ اچھا آپ کھانا کھا کر ریسٹ کریں۔ میں کل بات کروں گی۔" اس نے فون بند کردیا اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ دو دنوں سے اسے آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

وہ فریش ہونے کے لیے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔

واپس آکر وارڈ روب سے جائے نماز نکال کر ایک کونے میں بچھائی اور ایک نگاہ تشکر "اوپر" ڈالی اور جوتے اتار کر مصلے پر کھڑی ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

ہارن کی آواز تواتر سے آرہی تھی۔ چوکیدار گرتا پڑتا گیٹ کی سمت بھاگا۔

"آیا صاحب... آیا۔" اس نے دور سے ہی چلانا شروع کردیا اور گیٹ کھول دیا۔

"تمہاری ڈیوٹی ادھر گیٹ پر ہے اور تم ادھر ادھر تفریح کرتے پھر رہے ہو۔" کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے وہ جھنجلایا۔ تھکان، ذہنی پریشانی اور اعصابی دباؤ نے اس کے مزاج پر بہت برا اثر ڈالا۔

اس نے گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ پورچ میں موجود تین مختلف ماڈل اور رنگوں کی گاڑیوں کی قطار میں اس نے اپنی گاڑی بھی کھڑی کردی۔ گاڑی کی آواز گھر کے اندر تک گئی تھی۔

انہوں نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور بے قراری سے باہر بھاگیں۔

بیرونی آبنوسی منقش دروازے تک پہنچی ہی تھیں کہ تیمور نے اندر قدم رکھا۔

"کہاں تھے تم؟ نہ کھانا کھایا' نہ کچھ بتایا اور نکل کھڑے ہوئے۔"

وہ بے قراری سے آگے بڑھیں۔ تیمور نے صرف ایک نگاہ ان پر ڈالی تھی۔ اس کی ایک نظر میں اتنا کچھ تھا کہ انہیں اپنے اندر کچھ محسوس ہوا تھا۔ وہ بغیر جواب دیے آگے بڑھ گیا۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔ سب جگہ فون کرلیا مگر تم نہ کسی دوست کے گھر ملے نہ رشتہ دار کے۔" وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔

"کیوں ڈھونڈ رہی تھیں آپ مجھے؟" وہ پلٹے بغیر ترشی سے بولا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں آگئے تھے جہاں گھر کے باقی افراد موجود تھے۔

"ماں ہوں تمہاری۔ مجھے تمہاری فکر نہیں ہوگی بھلا؟" وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔

"نہیں ہے آپ کو میری پروا۔ اگر ہوتی تو انہیں گھر سے نہ نکالتیں۔" وہ پلٹا۔ آنکھوں میں شکوے اور چہرے پر دکھ اور غصے کے بادل چھائے تھے۔

"تم اپنی ممی سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو تیمور؟ کیا تم یہ بھول گئے ہو کہ یہ تمہاری ماں ہے؟" باسط کے ساتھ شطرنج کھیلتے کھیلتے عمران سلیم نے اسے ڈپٹا۔

"اور وہ... جسے دھکے دے کر اس گھر سے جو کہ ان کا ہی ہے' نکال دیا گیا... وہ... وہ کون ہیں ڈیڈ؟" اس نے انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

"بکواس بند کرو۔" انہوں نے دھاڑتے ہوئے ہاتھ مارا اور شطرنج کی ساری بساط تتر بتر کر ڈالی۔

"سچ جلتا ہوا کوئلہ ہوتا ہے۔ کوئلہ جب ہاتھ جلاتا ہے تو چیخ نکل ہی جاتی ہے۔" وہ اس قدر بدلحاظ اور منہ پھٹ نہیں تھا جتنا اس وقت نظر آرہا تھا۔ سب ہی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو بہت ہی ٹھنڈے مزاج والا اور تحمل مزاج تھا۔ ضرورت کے مطابق ہی اس کے منہ سے کچھ نکلتا تھا مگر آج تو وہ کوئی اور ہی تیمور تھا۔

"تیمور...! تم حد سے گزر رہے ہو۔" باسط نے مداخلت کی۔

"میں نے ایسا کچھ غلط نہیں کیا۔ ہر شے اپنی فطرت پر ہوتی ہے بھیا!" تیمور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم دادی کے جانے کا غصہ ہم پر کیوں نکال رہے ہو؟" بڑی بھابی ریکا نے جل کر کہا۔

"ان کے ساتھ جو بدسلوکیاں اس گھر میں کی گئی تھیں۔ وہ ناقابل برداشت تھیں۔ مجھے خود پر افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ان کے ساتھ اس قسم کی بدسلوکیوں اور رویوں کے بارے میں پہلے ہی سے کوئی موثر اقدام کیوں نہ کرلیا۔" اس نے سرد نظروں سے ریکا کو دیکھا۔

عریشہ کو تو بڑے بھائی کے تیور اور انداز دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی تھی' وہ ٹی وی کا والیوم کم کر کے چپکے سے اٹھ کر وہاں سے کھسک گئی تھی۔

"میری ایک بات یاد رکھیں... وہ میری ماں ہیں... اگرچہ انہوں نے مجھے جنم نہیں دیا مگر وہ میری ماں ہیں۔ انہیں کچھ ہو گیا ناں... تو میں آپ سب کو سمجھ لوں گا۔"

وہ خشک لہجے اور انگارے برساتی آنکھوں کے ساتھ تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ کمرے میں چند لمحوں تک گہرا سناٹا راج کرتا رہا۔

"یہ سب تمہاری لاپروائی کا نتیجہ ہے... تمہیں تیمور کو شروع سے ہی اپنے ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ اب دیکھ لو۔" عمران سلیم نے تیمور کا سارا غصہ بیگم پر نکالا۔

"مجھے الزام مت دیں۔ صرف بیوی ہی اولاد کی تربیت کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ تین تین بچوں کی پرورش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔" بیگم نفیسہ

نے ان سے زیادہ اونچی آواز میں جواب دیا۔

"پلیز ممی' ڈیڈ... اب آپ دونوں شروع مت ہو جائیے گا۔" باسط نے بیزاری سے کہا۔

"بڑی بی نے میرے بچے کے ذہن میں ہمارے خلاف زہر بھر دیا ہے۔ کچھ وقت تو لگے گا اس زہر کو نکالنے میں۔" نفیسہ بیگم بولیں۔

"اگر پہلے پتا ہوتا تو اتنا تماشا کھڑا کرنے کے بجائے بڑھیا کو زہر ہی دے دیتی۔" نفیسہ بیگم بل کھاتی ناگن کی طرح ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

"اب بات کرو اس سے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔" عمران سلیم نے کہا۔

"اس وقت بات کرنے سے وہ اور بھڑکے گا۔ کل بات کیجیے گا۔" ریکا نے ناخنوں کی شیپ کو بغور دیکھتے ہوئے مفت مشورہ دیا اور پھر تراشیدہ بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے باسط کو دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بیوی کے کھڑے ہوتے ہی وہ بھی اٹھ گیا۔ ریکا کے آنکھ کے اشاروں کو وہ بخوبی سمجھتا تھا۔

"اوکے ممی' ڈیڈ... گڈ نائٹ" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ریکا پہلے کمرے سے نکلی تھی۔

"جورو کا غلام... ہنہ... شادی کے بعد آپ کا بیٹا بس بیوی کا دُم چھلا بنا رہتا ہے۔ دو گھڑی ہمارے پاس نہیں بیٹھتا۔ آجائے تو پیچھے پیچھے وہ آجاتی ہے کن سوئیاں لیتی ہوئی۔" وہ بڑبڑا رہی تھیں مگر آواز قدرے دھیمی تھی۔

"بھئی۔ اب کیا کریں۔ شادی کے بعد ہر کوئی ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ جب سے شادی ہوئی ہے صرف تمہاری ہی مانی ہے۔" عمران سلیم نے نظر کے چشمے کے پیچھے سے انہیں جھانکا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خیر۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اپنی من مانی تو آپ بھی کرتے ہیں۔" وہ بھی تقلید میں کھڑی ہو گئیں۔

"مگر پلڑا تو آپ کا ہی بھاری رہتا ہے بیگم۔" انہوں نے ترچھی نظر اور دھیمی سی مسکان کے ساتھ جواب دیا۔ ایک فاتحانہ مسکان نفیسہ بیگم کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

جیت کا غرور ان کی تنی ہوئی گردن میں مزید "سریے" بھر گیا۔ سیڑھیوں کے عین نیچے ان کا ماسٹر بیڈ روم موجود تھا۔ گول کمرے سے نکل کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"تیمور کو نکیل ڈالنی ضروری ہے۔ اس عورت کا بھوت اس کے سر سے اتارنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی دوسری عورت کا جادو اس پر حاوی ہو۔" نفیسہ بیگم نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" عمران حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ تیمور کی شادی کر دی جائے۔" انہوں نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"شادی... مگر کیا وہ راضی ہو گا؟ اور لڑکی... لڑکی کہاں سے آئے گی اتنی جلدی؟" عمران سلیم بیڈ پر بیٹھتے بیٹھتے چونکے۔

"تم نے اسے پہلے کتنی لڑکیاں دکھائی ہیں' ہر لڑکی پر اس کی گردن دائیں بائیں جھومنے لگتی ہے۔ 'نہ' ہاں میں نہیں بدلتی۔" عمران سلیم نے ناگواری سے کہا۔

"اس کے انکار کی وجہ میں جانتی ہوں عمران۔ اسی بڑھیا کی زبان بولتا تھا میرا بچہ۔ مگر اب فساد کی جڑ ہی نہیں تو فساد کہاں سے برپا ہو گا۔" نفیسہ بیگم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تمہاری نظر میں ہے کوئی لڑکی؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

"یونہی ذکر نہیں چھیڑا تھا میں نے۔" نفیسہ بیگم نے ادا سے کہا۔

"لیکن ایک بات یاد رکھنا' تمہارے چہیتے کی ہم مزاج ہو لڑکی... ایسی لڑکی جو تیمور سے نباہ سکے۔" عمران نے بیٹے کے مزاج کے مطابق بات کی۔

"فکر مت کریں.... میں بہت سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کرنے کے بعد اس لڑکی کے لیے راضی ہوئی ہوں۔ کافی دنوں سے چھان پھٹک کر رہی تھی۔" ہینڈ کریم کی شیشی کا ڈھکن کھولتے ہوئے وہ کہہ رہی تھیں۔

"آپ کا انتخاب ہے تو لاجواب ہی ہوگا ہمیں آپ پر بھروسا ہے۔" وہ محبت سے نفیسہ بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔ نفیسہ کا صحت مند قدرتی سرخی لیے چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ قدرت نے انہیں ظاہری حسن سے اس قدر فراوانی سے نوازا تھا کہ عمر کے اس الوداعی حصے میں بھی ان کا روپ اپنی کشش برقرار رکھے ہوئے تھا۔ عمران سلیم پر ان کا جادو روزِ اول سے چڑھا تو آج تک نہ اترا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت بے قراری سے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ ذہنی، جسمانی اور اعصابی تھکاوٹ کے باوجود وہ چین سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار ایک ہی چہرہ آجاتا۔ فرشتوں کا سا پرنور.... چاندی کی طرح دودھیا دھیمی سی مسکان والا۔ بے چینی حد سے بڑھی تو اس نے جا کر وضو کیا اور اللہ کے روبرو فریاد کرتے کرتے بچوں کی طرح رو پڑا۔

☆ ☆ ☆

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ مریضہ کے پاس آئی جسے اب روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

"السلام علیکم.... کیسی ہیں اب آپ؟" بشاش لہجے اور مسکراتے لبوں کے ساتھ وہ پوچھ رہی تھی۔ ساتھ ہی زخموں کا "جائزہ" بھی لے رہی تھی۔ بوڑھی مگر چمکیلی جھیل سی تھکی تھکی سی آنکھوں نے اس فرشتے کی طرف دیکھا جو سفید کوٹ پہنے "اپنے کام" میں مگن تھی۔

"آپ کو اپنے گھر کا ایڈریس، فون نمبر... کچھ یاد ہے؟" اس نے اس بار نرمی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اماں جی.... ! آپ کو میری بات سمجھ میں آرہی ہے؟ سنائی دے رہی ہے ناں؟" وہ بے حد نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ سسٹر رفیقہ اسی وقت اندر داخل ہوئی تھی۔

"کہیں سر کی چوٹ کی وجہ سے یہ اپنی یادداشت تو نہیں کھو بیٹھیں؟"

"اگر ایسا ہوا تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ ان کے گھر والوں کو کیسے ڈھونڈیں گے؟" روشنی نے انگلش میں سسٹر رفیقہ سے کہا۔

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں۔" روشنی کے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی لرزاں آواز میں بولی تھیں۔ دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے اماں جی؟ کوئی تو ہوگا...." سسٹر رفیقہ نے بے ساختہ کہا۔

"ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں بیٹی جن کا بھری دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔ یہ بھی دنیا کی سچائیوں میں سے ایک ہے۔" عورت نے مبہم سا مسکرا کر جواب دیا۔

"تو اماں! کوئی تو ٹھکانا ہوگا آپ کا، جہاں پر آپ کی رہائش ہوگی؟" روشنی نے نرمی سے پوچھا۔ خاتون چند لمحوں تک چپ رہیں پھر سر جھکا لیا۔

"بے سہارا ہوں بیٹی۔ گھروں کے کام کاج کر کے پیٹ بھر لیتی ہوں۔ جس گھر میں کام کرتی تھی، وہاں کے مکینوں نے نکال دیا۔ اب ساری زمین میرا گھر ہے اور کھلا آسمان میری چھت۔" روشنی کو اس خاتون کے چہرے کے نقوش اور لب و لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور گردشِ حالات و تقدیر کی نذر ہوئی ہیں۔

"تو پھر آپ یہاں کلینک سے نکل کر کہاں جائیں گی؟" سسٹر رفیقہ نے سوال کیا۔

"ہم جیسے بے کار بوڑھوں کے لیے کچھ ہمدرد نرم دل افراد نے چار دیواریاں قائم کر رکھی ہیں۔ کبھی خیرات

خانے میں مقدر آزمانوں گی۔ آپ میری فکر مت کریں بیٹی.... مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ نے جو میرا علاج کیا میں اس کی رقم ادا نہیں کر سکتی البتہ اس کے بدلے میں آپ کے ہسپتال اور گھر کا کام کاج کر کے آپ کے احسان کا بدلہ اتار سکتی ہوں۔" بڑے بنچے تلے انداز میں جواب آیا تھا۔

"آپ ایسا کچھ مت سوچیں۔ آپ میری بزرگ ہیں۔ کام کاج کروانے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ ایک کام کریں۔ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔" روشنی نے نرمی سے کہا۔

"نہیں بیٹی! آپ کا احسان تو پہلے ہی مجھ پر اتنا ہے کہ...." خاتون نے کہنا چاہا تو روشنی نے اسے ٹوک دیا۔

"بیٹی کہا ہے تو بیٹی کی بات بھی ماننی پڑے گی۔ آپ انتظار کریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔" روشنی نے سسٹر رفیقہ کو اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟ پتا نہیں کون ہے؟ سچ بول رہی ہے یا جھوٹ؟ کوئی مسئلہ ہی نہ کھڑا ہو جائے۔ آپ سیدھے سیدھے گھر لے جانے کی بات کر رہی ہیں۔"

"نہیں.... یہ خاتون بہت اچھے گھرانے کی لگتی ہیں۔ اگر قسمت میں گردش لکھی ہو تو شاہ بھی فقیر بن جاتا ہے۔ ان کے اچھے وقتوں کی داستان ان کے چہرے کے نقوش اور انداز و بیاں میں پوشیدہ ہے۔" روشنی نے اس کی بات سے بالکل بھی اتفاق نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان کی انگلیاں تیزی سے ننٹنگ میں مصروف تھیں۔ ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی ملازم کو مختلف قسم کی ہدایات دینے میں مصروف تھی۔

"ارے بھئی یہ صوفہ ذرا سا ادھر کھسکاؤ.... ہاں ادھر! میں جانب۔" ملازم ان کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔

"ارے بھئی بیگم! یہ آپ کیا ملازمین پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں۔ اچھے بھلے غریب وہاں ہمارے پاس بیٹھے کیرم کھیل رہے تھے۔ بچاروں کو در بدر کر دیا۔" شہاب امام نے اندر داخل ہوتے ہوئے ترحم بھری نگاہ ملازموں پر ڈالی۔

"چلیں جی.... اب تو ہو چکا کام.... آپ جائیے کرنل صاحب! اپنے لیے کسی اور کمپنی کا بندوبست کریں۔" پرانے نمک خواروں کے لبوں پر مبہم مبہم سی مسکراہٹیں ابھر آئیں۔

"ارے بیگم! کیوں پرانے دنوں کی یاد دلا کر دل جلاتی ہیں.... ہا.... ہ.... آہ۔" شہاب امام نے طویل سانس حلق سے خارج کی....

"توبہ ہے کرنل صاحب! ریٹائرمنٹ کے بعد تو آپ بالکل ہی بچہ بن گئے ہیں۔ دن بھر ان لوگوں کو بٹھا کر یا تو کیرم کھیلا جاتا ہے یا پھر اپنی شجاعتوں کے قصے سنائے جاتے ہیں۔ میں کہتی ہوں کرنل صاحب! اب آپ بھی "بڑے" ہو جائیے۔"

"ارے رے.... بھئی اس پردے کی فال تو ٹھیک کرو۔" دفعتاً" ان کی نگاہ دین محمد پر پڑی جو کہ پردے لگا رہا تھا۔

"فال سے ایک قصہ یاد آ گیا بیگم صاحب۔" شہاب امام کی یادداشت کی پوٹلی کھلنے لگی۔

"بس کیجیے آپ رہنے دیں۔ مجھے کام نبٹانے دیں.... سارا انبار سر پر رکھا ہے میرے۔" بیگم شہاب نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑتے ہوئے "پوٹلی" کی گرہ کھلنے کی مہلت ہی نہ دی۔ بیچارے شہاب امام اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ "ایسے مواقع پر ہماری دختر نیک اختر بہت کام کرتی ہے۔ دختر سے یاد آیا۔ کہاں ہیں ہماری روشنی؟"

"آپ کو بہت شوق تھا اسے ڈاکٹر بنانے کا۔ اب بھگتیں۔ میری چاندی سی چمکتی بچی کی رنگت ہلدی کی طرح ہو گئی ہے۔ سب آپ کی شہ کا نتیجہ ہے۔"

"ارے تو خدمت خلق تو اچھی بات ہے بھئی۔"

شہاب امام نے بیٹی کی طرف داری کرنی چاہی۔
"جی ہاں... مگر جو آپ کی بچی کر رہی ہے اسے خود کشی کہتے ہیں۔ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہیں ہے۔ نہ کھانے کا نہ پینے کا نہ آرام کرنے کا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس شہر میں صرف وہی ایک ڈاکٹر رہ گئی ہے۔ آجانے دیجیے ذرا۔ آج تو خوب خبر لوں گی اس کی۔" بیگم شہاب کی گرج چمک عروج پر تھی۔ شہاب امام کو ان کے غصے کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔ دفعتاً" ان کی نگاہ دروازے میں ایستادہ روشنی پر پڑی، جس کی طرف بیگم شہاب کی پشت تھی۔ روشنی نے اشارے سے "موسم" کا حال دریافت کیا۔ شہاب امام نے اشارے ہی سے اسے "موسم" کی خرابی کا احوال دے دیا۔ روشنی نے التجائیہ انداز میں سفارش کرنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے آنکھوں کے اشارے سے ساتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔

"ویسے بیگم! آپ درست کہہ رہی ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اسے گھر ہی بٹھالوں۔" ان کے بدلتے ہوئے پینترے پر بیگم شہاب نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ہیں... کیا کہا؟"

"ہاں... اور کیا... بھئی کروڑپتی باپ کی اولاد ہے۔ وہ بھی اکلوتی، اتنی پراپرٹی ہے... بس وہی سنبھالے۔ یہ ڈاکٹری کے جھمیلوں سے نکلے اب... آنے دو... بات کرتا ہوں اس سے۔" شہاب امام نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ بیگم شہاب نے پہلے حیرت اور پھر مشکوک نظروں سے شوہر کو گھورا۔

مگر روشنی پر نظر پڑتے ہی شہاب امام کی چالاکی سمجھ گئیں۔

"اچھا... تو یاد آگئی آپ کو ماں اور باپ کی؟ میں تو سمجھی کہ ہماری بیٹی تو گھر کا راستہ ہی بھول گئی ہیں۔" بیگم شہاب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آئم سوسوری ممی... بٹ پلیز... اب موڈ آف مت کریں۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" وہ فوراً" ان سے لپٹ گئی اور بیگم شہاب کا سارا غصہ غائب ہوگیا۔

"تو کیوں تھکاتی ہو خود کو؟ آخر تمہیں کس چیز کی کمی ہے... دیکھو تو پھول جیسا چہرہ کملا کر رہ گیا ہے۔"

"ممی... ممی! پلیز یہ باتیں چھوڑیں۔ مجھے آپ سے اور بابا سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے ان کو ٹوکا۔

"بولو..."

"آپ بیٹھیں... بابا! آپ بھی۔" اس نے دونوں کو صوفے پر بٹھایا۔

"لگتا ہے کوئی تگڑی سفارش کرانی ہے..." شہاب امام نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اندازہ لگایا۔

"ممی! بابا! کل مجھے ایک بہت ہی بوڑھی اور غریب عورت ملی۔ بیچاری کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جہاں کام کرتی تھی وہاں سے بھی اسے نکال دیا ہے۔ یہ وہی زخمی عورت ہے جسے میں رات کو کلینک لے گئی تھی۔" اس نے تمہید باندھی۔

"ہوں... تو پھر... کیا کیا جائے؟ ایسے لوگوں کے لیے ادارے موجود ہیں۔ میں کچھ کرتی ہوں۔" بیگم شہاب نے پرسوچ نظروں سے غیر مرئی نقطے کو گھورا۔

"ممی! میں سوچ رہی تھی کہ اگر ہم انہیں اپنے ساتھ رکھ لیں تو..." اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہیں... ہیں لڑکی! ہوش میں تو ہو؟ بن جانے کسی انجان عورت کو کیسے رکھ لیں؟ نجانے کون ہے؟ کس خاندان کی ہے؟ کہیں لینے کے دینے پڑ گئے تو؟" وہ گرم ہوگئیں۔

"آپ ایک بار ان سے مل تو لیں۔ کسی اچھے گھرانے کی لگتی ہیں۔ مگر مصیبت کی ماری ہیں۔ انہوں نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ کسی ادارے میں چلی جائیں گی مگر میرا دل نہیں مانا... پلیز انہیں رہنے کی اجازت دے دیں۔"

اس نے ماں کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے التجا کی۔

"ارے کرنل صاحب! اب آپ کی اس لاڈلی کا

کیا کروں؟ کبھی سڑک پر سے بلی، کتے کے بچے اٹھا کر لے آتی ہے۔ کبھی چڑیا اور کبوتر۔ اس بار تو حد کر دی، ایک جیتا جاگتا انسان لے آئی ہے... لو بھلا... گھر نہ ہوا کشتی نوح ہو گیا۔ بھرتے جاؤ۔ بھرتے جاؤ۔" انہوں نے عاجز آکر شوہر کو دیکھا۔

"بھئی اب تو وہ خاتون آگئی ہیں۔ جا کر مل لیتے ہیں۔ عمر رسیدہ ہیں۔ کچھ دن رکھ لیں اگر ٹھیک نہیں لگا تو اس ملک میں ادارے تو بھرے پڑے ہیں۔ آخر آپ کی "سماجی خدمت" کس دن کام آئے گی؟" شہاب امام نے حسب عادت بیٹی کی طرف داری کی۔

"اف... توبہ ہے آپ دونوں باپ بیٹی سے... سوشل ورکر تو آپ دونوں کو ہونا چاہیے تھا۔" بیگم شہاب نے ہتھیار ڈالا۔ "چلو... ملواؤ۔"

وہ کھڑی ہو گئیں تو شہاب امام نے معنی خیز شوخ مسکراہٹ سے روشنی کو دیکھا اور وکٹری کا نشان بنایا۔

وہ زیر لب مسکرا کر ماں کے پیچھے چلنے لگی۔

"آپ بھی تو آئیے۔" کمرے سے نکلتے نکلتے وہ حکم صادر کر گئیں۔

☼ ☼ ☼

روشانے ان کے گھر کا واحد چراغ تھی۔ اس سے پہلے شہاب امام اور بیگم شہاب کا گھر اولاد کی روشنی سے محروم تھا۔ دونوں میاں بیوی کے مزاج میں فرق تھا مگر مزاج آشنائی کے سبب بہت اچھے طریقے سے گاڑی چل رہی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی سوچ اور ایک دوسرے کی مرضی کا احترام کرتے تھے۔ نسلی جاگیردار ہونے کے باوجود شہاب امام بہت کھلے ذہن اور روشن سوچ کے مالک تھے۔ اپنی بیٹی کی تربیت بھی دونوں نے اپنے اصولوں کے مطابق کی تھی۔ روشنی میں ماں اور باپ دونوں کے اوصاف موجود تھے۔

ڈرائینگ روم کے سنگل سیٹر پر وہ دھان پان سا وجود کھلی آنکھوں کے ساتھ نجانے کس دیس کی سیر میں مگن تھا۔

"اماں جی... یہ میرے بابا اور ممی ہیں۔" اس کی آواز نے اس وجود میں حرکت پیدا کی۔

"السلام علیکم۔" وہ کھڑی ہو گئیں۔

"آپ بیٹھیں۔ ابھی چوٹ تازہ ہے۔" روشنی نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر پھر بٹھا دیا۔

"آپ کی بیٹی فرشتہ ہے... آپ لوگوں کی تربیت کا عکس جھلکتا ہے آپ کی بیٹی میں۔" سوکھے لبوں میں جنبش ہوئی۔ دونوں میاں بیوی کو عورت کے انداز بیان نے متاثر کیا۔ وہ پڑھی لکھی خاتون لگ رہی تھیں۔

"شکریہ۔ روشنی نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔ بہت افسوس ہوا آپ کے حالات سن کر۔" بیگم شہاب نے نرمی سے کہا۔

"اللہ آپ کی بیٹی کو ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔ گرم ہوا سے بھی محفوظ رکھے۔ اس نیک فطرت کو اس کے جوڑ کا بر ملے۔ اس نے مجھ غریب کو سہارا دیا۔" ان کی بوڑھی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

"جو میری بیٹی کو اتنی دعائیں دے بھلا اسے ہم کیسے حوادث زمانہ کے سپرد کر دیں۔ آپ ہمارے پاس ہی رہیں گی اماں جی۔" بیگم شہاب پگھل گئیں۔ شہاب امام البتہ کسی سوچ میں تھے۔

"آپ یہیں کی رہنے والی ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"میری پیدائش آگرہ کی ہے بیٹا!" کچھ یاد آیا تو پھر سے آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

روشنی باہر نکل گئی تھی تاکہ اماں جی کے لیے کچھ کھانے وغیرہ کا بندوبست کروائے۔

"میری قسمت یہاں لکھی تھی بیٹا۔ نکاح کے بندھن میں جو بندھی تو پھر بیوگی تک کا سلسلہ یہیں سے جڑا۔ مڑ کر دوبارہ اس مٹی میں جانا نصیب نہ ہوا جس مٹی کا خمیر ہوں۔" انہوں نے بتایا۔ روشنی بھی واپس آچکی تھی۔

"اور آپ کی اولاد؟" شہاب امام نے پوچھا۔

"ہاں... ہاں... بھرا پرا گھر... رونق میلے والا" انہوں

کے انبار.... مسکراہٹیں.... خوشیاں.... بیٹا! سب کچھ تھا.... بس.... پھر نصیبوں کی مار پڑی تو.... "یک دم وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ تینوں دم بخود سے ہو گئے۔

"اماں جی! آپ کا نام کیا ہے؟" دفعتاً" روشنی کو خیال آیا۔

"رُخ مریم.... میرا نام رخ مریم ہے۔"

"اتنا خوب صورت نام۔" تینوں نے ستائشی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اچھا تو میں آپ کو پھر اماں مریم کہوں گی۔ ٹھیک؟" روشنی نے کہا۔

"تمہارے منہ سے بہت اچھا لگے گا اگر تم مجھے انا بی کہو گی۔" انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"گڈ.... چلیں یہ بہت اچھا ہے۔ چلیں انا بی! پہلے کچھ آرام کرلیں۔ آپ کا کمرہ ریڈی ہے۔ اسلم لنچ بنا رہا ہے پھر مل کر لنچ کریں گے۔" اس نے انا بی کو سہارے سے کھڑا کیا۔

"ٹانکے ابھی کچے ہیں۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے آپ کے لیے پرہیزی کھانا بنوایا ہے۔" اس نے انا بی کے ہم قدم ہوتے ہوئے کہا۔

"تکلف کیوں کر رہی ہو بیٹی۔ مجھے اس قدر التفات کی عادت نہیں ہے۔" انا بی نے اداس لہجے میں کہا۔

"بیٹی کہتی ہیں اور تکلف بھی برتتی ہیں۔ کمال ہیں آپ۔" وہ بُرا مان کر بولی اور انیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

"روشنی! تم واقعی روشنی ہو...." انا بی کے دل میں اس کے لیے محبت اور دعائیں تھیں۔ روشنی مسکرائی۔ انا بی کو لگا جیسے اس مسکان سے ان کی پرانی آشنائی ہے۔

"آپ آرام کریں میں بھی ذرا چینج کرلوں۔" وہ کمرے کا دروازہ کھول کر نکل گئی۔ انا بی نے بیڈ پر اپنے دکھتے ہوئے وجود کو گرایا۔ پین کلر لینے کے باوجود زخموں اور ٹانکوں میں اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔

سخت تکلیف تھی جسم کی یا دل کی؟ وہ سوچ رہی تھیں.... اور اسی سوچ میں ڈوبی وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئیں پتا بھی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

وہ دوبارہ ان کے کمرے میں گئی تھی۔ شاید دواؤں کا اثر تھا یا کچھ اور وجہ وہ گہری نیند سوئی ہوئی ملیں۔ وہ شہاب امام اور بیگم شہاب کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ اس وقت موضوع گفتگو "رخ مریم" تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ انا بی کے ساتھ معاملہ کچھ اور ہے۔" چائے کی چسکی لیتے ہوئے بیگم شہاب نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں ماں کو دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے ان کی اولاد نے انہیں گھر سے نکال دیا ہے۔ اپنا اور اپنی ناخلف اولاد کا بھرم بنائے رکھنے کی خاطر انہوں نے ہم سے جھوٹ بولا ہے۔" انہوں نے بڑے وثوق سے کہا۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتی ہیں؟" شہاب امام نے بیوی کی جانب دیکھا۔

"ایسے سینکڑوں کیسز ہم نے ڈیل کیے ہیں۔ ایسی ناخلف بے غیرت اولادوں کی کمی نہیں ہے ہمارے ملک میں۔" وہ ناک سکیڑ کر بولیں۔

"یہ تو دنیا میں ہو رہا ہے۔ ساری زندگی ماں اور باپ سے اولاد خراج ہی وصول کرتی ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر جوان ہونے تک اور ان کے بڑھاپے تک کبھی کبھی زندگی کی آخری سانسوں تک.... چلیں غیر مسلموں کو تو چھوڑ دیجیے کہ ان کا تو نظریہ ہی الگ ہے مگر مسلمان جب ایسا کرتے ہیں تو یقین مانیے کرنل صاحب! میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہمارے آقائے دو جہاںﷺ نے ہمیں کیا عظیم نصیحت و عمل سکھایا اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ دکھ کی کیا بات ہوگی کہ پاکستان جیسے ملک میں بھی ہمیں

اب جا بجا بوڑھے والدین کے لیے رفاہی ادارے اور اولڈ ہاؤسز کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ کنالوں پر پھیلی چہار دیواری میں ان ہی دو افراد کی جگہ نہیں ہوتی' جن کی وجہ سے اینٹ پتھر کو مکان و محل کا درجہ دیا جاتا ہے۔

بیگم شہاب کی پلکیں بھیگ گئیں۔ روشنی اداس سی چائے کی پیالی کو تک رہی تھی۔ شہاب امام کی نگاہیں بھی جیسے کہیں ماضی کے دریچے سے کچھ جھانک' کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

"میں اناں بی سے پوچھوں گی ان کی اصل کہانی۔" روشنی نے کہا۔

"نہیں بیٹا! اگر خود سے بتا دیں تو ٹھیک... ورنہ کسی کے بھرم پر پڑے ہوئے پردے کو ہم اٹھا دیں' یہ ہمارا حق نہیں ہے۔" شہاب امام نے فوراً" بیٹی کو سمجھایا۔

"جی ابا!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"اچھا' میں کچھ دیر ریسٹ کروں گی۔ پھر مجھے ہاسپٹل جانا ہے۔ کال آئی ہے۔ آج نائٹ ہے وہاں۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کرو' اپنا سارا سامان لے کر وہیں کسی کمرے میں رہ جاؤ۔ گھر پر تو یوں بھی تم "نجم السحر" کی طرح نمودار ہوتی ہو اور پھر غائب۔" بیگم شہاب تپ گئیں۔

"بیٹا! جب اپنا کلینک ہے تو ہسپتال سے ریزائن کر دو۔ اس طرح تو تمہاری صحت متاثر ہو گی۔" شہاب امام بولے۔

"جی ابا... میں بھی یہی سوچ رہی تھی... ویسے بھی اس طرح میں کلینک کو ٹائم نہیں دے پاتی... ویسے ابا! میری پلاننگ کچھ اور ہے۔" اس نے پہلے ماں کی طرف دیکھا اور پھر باپ سے کہا۔

"میں اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانا چاہتی ہوں اور... اپنا اسپتال بنوانا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"ضرور بیٹا! جو تم چاہو۔" وہ فراخ دلی سے بولے۔

"اور میں جو اس کی شادی کروانے کا سوچے بیٹھی ہوں... وہ؟" بیگم شہاب نے مصنوعی ناراضی سے دونوں کو دیکھا۔

"ممی پلیز... یہ کیا ٹاپک لے آئی ہیں۔" اس نے فوراً" کہا۔

"یہ ہی تو اہم ٹاپک ہے۔" انہوں نے اپنی بات پر زور دیا۔

"اُفوہ... میں جا رہی ہوں ریسٹ کرنے۔" وہ جھلا کر اٹھی اور چلی گئی۔

"کیا ہے بیگم۔ بچی کا موڈ خراب کر دیا۔" شہاب امام نے کہا۔

"چپ رہیں آپ۔ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ لڑکی کے لیے شادی سے زیادہ اہم کام کوئی نہیں ہوتا۔" وہ ان پر پل پڑیں۔

"عورت ذات چاند پر چلی جائے یا محاذ پر نکل جائے' اسے گھر بسانا ہوتا ہے اور اگر یہ کام وقت پر ہو جائے تو بہتر ہے۔ آپ معاملے کی نزاکت کو کب سمجھیں گے۔ لڑکی پر ایا دھن ہو..." بیگم شہاب نے کہنا چاہا مگر شہاب امام نے ان کی بات میں اپنی گفتگو کا پیوند لگا دیا۔

"ہوتی ہے۔ بیٹیوں کا گھر بسانا افضل عبادت ہے وغیرہ وغیرہ... بیگم صاحبہ! ہمیں آپ کی تقریر کا لفظ لفظ حفظ ہے۔ آپ کی بات سر آنکھوں پر۔" ان کے انداز پر بیگم شہاب کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

یہ پھولوں سے بھرا راستہ تھا۔ میدان سبزے سے بھرا ہوا تھا۔ اس قدر گہرا سبز رنگ جیسے ہرا قالین بچھا ہو۔ مخملی گھاس پر سفید رنگ کے لباس میں موجود دو وجود ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ مرد کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے چڑھائی چڑھتے چڑھتے عورت کی طرف دیکھا۔ محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو ان دو چمک دار آنکھوں میں موجزن تھا۔

"ارمان...! میری سانس پھول رہی ہے..." اس نے کہا۔

"چلتی رہو میرے ساتھ۔" ارمان نے پلٹے بغیر کہا۔ اب وہ پہاڑی ایک سیدھی اور ناقابل تسخیر پہاڑ کی صورت نظر آ رہی تھی۔

"ارمان ۔۔۔ ! مجھ سے اور نہیں چڑھا جا رہا ۔۔۔ بس۔" وہ تھک کر رکنے لگی۔ مگر ارمان نے نہ تو اس کا ہاتھ چھوڑا اور نہ ہی اسے سانس لینے کی مہلت دی۔

"تم سن رہے ہو؟ میں اور نہیں چل سکتی۔ میں گر جاؤں گی ارمان۔ نیچے کھائی ہے۔"

وہ کچھ پریشان ہو گئی اور اسی پل منظر بدلا اور آناً فاناً "جنت نظیر منظر" جہنم کا منظر پیش کرنے لگا۔ چاروں سمت خطرناک آگ اگلتی کھائیاں تھیں۔ ہر طرف پتھریلی چٹانیں تھیں، جن کی نوکوں پر خونخوار گدھ بیٹھے اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔

اس نے چاہا کہ ارمان کو پکارے ۔۔۔ کسی کو مدد کے لیے پکارے مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی اور اسی پل اسے لگا کہ جیسے اس کا پورا وجود زلزلوں کی لپیٹ میں آگیا ہے۔

"انابی ۔۔۔" روشنی کے تقریباً "جھنجھوڑنے پر وہ یک دم خواب کی دنیا سے باہر آئیں۔ روشنی ان پر جھکی ہوئی پکار رہی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"انابی! جاگ جائیں۔ کچھ کھالیں۔" وہ کہہ رہی تھی اور رفتہ رفتہ انابی شعور کے جہاں میں آگئیں۔ (تو وہ خواب تھا) انہوں نے سوچا ۔۔۔ پھر گہری سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"آپ کھانا کھا کر دوا لیں اور فریش ہو جائیں۔ مجھے آپ کی بینڈیج بدلنی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ ٹرالی بیڈ کے قریب رکھ کر اس نے مرغی کی یخنی پیالے میں نکالی اور اس میں ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے ڈال دیے۔

"میں منہ ہاتھ دھونا چاہتی ہوں۔" انہوں نے کہا۔

انہیں چکر آرہے تھے۔ روشنی نے انہیں سہارے سے غسل خانے تک پہنچایا۔

روشنی نے ان کو اپنے ہاتھ سے یخنی اور ڈبل روٹی کھلائی۔ اس دوران وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر ٹکی ہیں۔ وہ جیسے اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

"لگتا ہے میری صورت آپ کے کسی رشتہ دار سے ملتی ہے۔" اس نے بالآخر پوچھ لیا۔

"رشتہ تو تم نے بنا ہی لیا ہے میری بچی۔ اتنی پیاری ہو کہ جی کرتا ہے بس دیکھتی رہوں۔ ماشاء اللہ ۔۔۔ اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے اور نصیب اچھے کرے۔" انہوں نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر دعائیں دیں۔

"میری آج نائٹ ڈیوٹی ہے۔ ممی آپ کا خیال رکھیں گی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیں۔ کوئی نہ کوئی آجائے گا۔" اس نے بیڈ کے قریب ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" انہوں نے دعا دی۔ وہ چلی گئی اور وہ اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ہسپتال میں ایمرجنسی تھی ۔۔۔ وہ اپنے سینئرز کے ساتھ آپریشن تھیٹر سے پانچ گھنٹوں کے انتہائی پیچیدہ آپریشن کے بعد باہر آئی تھی۔ اس وقت وہ اسٹاف ڈاکٹرز کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ یہ چار ڈاکٹرز تھے جنہیں آج نائٹ ڈیوٹی کرنی تھی۔ ان ہی میں وہ بھی شامل تھی۔ ان میں سے دو ڈاکٹر تو آرام کرنے کی غرض سے اٹھ کر ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں وہ اور ڈاکٹر زیدی موجود تھے۔

"بال بال بچا ہے یہ لڑکا۔ اگر آدھا گھنٹہ مزید دیر ہو جاتی تو اپینڈکس اندر ہی پھٹ جاتا۔ ڈاکٹر روشا نے! آپ نے اچھا جج کیا تھا۔ ایکسرے رپورٹ نے وہی ظاہر کیا جو آپ نے بڑے اعتماد سے تشخیص کیا تھا۔ ویلڈن۔" انہوں نے اسے سراہا تھا۔

"تھینکس ۔۔۔ سر!" وہ مسکرائی۔

"ایک بات آپ کو بتانی ہے ۔۔۔ میں نے ابا سے اور ممی سے اسپیشلائزیشن کے بارے میں ڈسکشن کی

تھی۔ وہ دونوں ہر طرح سے فیور کرنے کے لیے تیار ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ویری گڈ.....؟"

"سر! ایک بات پوچھوں۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"یس۔"

"آپ کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہیں۔" اس نے پوچھا۔ ڈاکٹر زیدی نے اپنی چمک دار آنکھوں سے اس کا معصوم چہرہ دیکھا۔ "آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے۔"

وہ مبہم سا مسکرائے تو وہ گڑبڑائی۔

"نہیں سر..... بس مجھے لگا کہ آپ ذہنی طور پر کہیں اور ہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"کچھ خاص نہیں..... پرسنل پرابلمز ہیں۔" انہوں نے ٹالا۔ ان کے انداز کو دیکھ کر اس کی مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"کافی اور بناؤں؟" اس نے پوچھا "تھینکس میں اپنے روم میں ہوں۔ کوئی بات ہو تو بتادیجیے گا۔"

وہ اٹھ کر چلے گئے۔ روشنی نے ان کے اونچے لمبے قد والے مضبوط سراپے کو دیکھا' جب تک وہ اسے دکھائی دیتے رہے تب تک وہ بغیر پلکیں جھپکے انہیں دیکھتی رہی۔ اس ہسپتال سے رشتہ نہ توڑنے کی ایک بہت بڑی وجہ ڈاکٹر زیدی بھی تھے۔

اسے یاد تھا اس ہسپتال میں اپنا پہلا دن جب وہ اپنے ساتھی اسٹوڈنٹس کے ساتھ یہاں ہاؤس جاب کرنے آئی تھی۔

ڈاکٹر زیدی بچوں کے اسپیشلسٹ تھے۔ بچوں اور مریضوں سے بے حد شفقت و اپنائیت سے پیش آنے والے ڈاکٹر زیدی اپنے عملے اور اپنے اصولوں میں بہت سخت تھے۔ وہ معمولی سی غلطی برداشت کرنے کے بھی عادی نہ تھے۔ روشانے سے ان کی پہلی ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی اور اس ملاقات کے بعد روشانے بہت پچھتائی تھی۔

روشانے کی کلاس فیلو اور سہیلی فرح کی منگنی تھی۔ باقی گروپ کے ساتھ وہ بھی ہنستی مسکراتی چہکتی ہوئی پھولوں کے چھوٹے چھوٹے تھال سجا رہی تھی۔ دفعتاً اس کی سہیلی (جو کہ فرح کی کزن بھی تھی) نے اس سے کہا "روشنی! نیچے فریج میں فرح کے اور ہمارے گجرے رکھے ہیں۔ وہ باسکٹ لے آؤ پلیز۔"

"اوکے۔" وہ تھال میں پتیوں سے تارے بنا رہی تھی۔ اس کا کام تقریباً نمٹ ہی چکا تھا۔ اپنی فطری لاپروائی اور الہڑپن کے ساتھ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی' اسی پل ہما نے پیچھے سے پکارا تھا۔

"اور وہ کون مہندی بھی لے آنا۔" روشنی نے بے دھیانی میں پلٹ کر دیکھا۔

"اوکے۔" اور اسی پل اس کا خوب صورت کام دار لہنگا اس کی ہائی ہیل میں پھنس گیا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کی چیخ میں ہما کی چیخ بھی شامل تھی جو کہ سمجھ رہی تھی کہ روشنی کی ہڈی پسلی یقیناً ٹوٹ چکی ہو گی۔ ادھر روشنی نے اپنا توازن بے ترتیب ہوتے دیکھا تو دل ہی دل میں خود پر فاتحہ پڑھ لی۔ یک دم دو ہاتھوں نے اسے سنبھالا تھا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں کے ستاروں سے وہ بجلی کوندی کہ وہ اس روشنی کے سحر سے پھر کبھی نکل نہ سکی۔ سرخ و سپید رنگت پر سیاہ مونچھیں' کشادہ پیشانی پر سیاہ چمک دار بالوں کی لہریں۔ ایک ایک نقش گویا تراشا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنا حسین مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" سرخی مائل بھرے بھرے لبوں میں جنبش ہوئی۔

"ہیلو..... میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔" اس کے ہونق چہرے کو گھورتے ہوئے اس بار قدرے سختی سے پوچھا گیا۔

"ج..... جی..... میں بچ گئی۔" اس نے عجیب احمقوں کے انداز میں جواب دیا۔

"سیڑھیاں اترتے وقت اپنی آنکھیں کھول کر رکھا کریں تاکہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ سکیں۔" اسے سہارے سے سیدھا کھڑا کرتے ہوئے گویا نصیحت کی گئی۔

"جی۔" اس نے سعادت مند بچوں کی طرح کہا۔
"کیا اب میرا بازو چھوڑیں گی پلیز؟" نہایت سنجیدگی سے اس نے روشنی کی توجہ دوسری طرف مبذول کرائی۔
"جی... اوہ..." اسے خیال آیا کہ وہ ابھی تک اس کا بازو تقریباً "دبوچے" ہوئے کھڑی ہے۔ اس نے گھبرا کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ روشنی کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ روشنی چند لمحوں کے لیے ہر شے بھلا بیٹھی تھی۔ اس ساحر کی پشت پر نظریں جمائے جانے کس جہاں میں گم ہوگئی تھی۔
"تم ٹھیک ہو؟ چوٹ تو نہیں لگی۔" ہما اس کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"آں ہاں... میں ٹھیک ہوں۔" وہ چونکی۔
"زیدی بھائی نے بچالیا تمہیں ورنہ ٹوٹی پھوٹی پڑی ہوتیں۔" ہما نے اس کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
"زیدی... تم جانتی ہو انہیں؟" اس نے پوچھا۔
"اکا کے فرینڈ ہیں۔ دونوں نے اکٹھے میڈیکل کیا تھا۔ زیدی بھائی لندن سے اسپیشلائزیشن کرکے آئے ہیں۔ اب انہوں نے اسپتال جوائن کیا ہے۔ پتا ہے... ہمیں ہاؤس جاب کے لیے ان ہی کے اسپتال بھیجا جارہا ہے۔" ہما کافی "باخبر" تھی۔
"اچھا۔" اس نے پرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔
"دعا کرو کہ ہماری ڈیوٹی ان کے ساتھ نہ لگے۔" اس نے فریج کھولتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟ اتنے ہینڈسم اور ڈیشنگ لگتے ہیں۔" وہ حیران ہوئی۔
"صرف "لگتے" ہیں اور صرف بچوں اور مریضوں کے لیے "خوب صورت" ہیں بھی... جوان کا اسٹاف ہے نا اور ہم جیسے "بے چارے" جونیئرز... ان کے لیے آدم خور جلاد ہیں۔ پتا چل جائے گا جو اگر خدانخواستہ ان کے وارڈ میں ڈیوٹی ہوئی۔"
"کیوں ڈرا رہی ہو یار..." وہ چڑ گئی۔
"سچ ہمیشہ "ڈراؤنا" ہی ہوتا ہے میری جان۔" ہما نے اسے پھولوں کی ٹوکری تھمائی اور بہ خود مہندی کی پلیٹ اٹھا کر واپس پلٹی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہما نے روشانے کو ڈاکٹر زیدی کے "ظلم" کے ایسے ایسے قصے سنائے کہ اس نے فوراً" ارادہ کرلیا کہ وہ ان کے ساتھ بالکل کام نہیں کرے گی لیکن اس کا نام ڈاکٹر زیدی کے ہی وارڈ میں نکلا۔
"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" ہما بڑے دردناک انداز میں ادھر ادھر سر ہلا رہی تھی اس کی صورت ایسی ہورہی تھی جیسے اب روئی کہ تب روئی۔
سفید اوور آل سمیت' اسٹیتھسکوپ گلے میں ٹانگے نہایت پروفیشنل انداز میں ڈاکٹر زیدی باری باری مریضوں کے بیڈ کے پاس جاکر ان کا معائنہ کررہے تھے اور ساتھ ساتھ اپنی ٹیم کو بھی گائیڈ کررہے تھے۔ درمیان میں ان سے اچانک ہی کوئی سوال کرلیتے۔ وہ ان سے ذرا اور دور چھپی چھپی سی پیچھے کی طرف تھی۔ اس سے مل کر زیدی نے خاصی حیرت سے پوچھا تھا۔
"آپ ڈاکٹر ہیں؟" اور ان کے انداز پر وہ پانی پانی ہوگئی تھی۔ وہ ان کی کمپنی میں بے حد محتاط رہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے کوئی بے وقوفی یا کوئی غلطی ہو اور پہلی ملاقات کی طرح ڈاکٹر زیدی پر غلط امپریشن پڑے۔ اس کی گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ کو ڈاکٹر زیدی نے محسوس کرلیا تھا' مگر وہ اس سے کھل کر کچھ نہ بولے۔ انہوں نے اسے نظرانداز کرنا شروع کردیا۔ وہ چاہتے تھے کہ روشنی بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ خود ہی آگے بڑھے اور اسے جو پوچھنا ہو خود پوچھے۔ ڈاکٹر زیدی کی شخصیت کا تاثر اس کے دل ودماغ پر گہرا ہوتا چلا جارہا تھا۔ اسے ان کے اس طرح خود کو نظرانداز کرنے پر سخت غصہ آتا تھا۔
اس رات اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی' مگر اسے سخت بخار نے آگھیرا تھا۔ اس نے اپنی ڈیوٹی ڈاکٹر فاروق کے ذمے لگائی اور اسے نوٹس بورڈ پر نام لگانے کا کہہ کر خود گھر آگئی۔ ڈاکٹر فاروق اپنے مریضوں کی مصروفیت میں نوٹس بورڈ پر موجود روشانے کے نام کو اپنے نام سے تبدیل کرنا بھول گیا۔ اسی دوران اس کے گھر سے فون

آگیا کہ اس کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ فوراً" گھر بھاگا۔

روشنی کی ڈیوٹی جس وارڈ میں تھی، وہاں صرف ایک نرس تھی اور کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر زیدی اس وقت اتفاق سے اپنے کمرے میں موجود تھے' وہ کسی کیس کی فائل کو اسٹڈی کررہے تھے جب نرس نے انہیں اطلاع دی کہ وارڈ میں کوئی ڈیوٹی ڈاکٹر نہیں ہے اور جس بچے کے جگر کا علاج ہورہا تھا' اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔

"آج ڈیوٹی کس کی تھی؟" اپنا اسٹیتھسکوپ اٹھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

"ڈاکٹر روشانے کی۔" نرس نے بتایا۔

"تو انہوں نے اس طرح انفارم کیے بغیر یہ حرکت کیسے کی؟ فون کرکے ابھی بلایئے ان کو۔" وہ خاصے بگڑے ہوئے لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

اس بچے کے مکمل چیک اپ کے بعد انہوں نے ایمرجنسی آپریشن کی تیاری کا حکم دے دیا۔ ایک نرس کو انہوں نے بچے کے ماں باپ کو اسپتال بلانے کا کہہ کر خود بچے کی رپورٹس دیکھنے لگے۔ روشانے کو اسپتال پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگے تھے۔ بخار میں پتی ہوئی وہ جب ڈاکٹر زیدی کے حکم پر تیار ہوکر آپریشن تھیٹر پہنچی تو وہاں ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر متین پہلے سے موجود تھے۔

"آپ اپنی ڈیوٹی سے انفارم کیے بغیر کیوں گئیں' اس بارے میں بعد میں بات ہوگی۔" اپنی سیاہ آنکھوں سے شرارے برساتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں اس کے قریب کھڑے اس سے مخاطب تھے۔

"جی.... مم.... مگر...." وہ حیرانی سے بولی۔

"بعد میں بات ہوگی۔" انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا اسٹریچر کے قریب آگئی۔

آپریشن کامیاب ہوا تھا۔ بچہ مکمل طور پر خطرے سے باہر تھا۔ وہ چکراتے سر کے ساتھ کمرے میں صوفے پر بے حال سی گری ہوئی تھی جب ڈاکٹر زیدی انتہائی غضب ناک انداز میں اندر داخل ہوئے۔

"میں آپ کو جتنا لاپروا اور غیر ذمہ دار سمجھتا تھا' آپ اس سے زیادہ لاپروا' غیر ذمہ دار اور بے حس ہیں۔" ان کی غضب ناک' مگر دھیمی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور انہیں دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

"جی.... ڈاکٹر زیدی! مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیں۔" اس نے کہنا چاہا۔

"کیا کہیں گی آپ اور کیا صفائی پیش کرسکتی ہیں آپ؟ آپ کو میڈیکل جیسی رسپانسبل اور پچی فیلڈ قطعی سوٹ نہیں کرتی۔ آپ کیا سوچ کر اس پروفیشن میں آئی ہیں؟ ڈاکٹر کا مطلب جانتی ہیں؟ ذمہ داریاں جانتی ہیں؟ جو حلف آپ سے اٹھوایا گیا تھا' اس کی اہمیت کا اندازہ بھی ہے آپ کو؟ اس طرح بغیر انفارم کیے آپ گھر جاکر مزے کررہی ہیں؟ اگر اس بچے کو کچھ ہوجاتا تو....؟ شکر ہے اللہ کا کہ میں موجود تھا۔ اگر میں آپریشن کرنے میں صرف دس منٹ اور دیر کردیتا تو وہ بچہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ آپ آخر کس قسم کی انسان ہیں؟" وہ اسے بے بھاؤ کی سنا رہے تھے۔

"جسٹ اے منٹ ڈاکٹر زیدی! آپ بغیر میری بات سنے مجھے اتنا سخت سست نہیں سنا سکتے' مجھ سے آج تک کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی۔" اس کا صبر جواب دے گیا تھا۔ اس نے قدرے اونچی آواز میں انہیں ٹوکا۔

"مجھے ایک سو تین بخار تھا اور میں ڈاکٹر فاروق کو انفارم کرکے گھر گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ میری جگہ ڈیوٹی کرلیں گے اور نوٹس بورڈ پر بھی لگادیں گے۔ میری بات پر یقین نہیں تو بلا کر پوچھ لیں غلطیاں ہر کسی سے ہوجاتی ہیں۔ ہم ڈاکٹرز بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ کیا آپ سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی؟" وہ رونے لگی۔

ڈاکٹر زیدی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ملیح چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہورہا تھا۔ بھیگی آنکھیں' ہلکے گھنگریالے بالوں کی لٹیں پونی سے نکل کر اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ کسی گڑیا کی طرح نظر آرہی تھی۔

"ڈاکٹر فاروقی کی والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ غالباً" جلدی میں اور پریشانی میں وہ بتانا بھول گئے تھے اور ڈاکٹر روشانے شہاب امام! عام انسان کی غلطی اور ایک ڈاکٹر کی غلطی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اگر غلطی کرے تو اس کے گلے "دقتل" پڑ جاتا ہے۔ مائنڈ اٹ۔" انہوں نے اس بار قدرے دھیمے انداز میں کہا۔ غالباً" اس کے آنسوؤں کا اثر تھا۔

"آپ کس کے ساتھ آئی ہیں؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"بابا ڈراپ کر کے گئے ہیں۔" اس نے اپنے آنسوؤں کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بتایا۔

"چلیے میرے ساتھ آیئے۔" وہ کہہ کر رکے نہیں اور وہ خود کو کوستی ہوئی ان کے پیچھے تقریباً" بھاگی۔ (چلتے ہیں یا "اڑتے" ہیں) ان کی "تیز رفتاری" پر وہ ہانپ گئی تھی وہ اپنے کمرے میں آگئے تھے۔ اس نے ان ہی تقلید کی۔

"یہ کھالیں پھر میں آپ کو ڈراپ کر آتا ہوں۔" انہوں نے ایک ٹیبلٹ اور پانی کا گلاس اسے تھمادیا۔

اس نے حیران سی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"آدم خور حیوان" میں صرف ان کے لیے ہوں جو اپنے فرائض سے جانتے بوجھتے کوتاہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر روشانے! میں نے ڈاکٹر کی "غلطی" کا نتیجہ دیکھا اور بھگتا ہوا ہے۔ میرے جان سے پیارے دادا ایک ڈاکٹر کی غلطی کی وجہ سے ہی مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ اسی لیے مجھ سے کسی ڈاکٹر کی غلطی برداشت نہیں ہوتی۔ کسی پیارے کو کھودینے کا درد محسوس کیا ہے اسی لیے دوسروں کے پیاروں کے درد کا احساس ہے۔" وہ گمبھیر انداز میں کہہ رہے تھے۔ روشانے نے ان کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔

"آئم ساری۔ نیکسٹ ٹائم آئی ول بی موسٹ کیئرفل اباؤٹ اٹ تھنگ۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"چلیے میں گھر چھوڑ آؤں آپ کو۔" انہوں نے کہا۔

"تھینکس سر۔ میں صبح چلی جاؤں گی۔" اس نے ان سے آنکھیں چرائیں۔ (اپنے بارے میں ان کے خیالات سے آگاہ ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی پرسنل کوئی چیز نہیں لی) وہ سوچ کر شرمندہ ہورہی تھی۔

"آپ اکلوتی بیٹی ہیں اپنے پیرنٹس کی؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔ جی ہاں سر۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟" وہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپ کو دیکھ کر اندازہ لگایا ہے۔ چلیے۔" وہ مبہم سا مسکرائے اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گئے۔

"وہ کیسے؟" وہ بھی پیچھے بھاگی۔

"آپ کی ضد' آپ کی حرکات۔ وغیرہ وغیرہ۔" انہوں نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔" وہ سرخ پڑ گئی۔

"یہ کام آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔" وہ برجستہ بولے تو وہ خوش گوار سی مسکان لیے حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتی ان کے پیچھے چل پڑی۔

اس رات انہوں نے اسپتال سے اس کے گھر تک کا فاصلہ طے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے اور اس کے درمیان موجود کئی ایک دیواریں گرائی تھیں۔ روشانے کسی مقناطیسی کشش کے تحت ان کی اور کھنچی چلی جارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

پہلے وہ ڈاکٹر زیدی کو پسند کرتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی عزت کرنے لگی تھی اور جانے کس پل کس لمحے کس گھڑی وہ ان کو اپنی سب سے قیمتی چیز۔ اپنا "دل" سونپ بیٹھی' وہ خود بھی بے خبر تھی۔ ڈاکٹر زیدی اس کے لیے ایک استاد کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ ہیرا تھی۔۔۔ جسے ڈاکٹر زیدی کے ماہر ہاتھ تراش کر "کوہ نور" بنا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

تمہیں معلوم بھی ہے میں تنہا جی نہیں سکتی
میری عادت بدلنے تک میرے ساتھ رہ جاؤ

"میں تمہیں بہت مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی پر انحصار نہ کرو۔ کسی پر تکیہ نہ کرو۔ چاہے میں ہی کیوں نہ ہوں۔" وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"مگر میں ہمیشہ تمہاری محتاج بن کر رہنا چاہتی ہوں۔ تم پر انحصار کرتے رہنا چاہتی ہوں۔ تم میری محبت ہو' میری عادت ہو۔ مجھے بدلنے کے لیے مت کہو۔" وہ اس کے شانے سے بچوں کی طرح چمٹ گئی۔

"سوچتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو..." اس نے کہنا چاہا' مگر اس سے پہلے ہی لرز کر اس نے اس کے لبوں پر اپنا دودھیا ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا نہ کرے۔ تم سے پہلے میری سانسیں نکلیں۔" وہ رو پڑی۔

ارمان نے رخ مریم کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

میری آنکھ میں ایک آنسو جو نہیں دیکھ پاتا تھا
آج وہی میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کا سبب ہے
دو موتی گرے اور سفید آنچل کے شفاف دھاگوں میں جذب ہو گئے۔

"جانا ہی تھا تو مجھ بدنصیب کو بھی لے جاتے۔ اس بے رحم دنیا کی غلیظ سچائیوں کے سامنے مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیا۔" بوڑھی آنکھوں میں اس کی یادیں ابھی تک تازہ تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ریکا! تم شام کو فری ہو؟" نفیسہ بیگم نے ناشتے کی میز پر بہو سے پوچھا۔

"جی... کیوں خیریت؟"

"تیمور کے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ممی! میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔ جب تک انابی نہیں مل جاتیں کم از کم تب تک تو ہرگز نہیں۔" تیمور نے جوس کا گلاس لبوں سے لگایا اور قطعی انداز میں بولے۔

"کیا بچوں کی سی ضد باندھی ہوئی ہے تم نے۔ دادی نہ ملی تو کیا شادی نہیں کرو گے؟ پینتیس کراس کر چکے ہو۔ کیا بال سفید کر کے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟" نفیسہ بیگم تپ کر بولیں۔

"ممی..." تیمور نے کہنا چاہا۔

"تیمور! تم کم از کم لڑکی تو دیکھ لو۔ پسند نہ آئے تو منع کر دینا اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو بتاؤ۔" باسط نے نپے تلے انداز میں بات کو سمیٹتے ہوئے انہیں سمجھایا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے باسط۔ تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ۔" عمران سلیم نے پوچھا۔ چھم سے ایک چہرہ ان کی کھلی آنکھوں کے فریم میں تصویر بن کر اترا۔ انہوں نے فوراً" ہی نہ سر جھٹکا۔

"میری کوئی پسند نہیں۔" وہ اٹھ کر چلے گئے۔

"شکر ہے۔ اس نے ہامی تو بھری۔ بس میں تو آج ہی جاؤں گی لڑکی والوں سے ملنے۔" نفیسہ بیگم نے گہری سانس لی۔

"مگر ممی! کون ہیں وہ لوگ؟ کچھ تفصیل تو بتایئے۔" باسط نے پوچھا۔

"ریٹائرڈ کرنل شہاب امام کو جانتے ہو؟"

"جی... وہ منزہ بیگم کے شوہر۔" باسط نے فوراً" کہا۔

"ہوں... ان کی اکلوتی بیٹی ہے روشانے۔ کروڑوں کی جائیداد کی تنہا وارث۔ ڈاکٹر ہے۔ اس کی ماں بتا رہی تھی کہ اپنا اسپتال بنانے کا منصوبہ بنا رہی ہے لڑکی۔ میں مل چکی ہوں روشانے سے۔ سیدھی سادی سی ہے۔ تیمور کے مزاج میں ڈھل جائے گی۔ بس عمر میں کافی چھوٹی ہے تیمور سے۔" وہ اپنی چائے ختم کرنے کے دوران تیزی سے بتا رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے... تم بات بڑھاؤ۔ آگے اللہ مالک ہے۔" عمران سلیم نے کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"انابی! شام کو روشنی کے رشتے کے سلسلے میں کچھ

لوگ آرہے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ رہیے گا۔"
مسز شہاب نے ایک پیکٹ انابی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا! اللہ مبارک کرے۔" ان کا دھیان پیکٹ پر نہیں تھا۔

"یہ آپ کے نئے کپڑے بن کر آگئے ہیں۔ میں نے ارجنٹ سلوائے تھے۔ آپ یہ پہن لیں۔"

"بیٹا! کیوں مجھ غریب کو اتنے احسانات کے بوجھ تلے داب رہی ہو۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"کاش میں نے تمہیں اپنے پیٹ سے جنا ہوتا۔" انہیں نجانے کیا کچھ یاد آگیا۔ ان کو اداس دیکھ کر وسیم نے موضوع بدلا اور شام کا مینو ان سے ڈسکس کرنے لگیں۔ اور بظاہر جسمانی طور پر وہاں موجود انابی ایک بار پھر ماضی کی تلخیوں میں کھو گئی تھیں۔

باسط کی پسند اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے نفیسہ بیگم نے ریکا کے گھر والوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا وہ اور عمران گھر کے باقی افراد سمیت کل رات کو ہونے والی اس چھوٹی سی تقریب کا مینو ڈسکس کر رہے تھے اور ان سب کو چائے سرو کرتی ہوئی انابی سے کسی نے مشورہ لینے کی یا کچھ پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی تھی۔

"اگر تم لوگ بریانی کے ساتھ شاہی قورمہ اور لکھنؤ بستی کباب رکھو تو بہت اچھا رہے گا۔" انہوں نے بن مانگے مشورہ دے تو دیا' اس کا نتیجہ اچھا ثابت نہیں ہوا۔

"آپ سے کس نے مشورہ مانگا ہے؟ اس قدر اولڈ فیشن ڈشز کون رکھتا ہے اب دعوتوں میں؟" نفیسہ بیگم نے نہایت بدتمیزی سے کہا تھا۔ انابی کا چہرہ مارے خفت کے پھیکا پڑ گیا۔ کچھ فاصلے پر کتاب میں گم تیمور نے غصے سے اور تاسف سے ماں کی طرف دیکھا۔

"فار یور کائنڈ انفارمیشن ممی! یہ ٹریڈیشنل ڈشز ہیں اور ان کی ہمیشہ ہی بہت زیادہ ڈیمانڈ رہی ہے۔"

"دادی کا چمچہ۔ جب تک بول نہ لے' اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" وہ غصے سے بولیں۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ اس لیے آپ کو برا لگ گیا۔"

"چھوڑیں انابی! آپ مجھے یہ ساری ڈشز کھلائیں۔ قسم سے... وہاں لندن میں ترس گیا تھا میں آپ کے ہاتھ کا پکوان کھانے کے لیے۔" تیمور اٹھے اور دادی کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے گئے۔

"ارے رے... چائے تو سرو کرنے دو۔" وہ کہتی رہ گئیں۔

"کھو عرشی! اور چائے سرو کرو سب کو' یہ تمہارا کام ہے۔ انابی کا نہیں۔ آئندہ میں انابی کو کوئی کام کرتے ہوئے نہ دیکھوں۔" انہوں نے رعب دار انداز میں بہن سے کہا۔ وہ تلملائی' مگر چونکہ بھائی کا رعب شروع سے سب گھر والوں پر تھا لہٰذا بادل نخواستہ اٹھی اور "حکم" بجالائی۔

تیمور کی شخصیت کا رعب ہی اتنا تھا کہ کوئی بھی ان سے بدلحاظی یا بدتمیزی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ وہ نہ تو غصے والے تھے نہ ہی تیز آواز کا "استعمال" کرتے تھے۔ انابی کے بقول ان کے نانا کی شخصیت کا سارا حسن و رعب و دبدبہ ان میں منتقل ہوا تھا۔ اس گھر میں ان کا پوتا ہی تو تھا۔ ان کے لیے لڑتا تھا۔ ان کے لیے خفا ہوتا تھا۔ ان کا خیال رکھتا تھا۔ جان دیتا تھا ان پر ورنہ ارمان کی موت کے بعد جب سے انہوں نے ساری جائیداد وغیرہ ارمان کے نام کی تھی انہوں نے اس محل کے مکینوں کے اصل چہرے دیکھ لیے تھے۔ وہ تو تیمور کی وجہ سے سب خاموش تھے۔ ورنہ انابی کا نشان تک اس چار دیواری میں نظر نہ آتا۔

"آپ ان سب کی بدتمیزیاں کیوں سہتی ہیں؟ کچھ کہتی کیوں نہیں؟ آپ بڑی ہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ کا اور دادا جان کا... جس میں ان سب کو پناہ ملی ہوئی ہے۔ آپ یہاں "کسی کے" احسان کی وجہ سے نہیں رہ رہی ہیں بلکہ یہ سب "آپ کے" احسان کی وجہ سے یہاں رہ رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں۔" وہ ناراض ہو رہے تھے۔

"احسان ہی تو ہے تیمور... ورنہ اب یہ چھت میری کہاں۔" وہ آزردگی سے بولیں اور پلکوں سے چھلکتے

آنسو اندر رو ھکیلے۔

"آپ کا ہی ہے سب کچھ۔ ڈیڈ نے دھوکے سے یہ مکان اپنے نام کروایا تھا اور ممی نے ڈیڈ پر پریشر ڈال کر اپنے نام کاغذات لکھوا لیے، مگر آپ زندہ ہیں الحمدللہ۔ آپ کا پورا پورا حق بنتا ہے ہر چیز پر۔ ہم سب پر۔ آپ کا کیا ڈیڈ پر یہ احسان کم ہے کہ سوتیلی ہونے کے باوجود آپ نے کبھی سوتیلے پن کا رشتہ درمیان میں نہ آنے دیا۔ اماں! جو آپ نے ان لوگوں کے لیے کیا ہے نا... کوئی سگا بھی نہیں کرتا۔ احسان فراموش ہیں یہ سب۔ کتنی بار کہا ہے آپ سے کہ چلیں میرے ساتھ.... میں دوسرا مکان خرید لیتا ہوں ہم دونوں وہاں رہیں گے مگر آپ ہیں کہ مانتی نہیں۔" وہ جیسے پھٹ پڑے۔

"میرے لال! اس گھر کی ایک ایک اینٹ میں تمہارے دادا جان کی یادیں جڑیں ہیں' ایک ایک گوشے میں سے ان کی خوشبو آتی ہے۔ میں نے یہاں اپنی پوری جوانی "ان" کے ہمراہ گزاری۔۔۔ ہر دور دیکھا... میں یہاں سے جیتے جی کیسے چلی جاؤں۔" اماں کی بات پر وہ خاموش ہو گئے۔ وہ ان کے احساسات و دل سے قریب تھے۔ محبت کے اظہار اور تحفظ ظاہر کرنے کو انہوں نے بس اپنے مضبوط بازو کے حصار میں اماں کا گڑیا سا وجود لے کر خود سے لگا لیا۔

ایک وہ تھے جو کہنے کو اپنے تھے' مگر غیروں سے بھی بدتر... ایک یہ ہیں... جن سے کوئی تعلق' نہ رشتہ بس ایک کڑی ہے... جسے عرف عام میں "انسانیت" کہتے ہیں۔ انہوں نے سوچتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گم صم بیٹھی تھی۔ ممی اور ابا کے لاکھ پوچھنے پر بھی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے تو بتا دے' اس کے لبوں سے ڈاکٹر زیدی کا نام نہ نکل سکا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ڈاکٹر زیدی اس کے لیے کیسے احساسات رکھتے ہیں۔ اس کی انا... اس کی نسوانیت... اس کی حیا اسے اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دل کی بات از خود محبوب تک پہنچائے۔ اپنی گلابی ہتھیلی کو پھیلائے لکیروں کے جال میں الجھی سوچ رہی تھی کہ اپنی محبت کی اس یک طرفہ کہانی کو کیا عنوان دے؟

"روشنی! چلو بیٹا! آجاؤ۔ وہ لوگ آگئے ہیں۔ تم اسلم کے ساتھ چائے لے آؤ۔ رفیقہ نے کباب' سینڈوچ' بروسٹ وغیرہ گھر پر ہی بنا لیے ہیں۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ تمہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آجائے۔ وہ مہمانوں کو کمپنی دے رہی ہے۔"

بیگم شہاب بے حد عجلت میں کمرے میں آئی تھیں۔ گرین کلر کے کرتے پاجامے اور سرخ پھول دار بڑے سے دوپٹے میں صرف ہلکی سی گلابی رنگ کی لپ اسٹک سے چہرے کو سجائے ہوئے بھی وہ بے حد دلکش و پرکشش لگ رہی تھی۔ ممی کے بلانے کے باوجود اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ نیچے جائے۔ نیچے تیمور کے علاوہ تقریباً" سب ہی گھر والے موجود تھے۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی کسی کو نہیں دیکھا۔ بس سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ ریکا اور نفیسہ بیگم اس سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھیں۔ وہ مختصر جواب دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر معذرت کرکے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

"آپ کی بیٹی ہمیں بہت پسند آئی ہے۔" عمران سلیم نے کہا۔

"اور مجھے تو شروع ہی سے پسند ہے...." نفیسہ بیگم نے ٹکڑا جوڑا۔

"اب آپ بتائیے کہ ہمارے غریب خانے پر کس دن تشریف لا رہے ہیں؟" عمران سلیم نے پوچھا۔

"جی... جب آپ لوگ بلائیں گے' ہم حاضر ہو جائیں گے" شہاب امام نے کہا۔

"بس تو پھر اتوار کو آپ سب لنچ ہمارے ساتھ کیجیے گا۔ روشانے بچی کو ساتھ لے کر آئے گا۔ تیمور بھی آپ لوگوں سے مل لے گا۔" نفیسہ بیگم نے کہا۔

فان کلر کی پلین ریشمی ساڑھی میں ملبوس' گلے میں سونے کی بھاری زنجیر' کانوں اور ہاتھوں میں میچنگ ٹاپس اور کڑے۔ دونوں ہاتھوں میں سونے کی دو دو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بھاری بھاری انگوٹھیاں پہنے وہ بے حد مہذب اور سلجھی ہوئی اور باوقار دکھائی دے رہی تھیں۔

"تیمور سے تو میں ایک بار مل چکی ہوں۔" بیگم شہاب نے شہاب امام کی طرف دیکھا۔

"آپ کو بتایا تھا نا... وہ مسٹر زاہد کی بیٹی کی انگیجمنٹ تھی... ماشاء اللہ بہت ہی اچھا بچہ ہے۔" انہیں تیمور کی پراثر شخصیت یاد آئی۔

"چلیے... تو پھر سن ڈے ڈن رہا۔" شہاب امام بولے۔

وہ اپنے کمرے میں موجود تھیں۔ افراد خانہ کی ہنسی اور باتوں کی آوازیں ان کی سماعتوں سے ٹکرا کر انہیں عجیب سے احساسات سے دوچار کر رہی تھیں۔ بیگم شہاب کی زبانی انہیں یہ تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ روشانے کے لیے رشتے لانے والے وہی ہیں جن کے دیے ہوئے زخموں کو روح سے لگائے وہ جی رہی تھیں اور جن کی بدولت وہ آج غیروں کے در پر پڑی تھیں۔ انہیں صرف اس بات کی خوشی اور اطمینان تھا کہ روشنی کے حصے میں تیمور آرہا تھا اور تیمور کے نصیب روشنی سے چمکنے والے تھے۔ وہ اس وقت بھی ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

"میرے تیمور کے لیے تم سے زیادہ بہتر لڑکی کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ تم تو میری ان دعاؤں کا حصہ ہو... جو میں تیمور کے لیے کرتی تھی۔" روشنی کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

"میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔ دیکھنا... تم بہت خوش رہو گی۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا کہے۔ عجیب سی طبیعت ہو رہی تھی۔ بے چینی کی وجہ بھی جانتی تھی اور علاج بھی، مگر ہمت نہیں کرپارہی تھی۔

"آپ کیوں نہیں آئیں باہر؟" اسے کوئی نہ کوئی بات تو کرنی تھی۔

"میرے سر میں درد تھا ورنہ ضرور آتی۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"انابی! آپ نے اپنے ماضی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔" اس کو نجانے کیوں خیال آیا۔

"آپ تو کسی رائل فیملی کی لگتی ہیں۔" ان کے نہایت موزوں اور تراشیدہ نقوش کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تم کیا کرو گی میری زندگی کے بارے میں جان کر۔ پرانے قصے چھوڑو... اب تو تم ماشاء اللہ خود نئی زندگی کی شروعات کرو گی۔ تم اپنے مستقبل کے رنگین سپنے بنو۔ نئی امنگوں سے نئی شروعات کرو۔" انہوں نے اس کی ذہنی رو بدلنی چاہی۔

"ٹالیں مت۔ آپ کی زبان اتنی شیریں ہے' اتنی مٹھاس والی ہے... بتائیں نا..." وہ ضد کرنے لگی۔ "کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟" اور اس کی ضد نے بالآخر انابی کے بند لبوں کو کھلوا دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی اس کے سامنے کھول دی۔

"میرا پورا نام نواب زادی رخ مریم ہے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"میرا تعلق ہندوستان کے شہر آگرہ سے ہے۔ میرے ددھیال اور ننھیال دونوں ہی نواب تھے۔ جدی پشتی نواب۔ انہیں یہ نوابی انگریزوں کی "نوازش" کی وجہ سے نہیں ملی تھی۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"آپ کا اصل آپ کے ہر ہر انداز سے جھلکتا ہے انابی۔" اس نے محبت سے کہا۔

"ہمارے ہاں آپس ہی میں رشتے کرکے نبھانے اور خاندان کو مضبوطی سے جوڑے رہنے کا رواج تھا۔ میرے نام کے ساتھ بھی میری پیدائش کے بعد میرے تایا زاد کا نام جڑ گیا تھا۔ وہ مجھ سے بیس سال بڑے تھے۔ جب میں بالغ ہوئی تو میرا نکاح کر دیا گیا۔ میرے شوہر کا نام عبداللہ تھا' وہ اس دور میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے لندن گئے تھے۔

عبداللہ کے آتے ہی میری رخصتی کر دی گئی اور میں رخصت ہو کر دلی آگئی۔ عبداللہ بہت اچھے انسان اور بہترین شوہر تھے۔ میرا اور ان کا ساتھ بہت کم رہا، مگر

وہ اپنی بہترین خصلت اور عادات کی وجہ سے مجھ میں ہمیشہ زندہ رہے۔ شادی کے تیسرے دن انہیں لندن واپس جانا تھا' ان کے ایک دوست نے انہیں مطلع کیا تھا کہ ان کا نتیجہ آگیا ہے اور وہ بہترین نمبروں سے پاس ہوئے تھے۔ انہیں ڈگری لینے خود جانا تھا۔ تین روز کی دلہن کو چھوڑتے ہوئے ان کا بھی دل نہ مانتا تھا' مگر مجبوری تھی۔ مجھے انتظار کی راہ دکھا کر خود ایسے گئے کہ پھر واپس لوٹ کر نہ آئے۔ واپس آئی تو ان کی خون میں لت پت لاش۔ جس وقت وہ مجھ سے مل کر نکلے تھے' راستے میں ہی ہندو کانگریسیوں کا جلوس مل گیا' بپھرے ہوئے ہندوؤں نے میرے سہاگ کو بے جان لاش میں بدل دیا تھا۔ میں نعش دیکھ کر جو گری تو ایک مہینہ تک ہوش میں نہ آسکی۔ ایک مہینے بعد دوا دارو اور دعاؤں کی وجہ سے میں نے آنکھیں تو کھول دیں' مگر سدھ بدھ لوٹ کر نہ آئی۔

تب ہی ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندو اور مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹتے تھے۔ میں بیوگی کی چادر اوڑھے ایک اور امانت کا بوجھ اٹھائے اپنے تایا کے گھر پر تھی۔ عبداللہ کی امانت میرے پیٹ میں پل رہی تھی۔ حالات قابو سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان ہی دنوں مسلمانوں کے لیے الگ ملک کے مطالبے نے زور پکڑ لیا۔ بس... وہ حال تھا کہ مت پوچھو...

وہ ہندو اور سکھ جو کہ ہمارے در پر آتے تو اپنے جوتے بھی باہر اتارتے تھے انہیں ہندو اور سکھوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے درندے بنتے دیکھا تھا۔" اناں کی آنکھوں سے اشک پانی کی طرح رواں تھے۔ اس نے انہیں پانی کا گلاس دیا اور خود اپنی بھیگی آنکھوں کو دوپٹے سے خشک کیا۔

"درندگی کا وہ عالم تھا کہ شیطان کو بھی پسینہ آگیا ہوگا۔ میں گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر بھاگی تھی اور بھاگتے بھاگتے گری تھی۔ گرتے ہی اپنا ہوش کھو بیٹھی تھی۔ جب ہوش آیا تو پوری دنیا ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں سمجھی کہ مجھے چکر آرہے ہیں' مگر جب حواس میں آئی تو پتا چلا کہ کسی گھوڑا یا بیل گاڑی میں لیٹی ہوں۔ میں گھبرا کر اٹھنے لگی تو سر سے اٹھنے والی ٹیسوں سے بے حال ہو کر پھر لیٹ گئی۔ سر پر بندھی ہوئی پٹی سے مجھے اندازہ ہوا کہ کسی نے میرے زخموں کے علاج کا بندوبست کیا ہے۔

"آپ آرام سے لیٹی رہیں۔ آپ کو خاصی چوٹیں آئی ہیں۔" کسی کی نرم آواز پر میں نے گھبرا کر دیکھا میرے قریب ہی ایک انجان مرد سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔ میں ڈر کر بری طرح چلانے لگی تو اس نے گھبرا کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ کے واسطے شور مت مچائیں۔ مجھ سے آپ کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ رات کے اس سناٹے میں اگر کسی نے آپ کی چیخ سن لی تو اس چھوٹے سے قافلے کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔" وہ ملتجی انداز سے بولا۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی کہ میں شور نہیں مچاؤں گی۔ وہ مطمئن سا ہو کر پرے ہو کر بیٹھ گیا۔

"میرا نام ارمان سلیم زیدی ہے۔ میں بنارس کا رہنے والا ہوں۔" اس نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔

"میرا نام رخ مریم ہے۔" میں نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"پانی پیجیے' مگر صرف چند گھونٹ۔ مجبوری ہے... راستہ لمبا ہے اور پانی کی مقدار قلیل۔" اس نے چھاگل میری جانب بڑھائی۔ میں نے بے تابی سے پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتارے۔

"میں بہت شرمندہ ہوں' مگر مجبوری ہے۔ آپ یہ کھالیں۔ پورے چار دن اور تین راتوں بعد ہوش میں آئی ہیں آپ۔" اس نے ایک تھیلے میں سے چند کھجوریں اور سوکھے ناریل کے چند ٹکڑے میری طرف بڑھا دیے۔ میں ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپ نہر کے کنارے بے ہوش ملی تھیں مجھے۔ میں پانی بھرنے نہر پر گیا تھا۔ ہمارا قافلہ ہمارے ہی جیسے بے سرو سامان لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد

کر سکوں۔" وہ ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔ مجھے پھر سے وہ ہولناک منظر یاد آگیا اور میں ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس نے اس بار مجھے نہ روکا۔ جب میں تھک کر خود ہی چپ ہوگئی تو اس نے کھانے کی چیزیں میری سمت بڑھادیں۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب بتادیا۔ اس نے بھی اپنے بارے میں مجھ سے کچھ نہ چھپایا۔

وہ ایک کاشتکار تھا اس کی اپنی زمین تھی۔ گھربار' مال مویشی تھے۔ ظالموں نے اس کے بھرے پرے گھرانے کو ان ہی کھیتوں میں کاٹ ڈالا تھا۔ تین چھوٹی چھوٹی بہنیں' دو جوان بھائی' ایک خالہ' ایک بیوہ پھپھی' ماں' باپ سب ہی کو بھالوں سے ماردیا گیا تھا۔ وہ چونکہ اپنی فصل بیچنے منڈی دوسرے شہر گیا تھا لہٰذا بچ گیا۔

قدرت نے اسے شاید میرے لیے زندہ رکھا تھا دشمنوں سے بچتے چھپتے کئی ماہ کے سفر کے بعد ہم لاہور پہنچے۔ نیا دیس' نئی جگہ لیکن کچھ بھی اجنبی نہ تھا۔ سب اپنا اپنا لگ رہا تھا۔ میں نے پاکستان کی سرزمین پر عبداللہ کی بیٹی کو جنم دیا تھا۔ جسے ارمان نے اپنا نام دیا تھا۔

لاہور میں ارمان کے چچا رہتے تھے۔ ہم دونوں سیدھے ان کے گھر چلے گئے تھے۔ ساری کہانی سننے کے بعد چچا عرفان نے ہمیں اپنے گھر اپنے دلوں میں جگہ دی اور میرا اور ارمان کا نکاح پڑھوا دیا۔ چچا عرفان کی بیوی مرچکی تھی۔ صرف ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام زہرہ تھا چچا نے اس کی شادی جن لوگوں میں کی تھی۔ وہ دھوکے باز لوگ تھے۔ شادی کے دوسرے سال زہرہ کے جہیز کا سارا سامان اور زیورات چھین کر اسے اس کے ایک سالہ بیٹے عمران کے ساتھ گھر سے نکال کر خود کہیں غائب ہوگئے تھے۔

زہرہ بہت نیک اور اچھی خاتون تھیں۔ مگر قدرت کو بھی شاید کچھ اور منظور تھا ننھے عمران کو میری گود میں ڈال کر چل بسیں۔ میں نے تیرہ ماہ کے عمران کی پرورش ماں کی طرح کی تھی۔ اس اثناء میں ارمان نے چچا عرفان کے معمولی سے کاروبار کو دن رات کی سخت محنت کے بعد اس قدر چمکادیا کہ چند ہی سالوں میں کاروبار کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ چچا عرفان ہم سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی وصیت تیار کر کے کچھ حصے کو چھوڑ کر باقی سارا کاروبار و جائیداد ارمان کے نام پر کردی تھی' کچھ حصہ انہوں نے عمران کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے ارمان کو سختی سے نصیحت کی تھی۔

"جو کچھ تمہارا ہے' اس میں عمران کو حصے دار نہ بنانا۔ یہ اس سانپ کی اولاد ہے' جس نے میری بیٹی کو نگل لیا۔ سانپ سے ہمیشہ سنپولا ہی جنم لیتا ہے۔ جو حصہ اس کے لیے چھوڑا ہے' وہی اس کے لیے کافی ہے۔ اسے اس پر محنت کرنے دینا۔ جو تمہیں ملا ہے' وہ تمہاری محبت اور تمہاری بیوی اور بچی کے نصیبوں کا ہے۔ نصیبوں میں بٹوارا کبھی مت کرنا۔"

چچا عرفان تو اس نصیحت کو کرنے کے بعد گزر گئے مگر ہم دونوں اس نصیحت کو بھول کر عمران کو اپنی اولاد کی طرح پالنے لگے۔ عمران یہ ساری باتیں جانتا تھا۔ مگر اس نے ہمیشہ ہماری عزت ماں' باپ سمجھ کر کی تھی۔ ارمان نے اسے بہت اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ میں نے اسے اپنا دودھ پلایا تھا۔ لوگوں میں یہی بات مشہور ہوگئی کہ وہ ارمان اور زہرہ کا بیٹا ہے۔ ہم نے بھی کبھی اس کی تردید نہ کی۔ وہ ہنسیں۔

"حوریہ کو وہ اپنی سگی بہن سمجھتا تھا۔ دونوں میں بہت پیار تھا۔ کبھی اجنبیت کی دیوار ان کے درمیان کھڑی نہ ہوسکی۔ ارمان نے چچا عرفان کا گھر کرائے پر دے کر "مریم" پیلس خرید لیا تھا۔"

تب ہی بیگم شہاب کی آمد نے گفتگو کے سلسلے کو منقطع کردیا۔

"میں یہ بتانے آئی تھی اناںی کہ مہمان چلے گئے ہیں اور کل اتوار کو ہمیں تیمور کے گھر جانا ہے۔ آپ بھی چلیے گا۔ لڑکا دیکھ لیجیے گا۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"تیمور" وہ چونکی..... چھن سے اندر جیسے کچھ روشن سا ہوگیا..... ہاں..... ہوسکتا ہے..... مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کوئی اور ہو..... میں کتنی پاگل ہوں..... ممی جب اس کے بارے میں بتارہی تھیں تب میں نے کان بند

کر کے کہا تھا کہ مجھے کچھ نہیں سننا۔"

"روشنی بی بی! آپ کا فون ہے۔" ملازم نے اطلاع دی تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری والدہ محترمہ تو ڈاکٹر بہو کے چکر میں خبطی ہو رہی ہیں۔ اتنا ڈھیر سارا مینو لنچ کے لیے آرڈر کر دیا۔" چہرے پر کلینزنگ ملک لگاتے ہوئے ریکا کلس رہی تھی۔

"کیوں اپنا خون جلا رہی ہو۔ کون سا تمہاری جیب سے جا رہا ہے سب؟" باسط نے لاپروائی سے موبائل کی اسکرین دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ بھئی اس گھر کے باورچی خانے سے تو جا رہا ہے ناں؟ اور بجٹ میں میرا اور تمہارا بھی حصہ ہے۔ اسی طرح جیسے بزنس میں۔" ریکا نے تنک کر کہا۔

"معلوم ہے بھئی۔ مگر اس طرح کے ڈنر اور لنچ تو کامن ہیں۔ تم اتنا پوزیسو کیوں ہو رہی ہو؟" وہ درحقیقت حیران تھا اس کے رویے پر۔ کیونکہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں اُسے اپنے اور باسط کے علاوہ کسی معاملے سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں البتہ بزنس کے معاملات میں وہ دلچسپی رکھتی تھی کیونکہ اس میں اس کے شیئرز تھے۔

"دیکھو باسط! پہلی فرصت میں سمجھو اور عمل کرو۔ تمہارے ماں باپ تیمور کو ضرورت سے زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔ ہر چیز میں تم دونوں بھائیوں کے علاوہ تم لوگوں کی بہن کا بھی حصہ ہے۔ تم نے سوچا ہے کہ جب یہ حصے بخرے ہونے شروع ہوئے تو ہمیں اور ہماری اولاد کو بیچ میں سے کیا ملے گا؟ مہنگائی کا عالم تمہارے سامنے ہے۔ تیمور کی بیوی آ گئی تو ہر چیز کی برابری اور حصے داری کی بات کرے گی۔ تم مجھے دعائیں دو کہ میرے مشورے پر تم نے اتنا کچھ بنا لیا۔" ریکا کلینزنگ چھوڑ کر اس کی طرف مڑی باسط پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

"اب سنو! میرا پلان یہ ہے کہ اپنا سب کچھ یہاں سے بیچ کر ہم لندن ڈیڈی کے پاس شفٹ ہو جائیں گے۔ ان کا بزنس "ان" ہے اور "رننگ" میں ہے۔ تم ان کے ساتھ انویسٹ کر دینا۔ یہ کام جلد سے جلد کرنا ہے۔ میں اس چڑیا گھر میں مزید نہیں رہ سکتی۔" وہ یہ کہہ کر واپس آئینے کی طرف گھوم گئی اور اپنے کام میں لگ گئی۔

"تم نے اکیلے ہی اتنا کچھ پلان کر لیا۔" باسط نے پوچھا۔

"میں نے پہلے ڈیڈی اور بھائی سے ڈسکس کیا تھا۔ ساری انفارمیشن لینے کے بعد تم سے کہہ رہی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"اور مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا۔" باسط کا موڈ خراب ہو گیا۔

"تو اب پوچھ رہی ہوں۔ بولو۔ کیسا لگا میرا آئیڈیا۔" وہ بہت اطمینان سے بولی۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے نہیں کسی چھوٹے بچے سے بات کر رہی ہو۔

"دیکھو ریکا! یہاں میرا بزنس بہت اچھا رن کر رہا ہے۔ مجھے تمہارے باپ اور بھائی کے ساتھ انویسٹ نہیں کرنا۔ تم انہیں منع کر دو۔" باسط نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ تو پھر اپنے شیئر بیچ کر میں اپنے حصے کی انویسٹ کر دوں گی۔" ریکا سنجیدگی سے بولی۔

"تم بچوں کی طرح ضد کیوں کر رہی ہو؟ ہمارا بزنس بہت اچھا جا رہا ہے اور تمہارے فادر کا بزنس پہلے جیسی پوزیشن میں نہیں رہا۔ میں مارکیٹ سروے کرتا رہتا ہوں۔ میرا واسطہ اور تعلق لندن میں بزنس کرنے والوں سے رہتا ہے۔ تمہارے ڈیڈی کا بزنس خسارے میں جا رہا ہے۔ وہ ہمارا پیسہ انویسٹ کر کے خود کے بزنس کو "ٹیک" دینا چاہتے ہیں۔ سوچو ذرا۔۔۔ اگر ہمارا پیسہ بھی ڈوب گیا تو۔۔۔ ذرا عقل سے کام لو۔"

ریکا کے شیئرز اس کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔ اس کا حصہ 38 فیصد تھا جبکہ ریکا 70 فیصد کی

مالک تھی اور باقی بچا ہوا حصہ عمران سلیم نے عریشہ کے نام سے انویسٹ کیا تھا۔

"میری ڈیڈی سے تفصیلاً" بات ہو چکی ہے۔ جو کہانی تم مجھے سنا رہے ہو' اس کی تفصیل یہ ہے کہ پچھلے سال کمپنی نے اپنی پرانی پوزیشن سنبھال لی ہے۔ جو ڈیڈی کے مد مقابل تھے' انہوں نے ڈیڈی کی کمپنی کی ساکھ خراب کرنے کے لیے کچھ ہتھکنڈے استعمال کیے تھے جس کی وجہ سے ڈیڈی کی کمپنی کی ساکھ اور پروڈکٹ متاثر ہوئی تھی۔ مگر اب سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔" ریکا نے مفصل جواب دیا۔

"بہر حال... یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے۔ میں مکمل چھان بین کے بعد کوئی حتمی فیصلہ کروں گا۔ یہ کوئی ڈائمنڈ نیکلس نہیں ہے جو تم جیولر کی شاپ سے اٹھا کر لے آؤ۔ مجھے سوچنے دو۔" باسط نے رکھا سا جواب دے دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پندرہ دن کے اندر مجھے جواب دو... مجھے اب اس گھر میں نہیں رہنا۔ مجھے الگ گھر چاہیے... جو تم میرے نام سے خریدو گے۔" ریکا نے ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

باسط کو اس کی خود سری پر غصہ تو آیا مگر ضبط کر گیا۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کہ کیوں اس نے ریکا کو اتنی ڈھیل دی۔ وہ اس بات پر بھی پچھتا رہا تھا کہ اس نے جذبات میں آکر اتنے زیادہ شیئرز اور جائیداد کا بڑا حصہ ریکا کے نام پر کیوں کر دیا۔ ریکا ایک سرپھری اور امیر خاندان کی بگڑی ہوئی لڑکی تھی۔ باسط سے اس کی ملاقات یونیورسٹی کیمپس میں ہوئی تھی۔ اس کی پوری فیملی لندن میں مقیم تھی۔ وہ اپنی تعلیم پوری کرنے کی غرض سے یہاں ہاسٹل میں رہتی تھی۔ وہ خوب صورت اور طرح دار تھی۔ باسط اس کی اداؤں پر دل ہار بیٹھا اور اس کے سامنے شادی کی درخواست لے کر پہنچا۔ ریکا نے اپنی ماں کی پڑھائی ہوئی پٹی باسط کی آنکھوں پر باندھ دی۔ اس وقت شادی کی جو جو شرائط ریکا اور اس کی ماں نے باسط کے سامنے رکھی تھیں' اس نے من و عن ہامی بھری تھی۔ بھاری حق مہر کے نام پر لاکھوں کا زیور' روپیہ' جائیداد' شیئرز تک باقاعدہ تحریری طور پر ریکا نے اپنے نام پر لکھوا لیے تھے۔

شادی کے دو سال بعد تک تو باسط بغیر سوچے سمجھے وہی کرتا رہا جو ریکا کہتی رہتی۔ مگر اب "اندھے پن کی پٹی" وہ اتار کر پھینک چکا تھا۔ ریکا کو اس بات کا صحیح سے اندازہ آج اس بحث کے بعد ہوا تھا اور وہ اس کا توڑ سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ تیمور کے آنے سے قبل ہی تیار تھی اور بڑی بے تابی سے ان کی منتظر تھی۔ انابی لان میں ہی کرسی پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ ان کی جہاں دیدہ آنکھیں اس کے چہرے پر پھیلے رنگوں کی داستان پڑھ چکی تھیں۔ تیمور کو ساڑھے آٹھ بجے آنا تھا' جبکہ ابھی صرف سات بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ ہلکے گلابی لباس میں معصوم چہرے پر انتظار کی کیفیت سجائے وہ انابی کو اتنی پیاری لگی کہ انہوں نے اس کی نظر اتاری۔

"ابھی وقت ہے' کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔" انہوں نے اس کو اپنے پاس اشارے سے بیٹھنے کا کہا۔

"نہیں۔ ویسے ہی۔" وہ جھینپ گئی۔

"اور کون کون ہو گا؟" انہوں نے چند قدم کی چہل قدمی کے بعد دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تین چار ڈاکٹرز مزید ہوں گے۔ ان ہی میں میری سہیلی ہما کے بھائی افتخار بھی ہیں' وہ یو این او میں ہوتے ہیں۔ اس کام میں انہوں نے ہماری بے حد مدد کی ہے۔" وہ بتانے لگی۔

"انابی! آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی ایک بیٹی تھی۔ وہ اب کہاں ہے؟" اسے خیال آیا تو سوال کیا۔

"حوریہ... آہ..." انابی کے دل سے جیسے آہ نکلی۔

"انابی! اس روز ہماری باتیں ادھوری رہ گئی تھیں۔ آج اسے پورا کر دیں۔" وہ ان کے بوڑھے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

انابی کی نیلی جھیل سی آنکھوں میں ماضی کا چاند اپنا عکس دیکھنے لگا۔

"مریم پیلس" میرے اور ارمان کے خوابوں کا مظہر تھا۔ میری زندگی میں دو ہی مرد آئے تھے۔ عبداللہ کا اور میرا ساتھ صرف گنتی کے چند دنوں کا تھا۔ دوسرا مرد ارمان تھا۔ وہ عبداللہ حسین نہ تھا مگر اعلا ظرف تھا۔ حوریہ کو اس نے اپنا نام دیا تھا۔ حوریہ کو اس نے اپنی بیٹی کی طرح سمجھا تھا' میری بیٹی بہت پیاری' بہت معصوم تھی۔ بالکل تمہاری طرح۔ انابی نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ دولت اور قسمت ہم پر مہربان تھی۔ عمران کو اچھی تعلیم دلوا کر ارمان نے اپنے ساتھ ہی کاروبار میں شریک کرلیا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم یہ بھول گئے تھے کہ عمران ہماری سگی نہیں لے پالک اولاد ہے۔ مگر ایک روز اس کا سگا باپ سلیم اس سے ملا۔ اس کے بعد سے عمران بدلنا شروع ہوگیا۔ سلیم نے اسے اپنی بھتیجی سے ملوایا۔ عمران اس کے حسن و اداؤں کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے نفیسہ سے شادی کی ضد شروع کردی۔ ارمان نے عمران کو دنیا کی اونچ نیچ اور حالات کی سچائی سمجھائی مگر اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی بہت سخت تھی۔ مجبوراً" اس کی شادی کے لیے ہامی بھرنا پڑی۔ نفیسہ کو گھر میں لانا ہماری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ارمان کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تھا۔ وہ اور میں اپنے بیٹے کی محبت میں کھو کر بہت کچھ عمران کے حوالے کرچکے تھے۔ مگر جب بزنس میں ایک کروڑ کا جھٹکا لگا تب ارمان کو احساس ہوا کہ عرفان چچا کی بات کتنی سچ تھی۔

ارمان نے چپکے سے اپنی وصیت تبدیل کرائی تھی۔ اس نے ساری جائیداد میرے اور حوریہ کے نام منتقل کردی تھی۔ جو دولت و جائیداد عمران دھوکے سے ہتھیا چکا تھا وہ تو اب واپس نہیں آسکتی تھی۔۔۔ مگر جو کچھ تھا وہ بھی بہت زیادہ تھا۔

ارمان کی اس حرکت کا علم کسی طرح عمران کو ہوگیا اور اس نے گھر میں جھگڑا کھڑا کردیا۔ مگر ارمان نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے اس گھر میں رہنا ہے تو طریقے سے رہنا ہوگا ورنہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا بندوبست کرلے۔

نفیسہ' عمران سے زیادہ ہوشیار نکلی۔ اس نے سلیم سے مشورہ کرکے اپنے انداز بدل دیے اور یک دم بہت ہی اچھی بن گئی۔۔۔ عمران نے بھی اپنی بدتمیزیوں اور رویوں کی معافی مانگ لی تھی۔ ہم سمجھے کہ وہ دونوں پشیمان ہیں اور سدھر گئے ہیں۔۔۔ مگر یہ ہماری غلط سوچ تھی۔"

انابی نے آنکھوں کے بھیگے گوشوں کو چپکے سے صاف کیا۔

"عمران اور نفیسہ کے سارے بچے ان ہی جیسے تھے' ماسوائے تیمور کے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"تیمور۔۔۔" وہ بری طرح چونکی۔

"ہاں۔۔۔ وہی تیمور۔۔۔ جس سے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔" وہ مسکرائیں۔ روشانے کے لب نیم وا تھے اور وہ متحیر سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تیمور ان سب سے مختلف ہے روشنی۔۔۔ خوش قسمت ہو جو تمہارے حصے میں تیمور آیا ہے۔"

وہ گویا اس کے ذہن کو پڑھ کر جواب دے رہی تھیں۔ روشنی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اسی وقت گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔"

"تیمور کی گاڑی ہے۔۔۔ آپ ان سے مل لیں۔" اس نے بمشکل کہا۔

"ابھی نہیں۔۔۔ ابھی پردہ پڑے رہنے دو بیٹی۔۔۔ کچھ مصلحتیں ہیں۔۔۔ اسے ابھی میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ کار کا ہارن پھر بجا۔ اس بار چوکیدار گیٹ کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ "جاؤ۔۔۔ اللہ کے حوالے۔" انہوں نے اشارہ کیا۔ وہ جیسے زبردستی اٹھی تھی۔

"تیمور ہیرا ہے روشنی اور اللہ نے اسے تمہارے لیے چنا ہے' دل کو صاف رکھو میری بچی۔" انہوں نے جیسے اس کی ڈھارس بندھائی۔

روشنی نے ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر سر ہلا کر آگے

بڑھ گئی۔ انابی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ماضی نے ان کے ذہن پر دستک دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"انابی! مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاسکتا۔" حوریہ ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

"ایسے نہیں کہتے ہیں حور! وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔" رخ مریم نے ناراضی سے کہا۔

"میں ان کو اپنا بڑا بھائی اور آپ ان کو اپنا بیٹا سمجھتی ہیں، میں نے بھی کبھی رشتوں میں فرق نہیں کیا... مگر انابی! یہ بھی سچ ہے کہ عمران بھائی بدل گئے ہیں۔ وہ اور بھابھی اب ہمیں صرف بے وقوف بنا رہے ہیں۔ میری سہیلی انامیہ کے سگے بھائی ایڈووکیٹ ہیں۔ اس نے مجھے یہ بتایا کہ عمران بھائی اور بھابھی اس کے پاس آئے تھے۔ وہ ارمان سلیم زیدی کی جائیداد کو غیر قانونی طریقے سے اپنے نام کروانے کے سلسلے میں ان سے مدد مانگ رہے تھے اور خاصی بھاری رقم منہ بند کرنے کے لیے آفر بھی کی تھی۔ انہوں نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا۔"

حوریہ جو کہ لاء کی اسٹوڈنٹ تھی اس نے ماں کو سارے حقائق... بتائے۔ رخ مریم دل پر ہاتھ رکھے بیٹی کے منہ سے سفاک سچ سن رہی تھیں۔

"ابھی میں نے ابا میاں سے کچھ نہیں کہا۔ انابی! میں چاہتی ہوں کہ یہ سلسلہ یہیں رک جائے۔ آپ بھائی اور بھابی کو پہلی فرصت میں علیحدہ کردیں۔ ابا میاں ویسے بھی دل کے مریض ہیں۔ انہیں علم میں لائے بغیر کوشش کریں کہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹ جائے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

مریم نے حوریہ کی طرف دیکھا۔ بے حد حسین و معصوم اور کم عمر۔ مگر بے حد ذہین و بردبار۔ بے حد ٹھہراؤ اور وقار والی شخصیت تھی اس کی۔ جیسے کہ نواب زادی کی شخصیت میں ہونا چاہیے۔ "کاش پروردگار! تو مجھے ایک سعادت مند اور لائق بیٹا بھی عطا فرما دیتا۔" ان کے دل سے دعا نکلی۔ انہوں نے حوریہ کی طرف محبت بھرے دیکھا۔

"اپنے ابا کو کچھ نہ بتانا۔ میں کچھ سوچتی ہوں۔" انہوں نے کچھ دیر کے توقف کے بعد کہا تھا۔ حوریہ کی وجہ سے انہیں بڑی ڈھارس رہتی تھی۔ ارمان کو دو مرتبہ دل کا دورہ پڑچکا تھا۔ حوریہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے کاروبار کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی اور یہ بات عمران اور نفیسہ دونوں کو کھلتی تھی۔ ان دونوں نے حوریہ کے آفس جانے پر تنقید بھی کی تھی مگر حوریہ نے بہت تحمل سے ان کے ہر اعتراض کا جواب دیا تھا۔ حوریہ کا نازک سا وجود دونوں کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگا تھا۔

سلیم سے جب حوریہ کے بارے میں بات کی گئی تو اس نے حوریہ کی شادی کرنے کا مشورہ دیا۔

"مگر شادی کے بعد تو حوریہ کے ساتھ ساتھ اس کا شوہر بھی حصہ دار بن کر داخل ہوجائے گا۔" نفیسہ نے کہا تھا۔

"تو اس کا شوہر وہ نہیں تم دونوں چنو۔ پھر اسے کٹھ پتلی کی طرح اپنی انگلیوں پر نچاؤ۔" سلیم نے مشورہ دیا۔ اس کی پٹاری ایسی اسکیموں سے بھری پڑی تھی اور اپنے "زرخیز" ذہن کی بدولت وہ عمران سے بہت کچھ ہتھیا چکا تھا۔ مگر وائے قسمت کہ اور "زیادہ" کی ہوس دل میں لیے وہ دار فانی سے کوچ کرگیا مگر جاتے جاتے بھی اس نے اپنے بیٹے کو اسی پیسے کا مکین بنا دیا تھا۔

"انابی! آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو اندر ڈھونڈ رہا ہوں۔" شہاب امام انہیں تلاش کرتے کرتے لان میں آگئے۔ انابی چونکیں... انہوں نے غیر حاضر دماغی سے اپنے اردگرد دیکھا۔ حوریہ، ارمان، عمران سب غائب تھے۔ وہ لان میں سفید کرسی پر براجمان تھیں۔ سحر کی نرم دھوپ پھیل چکی تھی۔ انہوں نے ایک طویل سانس لی۔

"بہت پیچھے چلی گئی تھی شہاب میاں۔" انہوں نے کرسی کے سہاروں پر زور دے کر خود کو کھڑا کیا۔

"روشنی چلی گئی۔" وہ انہیں کندھوں سے سہارا دیتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"جی بیٹا! کب کی۔"

"بہت مانوس ہو گئی ہے آپ سے۔"

"آپ کا احسان ہے شہاب میاں! ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔" انہوں نے ہولے ہولے قدم آگے بڑھائے۔ دھوپ کی تمازت نے ان کے جسم کو گرمی دی تھی۔

"اسے اللہ کا کرم کہیں۔ آپ نے جو کچھ جھیلا' اللہ دشمنوں پر بھی ویسا وقت نہ لائے۔ نوابوں کا خون اور شاہانہ زندگی گزارنے والی خاتون' چند آستین کے سانپوں کی وجہ سے بے گھر ہو گئیں۔" انہوں نے بے حد تعظیم و عقیدت سے انابی کو دیکھا۔

"تم سب بہت قسمت والوں کی اولادیں ہو۔ اللہ تمہارے والدین کی آنکھوں اور دلوں کو ٹھنڈا اور روشن رکھے۔" انہوں نے دعا دی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔

"ارے..... آپ لوگ اندر آ گئے۔ میں تو چائے باہر لا رہی تھی۔" بیگم شہاب اسلم کے ہمراہ باورچی خانے سے نکل رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر چونکیں۔

"روشنی نے ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا۔ کتنا کہا بھی اسے مگر یہ لڑکی مانتی کہاں ہے۔" وہ انابی سے کہہ رہی تھیں۔

"فکر مت کرو۔ جس کے ساتھ گئی ہے' وہ بڑا ذمہ دار انسان ہے۔ بھوکے پیٹ نہیں رکھے گا ہماری روشنی کو۔" انابی کے تصور میں تیمور کا چہرہ آ گیا۔ صبح بھی لاکھ چاہنے کے باوجود وہ پیٹھ موڑ کر بیٹھی رہیں تاکہ غلطی سے بھی تیمور کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ وہ انہیں بہت یاد آ رہا تھا۔

"آپ ملی ہیں ڈاکٹر تیمور سے؟" شہاب امام نے پوچھا۔ باتوں کے دوران دونوں لاؤنج میں آ گئے تھے۔ بیگم شہاب ان کے پیچھے تھیں۔

"ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے روشنی کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا۔" وہ مبہم سا جواب دیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"میں صرف ایک بار ملا تھا ڈاکٹر تیمور سے۔ بس سرسری سا۔ مجھے تو بہت پسند آئے تھے۔ میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ کاش ہماری روشانے کی شادی ان ہی سے ہو۔ بہت نائس پرسن ہیں۔ پورا نام..... شاید تیمور زیدی ہے۔" شہاب امام نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا..... تیمور زیدی..... باپ کا نام کیا ہے؟" بیگم شہاب بری طرح چونکیں جبکہ انابی اطمینان سے تسبیح کرتی رہیں۔

"عمران سلیم ہے غالباً۔" وہ کچھ سوچ کر بولے اور پھر خود ہی چونک گئے۔

"ارے۔ یہ تو کیا خوب اتفاق ہوا..... زبردست بھئی۔" وہ ساری بات سمجھ گئے تھے۔ ان کے چہرے سے خوشی عیاں تھی۔

"انابی! ویسے رشتہ پکا ہو گیا تو منگنی کریں یا نکاح ہی رکھ لیں۔" بیگم شہاب نے پوچھا۔ "بات پکی کر کے نکاح کی تاریخ ہی رکھنا۔ پھر شادی..... جب حتمی ارادہ کر لیا ہے تو امانت کو اس کے مالک تک پہنچا ہی دینا۔" انہوں نے لبوں کو جنبش دی۔ پھر وہ تینوں اسی بارے میں محو گفتگو ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے ناشتا کیا ہے؟" ڈاکٹر تیمور زیدی پوچھ رہے تھے۔

"نہیں۔ صرف کافی لی ہے ایک کپ اور دو بسکٹ۔" اس نے بتایا۔

"ماشاء اللہ ڈاکٹر ہو کر یہ حالت ہے۔" تیمور نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جھینپ گئی۔

"پہلے کچھ کھا لیں۔" انہوں نے ایک ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی روکی۔

"رہنے دیں سر۔ بالکل بھی موڈ نہیں۔" وہ بولی۔ "پیک کروا رہا ہوں۔ راستے میں کھا لیجیے گا۔" انہوں نے سینڈوچ پیک کرنے کا آرڈر دے دیا۔

"آپ نہیں لیں گے؟" روشانے نے پوچھا۔

"میں اچھا خاصا ناشتا کر کے آیا ہوں۔" وہ بلیک سن

گلاسز کے پیچھے سے اسے دیکھتے ہوئے بولے روشنی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ نیلی شرٹ اور بلیک کوٹ پینٹ میں وہ بہت تازہ دم لگ رہے تھے۔ بے حد سلیقے سے جمے بال' تیکھی کھڑی ناک' خاموش لب۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

اس نے بے حد آہستہ سے نظروں کا زاویہ سامنے کی طرف موڑا۔ گاڑی میں بالکل خاموشی تھی۔ ایک ایسی خاموشی... جس کی لہروں پر ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیر رہی تھیں۔ اتنی خاموشی۔ کہ وہ ایک دوسرے کو محسوس کر سکتے تھے۔ اتنی خاموشی... کہ اس خاموشی کی آگ ان کے اندر عجیب سا الاؤ بھڑکانے لگی تھی۔

تیمور نے اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آن کر دیا۔

کتنی دل کش ہے اس کی خاموش
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

مغنیہ کی دل کش آواز گاڑی کی ٹھہری ہوئی فضا میں ارتعاش برپا کرنے لگی۔ روشانے نے گھبرا کر تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کالے چشموں کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھوں میں کون سے پیغام تھے' وہ پڑھ نہ سکی... مگر اس کی آنکھوں میں تیرتے رنگوں نے تیمور کے دل میں پھر سے جوار بھاٹا پیدا کر دیا۔

پچھلی رات ہی تو عرشیہ کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کے دل میں ہلچل پیدا کرنے والی ہستی کل ان کی زندگی ان کے گھر میں بھی آکر بسنے والی ہے۔ کل رات سے وہ بیک وقت دو طرح کے احساسات کا شکار تھے۔ انابی کے گھر سے جانے کا غم اور روشانے کو پالینے کی خوشی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسا رد عمل ظاہر کریں۔ انابی ابھی تک نہیں ملی تھیں اور روشانے بنا کسی تردد کے مل رہی تھی۔

"روشنی! تم جانتی ہو... اس پیام کے بارے میں جو تمہارے لیے آیا تھا... کچھ روز قبل۔" بالکل اچانک ہی انہوں نے سوال کیا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ اس نے تیمور کی طرف دیکھا۔ تیمور نے سن گلاسز اتار کر ذرا سا آگے ہاتھ بڑھا کر' ایف ایم کا والیوم کم کیا۔ وہ جان بوجھ اسے نہیں دیکھ رہے تھے۔

"جی... جی۔" وہ ہکلائی۔

"تم جانتی تھیں' وہ پرپوزل کس کا تھا؟ اس بار انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ روشنی کو ساری خود اعتمادی ہوا ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کا یک دم بدلتا ہوا انداز تخاطب اور لہجہ' ان کی آنکھوں کی سحر انگیزی... اس نے چہرے کا رخ بدل لیا۔

"پہلے نہیں جانتی تھی... پھر پتا چل گیا۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔ وہ چپ رہی۔

"روشنی... میں نے کچھ پوچھا ہے۔" وہ اپنی گمبھیر آواز میں مدھم لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"اگر نامنظور ہوتا تو ممی اور ابا آپ کے گھر آنے سے منع کر دیتے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ایک بات کہوں۔" انہوں نے پوچھا روشانے نے سر ہلایا۔ مجھے کل رات کو میری بہن کی زبانی ہی معلوم ہوا تھا۔"

"اوہ... تو... کیا آپ...؟" وہ چونکی اور ان کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے لبوں سے ادا ہونے والے ادھورے سوال کو وہ پڑھ چکے تھے۔

"اللہ نے تو بن مانگے میری مراد پوری کر دی۔" وہ مسکرائے۔ وہ چونکی۔

"پہلی نظر میں ہی' پہلی ملاقات میں ہی تم اچانک ہی چپکے سے دل کے کسی گوشے میں ذہن کے کسی حصے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھیں۔ میں اپنی پریشانی میں تھا۔ سمجھ نہ سکا۔ شادی کے لیے تمہارا نام تو تمہیں ذکر ضرور سامنے آیا تھا' تب تنہائی کے کسی ایک پل میں مجھ پر میرے ہی احساسات آشکار ہوئے... مگر عمر کے فرق سے ہمت نہ ہوئی کہ تم سے اجازت لیتا۔ پوچھنے کی بات اس لیے تمہیں کی پہلی ملاقات سے لے کر آج تک تمہاری نظریں اپنے لیے صرف حسین جذبے ہی دیکھے ہیں۔"

وہ کہہ رہے تھے اور روشانے حیران حیران سی ان کو

سکتی جا رہی تھی۔

"زمین دیکھنے کا تو صرف بہانا تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔" اسی پل ان کا آرڈر آگیا۔ تیمور نے بے بنٹ کر کے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"آپ نے اتنا کچھ چھپایا... کبھی ظاہر ہی نہ ہونے دیا۔" وہ ہولے سے بولی۔

"ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے روشنی۔" وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولے۔

"اتنا کچھ بتادیا... تو اپنی اس پریشانی کی تفصیل بھی بتادیں۔" اس نے موضوع گھمایا۔

"ہاں... سنو... میری جان سے بڑھ کر' میری پیاری انابی... میری دادی... کہیں کھو گئی ہیں... میں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا ہوں... مگر اتنے مہینے گزر جانے کے باوجود بھی ان کا کچھ پتا نہیں۔" وہ افسردگی سے گویا ہوئے۔

"مگر آپ کی دادی گھر سے غائب کیسے ہوگئیں؟" اس نے انجان بن کر سوال کیا۔

"اچانک گھر سے نہیں گئیں۔ میں ان دنوں لندن گیا ہوا تھا۔ لندن سے مجھے نیویارک پہنچنا تھا۔ ایک کانفرنس اٹینڈ کرنے۔ جب میں گھر واپس لوٹا تو مجھے ملازموں کی زبانی معلوم ہوا کہ انابی کو میرے گھر والوں نے اتنا ستایا کہ وہ بنا کسی کو کچھ بتائے گھر سے نکل گئیں۔ میرے فادر ان کے لے پالک بیٹے ہیں۔ وہ میری سگی دادی نہیں ہیں مگر میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میری پرورش ان ہی کے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ میری ممی' میری پیدائش کے بعد بہت زیادہ بیمار ہوگئی تھیں اسی لیے انابی نے پہلے دن سے مجھے گود میں لے لیا تھا۔ تم حیران ہوگی روشانے... میں نے بچپن میں اپنی ماں کا دودھ نہیں پیا۔ مجھے دودھ پلانے کے لیے آیا آئی تھی۔ یہ ایک طرح سے قدرت نے میری ماں کو سزا دی تھی کہ میری پیدائش کے بعد نہ ہی وہ مجھے پورے ایک ماہ تک گود میں اٹھا سکیں اور نہ ہی کبھی اپنا دودھ پلا سکیں... اور تمہیں پتا ہے وہ میرے سب بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔

ان کی پہلی محبت "دولت" تھی مگر میری پیدائش کے بعد ان کی پہلی محبت "میں" بن گیا۔" وہ تلخی سے مسکرائے۔

روشانے چپ چاپ ان کی صورت تک رہی تھی۔

"اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے۔ انہوں نے انابی اور میری پھپھی حوریہ پر بہت مظالم ڈھائے اور قدرت نے انہیں "میری محبت" کی صورت میں سزا دے دی۔ وہ جتنا مجھے خود سے قریب کرنے کی کوشش کرتیں' میں انابی اور حوریہ پھپھو کی طرف بھاگتا۔ میری ماں میری ہی محبت کے لیے تڑپتی ہے روشانے اور میں چاہ کر بھی ان کا دامن نہیں بھر سکتا۔ یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ عبرت ہے۔" انہوں نے لب بھینچ لیے۔ گویا خود پر قابو پا رہے ہوں۔

"انابی پر اس گھر میں، جو کہ ان کا اپنا ہی گھر ہے' اس قدر مظالم ہوئے اور میں ان کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ کس قسم کے لوگ ہیں... شاید تمہیں اپنا فیوچر ان سیف لگ رہا ہو۔ میں تمہیں اندھیرے میں رکھ کر شادی نہیں کرنا چاہتا... بس... تم جو فیصلہ کرو۔" انہوں نے سن گلاسز دوبارہ لگاتے ہوئے بے دردی سے پلکوں کے موتیوں کو رگڑا۔

"میں یہ سب پہلے سے ہی جانتی ہوں۔" اس نے لب کشائی کی۔

"واٹ؟" تیمور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسے؟ کس نے بتایا؟" وہ حیران تھے۔

"انابی نے..." اس نے انکشاف کیا۔ تیمور کے پیر یک دم بریکس پر پڑے۔ کار کے ٹائر چرچرائے اور تیمور نے سڑک کے کنارے پر کار روک دی۔

"تم... انابی کو جانتی ہو؟ ملی ہو ان سے؟" وہ بے حد حیران تھے۔

"جی ہاں اور وہ اس وقت جہاں بھی ہیں' بالکل محفوظ اور ٹھیک ٹھاک ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"روشنی! تم واقعی روشنی ہو۔" انہوں نے جذب کے عالم میں اسے دیکھا۔

"تم نے مجھے اتنی بڑی خوش خبری دی ہے... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں۔" وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔

"کچھ مت کہیں۔ گاڑی آگے بڑھائیں۔" وہ مسکرائی۔

"کہاں ہیں اناں؟ مجھے ان سے ابھی ملنا ہے۔" ان کی بے قراری دیکھنے لائق تھی۔

"وہ بالکل محفوظ ہیں... یقین کریں... جہاں تک ملنے کا معاملہ ہے تو میں ان سے پوچھ لوں پھر آپ کو ان سے ملوادوں گی۔ ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔ کیوں کہ انہوں نے مجھے منع کیا ہے۔" وہ بولی۔

"وہ... ناراض ہوں گی... ظاہر ہے... ان کے ساتھ جتنا برا ہوسکتا تھا' ہوا۔" وہ ڈھیلے پڑ گئے۔

"آپ سے ناراض نہیں ہیں۔ بہت محبت کرتی ہیں وہ آپ سے۔" اس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ تیمور نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"تم نے مجھے بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ بہت بڑا بوجھ میرے سر پر سے ہٹ گیا ہے۔" انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔

"آپ نے اپنی پھپھو کا ذکر کیا تھا۔ وہ کہاں ہوتی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔"

"کیا مطلب؟" روشنی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ان کی بھی ایک الگ داستان ہے۔" تیمور نے گیئر بدلا۔

"پھپھو بہت لائق اور قابل تھیں۔ "مریم پیلس" میں آج بھی ان کے کمرے میں ان کی قابلیت کی نشانیاں موجود ہیں۔ ٹرافیز' میڈلز' سرٹیفکیٹس... وہ لاء کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ دادا جی کا بزنس بھی سنبھالتی تھیں۔" تیمور نے اسٹیئرنگ گھمایا روشانے غور سے ان کی بات سن رہی تھی۔

"آخر جانا تو اسے اگلے گھر ہی ہے نا... کیوں لڑکی ذات کو اتنا سر چڑھا رہے ہیں۔" نفیسہ بیگم کو حوریہ سے شدید پرخاش تھی۔

"اسے یہ رشتہ منظور نہیں ہے اور میں اپنی بیٹی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی نہیں کرسکتا۔" ارمان نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔

"میری سمجھ میں آپ کی ضد نہیں آرہی۔ لڑکا اتنا امیر کبیر ہے۔ خوب صورت ہے۔ اچھا خاندان اور پڑھا لکھا ہے۔ کوئی برائی نہیں ہے اور خاندان بھی فکر کا ہے۔ ایسے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ اگر عرشیہ جوان ہوتی تو اس سے کرادیتی میں اشعر کی شادی۔ اتنا اچھا خاندان ہے اس کا۔ آپ لوگ آخر کس "گل فام" کی آس میں بیٹھے ہیں؟ لڑکی دہلیز پر بال سفید کر بیٹھے گی نا تب میری باتیں یاد آئیں گی... میرا تو رشتہ ہی برا ہے...."

نفیسہ بیگم نے غصے سے چمچہ میز پر پٹخا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے نفیسہ... آپ لوگوں کے ساتھ اچھائی شاید ہمیں راس نہیں آتی۔ اپنا خون ہوتا تو آنکھ بند کر کے بات مان لیتے آپ لوگ' مگر میں آپ کا لگتا ہی کیا ہوں؟" عمران سلیم نے ناراضی سے ارمان اور رخ مریم کو دیکھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ رخ مریم نے پہلے حوریہ اور پھر ارمان کو دیکھا۔

"میرے خیال میں بہو کی بات ٹھیک ہے۔ مجھے بھی لوگ پسند آئے ہیں۔ لڑکا بھی اچھا ہے۔ بظاہر کسی چیز کی خاص کمی نہیں۔ اللہ کا نام لے کر ہامی بھر لیں۔" رخ مریم نے کہا۔

"مجھے سوچنے دو مریم! یہ ہماری بیٹی کی پوری زندگی کا سوال ہے۔" ارمان نے سوچتے ہوئے کہا۔

حوریہ لاکھ بولڈ سہی' مگر اپنی شادی کی بات پر کھلے بندوں بولنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس سے اشعر کے رشتے کے بارے میں پوچھا گیا تھا اور اس نے صرف

عمران اور نفیسہ کی وجہ سے انکار کیا تھا کہ ان کے ذریعے یہ رشتہ آیا تھا اور وہ ان کی ہر حرکت کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

جب ارمان نے اس سے تفصیلاً بات کی تو اس نے وجہ بتا دی۔

"میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ زمین پر تو صرف "وسیلے" پیدا ہوتے ہیں... ہو سکتا ہے رب نے تمہارے "جوڑے" کے لیے "وسیلہ" ان ہی دونوں کو بنایا ہو۔"

ارمان نے اس سے بات کی تھی اور پھر وہ صرف ان کی بات رکھنے کے لیے "خاموش" ہوئی تھی۔ اشعر کے نام کی انگوٹھی پہننے کے لیے راضی ہو گئی۔ اشعر سے حوریہ کی شادی بھی بیگم نفیسہ کی سازش کا ایک حصہ تھا۔ اشعر اس کے دور کے رشتے داروں میں سے تھا اور کراچی میں رہتا تھا۔ ارمان اور نرخ مریم اسے نہیں جانتے تھے۔ اشعر کو دولت کا لالچ دے کر نفیسہ نے اپنے ساتھ منصوبہ میں شریک کر لیا تھا۔ دولت کی ہوس اور لالچ نے نفیسہ اور عمران سلیم کو اندھا کر دیا تھا۔ وہ چالوں پر چالیں چلتے جا رہے تھے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جس روز اشعر اور حوریہ کی منگنی تھی' اس تقریب میں انامیہ اور اس کا بھائی رضوان بھی موجود تھے۔ رضوان کو اللہ نے فرشتہ بنا کر اس محفل میں بھیجا تھا۔ فراڈ کے کتنے ہی کیس اس پر تھے اور بحیثیت وکیل رضوان اس سے اچھی طرح واقف تھا۔

اس نے ارمان سلیم زیدی کو ایک طرف لے جا کر اشعر کی حقیقت بیان کر دی۔

"اگر آپ کہیں تو میں آپ کو باقاعدہ ثبوت مہیا کر سکتا ہوں۔" رضوان نے جو کچھ بتایا اسے جان کر کہ وہ ششدر رہ گئے۔ ارمان نے اسی وقت یہ رشتہ ختم کر دیا تھا اور "وجہ" بھی اعلانیہ طور پر بیان کر دی۔

اشعر اپنی فیملی سمیت بہت غصے میں وہاں سے چلا گیا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ حوریہ کو نہیں چھوڑے گا اور اغوا کرا لے گا۔ اس کی اس طرح کی دھمکیوں پر ارمان' نرخ مریم اور حوریہ پریشان ہو گئے تھے۔ جبکہ عمران سلیم اور نفیسہ بیگم الٹا ان ہی لوگوں کو باتیں سنا رہے تھے۔ جوان بیٹی کے بارے میں دھمکیاں سن کر تو ارمان دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ رضوان انہیں اسپتال لے گئے۔ ارمان کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا۔ حوریہ کی فکر انہیں صحت یاب ہی نہیں ہونے دے رہی تھی۔

اس وقت انامیہ نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے بھائی رضوان سے مدد کی درخواست کی۔ رضوان نے ہامی بھر لی تھی۔ انامیہ اور رضوان کے والد ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے اور والدہ گزر چکی تھیں۔ اس مشکل اور کڑے لمحات میں انہوں نے ارمان اور ان کے خاندان کو تنہا نہیں چھوڑا تھا اور آپس کی بات چیت کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے اپنے گھر پر ہی قاضی کو بلوا کر حوریہ اور رضوان کا نکاح پڑھوا کر وہیں سے رخصتی کر دی جائے۔ جب ارمان صحت یاب ہوں گے تو نکاح کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا ولیمہ کی شکل میں۔ تب تک حوریہ کو کسی مناسب و محفوظ مقام پر رکھا جائے گا۔ سب اس بات سے متفق ہو گئے۔

کرنل عثمان نے نکاح خواں اور گواہوں کا بندوبست کیا۔ ایمرجنسی طور پر نکاح کا انتظام ہوا تھا۔ ان ہی گواہوں میں ایک گواہ کرنل شہاب امام بھی تھے۔ شہاب امام اور بیگم شہاب کرنل عثمان کے بہت ہی اچھے دوستوں میں سے تھے۔ بیگم شہاب نے اپنے تعلقات کا بخوبی استعمال کرتے ہوئے دو پولیس والوں کا انتظام بھی کروا لیا تھا۔ چند لوگوں کی موجودگی میں یہ "مخفیہ" اور "ایمرجنسی" نکاح ہو گیا تھا۔

بیگم شہاب نے جلدی میں عروسی جوڑے کے نام پر سرخ بھاری ساڑھی کا انتظام کیا تھا۔ کرنل عثمان کی مرحومہ بیوی کے زیورات میں دو سونے کے سیٹ' بارہ سونے کی چوڑیاں اور چند انگوٹھیاں حوریہ کو پہنا کر سجایا گیا تھا۔ انامیہ نے حوریہ کے نازک نازک ہاتھ پیروں پر مہندی کے حسین نقش و نگار بنا دیے تھے۔ سب

کچھ اس قدر اچانک اور جلدی میں ہو رہا تھا کہ حوریہ کی سمجھ ہی کام چھوڑ گئی تھی۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے وقت بھی وہ خالی الذہن تھی۔ اس کو شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ رخ مریم' ارمان کے پاس اسپتال ہی میں تھیں۔ حفاظتی اقدام کے طور پر انہیں اس نکاح میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

"اللہ تمہیں سدا سہاگن اور شاد رکھے۔" انہوں نے جانے سے قبل اسے دعا دی تھی۔ رخ مریم کے حافظے میں قیامت کا وہ منظر گھوم گیا تھا جو کبھی ان پر آکر گزر گئی تھی۔

"میرے اللہ! میری بچی کو ہر قیامت سے محفوظ رکھنا۔" ان کے دل سے دعا نکلی تھی۔ انامیہ نے اسے رضوان کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہ دودھ اور فروٹس رکھے ہیں جو دل چاہے کھا لینا۔" وہ محبت سے کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ حوریہ گم صم سی ساڑھی میں لپٹی تھی' انامیہ نے رضوان کو اندر بھیج دیا تھا۔

یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ رضوان کو بھی عجیب سی جھجک ہو رہی تھی۔ وہ عام سے گھریلو شلوار اور کرتے میں ملبوس تھا۔ اندر آکر اس نے اضطرابی انداز میں دروازہ بند کر دیا۔

اس نے قریب جاکر ہولے سے اسے پکارا۔

"حوریہ...؟" وہ چونکی۔ رضوان کو دیکھا اور پھر چونک کر ارد گرد نظر ڈالی۔ رضوان بہت سمجھ دار تھا۔ اس کی کیفیت اس پر عیاں تھی۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کا مہندی رچا ہاتھ اپنے گداز ہاتھوں میں لے لیا۔ ہاتھوں کی حرارت نے حوریہ کے ذہن کو شدید شاک سے باہر نکالا۔ اس کے اعصاب پر جمی برف پگھلنا شروع ہوئی۔

"جو کچھ ہوا' اچانک تھا' مگر اچھا ہی ہوا۔ باوجود تم سے شدید محبت کرنے کے میں تم سے کچھ نہ کہہ سکا اور جب سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو اللہ نے تمہیں از خود میری جھولی میں ڈال دیا۔ ہمارا ساتھ لکھا تھا حور.... بس اب تم "محفوظ" ہو اور "میری" ہو۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔" وہ گمبھیر اور سنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا اور حوریہ روتے ہوئے اس کے شانے سے لگ گئی۔

شادی کے بعد حوریہ اور رضوان' ارمان اور رخ مریم سے ملنے اسپتال گئے تھے۔ اپنی بیٹی کو خوش اور محفوظ دیکھ کر اور رضوان جیسا ساتھی اپنی حوریہ کے ساتھ دیکھ کر ارمان اتنے مطمئن ہوئے کہ دنیا ہی چھوڑ دی۔ رخ مریم پر اس کے حصے کی ایک قیامت اور آکر گزر گئی تھی۔ اس سے انیس سالہ تیمور نے انہیں سنبھالا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک بار پھر رخ مریم نے بیوگی کی سفید بے رنگ چادر اوڑھ لی تھی۔ بہت سوچ و بچار کے بعد انہوں نے اپنے سمدھی سے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ارمان کا چالیسواں کرنے کے بعد حوریہ کی رخصتی کر دی جائے۔ رخ مریم نے اپنا سارا زیور اور وہ زیورات بھی جو کہ حوریہ کے لیے بنوا کر رکھے تھے' وہ بینک کے لاکر میں الگ سے رکھ دیے اور اس کے ساتھ ہی ارمان کی تیار کروائی ہوئی نئی وصیت کے کاغذات کا بیگ بھی اسی لاکر میں رکھ کر چابی رضوان کے حوالے کر دی تھی۔

"مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ چپ نہیں بیٹھیں گے اور جلد ہی کوئی ذلالت دکھائیں گے۔ یہ چابی ہے اس لاکر کی اور اس کاغذ پر ساری تفصیلات موجود ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں یہ ملک ہی چھوڑ دو۔" رخ مریم نے کہا تھا۔

"آپ اطمینان رکھیں۔ ان بزدلوں سے اتنا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے خاصے کانٹیکٹس ہیں۔ میرا ایک دوست کمشنر ہے۔ ضرورت پڑی تو اس کی مدد لی جاسکتی ہے۔ آپ فکر مت کریں۔" رضوان نے ایک بیٹے کی طرح ان کی ڈھارس بندھائی۔

"بچی نہیں حوریہ اور تمہاری فکر ہے۔ جائیداد اور مال کی دشمنی بہت بری ہوتی ہے۔ جہاں یہ سب ہو وہاں خون کی ہولی ضرور کھیلی جاتی ہے۔ تم اپنا کیریر باہر بھی بنا سکتے ہو۔ بزنس کرسکتے ہو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ میں تم دونوں کو داؤ پر لگا نہیں دیکھ سکتی۔ سب کچھ کھودیا ہے۔۔۔ تم دونوں میرا اثاثہ ہو۔ اپنا اثاثہ لٹتے نہیں دیکھ سکتی۔ عمران سانپ کی اولاد ہے۔۔۔ نفیسہ ناگن ہے۔ یہ دونوں بے حد خطرناک ہیں۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔" وہ رو پڑیں۔

رضوان نے حوریہ سے پہلے آگے بڑھ کر انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔

"آپ میری بیوی کی ماں ہیں، مگر میں آپ کو اپنی ماں سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے بیٹے پر بھروسا کریں۔ ہمیں آپ کی دعا چاہیے۔" رضوان نے کہا تھا۔

"میں بزدلوں کی طرح نہیں بھاگوں گا۔ میری رگوں میں فوجی کا لہو ہے۔ آپ بس دعا کیجیے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ حوریہ بس خاموش تھی۔ وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ ارمان کے چالیسویں تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

مہمانوں کا تانتا بندھا تھا۔ ایک آرہا ہے تو دوسرا جارہا ہے۔ شاید اسی گہما گہمی کی وجہ سے عمران اور نفیسہ چپ تھے، مگر چالیسویں کے بعد اگلے روز ہی عمران کھڑا ہوگیا۔

"یہ کچھ پیپرز ہیں اماں! ان پر سائن کردیں نا۔" اس نے ایک فائل ان کے سامنے رکھ دی تھی۔

"کیسے پیپرز؟" انہوں نے فائل اٹھائی اور پڑھنا شروع کردی۔

"آپ بوڑھی ہوگئی ہیں۔ حوریہ کی بھی شادی ہوجائے گی۔ اتنی بڑی جائیداد اور کاروبار سنبھالنے کے لیے کوئی تو چاہیے ہوگا نا۔۔۔ ان پیپرز میں لکھا ہے کہ آپ نے مجھے سربراہ مان کر سارا اختیار مجھے دے دیا ہے۔" عمران نے بتایا۔

"وہ تو میں پڑھ چکی ہوں مگر تم کو اتنی جرات کیونکر ہوئی کہ تم نے ایسی حرکت کرنے کے بارے میں سوچا بھی کیسے؟" وہ برہم ہوئیں۔ شور کو سن کر حوریہ اور تیمور بھی کمروں سے نکل آئے تھے۔

"قانونی طور پر یہ سب کچھ میرا ہے کیوں کہ آپ کے شوہر نے میرے ہی نانا کے کاروبار کی "رکھوالی" کی تھی اور "رکھوالی" کرتے کرتے وہ مالک بن بیٹھے۔" عمران نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"یہ تم کس انداز میں بات کررہے ہو عمران؟ تم بھول گئے ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ میرا دودھ خون بن کر تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔" وہ غصے سے بولیں۔ نفیسہ بھی باسط کے ہمراہ وہاں آن پہنچی تھیں۔

"صرف دودھ ہی پلایا ہے، کون سا میری سگی ماں ہیں۔ وہ تو تیمور کی آپا نے بھی اسے دودھ پلایا ہے۔ تو کیا وہ آپا تیمور کی ماں ہوگئی؟ نہیں اماں! آپ نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔۔۔ یہ سب جائیداد میرا حق ہے اور میں اپنا حق لے رہا ہوں۔" وہ بدلحاظی سے بولا۔

ایک ٹیس رخ مریم کے سینے میں اٹھی تھی۔ وہ تو اسے پالتے پالتے بھول بیٹھی تھیں کہ وہ ان کی سگی اولاد نہیں ہے صرف لے پالک ہے۔ عرفان چچا ٹھیک کہتے تھے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"عمران! تمہارے نانا ایک عظیم انسان تھے۔ انہوں نے وقت آخر جو تمہارے بارے میں کہا تھا وہ تم نے سچ کر دکھایا۔ تم واقعی سانپ کی اولاد ہو اور جس طرح تمہارے احسان فراموش باپ نے تمہاری معصوم ماں کو ڈسا تھا، تم نے مجھے اور میرے خاندان کو ڈسا ہے۔ فطرت سے ہٹ کر کچھ ہوتا تو اچنبھے کی بات ہے، تم تو اپنی فطرت پر ہی ہو۔ اور یہ بات بھی جان لو کہ تمہارے نانا نے تمہارے نام پر جائیداد کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ کیا تھا۔ باقی ساری جائیداد پر صرف میرے شوہر کا اور میرا حق ہے۔ یہ تو ہماری اعلا ظرفی ہے کہ تمہیں اپنی اولاد جان کر تمہارے نام اتنا بہت سارا مال و کاروبار کردیا۔۔۔ مگر تم تو اس کے بھی قابل نہ تھے۔ یہ اتنی بڑی امپائر ارمان نے دن رات کی انتھک محنت کے بعد کھڑی کی ہے۔ چچا عرفان کا تو کاروبار اتنا

چھوٹا تھا کہ اس سے تم ایک چھوٹا سا مکان ہی خرید پاتے... چچا عرفان احسان کرنے والے اور احسان کو سمجھنے والے انسان تھے۔ ارمان جیسے انسان کو پہچان کر ہی انہوں نے سب کچھ ان کے حوالے کیا تھا۔ ورنہ نواسا ہونے کی حیثیت سے سب کچھ تمہارے نام ہوتا... مگر وہ جہاں دیدہ انسان تھے۔"
وہ غم و غصے سے جیسے پھٹ پڑی تھیں۔
"میں سائن کروں گی' تم نے سوچا بھی کیسے۔"
انہوں نے کاغذات پھاڑ کر ہوا میں اچھال دیے۔
"تو ٹھیک ہے۔ پھر میں اشعر کو بلوا لیتا ہوں۔ حوریہ کا نکاح اس کے ساتھ آج ہی پڑھوایا جائے گا۔"
عمران کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
"حوریہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ میری بیٹی ہے اور اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق صرف میرے پاس ہے۔"
"ہنہ... تو پھر دیکھ لیجئے گا کہ میری بات نہ مان کر آپ کو کیا کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
"ڈیڈ! آپ کیوں انابی سے اس طرح بات کر رہے ہیں؟" تیمور سے برداشت نہ ہوا۔
"چپ رہو تم اور جاؤ اپنے کمرے میں۔ یہ بڑوں کا معاملہ ہے۔" نفیسہ نے اسے ڈپٹ کر اندر بھجوا دیا۔
"انابی! سوچ لیجیے۔ صرف شام تک کا وقت ہے آپ کے پاس۔" عمران نے حوریہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
"انابی! آپ..." حوریہ نے کچھ کہنا چاہا' مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔
"مجھے سوچنے کے لیے وقت دو عمران...! میں تمہیں کل صبح جواب دے دوں گی۔" رخ مریم نے کچھ دیر کے بعد قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔
"سوچ لیجیے۔ کوئی جلدی نہیں۔ کل جواب دے دیں۔" عمران نے مسکرا کر کہا۔
"انابی! اندر چلیے۔" حوریہ نے نفرت اور دکھ سے عمران کی طرف دیکھا اور ماں کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔

"کہیں بڑھیا کوئی چال تو نہیں سوچ رہی۔"
نفیسہ نے دونوں ماں بیٹی کے جانے کے بعد پوچھا۔
"میں انابی کو جانتا ہوں۔ وہ بہت معصوم ذہن کی مالک ہیں۔ میری دھمکی سے ڈر گئی ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ وہی ہوگا جو ہم چاہتے ہیں۔" عمران اطمینان اور پریقین انداز میں بولا۔
"دیکھا میرے مشوروں پر عمل کرنے کا فائدہ۔"
بیگم نفیسہ نے غرور بھری نگاہ شوہر پر ڈالی۔
"آپ کو تو مانتے ہیں بیگم صاحبہ۔" عمران نے سر تسلیم خم کیا اور نفیسہ نے ایک فاتحانہ نگاہ اپنے اطراف پر ڈالی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"انابی! آپ نے عمران بھائی کو صاف صاف کیوں نہیں بتادی سچائی۔" وہ حیران تھی۔
"حوریہ! کبھی کبھی مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے۔ مجھے مہلت چاہیے تھی تاکہ میں تمہیں یہاں سے نکال سکوں۔ عمران کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب تم میری بات غور سے سنو۔"
"تم رضوان کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کرو اور کہو کہ پولیس کے ہمراہ آکر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جائے۔" انہوں نے کہا۔
"میں باہر ان لوگوں پر نظر رکھتی ہوں۔ تم میرے کمرے سے ہی فون کر لو۔"
رخ مریم نے کہا اور خود چادر سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

صورت حال کی اطلاع ہوتے ہی رضوان اپنے کمشنر دوست کی مدد سے چند پولیس اہلکاروں کو لے کر مریم پیلس پہنچ گیا اور اپنا اور حوریہ کا نکاح نامہ پیش کرتے ہوئے حوریہ کو وہاں سے نکال لیا۔ انہوں نے رخ مریم سے بہت کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں' مگر وہ نہیں مانیں اور مجبوراً" حوریہ کو رضوان کے ہمراہ اکیلے

ہی وہاں سے نکلنا پڑا۔

حوریہ ماں کی طرف سے بہت پریشان تھی ٗمگر رضوان کے کمشنر دوست نے ان کی حفاظت کے لیے دو پولیس اہلکار وہاں چھوڑ دیے اور ان سے ایک خط بھی لکھوا لیا جس میں یہ لکھا تھا کہ عمران اور اس کی فیملی سے رخ مریم کی جان کو خطرہ ہے۔ لٰہذا ان کے ساتھ اگر کسی قسم کا بھی حادثہ پیش آیا تو عمران اور نفیسہ کو پولیس کی حراست میں لے لیا جائے۔

پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ ماں کو وہاں چھوڑ کر حوریہ بھاری دل کے ساتھ رضوان کے ہمراہ وہاں سے نکلی تھی۔

''تیمور! اناں کا خیال رکھنا۔'' اس نے جاتے جاتے تیمور سے کہا تھا۔

ہاتھ آئی مچھلی پھسل گئی تھی۔ عمران اور نفیسہ غصے سے بے حال تھے ٗمگر مجبوری تھی کہ خاموش رہنا ضروری تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ فی الوقت چپ رہا جاتا۔ تیمور ٗرخ مریم کا سایہ بن گیا تھا۔ رخ مریم نے اپنی زندگی کی ہر بات اس کو بتائی تھی۔ اس گھر میں اس کے رہنے کی ایک وجہ تیمور بھی تھا۔

زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹے.... انامیہ کی منگنی ہوگئی تھی۔ حوریہ کی گود میں ننھی منی سی پری آگئی تھی جس کا نام بڑی چاہ سے رضوان نے روشانے رکھا تھا۔

✡ ✡ ✡

''جگہ تو بہت اچھی ہے۔ بہت زبردست پروجیکٹ بنے گا ان شاء اللہ۔'' وہ زمین اور ارد گرد کا علاقہ دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔ وہ واپس جارہے تھے۔

''ہموں۔ بس اب کچھ ہی دنوں میں کام شروع ہوجائے گا۔'' تیمور نے جواب دیا۔

''اب تم گھر جاؤ گی یا میرے ساتھ۔'' تیمور نے پوچھا۔

''جی۔'' وہ چونکی۔

''اسپتال جانے کا کہہ رہا ہوں۔'' وہ مسکرائے تو وہ جھینپ گئی۔

''اسپتال ہی چلتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا اور باہر دیکھنے لگی۔

''تم مجھے اناں سے کب ملواؤ گی؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''بہت جلد....'' اس نے وعدہ کرلیا۔

''میں نے کچھ سوچا ہے۔'' انہوں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

''جی۔'' روشانے نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''شادی کے بعد ہم الگ گھر میں رہیں گے اور اناں ہمارے ساتھ رہیں گی۔ میں تمہیں اور اناں کو اس گھر میں دوبارہ لے کر نہیں جاؤں گا۔''

روشانے نے ان کی طرف دیکھا۔ لمحوں میں گویا صدیوں کا سفر طے کرکے وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر آگئے تھے۔ ایک اپنائیت ٗایک احساس کی ڈور ان کے درمیان غیر محسوس طریقے سے بندھ چکی تھی۔ حیا کی لالی اس کے رخساروں پر گلال بکھرانے لگی۔ وہ چپ رہی۔

''تمہیں دیکھتا ہوں تو کسی بہت اپنے کی یاد آتی ہے۔ جسے برسوں پہلے کھودیا تھا۔'' وہ آہستہ سے بولے۔

''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''میری پھپھو ٗحوریہ۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

✡ ✡ ✡

''دیکھو باسط! عقل کے ناخن لو۔ اس جائیداد کے لیے میں نے بہت کچھ کیا ہے۔ بہت محنت کی ہے اسے حاصل کرنے کے لیے۔ اب تم ایک خبطی عورت کے سحر میں آکر اسے بیچنے کی بات کررہے ہو۔'' نفیسہ بیگم برہم تھیں۔

''ممی! میں صرف اپنا اور ریکا کا حصہ بیچنے کی بات کررہا ہوں۔ اگر آپ اور ڈیڈ وہ حصہ خرید لیں تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے بہت اچھی اور بڑی آفرز آرہی ہیں۔ میں

نے اسی لیے پہلے ڈیڈ سے بات کی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو ہم دونوں کا حصہ خرید لیں۔" باسط اطمینان سے پراٹھے کے ساتھ آملیٹ کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ریکا اس وقت قصداً" وہاں موجود نہیں تھی۔ باسط کے منع کرنے پر وہ اس گفتگو میں شریک نہیں ہوئی تھی، مگر کان اس کے اسی محفل کی طرف لگے تھے۔

"تم جانتے ہو... بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ ممکن نہیں۔ ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ تمہارے شیئرز خرید سکیں۔ جو کچھ ہے، بس یہی ہے جو مل ملا کر بنایا ہے۔ اب تم اس کے ٹکڑے کرنے کی باتیں کر رہے ہو۔" عمران سلیم ناراضی سے بولے۔

"کم آن ڈیڈ! چیز ہماری ہے تو اعتراض آپ لوگوں کو کیوں ہے؟ میں فیصلہ کرچکا ہوں۔" وہ جھلا کر بولا۔

"باسط! سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی عریشہ کی شادی بھی کرنی ہے۔"

نفیسہ بیگم نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو شوق سے بیجیئے۔ مجھ سے جتنی ہو سکی، کروں گا مدد۔" وہ رکھائی سے بولا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

"ویسے تیمور بھی آپ کا ہی بیٹا ہے۔ اس کو کہیں ناں کہ اپنی "جمع پونجی" میں سے نکالے۔" وہ جاتے جاتے مفت مشورہ دے گیا۔

"دیکھا عمران! دیکھا اپنے بیٹے کو... پورے کا پورا بدل گیا ہے۔" بیگم نفیسہ نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

"یہ تو شروع سے ہی ایسا ہے نفیسہ... تمہیں آج پتا چلا ہے؟ کتنی مرتبہ کہا تھا تم سے کہ اپنی آنکھوں سے ممتا کی پٹی اتارو، مگر تم سنتی کب تھیں۔ اس نے دھوکے سے اندر ہی اندر کتنے ہی شیئرز اور بزنس کا بڑا حصہ اپنے اور اپنی بیوی کے نام کرا لیا۔ مجھے بھی بہت بعد میں خبر ہوئی، مگر کیا کرتا... جوان بیٹا ہے، اور ہے بھی بدلحاظ۔ اگر زیادہ کچھ کہتا تو پہلے ہی الگ ہو جاتا... تیل کی دھار تو پہلے ہی نظر آگئی تھی مجھے۔" عمران سلیم نے پچھتاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟" بیگم نفیسہ نے پوچھا۔

"سوچوں گا تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ پاور آف اٹارنی ابھی تک میرے ہی پاس ہے۔" عمران سلیم نے کہا اور کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

"آج تو تیمور کے سسرال والے بھی آ رہے ہیں۔" بیگم نفیسہ نے یاد دلایا۔

"اف... ہاں... تم باسط اور ریکا سے کہہ دو کہ گھر پر ہی رہیں۔ وہ لوگ دوپہر کے کھانے پر آ رہے ہیں۔"

"میں سوچ رہی ہوں کہ آج ہی بات پکی کر کے منگنی کے بجائے شادی ہی کی تاریخ فکس کرلیں۔ اکلوتی لڑکی ہے۔ سمجھو بیٹھے بٹھائے لاٹری نکل آئی ہماری تو۔" نفیسہ بیگم دور کی کوڑی لائی تھیں۔

"ہاں بھئی... یہی تو "خاص" بات ہے ان شریف لوگوں میں، مگر ابھی کوئی بھی ڈیمانڈ مت کرنا۔ نکاح کے وقت ہم اپنی مرضی سے جو چاہیں مانگ سکیں گے۔" عمران سلیم نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ نازک موقع ہو گا۔ وہ لوگ انکار کر ہی نہیں سکیں گے۔" دونوں میاں بیوی منصوبہ بندی میں لگے ہوئے تھے اور ناشتے کے لیے اندر آتے ہوئے تیمور کے قدم دروازے کی چوکھٹ پر ہی ٹھٹک گئے۔

(آپ لوگوں کے ہوس و لالچ کی کوئی حد ہے؟ ممی، ڈیڈ...) انہوں نے بے حد تاسف سے سوچا...

☆ ☆ ☆

"تم نے بات کی؟" ریکا نے باسط کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال کیا۔

"ہاں۔" باسط نے جواب دیا۔

"کیا نتیجہ رہا؟" وہ انجان بن کر پوچھ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری ڈارلنگ! نتیجہ ہماری مرضی کا نکلے گا مگر..." باسط نے اس کی طرف دیکھا۔

"مگر کیا؟" وہ اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں اپنا بزنس تو الگ کر لوں گا ریکا! مگر میں چاہتا ہوں کہ تم میری کچھ باتیں ٹھنڈے دماغ سے سنو۔" باسط نے سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو ریکا! ہم تمہارے فادر کے ساتھ انویسٹمنٹ کر لیتے ہیں، مگر پیپر ورک مکمل طور پر ہو گا اور دوسری بات یہ کہ میں بھی بزنس ایشوز میں ویسے ہی انوالو ہوں گا جیسا کہ انکل۔ ہماری پارٹنرشپ برابری کی بنیاد پر ہو گی۔ تم انکل سے کھل کر اس کے بارے میں ڈسکس کر لو۔"

"آف کورس میں ڈسکشن کر چکی ہوں باسط۔ ڈونٹ وری اور پھر تم میرے باپ کو اپنے باپ جیسا فلرٹ اور چیٹ مت سمجھو۔ ساری دنیا میرے "مسٹر اور ساس" جیسی نہیں ہے۔ ایمان دار اور اچھے لوگ بھی ہیں۔" حسب عادت ریکا نے جواب جوتے کی طرح اس کے منہ پر مارا۔ باسط تلملا کر رہ گیا، مگر "حسب معمول" وہ بھی کچھ نہ بولا۔

"آج تیمور کے ان لاز آرہے ہیں۔ مجھ سے خاطر داریاں نہیں ہوتیں۔ چلو باہر کا پروگرام بناتے ہیں۔" ریکا نے آرڈر دیا۔

"سن ڈے کو کہاں جاؤ گی؟" باسط نے پوچھا۔

"پہلے مینا (کزن) کے گھر، پھر وہاں سے گھومنے چلیں گے۔" ریکا نے اپنے تراشیدہ بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے پلان بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ تم مینا کو انفارم تو کر دو۔"

"بارہ بجے تک نکلیں گے۔" ریکا نے وقت بھی بتا دیا۔

☼ ☼ ☼

"نجانے اناں بی کس حال میں ہوں گی۔ مجھے ان کی بہت فکر ہو رہی ہے۔" حوریہ بے چین تھی۔

"وہ لوگ ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک لیڈی کانسٹیبل گھر کے اندر اور دو کانسٹیبل گھر کے باہر پہرہ دے رہے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ میں جلد ہی انہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔" رضوان نے اسے تسلی دی۔

"وہ گھر اناں بی کا ہے۔ ان کے نام پر ہے۔ آپ تو خود وکیل ہیں۔ ان لوگوں کو وہاں سے نکالیے۔ میری ماں وہاں سے کبھی نہیں جائے گی۔ ابا میاں کی یادیں اس گھر میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ وہ اس گھر کو نہیں چھوڑیں گی رضوان۔ پلیز جلد ہی کچھ کیجیے۔" حوریہ نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ بازی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں اناں بی سے بات کر کے قانونی کارروائی کروں گا۔" رضوان نے اسے تسلی دی۔

"تھینکس رضوان! اس مشکل وقت میں آپ فرشتہ ثابت ہو رہے ہیں۔" اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"حوریہ! مجھ پر یقین رکھو۔ میں اناں بی کو ان کا حق دلا کر رہوں گا۔" رضوان نے ننھی منی روشانے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ رضوان کی باتوں سے حوریہ کو ڈھارس ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ بظاہر معاملات قابو میں آتے نظر آرہے تھے۔ اناں بی کا تو عمران اور نفیسہ بال بھی بیکا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ رضوان نے ان کی گردنوں کے گرد خاصا تنگ گھیرا ڈال رکھا تھا۔ لہٰذا یہ ہڈی ابھی تک ان دونوں کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔

تیمور میڈیکل کر رہا تھا۔ حوریہ اور رضوان ہر دوسرے روز اناں بی سے ملنے آتے عمران اور نفیسہ پر یہ ظاہر کرنے کہ اناں بی دنیا میں تنہا نہیں ہیں۔ روشانے تین سال کی ہو گئی تھی۔ کرنل عثمان کا انتقال ہو چکا تھا اور انامیہ کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ یوگنڈا میں اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

بظاہر سکوت تھا، مگر اس سکوت کی تہ میں کون سے طوفان مچل رہے تھے اس کا اندازہ تب ہوا جب رضوان پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس کی کار کو

جان بوجھ کر ہٹ کیا گیا تھا۔ اس حادثے میں رضوان کو معجزانہ طور پر معمولی خراشیں ہی آئیں' مگر کار مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھی۔ رضوان نے اس حادثے کی رپورٹ فوری طور پر تھانے میں درج کروائی۔

"روڈ پر ٹریفک اکا دکا ہونے کے باوجود ٹرک نے میری کار کو پیچھے سے ہٹ کیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ جس نے بھی یہ کیا' جان بوجھ کر ہی کیا۔" رضوان نے اپنے کمشنر دوست سے کہا تھا۔ اسے شک ابھی بھی عمران سلیم اور اشعر پر تھا۔ تفتیش شروع ہوگئی تھی۔ حوریہ اور اتابی اس حادثے کے بعد سے خاصی ڈر گئی تھیں۔

رضوان انہیں سمجھاتا تھا کہ "موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اجل آئی ہو تو حادثہ بہانہ بن جاتا ہے۔" حوریہ اور اتابی دن رات رضوان کی سلامتی کی دعائیں کرتی رہتیں۔

اس روز کرنل شہاب اور بیگم شہاب کے گھر حوریہ اور رضوان مدعو تھے۔ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد حوریہ اور رضوان نے ان سے اجازت طلب کی۔ ننھی روشانے جو کہ بیگم شہاب سے بہت ہلی ہوئی تھی اور انہیں بھی ممی ہی کہتی تھی' نجانے کس موڈ میں تھی کہ ضد پکڑلی۔

"میں ممی کے پاس رہوں گی۔" ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ روشانے نے اس طرح کہیں رکنے کے لیے ضد کی ہو۔

"ضد کررہی ہے تو چھوڑ دو۔ میں خود پہنچادوں گی۔" بیگم شہاب نے بھی اسے گود میں اٹھالیا۔

"آپ کو ستائے نہ کہیں۔ پہلے کبھی میرے بغیر کہیں نہیں رکی۔" حوریہ نے کہا۔

"ستانے دو۔ اچھا ہے ہمارے اس گھر میں بھی رونق ہوجائے گی۔" شہاب امام اور بیگم شہاب بے اولاد تھے۔ انہوں نے روشانے کی محبت میں اسے اپنے پاس روک لیا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ اگر تنگ کرے تو فون کردیجیے گا۔" رضوان اسے لے جائیں گے۔"

حوریہ نے روشانے کا بے بی بیگ جس میں اس کے ڈائپرز' دودھ' فیڈر اور دوسرا ضروری سامان جو کہ وہ کہیں بھی جاتی تو احتیاط کے طور پر ضرور ساتھ لے جاتی تھی' موجود تھے۔ دونوں میاں بیوی نے بیٹی کو پیار کیا اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

انہیں پتا نہیں تھا کہ یہ ان کی' اپنی بیٹی سے آخری ملاقات ہے۔ دشمنوں کا داؤ چل گیا تھا یا اجل منہ کھولے منتظر تھی۔ کار کچھ دور گئی تھی کہ دیوہیکل ٹرک نے اتنی زور سے ٹکر ماری کہ کار کا بھرتہ بن گیا۔ دونوں میاں بیوی موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔

قدرت کے کام وہی جانتی ہے۔ جو اللہ نے منصوبہ بندی کرکے رکھی ہوتی ہے' ہوتا وہی ہے۔ چاہے لاکھ کوئی اپنا سر مارلے۔ شہاب امام اور بیگم شہاب کی بے رنگ دنیا میں روشانے کے وجود سے رنگ بھر گئے تھے۔ انہوں نے روشانے کی حفاظت کے پیش نظر عارضی طور پر اپنا گھربار چھوڑ دیا تھا اور انگلینڈ' جہاں شہاب کی کزن رہتی تھی' روشانے کو لے کر وہاں چلے گئے تھے۔

اتامیہ کو انہوں نے بذریعہ فون اطلاع دے دی تھی اور یہ تاکید کی تھی کہ روشانے کے بارے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کرے۔ اس کی زندگی کی حفاظت کے لیے یہ قدم ضروری تھا۔ انہوں نے اس قدر احتیاط کی تھی کہ جس رات یہ حادثہ پیش آیا اور انہیں اطلاع دی گئی تھی' اگلے روز دونوں میاں بیوی رضوان اور حوریہ کے جنازوں میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ دونوں صبح ہی اپنا ضروری سامان لے کر اپنے کاغان والے بنگلے پر چلے گئے تھے اور چند ہفتے وہاں گزارنے کے بعد اور نہایت عجلت میں تیاری کرکے وہ لوگ انگلینڈ روانہ ہوگئے تھے۔

روشانے کا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات بنوانے میں بیگم شہاب کے تعلقات بہت کام آئے تھے۔ انگلینڈ سے وہ واپس اپنے وطن تو آئے مگر اپنے گھر میں رہنے کے بجائے وہ اسلام آباد میں رہائش پذیر ہوگئے۔ اسلام آباد میں چھ سال رہنے کے بعد

انہیں جب یہ اطمینان ہوگیا کہ سب نارمل ہوگیا ہے تو وہ اپنے گھر روشانے کو لے کر لوٹ آئے۔ اس سارے عرصے میں رخ مریم سے نہ تو وہ ملے تھے' نہ ہی اسے دیکھا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب وہ لوگ رخ مریم سے ملے تو نہ ہی وہ اسے پہچان پائے اور نہ ہی شہاب امام اور ان کی بیگم کو وہ پہچان پائیں۔ جو کہانی اناں کی زبانی انہوں نے سنی تھی' وہ تو اب "عام" ہوتی جارہی تھی۔ لہٰذا ان کا دھیان تک اس طرف نہ گیا کہ رخ مریم کون ہوسکتی ہے۔

✲ ✲ ✲

رضوان اور حوریہ کے معاملے کی تحقیق ہوئی۔ چھان بین کے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ وہ ایک حادثہ تھا۔ حادثے تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ رخ مریم نے صبر کی چادر اوڑھ لی تھی۔ رضوان اور حوریہ کی ساڑھے تین سالہ روشانے کا کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔ دوبارہ جب روشانے منظر عام پر آئی تو وہ اب روشانے رضوان نہیں بلکہ ریٹائرڈ کرنل شہاب امام کی بیٹی روشانے امام تھی۔

بیگم شہاب نے سب کو یہ بتایا تھا کہ روشانے ان کی شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی ہے۔ اپنے سسرال اور میکے والوں تک سے انہوں نے یہ بات چھپائی تھی اور جس قدر مشکلات اس راز کو راز رکھنے کے لیے انہوں نے اٹھائی تھیں' وہ تو خدا ہی جانتا تھا یا وہ دونوں میاں بیوی۔

انہوں نے ایک لمبے عرصے تک خود کو تمام رشتہ داروں سے دور رکھا تھا۔ کبھی جانا بہت ہی ناگزیر ہوتا تو شہاب امام تنہا ہی جاتے' اور بہت ہی کم عرصے کے لیے جاتے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے دونوں میاں بیوی نیویارک میں بھی رہے تھے۔ بیگم شہاب کے پاس امریکہ کی شہریت بھی تھی کیونکہ ان کی پیدائش وہیں کی تھی۔ نیویارک میں انہوں نے اپنا سارا بچپن گزارا تھا۔ شہاب امام اور بیگم شہاب کے علاوہ صرف اناں میہ

یہ راز جانتی تھی' اور بھتیجی کی زندگی اور حفاظت کی خاطر وہ بھی کبھی روشانے سے نہیں ملی تھی۔ مگر انہیں بیگم شہاب سے —— روشانے کی خبریں پتا چلتی رہتی تھیں۔ دل پر پتھر رکھے وہ اس انتظار میں ضرور تھی کہ کب قدرت موقع دے اور وہ روشانے سے ملے۔

✲ ✲ ✲

دعوت کی اچھی خاصی تیاری کی گئی تھی۔ روشانے بطور خاص مدعو تھی۔ حالانکہ بیگم شہاب کو اس کے جانے پر اعتراض تھا کہ شادی سے پہلے لڑکی کا سسرال جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر نفیسہ بیگم کے نہایت اصرار پر وہ مان گئیں۔ ریکا اور باسط مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی گھر سے جاچکے تھے۔ نفیسہ بیگم اور عمران سلیم گلس رہے تھے' مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ان کا بیٹا بیوی کے "انڈر" میں تھا ماضی جیسے۔ خود کو دہرا رہا تھا۔ جیسا عمران اور نفیسہ' ارمان اور رخ مریم کے ساتھ سلوک اور رویہ رکھتے تھے' ویسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی باسط اور ریکا ان دونوں کے ساتھ کررہے تھے۔

عریشہ جیسی خود میں مگن رہنے والی لڑکی نے بھی اس چیز کو نوٹ کیا تھا مگر عمران اور نفیسہ کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔

وہ لوگ مہمانوں کو ریسیو کرنے پورچ میں آچکے تھے۔ روشانے' نے گاڑی سے اترتے ہوئے اس حویلی کی طرز کے وسیع گھر کو دیکھا۔ ہلکے سرخ پتھروں اور ماربل سے بنا یہ گھر "رخ مریم اور ارمان" کی یادوں کی جنت تھا' مگر وہاں راج کون کررہا تھا؟ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

تیمور میزبانوں کے درمیان بہت ہی نمایاں تھے۔ سفید کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنی قدرتی شان ——کے ساتھ سینے پر ہاتھ باندھے اپنی گہری آنکھوں سے روشانے کو دیکھ رہے تھے۔ پرل وائٹ کلر کے کرتے اور پاجامے اور بڑے سے دوپٹے میں سجے موتیوں کی بے حد نازک اور ہلکی پھلکی جیولری پہنے

وہ تیمور کے ساتھ نہایت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے نقوش میں حیرت انگیز حد تک حوریہ کے نقوش کی شباہت تھی۔

تیمور نے جب روشانے کو پہلی بار دیکھا تھا تو وہ چونک گئے تھے۔ مگر پھر سوچا تھا کہ دنیا میں بہت سارے لوگوں کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں۔ مگر پھر جب جب روشانے ان کے سامنے آتی وہ بے چین ہو جاتے تھے' ماضی کی بہت ساری یادیں جنہیں وہ اپنے ذہن کے اسٹور روم میں بند کر چکے تھے' وہ بار بار دروازہ کھول کر سامنے چلی آتیں۔ روشانے ہمیشہ انہیں اپنی پھپھو حوریہ کی یاد دلاتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ انہیں روشانے کی عادت ہوتی چلی گئی اور یوں ہی تنہائی کے کسی پل' کسی لمحے' میں انہیں احساس ہوا کہ وہ پور پور روشانے کی محبت میں بھیگ چکے ہیں اور اب یہ لڑکی جو کچھ ہی دنوں میں ان کی ہونے والی تھی' ان کے اندر رچ بس چلی تھی۔ اس کے اور اپنے بارے میں وہ بہت کچھ سوچ کر بیٹھے تھے۔

دل نشین مسکان ہونٹوں پر سجائے ہوئے وہ باقی لوگوں کے ساتھ اندر آگئی۔

"آپ کا بیٹا اور بہو نظر نہیں آرہے۔" شہاب امام نے پوچھا۔

"جی۔۔۔ دراصل میری سمدھن عمرے سے آئی ہیں اور ہم سب وہاں انوائیٹڈ تھے' مگر چونکہ آپ لوگوں کے ساتھ ہمارا کمٹمنٹ پہلے سے تھا لہٰذا میں نے باسط اور ربیکا کو بھیج دیا۔

گڑبڑا کر بیگم نفیسہ نے جھوٹ بولا۔ تیمور اور عریشہ نے ماں کی طرف دیکھا۔

"ارے تو آپ ہمیں فون کر دیتے۔ ہم لوگ کسی اور وقت آجاتے۔" انہوں نے کہا۔

"ارے نہیں بھئی ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی تو بعد میں بھی مبارک باد دینے جا سکتے ہیں۔ فی الحال تو یہ کام زیادہ ضروری تھا۔" بیگم نفیسہ نے ہنس کر شوہر کی طرف دیکھا۔

"بالکل بالکل۔" عمران سلیم نے کہا۔ ہلکے پھلکے ماحول میں لنچ کیا گیا اور پھر بیگم نفیسہ نے تیمور سے کہا کہ وہ روشنی کو پورا گھر دکھا دیں۔ تیمور اور روشانے کے جانے کے بعد دونوں گھرانے شادی کی تاریخ پر بات کرنے لگے۔

"یہ میری دادی کا کمرا ہے۔ آؤ۔ تمہیں ان کی پرانی تصاویر دکھاؤں۔" تیمور نے رخ مریم کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"میں یہ کمرا اپنی نگرانی میں صاف کرواتا ہوں اور ہمیشہ لاک کر کے چابی اپنے پاس رکھتا ہوں۔ انابی جب واپس اپنے گھر آئیں گی تو انہیں ان کا کمرا ویسا ہی ملے گا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ کسی کی ہمت نہیں کہ اس کمرے کی کسی چیز کو ادھر سے ادھر کرے۔"

تیمور بتا رہے تھے۔ روشانے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انابی تیمور کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہیں' سے یہ بات بہت اچھی لگی تھی۔

"آپ انابی کو اتنا چاہنے کے باوجود ان کے لیے کچھ نہیں کر سکے؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ مجھے کچھ کرنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ جب بھی میں ان کے لیے اسٹینڈ لینے کی کوشش کرتا وہ میرا منہ بند کر دیتیں۔ شاید وہ مجھے کھونے سے ڈرتی تھیں۔۔۔ ڈرتی تھیں کہ جس طرح میری پھپھو حوریہ اور ان کے شوہر رضوان اور ان کی بیٹی روشانے کے ساتھ ہوا۔"

وہ جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

"روشانے۔۔۔؟" وہ چونکی۔

"میری پھپھی زاد کا نام بھی روشانے تھا۔" وہ درد سے مسکرائے۔

"آئی سی۔۔۔ کیا ہوا تھا ان کے ساتھ؟" اس نے پوچھا۔

"نہایت دردناک موت مرے تھے وہ۔۔۔" انہوں نے افسردگی سے کہا۔ "آئی ایم سوری۔۔۔ مگر کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا' اور اس ایکسیڈنٹ کو کروانے میں ہاتھ میرے اپنے ہی گھر کے لوگوں کا تھا۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولے۔

"مائی گڈنس۔" روشانے نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

"نہیں اس وقت کم عمر تھا' تب میرے بس میں کچھ نہ تھا اور اب جب سب کچھ بس میں ہے تو۔۔۔۔ اتابی نجانے کہاں ہیں؟ روشانے کا بھی کچھ پتا نہیں۔ لو یہ تصاویر دیکھو۔" انہوں نے کچھ البمز لاکر اس کے سامنے رکھ دیے۔

"تو کیا روشانے کی ڈیتھ نہیں ہوئی تھی؟" اس نے پرانے اسٹائل کی سیاہ البم کھولی۔ پہلے ہی صفحے پر بلیک اینڈ وائٹ تصویر رخ مریم اور ارمان کی تھی۔ دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ رخ مریم کا حسن دیکھ کر وہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"اس کار ایکسیڈنٹ میں پولیس کو صرف پھپھو اور پھوپھا کی لاشیں ملی تھیں۔ روشانے کار میں تھی ہی نہیں۔" انہوں نے بتایا۔

"یہ میری پھپھو حوریہ اور یہ ان کے ہزبینڈ۔" تیمور نے دوسری البم کھول کر اسے تصویر دکھائی۔

"بہت خوب صورت ہیں آپ کی پھپھو۔۔۔۔ سوری' دو تھیں۔" اس نے بے دھیانی میں کی گئی تعریف کی تصحیح خود ہی کردی۔ البم دیکھتے دیکھتے اس کے گردش کرتے ہاتھ رک سے گئے۔

"یہ روشانے کے بچپن کی تصویر ہے۔" تیمور بتا رہے تھے مگر وہ سن ہی کب رہی تھی۔

اس ایک سال کی صحت مند اور منہ بسورتی بچی کی تصویر اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔۔۔۔ بت کی طرح ساکت دجامد وہ بغیر پلکیں جھپکے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ تیمور کیا کہہ رہے تھے اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس نیم وا لبوں اور متحیر نظروں سے وہ اس گلابی گلابی سی بچی کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ کیونکہ یہ اسی کی تصویر تھی۔

"روشنی! آر یو آل رائٹ؟" تیمور نے جب اس کے چہرے کے زرد ہوتے رنگ کو دیکھا تو فکر مندی سے پوچھا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ انسان کی زندگی میں کچھ پل ایسے بھی آتے ہیں کہ جب وہ بولنے سے محتاج ہو جاتا ہے۔ اسی پل کی گرفت میں اس وقت روشانے آچکی تھی۔

"روشانے!" تیمور نے پریشان ہو کر اس کا کندھا جھنجھوڑا۔ مگر وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اتنا شدید جھٹکا اسے پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ اس نے تصویر اٹھائی اور کمرے سے باہر پاگلوں کی طرح بھاگی اور اس کا دوپٹہ بھی کہیں بیچ میں ہی گر گیا تھا۔ تیمور پریشانی سے اس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے پیچھے بھاگے۔ مگر اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ تیمور کو اس کا نازک سا تلے والا کھسہ بھی کچھ دور مل گیا تھا۔ وہ کھسہ اٹھا کر آگے بڑھے۔

روشانے ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تھی۔ وہ ششدر سے آگے بڑھے تو ڈرائنگ روم کا ماحول یکسر بدلا ہوا تھا۔ روشانے شہاب امام کے سینے سے لگی بلک رہی تھی۔ بیگم شہاب اس کا شانہ جھنجھوڑ کر اس سے رونے کا سبب دریافت کر رہی تھیں۔ بیگم نفیسہ' عمران سلیم اور عریشہ سمیت۔ جو چند ملازمین چائے پیش کر رہے تھے' وہ بھی ہکا بکا یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ تیمور کی "انٹری" پر سب کی سوالیہ نظریں اور سرد نگاہیں ان کے ہاتھوں میں دبے دوپٹہ اور کھسے پر ٹک گئیں۔ کسی کا دھیان روشانے کی مٹھی میں دبی تصویر پر نہیں گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے تیمور؟ روشانے ایسے بی ہیو کیوں کر رہی ہے؟" شہاب امام کی سلاخوں جیسی نگاہیں تیمور کے ہاتھوں میں دبی چیزوں پر تھیں۔ ان کا انداز بے حد سرد تھا۔ عجیب ہی صورت حال ہو گئی تھی۔ تیمور کو یکایک سچویشن کی "سفاکی" کا اندازہ ہوا۔

"آپ لوگ جو سمجھ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تو اتابی کے کمرے میں ان کی تصویر دکھا رہا تھا روشانے کو۔ یکایک کیا ماجرا ہوا میں خود حیران ہوں۔" تیمور نے بہت وقار اور ضبط کے ساتھ جواب دیا۔

"روشنی۔۔۔۔ میری جان کیا ہوا؟" بیگم شہاب نے اسے پیار سے سہلایا۔ روشانے نے کچھ کہنے کے بجائے مٹھی میں دبی ہوئی تصویر ان کے سامنے کردی اور خود غش کھا کر شہاب امام کے بازوؤں میں جھول

گئی۔

☆ ☆ ☆

"نانی! "اپنے" گھر چلیں۔ وہ آپ کا گھر ہے۔ وہ در و دیوار ابھی بھی آپ کے منتظر ہیں۔" تیمور نے ان سے کہا۔

"بہت دیر میں سمجھ میں آیا ہے تیمور! کہ اینٹ پتھر کی عمارتوں سے اپنے جذبات و احساسات کی ڈور باندھ کر ہم کتنی بڑی غلطی کرتے ہیں۔ ارمان اس عمارت کے اینٹ پتھروں میں نہیں' میرے اندر بستے ہیں۔ وہ گھر تب تک "گھر" "تھا" جب تک ارمان میرے ساتھ تھے۔ ان کے جانے کے بعد تو بس۔۔۔ وہ صرف ایک چار دیواری بن کر رہ گیا تھا۔"

رخ مریم نے لبوں کو جنبش دی۔ تیمور چونکے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ رخ مریم کی جذباتی وابستگی اس گھر سے کیسی ہے۔ "تم مجھے ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ اس گھر کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ کہیں دور چلی جاؤں' مگر باوجود اس قدر تکالیف سہنے کے میں وہ جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتی تھی کہ ارمان کی یادیں مجھے جابجا ان کے ہونے کا احساس دلاتی تھیں۔ مگر ارمان تو ہمیشہ میرے اندر رہے ہیں' کاش۔۔۔ میں پہلے تمہاری بات مان لیتی۔"

انہوں نے اپنی جھیل سی آنکھوں کو موندا تو دو قطرے' جھریوں بھرے چہرے سے لڑھک کر ان کے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

"تو میری حوریہ۔۔۔ میری بچی شاید زندہ ہوتی۔"

"وہ حادثہ ان کی قسمت میں لکھا تھا نانی! زندگی اور موت کا تو وقت مقرر ہوتا ہے۔ بس۔۔۔ ہوا یہ کہ کچھ بدنیتوں کی نیت پھپھو اور پھوپھا کے حادثے سے جڑ گئی۔" تیمور نے آہستہ سے کہا۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ ہماری روشانے کو ایسی ہی پختگی و متانت و بردباری کی ضرورت ہے۔" بیگم شہاب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کی نظر اتاری تھی۔

☆ ☆ ☆

"ساری بازی الٹ گئی۔ جہاں سے کہانی ختم ہوئی تھی' وہیں سے پھر سے شروع ہو گئی۔" عمران تسلیم تلملاتے ہوئے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

"اس ناگن کو کچل دیا مگر اس چھٹکی بھر وجود کو ہم نہ ڈھونڈ سکے' نہ مار سکے۔ کمبخت کو کتنا تلاش کروایا تھا مگر وہ نہ ملی۔ پھر یہ سوچ کر خوش ہو گئے کہ شاید وہ گاڑی سے باہر کہیں گر ورگئی ہو اور کوئی جانور اسے اٹھا کر لے گیا ہو۔۔۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ "سنپولی" بغل میں ہی پل رہی ہے۔۔۔ اور تو اور اسی کا رشتہ ہم اپنے ہی بیٹے سے کرا رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تیمور نے اسے تصویریں دکھادیں اور وہ اپنے بچپن کی تصویر پہچان گئی۔ جان چھڑا دی اللہ نے۔ ورنہ الٹا لینے کے دینے پڑ جاتے۔" نفیسہ نفرت سے کہہ رہی تھیں۔

"مگر تیمور کو کیسے سمجھائیں؟ وہ تو دادی' پھپھی کا دیوانہ ہے اور روشانے' حوریہ کی بیٹی ہے۔" باسط نے انگور کا دانہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔ اسی بات کی مجھے بھی فکر ہے۔" نفیسہ سوچنے لگیں۔

"خیر۔۔۔ یہ تو آپ لوگوں کا مسئلہ ہے۔ میں تو کچھ اور کہنے آیا تھا۔" باسط نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم ہماری اولاد نہیں ہو جو اس طرح کہہ رہے ہو۔" عمران جل کر بولا۔

"اُفوہ۔۔۔ ڈیڈ! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ بے زار ہو کر بولا۔

"تو پھر؟" بیگم نفیسہ نے بائیں ابرو چڑھائی۔

"عریشہ کے لیے بہت اچھا پرپوزل آیا ہے۔" ریکا نے پستے کے چند دانے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا! کون لوگ ہیں؟" اس بار بیگم کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ بات ان کی اپنی بیٹی کی جو تھی "میرا چھوٹا بھائی۔۔۔ ارمغان لندن میں ہوتا ہے ناں۔ میری ممی نے اس کے لیے عریشہ کا رشتہ مانگا ہے۔" ریکا نے بتایا۔

"ارمغان! مگر۔۔۔ وہ تو۔۔۔ اس کی تو پہلے سے ایک بیوی۔۔۔" اس بار بیگم نفیسہ کے تیور بدل گئے۔

"تھی۔ اس نے ارمغان سے طلاق لے کر دوسری شادی کرلی ہے۔ وہاں ایک آدمی سے اس کا افیئر تھا' اور پھر وہاں تو یہ عام سی بات ہے کہ اگر میاں یا بیوی میں سے کسی کو بھی رشتہ ختم کرنا ہو تو اپنی زندگی آزادی سے گزار سکتے ہیں' وہ رشتہ ختم کرکے دوسرا رشتہ استوار کرسکتے ہیں۔ پھر ارمغان کا کروڑوں کا کاروبار ہے' جائیداد ہے اس کی۔ بینک بیلنس ہے۔۔۔ اچھا کیریکٹر ہے۔ اکیلا گھر ہے۔ نہ کوئی روکنے والا' نہ ٹوکنے والا۔ عریشہ وہاں عیش کرے گی۔ رانی بنا کر رکھے گا ارمغان اسے۔"

ریکا کہہ رہی تھی اور لفظوں سے نفیسہ کو سبز باغ دکھا رہی تھی اور نفیسہ نے خیالوں ہی خیالوں میں اس باغ میں محلات کی تعمیر شروع کردی تھی۔

"مگر۔۔۔" وہ ہچکچائی۔

"مگر کیا ممی' شکر کریں کہ یہاں سے جان چھوٹ رہی ہے اس کی۔ پاکستان میں کسی سے بیاہیں گی تو ان کے ناز نخرے الگ اٹھانے پڑیں گے۔ پھر جہیز و جائیداد کے الگ معاملات ہوں گے۔ ہمارے ارمغان سے شادی کرنے میں تو آپ لوگوں کا ہی فائدہ ہے۔ نہ ہمیں جہیز چاہیے' نہ جائیداد۔ بس آپ حامی بھریں تو ارمغان اور ممی' ڈیڈ آجائیں گے۔ نکاح سادگی سے کرکے باقی ساری رسومات لندن میں ہی ہوجائیں گی۔" ریکا نے "ان" کی ہتھیلی پر سرسوں جمائی تھی۔

"دیکھ لیں۔ زیادہ وقت نہیں ہے۔ ارمغان پرسوں آرہا ہے یہاں۔ اپنے کسی کام کے سلسلے میں۔ ویسے اور کافی اچھے رشتے ہیں مگر عریشہ چوں کہ گھر کی لڑکی ہے تو میں نے اسی کا نام پہلے لیا ہے۔ اب آپ لوگ وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے جواب دیں تاکہ میں ممی وغیرہ کو بھی بلالوں۔ پھر نکاح کے بعد پیپر ورک میں بھی خاصا ٹائم لگ جائے گا۔"

نفیسہ اور عمران کی ہچکچاہٹ دیکھ کر ریکا نے ان پر جذباتی و نفسیاتی دباؤ ڈالا۔

"ہمیں سوچنے کے لیے وقت دو ریکا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟" عمران نے کہا۔

"ڈیڈ! جلدی کی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے پھر اپنے گھر والوں کو کنفرم کرنا ہے کیونکہ اس رشتے کے ڈن ہونے کے بعد وہ لوگ پھر دوسری لڑکیوں کو دیکھنے کا سلسلہ کینسل کردیں گے۔ یوں بھی میرے گھر والوں کو پسند نہیں ہے گھر گھر جاکر لڑکیاں چھانٹنا۔" ریکا "تیلی" لگانے سے باز نہیں آئی تھی۔

باسط نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی مگر وہ کندھے جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ سوچ کر کل صبح تک جواب دے دیں۔ ارمغان ہم سب کا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ مجھے تو پرسنلی بہت پسند ہے۔" باسط نے درمیان میں کود کر جلتی ہوئی تیلی پر پھونک ماردی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر عریشہ سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔" بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

ریکا وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تو باسط نے ماں کو سمجھایا کہ ارمغان کے ساتھ شادی کرنے میں کس قدر فائدے ہیں۔ جوں جوں وہ۔۔۔ فوائد گنوا تا رہا' توں توں بیگم نفیسہ ارمغان کے حق میں ہوتی چلی گئیں۔ ارمغان کے ساتھ عریشہ کی شادی کے اتنے فوائد سن کر باسط کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ماں کی "ہاں" کے ساتھ ہی وہاں سے اٹھا تھا۔

"تم عجیب ہو۔ کم از کم کچھ مہلت تو ضروری ہوتی ہے ناں۔ میں ارمغان کے بارے میں معلومات کروالیتا۔ لندن میں میرے ملنے جلنے والے ہیں۔ پھر ریکا یکایک اتنی اچھی کیسے ہوگئی کہ عریشہ کو بھابھی بنانے پر راضی ہوگئی۔ اگر کوئی گڑبڑ والی بات ہوئی تو۔۔۔؟" عمران بیوی پر ناراض ہوئے۔

"آپ کو تو ہر وقت شک رہتا ہے ہر کسی پہ۔۔۔ بھئی ریکا ہماری بہو ہے۔ اس نے عریشہ کو دیکھا بھالا ہوا ہے۔ سوچا ہوگا کہ اس سے اچھی کون سی لڑکی ہوگی۔ عریشہ جیسی ہے اس کے سامنے ہے۔ اگر ہماری بیٹی میں کوئی نقص ہوتا تو وہ تھوڑی اپنے بھائی کے لیے عریشہ کو مانگتی۔"

عمران سلیم نے حیرت سے بیوی کی شکل دیکھی۔

کیسا پینترا بدلا تھا۔ "مگر۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"۔۔۔ باسط کی باتیں نہیں سنیں؟ ارے لڑکا کروڑپتی ہے۔ اس کے ہاں عریشہ بھی سکھی زندگی گزارے گی اور ہمارا بھی بھلا ہوتا رہے گا۔" نفیسہ نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ عمران کو دیکھا اور دونوں معنی خیز ہنسی ہنس پڑے۔

روشانے اس دن کے بعد اسپتال نہیں آئی تھی۔ اسے یہ سب جان کر شدید دھچکا لگا تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ جنہیں وہ ماں باپ سمجھتی آئی تھی ان سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ تیمور نے بھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا خیال تھا۔ روشانے کو وقت دینا چاہیے تاکہ وہ خود کو سنبھال سکے۔ آج وہ آئے تھے۔ وہ اس وقت لان میں بیٹھی تھی۔ وہ اس کے پاس آگئے۔

"اور کتنا آرام کرنے کا ارادہ ہے؟ ایک ڈاکٹر کو بالکل زیب نہیں دیتا کہ اتنے دنوں کے لیے چھٹی پر جائے۔" وہ معمول کے انداز میں بولے۔

روشانے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"کچھ خاطر تواضع نہیں کرو گی؟ اچھی سی چائے پلواؤ۔ ٹھہرو میں کہتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگے۔

"تیمور۔۔۔" اس نے نقاہت کی وجہ سے آہستہ سے پکارا۔ تیمور ٹھٹک کر مڑے۔

"لوگ اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟ ذرا سے فائدے کے لیے زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ اللہ تو بے رحم نہیں ہے تیمور۔۔۔ مگر اس کے بندے بہت ظالم ہیں۔۔۔ میں کس کو اپنا کہوں؟ جو موجود ہیں۔۔۔ جن کے ساتھ بچپن کے گلابی دن اور چاندی جیسی راتیں گزاریں۔۔۔ جنہوں نے ایثار و قربانی کی انتہا کر دی۔ جن کی محبتوں کی مقروض ہوں۔۔۔ جن کی چھاؤں میں زندگی کے تیس سال گزار دیے۔ جنہوں نے کبھی "غیر" "لے پالک" ہونے کا گمان تک نہ ہونے دیا۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں انسان سمجھوں یا فرشتہ کہوں؟۔۔۔ یا پھر وہ۔۔۔ جن کا نام ہی سنتی تھی۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ کسی اور کے حوالوں اور کسی اور کے احساس کے ساتھ۔ اپنی سگی ماں کی گود میں اپنی تصویر دیکھی تو۔۔۔ تو یہ احساس ہوا کہ جیسے اس نے مجھے میری ماں وسیم شہاب سے چھین لیا ہو۔۔۔ انابی۔۔۔ میری نانی۔۔۔ آپ میرے اپنے۔۔۔ پھر بھی عجیب سا احساس ہوا۔۔۔ ساری کہانی تو پہلے ہی جان چکی تھی ماسوائے اس کے۔۔۔ کہ میں تو خود اس قصے کا حصہ ہوں۔"

وہ آنکھوں کو موندے ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ تیمور نے اسے روکا نہیں۔ بس سنتے رہے۔ وہ تھک گئی تھی۔ پھر ہولے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تیمور کی سیاہ بھنورا آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری دو دو مائیں اور دو دو باپ ہیں۔ جنہوں نے تمہیں جنم دیا۔ وہ بھی بہت نیک فطرت اور بہترین لوگ تھے۔ تمہاری ماں حوریہ، میری پھپھو بہترین انسان تھیں۔ میرا اچھا خاصا وقت ان کے ساتھ گزرا تھا۔ تم اپنے فادر کو بھی نہیں جانتیں۔ مگر وہ اپنے وقت کے مشہور وکیل تھے اور ان کی انسانیت کا ادراک ان کے اس فعل سے ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک مشکل میں گھری ہوئی لڑکی کا ساتھ دینے کے لیے اپنی پوری زندگی اس کے نام کر دی۔ تم ایسے انسان دوست لوگوں کی اولاد ہو روشنی! انابی اور دادا ابا جیسے عظیم لوگوں کا خون ہو تم۔ جن کی گھٹی ہی میں خلوص ہے، ہمدردی ہے، انسانیت ہے تم نے جن ہاتھوں میں پرورش پائی خوش قسمتی سے وہ بھی ایسے ہی نکلے۔ ایک بالکل غیر بچی، جس کے باپ دادا سے ان کی صرف دوستی تھی۔ انہوں نے اس بچی کی جان بچانے کے لیے کیا کیا قربانیاں دیں۔۔۔ تم سا خوش نصیب کون ہو گا روشانے۔۔۔ تم خود کو پڑھو تو سطر سطر پر رقم داستاں ان لوگوں کی ہے۔ جن پر جان نثار کر دینے کو دل چاہتا ہے۔ اور ایک میں ہوں۔۔۔ جسے اپنے ماں باپ پر بھی شرم آتی ہے۔"

تیمور نے کہا۔۔۔ تو روشنی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ روشانے۔۔۔! مجھے تم پر رشک آتا ہے۔۔۔

تم میرے لیے کیا ہو میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ تم میری انابی کی دعا ہو۔ جو وہ مجھے دیتی تھیں۔ تم پھپھو حوریہ کا وہ پیار ہو... جو وہ مجھ پر نچھاور کرتی تھیں... تم میرے لیے خدا کی نعمت' اس کا انعام ہو' جو اس نے دنیا میں مجھے دیا ہے۔"

تیمور نے اس کا نازک سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ روشانے نے ان کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر لالی سی جھلک مارنے لگی تھی۔

"تم میری ہو... میری بنوگی... مگر ہم اپنی دنیا اس چاردیواری میں نہیں بسائیں گے' جہاں انسان نہیں۔ روبوٹ رہائش پذیر ہیں۔ بس اب تم صحت یاب ہوجاؤ۔"

تیمور نے نرمی سے اس کے ہاتھ کی پشت کو لبوں سے چھوا۔ وہ باوجود نقاہت کے کانپ گئی۔ تیمور نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ' چائے یہاں ہوگی یا کہیں باہر چلیں؟"

"باہر چلیں..." اس نے مسکرا کر کہا۔

"کبھی دھند چھٹنے پر سورج کی کرنوں کی چمک دیکھی ہے؟ اگر آئینہ ہوتا تو تمہیں دکھا دیتا۔" وہ سیل فون نکالتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

روشانے نے جھینپ کر چہرہ موڑ لیا۔

☆ ☆ ☆

روشانے کی صحت یابی کی خوشی میں بیگم شہاب نے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ تیمور کے گھر والے بھی مدعو تھے۔ نفیسہ بیگم اور عمران سلیم اس بات پر حیران بھی تھے اور خوش بھی کہ شہاب امام اور بیگم شہاب نے حقائق جاننے کے باوجود تیمور اور روشانے کا رشتہ ختم نہیں کیا تھا بلکہ اسی دعوت میں دونوں کی شادی کا باقاعدہ اعلان کردیا تھا۔ انابی بھی نفیسہ بیگم کے بے حد اصرار اور معافیوں کے بعد واپس گھر چلی گئی تھیں۔ مگر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے انہیں بہت زیادہ خود کو سمجھانا پڑا تھا۔ عریشہ اور تیمور کی شادی کی تاریخ ایک ہی رکھی گئی تھی۔

ریکا کے گھر والے بھی آئے ہوئے تھے۔ خاصی گہما گہمی تھی۔ مسز رفیقہ نے سارے کاموں اور رسومات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انابی کو خوشیوں کے اس دور میں وہ سب لوگ بہت یاد آرہے تھے جنہیں وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

پہلے تیمور کی بارات جانی تھی اور اگلے دن عریشہ کی رخصتی تھی۔ ولیمہ کا انتظام بھی اسی طرح تھا۔ تیمور کا ولیمہ پہلے تھا اور ارمغان کا اس سے دو دن بعد۔ عریشہ اور ارمغان کا نکاح اسکائپ پر ہوچکا تھا۔

نکاح سے پہلے عمران سلیم نے تیمور کی غیر موجودگی میں شہاب امام سے جہیز کے نام پر اچھی خاصی جائیداد اور رقم کا مطالبہ کردیا۔

"لیکن آپ نے پہلے تو ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔" شہاب امام کو سخت غصہ آیا۔

"ہم نے سوچا کہ اکلوتی بیٹی ہے تو آپ لوگ از خود کچھ نہ کچھ دیں گے ضرور... اور اب بھی جو ہے' وہ آپ کی بیٹی کا ہی تو ہے۔ بجائے بحث میں پڑنے کے یا غلط سمت سوچنے کے' یہ ضرور سوچ لیں کہ آپ کی بیٹی کی بارات "آئی" ہے... اگر باعزت باپ نے باحیثیت ہونے کے باوجود داماد اور بیٹی کو کچھ نہیں دیا تو کتنی سبکی ہوگی اور اگر بغیر دلہن کے بارات واپس ہوگئی تو پھر تو ڈوب مرنے کا مقام ہوگا..."

عمران سلیم نے شرافت کا نقاب اتار دیا تھا۔ شہاب امام نے اپنے جذبات کو جہاں تک ممکن تھا قابو میں رکھا ہوا تھا۔

"تو ٹھیک ہے ڈیڈ! پھر آپ بھی حق مہر کے معاملے میں کچھ نہیں بولیں گے۔ میں اپنے حصے کی جائیداد' انابی والا بنگلہ اور بزنس میں جو میرے شیئرز ہیں' وہ حق مہر میں لکھ کر روشانے کو دوں گا۔" نجانے کس پل تیمور وہاں آکر ان کی گفتگو سن چکے تھے۔

"تیمور! کیا بک رہے ہو؟" عمران سلیم نے ڈانٹ پلائی۔

"بس ڈیڈ! بہت ہوچکا۔ آخر کتنی دولت چاہیے آپ کو؟ کتنی ہوس ہے آپ کی جو ختم ہی نہیں ہوتی۔ میں نے روشانے سے شادی کسی ہوس یا لالچ کی بنا پر نہیں کی۔ پہلے ہی ہمارے پاس ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔" تیمور کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ عمران سلیم کا لحاظ وہ صرف باپ کے رشتے کی وجہ سے کررہے تھے۔

"جو دل میں آئے کرو۔" عمران سلیم غصے سے پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

"میں اپنے ڈیڈ کی طرف سے معافی مانگتا ہوں انکل! لالچ کی پٹی جب ان کی آنکھوں سے کھلے گی تب انہیں احساس ضرور ہوگا کہ یہ کیا کیا کرچکے ہیں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔" تیمور نے نظریں جھکا کر سسر سے معافی مانگی۔ آج اپنے باپ کی وجہ سے اس کا سر جھک گیا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔ ہیرے اور کنکر کی پہچان ہے ہمیں، چلو۔" انہوں نے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھ کر وقار سے کہا۔

ولیمہ کی رسومات میں نفیسہ اور عمران دونوں ہی کے منہ بنے ہوئے تھے۔ مگر تیمور کو اب ان کے موڈ کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ سلسلہ رک جائے۔

روشانے کو اپنے سسر اور ساس کے رویے کی سرد مہری کی وجہ معلوم تھی۔ مگر جس ظرف کا مظاہرہ اس نے کیا تھا تیمور اس سے بے حد متاثر تھے۔

"اپنے خاندان کی بربادی کا بدلہ میں نے اپنے اللہ پر چھوڑ دیا ہے تیمور۔ وہ بہتر بدلہ لینے والا ہے۔ میں نے بس آپ کی خاطر ان سب کو بھی قبول کرلیا ہے۔" شادی کی رات تیمور سے روشانے نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

تیمور اپنے اور روشانے کے لیے علیحدہ رہائش گاہ کا بندوبست کرچکے تھے۔ بس عریشہ کی شادی ہوجانے کا انتظار تھا۔ اس کی شادی کے ٹھیک چوتھے روز تیمور بھی روشنی اور اناں بی کے ہمراہ اس بنگلے میں شفٹ ہوگئے جو انہوں نے اناں بی کے نام سے خریدا تھا، اور ایسا روشنی کے مشورے سے ہوا تھا۔ تیمور اور روشنی نے یہ بنگلہ رخ مریم کے لیے "تحفتاً" لیا تھا۔

"آپ اس گھر کی مالکن ہیں۔ جو کرنا ہے کریں۔ مجھے تو بس آپ کی گود میں سر رکھ کر سونا ہے۔ بہت تڑپایا ہے آپ نے۔ بہت بھگایا ہے۔ بہت ستایا ہے۔ بس..... اب میرے سارے نخرے آپ نے اٹھانے ہیں۔"

تیمور ان کی گود میں سر رکھ کر بول رہے تھے اور رخ مریم ان کے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ وہ حیرت انگیز حد تک عبداللہ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

"مجھے لگتا ہے تیمور جیسے عبداللہ کو خدا نے تمہاری شکل میں میری حفاظت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔" انہوں نے تیمور کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اطمینان سے پلکیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کا کام خاصی تیزی سے ہورہا تھا۔ بہت سے مخیر پاکستانی بھی دنیا بھر سے حسب توفیق مدد کررہے تھے۔

"پہلا پتھر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر اللہ خود ہی مدد فرمادیتا ہے۔ تمہاری نیت اور ارادہ اچھا ہے، تو خدا نے تمہاری مدد کے لیے غیبی امداد بھیجنی شروع کردی ہے۔ یہ تو صرف ابتدا ہے..... قدم بڑھاتے رہو، خدا تمہارا ساتھ دے گا۔ جب ہم "ذات" کے محور سے نکل آتے ہیں تب ساری کائنات ہماری ساتھی بن جاتی ہے۔ تم کو تو ذات کے محور میں خدا نے کبھی قید ہی نہیں کیا تھا تیمور..... تم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے..... سب کی فکر کرنے والے۔ سب کی مدد کرنے والے۔ سب کے لیے درد اپنے اندر محسوس کرنے والے۔ تو "وہ" تمہیں کس طرح تنہا چھوڑ دیتا؟ تم تو اس کے پیارے بندے ہو۔" وہ ایئرپورٹ پر کھڑی ہوئی کہہ رہی

تھیں۔

آج روشانے اور تیمور کی فلائٹ تھی۔ وہ دونوں آج لندن جا رہے تھے۔ روشانے کو اسپیشلائزیشن کرنی تھی اور تیمور کو وہاں میٹنگ اٹینڈ کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ جا کر یو این او کے چیف سے ملاقات کرنی تھی۔ دو سال قبل تیمور' روشانے' رخ مریم' شہاب امام اور بیگم شہاب کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کر کے آیا تھا۔ انہوں نے نفیسہ اور عمران کو بہت کہا کہ وہ بھی چل کر یہ فریضہ ادا کرلیں مگر دونوں نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ باسط اس عرصہ میں ریکا کے ساتھ لندن جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد عمران پر یہ عقدہ کھلا کہ باسط جاتے جاتے ان کا تمام بزنس و جائیداد بیچ باچ کر گیا ہے۔ اب جس گھر میں وہ رہتے تھے۔ بس وہی ان کی کل متاع بچی تھی یا پھر نفیسہ کے چند زیورات بچے تھے۔ تیمور ان کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ مگر دونوں میاں بیوی کی ناک ابھی تک "اونچی" تھی۔ وقت کے تھپیڑوں نے بھی ان کی گردنوں کے سریوں کو نہ پگھلایا تھا۔ پھر اس کے بعد باسط نے دونوں کو اپنے پاس ہی بلوالیا تھا اور تیمور سے ان کے گھر والوں کا رابطہ بالکل ہی منقطع ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

تیمور کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے جا رہے تھے اور جس قدر وہ کامیابیاں حاصل کرتے جا رہے تھے اسی قدر ان کی گردن اپنے رب کے حضور جھکتی چلی جا رہی تھی۔ بے تحاشا کامیابیوں نے دوسرے لوگوں کی طرح ان کی گردن میں "سریا" نہیں ڈالا تھا۔ انہوں نے اپنے پیروں کو کبھی زمین سے اٹھایا ہی نہیں تھا۔ وہ روشنی سے اکثر کہتے۔

"انسان کا ٹھکانہ زمین پر ہے۔ جو زمین پر نہیں رہتے۔ پھر وہ کہیں بسیرا نہیں کر سکتے۔ مجھے بے ٹھکانا نہیں ہونا ہے۔" تیمور اور روشانے کے چلے جانے کے بعد سسٹر رفیقہ انالی کے پاس شفٹ ہو گئی تھی۔ اپنا پورا مکان روشانے کے کہنے پر اس نے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ روشانے کا کلینک اب وہی سنبھال رہی تھی۔ شہاب امام اور بیگم شہاب بھی تقریباً" روز ہی انالی سے ملنے آتے تھے۔ کہ دونوں کے بنگلے قریب قریب تھے۔

تیمور اور روشانے کو لندن گئے ہوئے بارہ روز گزر گئے تھے۔ فی الحال روشانے اور تیمور کرائے کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ اس روز تیمور نے روشانے سے کہا تھا کہ وہ باسط اور عریشہ کے گھر جائیں گے اپنے ماں باپ سے ملنے' روشانے کی ان سے ملاقات ڈنر پر ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ اتنے چپ چپ کیوں ہیں؟" وہ سوپ سرو کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ تیمور جب سے واپس آئے تھے بہت زیادہ خاموش تھے۔ "ممی' ڈیڈ سے ملاقات ہوئی؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"بہت برا ہوا ہے روشنی۔ بہت برا۔" وہ دھیرے سے بولے۔

"اللہ خیر کرے۔ کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئی۔

"عریشہ کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ ارمغان نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی بلکہ وہ کچھ دنوں کے لیے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ عریشہ کے ساتھ شادی کا سن کر وہ اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ واپس آگئی اور اس نے ارمغان کو دھمکی دی' اگر اس نے عریشہ کو طلاق نہ دی تو وہ اس پر کیس دائر کردے گی۔ ارمغان نے عریشہ کو طلاق دے دی تھی شادی کے ایک سال بعد۔ اس کی ایک بچی بھی ہے۔" وہ بہت دکھ سے بتا رہے تھے۔

"اوہ! پھر؟" اسے بھی دکھ ہوا۔

"وہ بچی سمیت ارمغان نے عریشہ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر جب عریشہ نے قانون کی مدد لینے کی دھمکی دی تو اس نے بچی کو اس سے چھین کر مار دینے کی دھمکی دی۔ اب عریشہ' ارمغان کے گھر پر ہی رہتی ہے مگر اس کی اور اس کی پہلی بیوی کی ملازمہ بن کر۔ بچی بھی اس کے ساتھ ہے۔ اور ممی ڈیڈ۔"

تیمور نے گہری سانس لی۔

"باسط اور ریکا بھابھی نے ان دونوں کو ملازم بنا کر رکھا ہوا ہے۔ پچھلے مہینے ڈیڈ پر فالج کا اٹیک ہوگیا تو

انہیں اٹھا کر اسپتال پھینک آئے۔ ممی کو سانس کی تکلیف ہو گئی تھی۔ انہیں اٹھا کر "اولڈ ہاؤس" بھجوادیا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بچوں کی طرح رونے لگے تھے۔ روشانے تڑپ کر ان کے پاس آئی۔

"سب ان کے کیے کی سزائیں ہیں" روشانے نے۔ انسان اپنی سرمستی میں اپنی اوقات بھول جاتا ہے۔ زیادہ کی ہوس اسے انسانیت کے درجے سے گرا دیتی ہے۔ ہمیں کیوں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کھیتی ہے۔ جو ہم بوئیں گے وہی ہمیں کاٹنا ہے اور ہماری اولاد کو بھی۔ کیوں ہمیں اپنے حصے سے زیادہ چاہیے...؟"

وہ گویا پھٹ پڑے تھے۔ روشانے کے پاس لفظ نہیں تھے جو ان کو تسلی دے پاتے۔ بس اس نے محبت سے انہیں اپنی آغوش میں بھرلیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

اور آج پندرہ سالوں کے بعد وہ سب کے لیے چائے بناتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے اپنے خاندان' اپنے شوہر کے لیے اس وقت اتنی بڑی قربانی نہ دی ہوتی تو کیا ہوتا؟ کیا تیمور کے لبوں پر آج یہ ہنسی ہوتی؟ کیا ان کی آنکھوں میں وہ چمک ہوتی جو اس وقت وہ دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ چہرہ اس طرح روشن ہوتا جیسے آج تھا؟ تیمور لان میں تھے۔ اپنی دس سالہ بیٹی روشان اور چار سالہ بیٹے یوسف کے ساتھ پتنگ اڑا رہے تھے۔ اناں لان میں ہی کرسی پر بیٹھی تھیں اور تسبیح کررہی تھیں۔ بہت زیادہ ضعیفی نے انہیں کمزور کردیا تھا اور ان کے قریب قریب کرسیاں ڈالے شہاب امام' بیگم شہاب' نفیسہ' عمران اور عریشہ بیٹھے تھے۔ عریشہ کے قریب ہی اس کا دوسرا شوہر ڈاکٹر فیضان بیٹھے تھے۔ عریشہ کی بیٹی ثنا لان میں لگے جھولے پر جھول رہی تھی۔

آج روشان کی سالگرہ تھی اور وہ سب اسی لیے

یہاں اکٹھا تھے۔ اس روز روشانے نے اسپیشلائزیشن کرنے کا ارادہ ترک کرکے تیمور سے کہا تھا کہ وہ عریشہ' اس کی بیٹی' نفیسہ اور عمران کو لے کر واپس پاکستان جائے گی۔ پھر چند مہینوں بعد وہ سب لوگ واپس وطن آگئے تھے۔ اپنے اپنے مردہ ضمیر کو پھر سے زندہ کرکے انہوں نے اناجی' روشانے اور تیمور سے معافی مانگی تھی۔

مریم پیلس پھر سے آباد ہوگیا تھا۔ اناجی اپنے گھر لوٹ آئی تھیں۔ عریشہ کی شادی تیمور نے اپنے ایک بہت اچھے سے دوست سے کرادی تھی۔ فیضان بہت اچھا ڈاکٹر اور بہت اچھا انسان تھا۔ اس نے عریشہ کو اس کی بیٹی سمیت قبول کیا تھا۔ اور اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی کی طرح رکھا تھا۔ "وائٹ ہاؤس" کی ہوا کھا کر نفیسہ بیگم کی بینائی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ انہیں بہت کم نظر آتا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں۔ عمران سلیم کا مسلسل علاج ہونے کی وجہ سے اس کا جسم حرکت تو کرتا تھا' مگر دایاں ہاتھ بالکل بے کار ہوچکا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس سے اس نے رخ مریم کو دھکا دیا تھا اور اس اندھیری رات کی پروا کیے بغیر اسے گھر سے نکالا تھا۔ جس رات زخموں سے چور نڈھال رخ مریم' روشانے کی کار کے سامنے آگئی تھی جس جس نے جو جو کیا تھا' وہی پایا تھا۔

مسز رفیقہ چائے سمیت کچن سے جاچکی تھی۔ ہر سال کی طرح یہ پارٹی بھی چھوٹے سے پیمانے پر منعقد کی گئی تھی اور صرف گھر کے افراد ہی مدعو تھے۔

"آپ بھی آجائیں۔" رفیقہ نے جاتے جاتے کہا۔

"آرہی ہوں۔ تم سرو کرو تب تک۔" اس نے آنکھوں کو مسلا اور بولی۔ وہ پھر کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ سب موجود تھے' مگر تیمور نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ کھڑکی سے پلٹی ہی تھی کہ عین پیچھے کھڑے تیمور سے ٹکرا گئی۔

"اوہ... سوری۔" اس نے جھینپ کر کہا۔

"پرانی عادت ہے محترمہ... سوری کہنا چھوڑ دیں۔" تیمور شوخی سے مسکرائے اور اس کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کردیا۔

"ارے رے... کیا کررہے ہیں؟ سب موجود ہیں۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"تو کیا ہوا۔ قانونی و شرعی بیوی ہو میری۔" تیمور نے اسے چھیڑا۔

"شادی کے اتنے سال بعد بھی تم بلش کرتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہو۔" انہوں نے اسے چھیڑا۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔" روشنی نے بات بدلنے کو باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"ہوں... اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔" تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ سب بھی میرے اپنے ہیں تیمور... اپنوں سے بچ کر اور جان چھڑا کر جائیں بھی تو جائیں کہاں... مجھے میرے بزرگوں نے کبھی "فرار" کا راستہ دکھایا ہی نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ماضی خود کو دہرائے۔ جو درد ہم نے سہے ہیں اللہ نہ کرے کہ ہماری اولاد بھی وہ سہے۔"

اس کی نگاہیں سب پر سے ہوتی ہوئی رخ مریم پر ٹھہر گئیں۔ رخ مریم کے تحسین' شفیق و شفاف چہرے پر وہ اطمینان ہی اطمینان دیکھ رہی تھی اور پھر اسی پل روشان اور یوسف کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسے اور ان کی ہنسی کی قلقاریوں سے لان کا ہر پھول' ہر پتی مہکنے لگے۔

"بس... یہی تو حاصل زیست ہے۔" اس نے سرور مسکان کے ساتھ اور نم آنکھوں کے ساتھ تیمور سے کہا اور تیمور نے اپنے بازو کے حصار میں اسے محفوظ کرلیا۔

"آج ہم نے اپنے والدین کے لیے جو کیا ہے' وہ دراصل وہ بیج ہیں' جنہیں کل ہم نے بھی کاٹنا ہے... جب وہ مکمل فصل کے روپ میں سامنے آئیں گے۔ شکر ہے کہ ہم نے کوئی بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا نہیں رکھا۔" تیمور نے اطمینان سے اس کے سر پر بوسہ دیا اور تشکر بھری نظریں آسمان کی جانب اٹھائیں۔

✿
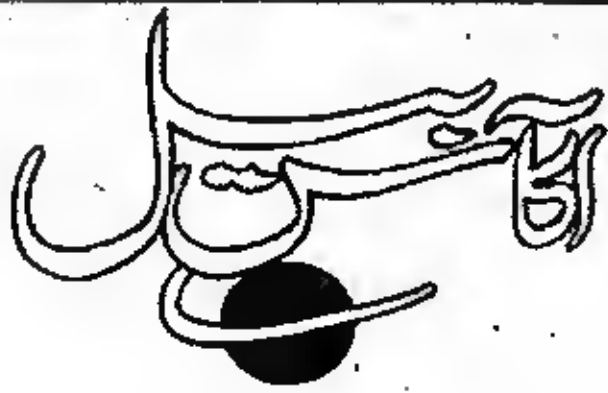
"نی طاہرہ! انی طاہرہ! اللہ تجھے غرق کرے پانی تو دے
جا مجھے۔" معذور ساس بستر پر پڑے پڑے چلائی اور چیخ
چیخ کر تھک گئی، نہ بیٹے نے دھیان دیا، نہ بہو نے پانی دیا،
حلق میں خار دار جھاڑیاں اگ آئی تھیں، مگر پیر کب

کے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اٹھنے کی کوشش میں جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑتے' منہ کے بل گرتی اور اٹھانے کو کس نے دوڑنا تھا۔

بڑا بیٹا تھوڑا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ کام پر گیا تھا۔ پیچھے چھوٹا بیٹا اور بہو بس۔ سارا دن پڑے پڑے بہو کے دو بولوں کو ترس جاتی۔

"ہائے ناس پٹی لڑ ہی لیتی مجھ سے۔ چلو زبان ہی ہل جل لیتی' پر نہ جی۔ بہو نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی اور بیٹوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ بھلے سے مرے یا جیے۔ بہو بیاہ کے لائی تھی کہ چلو گھر سنبھال لے گی' بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان پھر تو سکھ کے سانس لے گی۔ پاس پڑوس والی ہمسائیاں جو بہوؤں کی ڈسی تھیں سمجھاتی تھیں کہ

"بچ کے رہنا راج دھانی ہاتھ سے گئی اب بیٹے بھی گئے۔ گھر بھی گیا۔" مگر وہ ذرا مختلف طرح کی ساس تھی۔

"بیٹوں کا اچار ڈالنا ہے' بھئی سوؤں کے ہی ہیں اور پیسوں کی کیا ضرورت ہے' اب میں نے کون سا بیٹی کا داج اکٹھا کرنا ہے بس دو وقت کی روٹی ملتی رہے اور دو چار میٹھے بول بس۔ میں نے خالی خولی گھر کا کیا کرنا ہے۔"

وہ صرف باتیں ہی نہیں کرتی تھی اس نے واقعی ہی بہو کو تنکے جتنی تکلیف بھی نہ ہونے دی نہ بیٹے کو پھانس کر رکھنے کی کوشش کی' نہ دونوں کے مل بیٹھنے پر جل کے راکھ ہوئی بلکہ وہ تو ان کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر سوتی بن جاتی کہ کہیں دونوں اس کے لحاظ میں چپ نہ کر جائیں۔

بڑا بیٹا سیدھا سادا محبت کرنے والا تھا' مگر بہو خوب صورت اور ذرا نک چڑھی تھی۔ جی چاہتا تو ہنستی نہیں تو چپ رہتی۔

چھوٹا ندیم پہلے پہل تو گھر سے دور رہا کہ نئی نئی شادی ہے' مگر اب وہ مستقل گھر میں دکھائی دیتا تھا۔ ظہراں بی بی چپکے چپکے دیکھتی رہتی وہ تو جیسے اس گھر کا حصہ ہی نہیں تھی۔

چھوٹا بیٹا ندیم بھابھی بھابھی کرتا پھرتا' دو بہرے معنوں میں سانس بھی بھابھی سے پوچھ کے لیتا۔ شاید وہ تھی ہی اتنی اچھی۔ طاہرہ اور ندیم ہم عمر تھے اور طاہرہ کا شوہر علیم سال دو سال بڑا تھا دونوں سے۔ وہ روز شام کو سموسے' بسکٹ' فروٹ لاتا' مگر وہ دیکھتی بڑا بیٹا خراٹے لے رہا ہوتا یا اس کے کام پر چلے جانے کے بعد وہی چیزیں طاہرہ اور ندیم ہنس ہنس کے کھا رہے ہوتے دونوں کے قہقہے آسمان کو چھوتے۔

ظہراں بی بی جہاں دیدہ تھی' وہ کوشش کرتی تھی کہ بیٹے کے جانے کے بعد طاہرہ اس کے پاس بیٹھا کرے۔ وہ ان سنی کردیتی تھی۔ وہ پڑے پڑے پریشان ہوتی رہتی کیا پتا یہ اس کا وہم ہو' مگر وہ رہ کر احساس ہوتا کہ یہ محض وہم نہیں' بڑا بیٹا نہایت صاف ستھرے ذہن کا مالک تھا۔ وہ اپنے سامنے بھی دونوں کی بے تکلفی کو دیور بھابھی کے بجائے بہن بھائیوں والا پیار سمجھتا تھا اکثر وہ سوجاتا تھا اور ندیم اور طاہرہ رات گئے تک جاگتے رہتے تھے۔ وہ سب کے سامنے بیٹھے ہنستے رہتے' گھر کے مسائل تھے ہی کیا۔ یہ لینا ہے وہ نہیں لینا' بچت کیسے کرنی ہے۔ کیسا گھر بنانا ہے کیسا نہیں۔ مشورے ہوتے رہتے اور پھر نجانے کب دونوں سوتے پتا نہیں کب' بہو' بیٹے کے پاس جاتی تھی اور جاتی بھی تھی کہ نہیں۔

ظہراں بی بی کی آنکھیں انہیں دیکھ دیکھ کر تھکنے لگتیں' مگر وہ باتیں کرتے تھکتے نہیں تھے۔ ظہراں بی بی آوازیں پیدا کرکے انہیں احساس دلانے کی کوشش کرتی۔ کبھی لاٹھی سے بلی بھگاتی' کبھی پانی مانگ لیا' کبھی کروٹ بدل لی کہ وہ ہوشیار ہوجائیں جان جائیں وہ دونوں نہیں جاگ رہے تھے بلکہ ایک تیسرا شخص بھی گھر میں بیدار ہے۔ جاگ رہا ہے' چھوٹے بیٹے کی آنکھوں کی چمک اور والہانہ پن ظہراں بی بی سے چھپا ہوا نہیں تھا اور بڑے بیٹے کی بے ہوشی بھی اسے چین نہ لینے دیتی تھی جو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ گھروں کو تباہ کر ڈالتی ہیں طاہرہ جیسی عورتیں۔ وہ اگر منہ کھولتی تو بڑا بیٹا چھوٹے کو مار دیتا اور خود پھانسی چڑھ جاتا۔ طاہرہ کوئی اور

گھر ڈھونڈ لیتی خالی ہاتھ تو ظہراں بی بی نے ہی رہنا تھا۔ وہ دو بیٹوں کی بربادی کا غم نہیں سہہ سکتی تھی اور بدنامی، رسوائی تو مقدر تھی ہی۔

صبح ناشتے کا وقت تھا۔ علیم ناشتا کر کے گھر سے جا چکا تھا۔ ندیم گرم گرم خستہ پراٹھے، دہی، اچار اور گرما گرم نہاری میں لقمے ڈبو ڈبو کر خود بھی کھا رہا تھا اور بہو بھی شوہر کو خالی چائے اور باسی روٹی کے ساتھ ناشتا کروا کر رخصت کرنے کے بعد ندیم کے ہاتھ سے لقمے لے رہی تھی۔ دونوں میں کوئی خوف خدا نہیں تھا۔ اپنے بھائی کے کمائے ہوئے رزق میں سے کھا بھی رہا تھا اور پلید بھی کر رہا تھا۔

ظہراں بی بی کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، وہ آج کل بلاوجہ ہی غصہ کرنے لگی تھی زور سے چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتی، مگر نقار خانے میں ان کی آواز پر کان کس نے دھرنے تھے، وہ اس وقت کو کوستی تھی جب طاہرہ جیسی ڈائن کو اس نے پسند کیا تھا۔

"یااللہ تو میری مدد کر، مجھ بوڑھی مسکین پر رحم کھا۔" وہ جھولیاں اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتی۔ "یااللہ اس دکھ دا حل وے دے میرے مولا میں کمزور ہوں۔" اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بہو کو جوتوں سے پیٹے اس پر ڈنڈے برسائے، مگر اللہ نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ بیٹے دو سیکنڈ سے زیادہ ٹکتے نہیں تھے پاس، کون سننے والا تھا کوئی بھی نہیں۔

ایک دن پتا چلا کہ ندیم کام سے لگ گیا ہے اسے کچھ سکھ کی سانسیں آئی تھیں کہ اب بہو گھر میں اکیلی رہے گی۔ دونوں بیٹے شام کو گھر لوٹا کریں گے تو بہو کا دھیان بٹ جائے گا اور چار پیسے جمع ہو گئے تو چھوٹے کی شادی کر دیں گی، اللہ رحم کر دے گا اسے کچھ سکون محسوس ہوا تھا نیم کے گھنے درخت تھے اس نے آنکھیں موندلی تھیں ویسے بھی راتوں کو جاگ جاگ کر تھکن سے برا حال تھا۔

آج ندیم کام پہ گیا تھا۔ بہو اکیلی تھی ظہراں بی بی سو گئی تھی، مگر بڑھاپے کی نیند، نیند نہیں ہوتی درد سونے کہاں دیتے ہیں وہ بھی کچی پکی نیند میں تھی اندر سے ہنسی کی آواز نے اسے جگا دیا تھا یہ اس کے بیٹے ندیم اور بہو کے ہنسنے کی آواز تھی، دونوں اندر پلنگ پر بیٹھے تھے کہ لیٹے تھے۔ معلوم نہیں تھا، مگر شرمگین ہنسی بہت کچھ سمجھاتی تھی۔ یااللہ میں کیا کروں۔

"اگر علیم آگیا تو؟" وہ کانپ گئی تھی۔

"طاہرہ نی طاہرہ! اٹھ مجھے روٹی تھپ دے۔ بڑی بھوک لگی ہے۔"

مگر کوئی جواب نہیں آیا اس نے غصے سے اپنا جوتا دروازے پر دے مارا تو دونوں باہر نکل آئے۔ بہو چولہے چوکی میں مصروف ہو گئی اور بیٹا جس کے چہرے پر لپ اسٹک کے نشان تھے باہر جانے لگا ظہراں کی آنکھیں اور دماغ پھٹ سے گئے۔

"منہ دھو کے جا ندیم! اللہ سے ڈر میرا بچہ، اللہ سے ڈر۔ اس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔"

وہ رو دینے کو تھی اور ندیم اور طاہرہ تھوڑا کھسیا سے گئے تھے ندیم نلکے پر اس کے قریب ہی منہ دھو رہا تھا۔ ظہراں بی بی اس گندے کیڑے کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چلا گیا اور طاہرہ، ساس کی چیخ پکار کو نظرانداز کر کے ندیم کے کپڑوں کو تار سے اتار کر خوب جما کر تہہ لگا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

خالہ نصرت، ظہراں بی بی کو ہچکیوں سے روتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی اتنا تو اس کی ماموں کی بیٹی اپنی رخصتی پہ بھی نہ روئی تھی جتنا اب سسک سسک کر رو رہی تھی ظہراں بی بی کو شک تھا کہ اسے کوئی بڑی بیماری لگ گئی ہے اس لیے وہ چھوٹے بیٹے کا گھر بسا کر مرنا چاہتی تھی۔ اب اس کے پاس بہت کم مہلت تھی اور وہ جلد از جلد ندیم کی شادی کرنا چاہتی تھی۔

خالہ نصرت نے ہای بھر لی تھی اور فوراً" سے رقیہ کا رشتہ لے آئیں جو جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہی ہوا تھا اور ندیم بہت چیخا چلایا تھا کہ ابھی اسے شادی نہیں کرنی اور طاہرہ نے بھی جتنا ہو سکا لڑکی والوں کو ذلیل کیا، مگر ظہراں بی بی اور رقیہ کے گھر والے بڑے ثابت قدم

نکلے تھے۔ آخر کو ندیم کماؤ لڑکا تھا۔ اچھے رشتے آسانی سے نہیں ملتے مصبر تو کرنا تھا۔ انہوں نے بھی طاہرہ کی چالاکی کو ایک طرف کیا اور بیٹی کو دلہن بنا کر ندیم کے سنگ رخصت کر دیا۔

طاہرہ تلملا کر رہ گئی تھی اس نے رقیہ کے گھر والوں کو بہت سنائی تھیں مگر کسی بات کو خاطر میں نہیں لائے بس بیٹی بیاہنی تھی بیاہ دی۔

ظہراں کو دلہن بنی رقیہ ہفت اقلیم کی دولت لگی تھی، وہ جلد از جلد اسے ندیم کے کمرے میں پہنچانا چاہتی تھی۔ یہی لڑکی تھی جو اس گھر کو ہوس کے اس شیطانی کھیل سے بچا سکتی تھی۔

آج پہلا دن تھا جب ظہراں بی بی خوش ہوئی تھی دل سے۔ علیم، طاہرہ کے ساتھ اپنے کمرے میں اور دوسرے کمرے میں ندیم اور رقیہ اور وہ خود باہر بڑے چھپرے کے نیچے اکیلی۔ آج تو بے فکری سے سونا تھا۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

جس طرح ندیم خاموشی سے کمرے میں گیا تھا لگتا تھا سب خیر ہو گئی ہے۔ وہ جتنا پہلے شادی سے بھاگا تھا۔ اب ویسے ہی چپ چاپ اپنی دلہن کے پاس گیا تھا۔ دونوں بیٹے اپنے گھر گرہستی والے تھے اللہ اللہ خیر صلا۔

شروع شروع میں ندیم دلہن کے آس پاس پھرتا رہا، مگر پھر آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ وہ اب بھی زیادہ وقت رقیہ کے بجائے طاہرہ سے باتوں میں گزارتا تھا دونوں واپس پھر اسی معمول پر آ رہے تھے مگر اب ایک اور جیتا جاگتا وجود بھی ان کے درمیان تھا اور وہ وجود ظہراں کی طرح معذور نہیں تھا۔ رقیہ اپنے شوہر کے کپڑے، جوتے خود سنبھالنا چاہتی تھی اور طاہرہ اسے روکتی تھی۔ کبھی کپڑے چھینے، کبھی جوتے۔ کبھی ناشتا بنانے پر جھگڑا اور کبھی کھانا دینے پر جھگڑا۔ طاہرہ ہر ہر قدم پر رقیہ کا امتحان ثابت ہو رہی تھی۔ وہ کسی طور ندیم کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھی اور ندیم ہر وقت لڑتا تھا چیختا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رقیہ کو کوس رہا ہے یا طاہرہ کو۔ مگر وہ ہر وقت غصے میں رہنے لگا تھا۔ رقیہ اس سے بات کرنے سے بھی گھبرانے لگی تھی۔ وہ ایسا آخر کیوں کر رہا تھا۔ علیم تو اپنی بیوی کو اس طرح گالیاں نہیں بکتا تھا۔ تو آخر اس کا شوہر ہی کیوں۔

شادی کو ایک مہینہ بھی نہ ہو پایا تھا کہ وہ بدترین قرار دے دی گئی تھی۔ طاہرہ اور ندیم اسے بدتمیز کہتے تھے اور علیم بھائی اسے گھر میں فساد پھیلانے کی ذمہ دار قرار دیتے تھے۔

اس ایک مہینے میں ندیم نے ایک مرتبہ بھی اسے مسکرا کر نہیں دیکھا بلکہ وہ تو اس سے ہمیشہ بےزار ہی نظر آتا تھا۔ کئی بار رقیہ کے والدین آئے۔ سمجھایا بجھایا، مگر وہ کیسا غصہ تھا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا کیسی جھنجلاہٹ تھی جو سوار رہتی تھی۔ رقیہ جتنا قریب جاتی وہ اتنا دور بھاگتا تھا پھر بھی بشری تقاضے اسے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کمزور لمحے میں اسے رقیہ کے قریب کر دیتے تھے بس یہی غلط فہمی تھی رقیہ کو کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے مگر چڑھتا سورج، دن کے اجالے اور شوہر کی خونی نگاہیں اور ہی کہانی سناتی تھیں۔ ظہراں سمجھاتی جو کوئی اس کے پاس بیٹھتا۔ ندیم اب ماں کو بھی قصوروار ٹھہراتا تھا۔ جو ایسی فتنی کو بیاہ لائی تھی جس نے گھر کا سکون برباد کر دیا ہے۔ ظہراں، بہو کو تسلی دلاسے دیتی سمجھاتی رہتی۔

طاہرہ دن بہ دن پر پھیلا رہی تھی اور چھوٹی بہو کے لیے گھر میں جگہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ بد لڑائی ہونے لگی تھی۔ رقیہ اب طاہرہ کو اچھی طرح جواب دینے لگی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ چکی تھی، مگر سب کچھ جاننے سے پہلے ہی ندیم نے اسے فارغ کر دیا تھا۔ وقت کتنا لگتا ہے ان بولوں میں۔

رقیہ کا بوریا بستر گول ہوا اور ظہراں رو رو کر اندھی ہو گئی۔ اب پھر وہی منظر تھا۔ جس سے وہ ڈرتی تھی۔ تین مہینے بھی بہو گھر میں ٹک نہ سکی اب طاہرہ کھلم کھلا گاتی پھرتی تھی۔

تار پر رقیہ کا نیلا دوپٹا ٹنگا رہ گیا تھا۔ باقی سامان وہ لے گئی تھی ظہراں اسے دیکھ دیکھ کے روتی تھی کیسی زندگی تباہ کی تھی ایک معصوم لڑکی کی۔ کاش وہ بیٹے کی

شادی ہی نہ کرتی اور نہ بیٹی والے گھر کے منہ پر طلاق کا لیبل لگتا۔ وہ رہ رہ کر نادم ہوتی۔

طاہرہ کے میکے والے اپنی چھوٹی بیٹی ندیم کو دینے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے مگر طاہرہ کسی طرح بھی ماننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ بس اک خاموشی اور ٹال مٹول بھی ندیم راضی نہیں۔ کبھی ابھی ارادہ نہیں، طاہرہ کے بچپن دن بہ دن بگڑ رہے تھے۔ بچہ کوئی ہوا نہیں۔ بس ہنسی ٹھٹھول میں وقت گزر رہا تھا۔

شام کا وقت تھا سورج ڈوب رہا تھا' ہر طرف زردی پھیلی ہوئی تھی آسمان آہستہ آہستہ ستاروں سے سج رہا تھا۔ بڑا بیٹا اور بہو اچھے موڈ میں تھے۔ ندیم دوسری چارپائی پر لیٹا تھا۔ اللہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

طاہرہ چائے بنا کر لائی اور شوہر کو اپنے ہاتھوں سے چائے پلانے لگی اس والہانہ پن پر ساس کو حیرانی ہوئی مگر بندہ بشر ہے بدلنے میں دیر تھوڑی لگتی ہے' کیا پتا طاہرہ سیدھی راہ پر آگئی ہو' طاہرہ نے بڑے لاڈ سے شوہر کو چائے پلائی تھی پھر گپ شپ کرنے لگی۔ علیم بھی موڈ میں تھا ہنس رہا تھا۔ ندیم چپ تھا۔ ساس آہستہ آہستہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی اور علیم سب سے پہلے سو گیا تھا۔

صبح کسی کی آنکھ معمول کے مطابق نہیں کھلی تھی' خود ظہران بی بی کی بھی نہیں' حالانکہ وہ صبح سویرے اٹھنے کی عادی تھی مگر اس روز اتنی دیر سے بھولنے چائے پایا کھلایا اور اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد روتی پیٹتی باہر آئی تھی۔ علیم مر چکا تھا۔ نجانے رات کے کس پہر مر گیا تھا۔ دونوں نے رونا پیٹنا مچا دیا تھا۔ ظہران بی بی کے ہاتھ سے چائے گر گئی تھی۔ وہ صدمے سے نیچے گر گئی۔

"ہائے میرا علیم!" سارا محلہ جمع ہو گیا تھا علیم کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ شام تک دفن کر دیا گیا کل جہاں بیٹھ کر ہنستا رہا تھا وہیں بیٹھے نہلایا گیا۔

ظہران کو اب نظر بھی کم آتا تھا رو رو کر آنکھوں کا پانی مر گیا تھا علیم کے ماتھے پر گرے بال اس کی آنکھوں کے آگے سے ہٹتے نہیں تھے۔ کبھی ہاتھ' کبھی ناخن' کبھی بچپن' کبھی لڑکپن سب یاد آتا تھا۔ اب دیکھنا بھی کیا تھا۔ بہو اور بیٹا نکاح کر لیتے۔ بس کہانی ختم ہو جاتی تھی۔ علیم تو مر گیا۔

☼ ☼ ☼

"اب مجھ سے نکاح کیوں نہیں کرتیں' تم تمہارے لیے میں نے علیم کو ختم کر دیا۔ جب بڑے بھائی کے منہ پر تکیہ دیا تھا ناں میں نے۔ تب اس کے پاؤں آخری بار ہلے تھے' بڑا درد سہا ہے میں نے طاہرہ! تمہارے لیے' اب میں تمہارا ہوں اور تم میری۔ اب ہمارے بیچ کوئی نہیں رہا اب عدت بھی تمام ہوئی چلو نکاح کر لیتے ہیں۔"

وہ جیسے اسے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔ خوبرو طاہرہ کے تیور بدل چکے تھے اس کے ندیم کے علاوہ بھی کئی طلب گار تھے۔

"قتل تم نے کیا ہے میں نے نہیں۔" اس نے جیسے یاد دلایا تھا' جتایا تھا۔

"اور نیند کی بھاری مقدار میں گولیاں تم نے پلائی تھیں۔" وہ بھی چیخ کر بولا۔

"اور منہ پر تکیہ تو تم نے دیا تھا ناں جان۔"

طاہرہ بے حد شاطر عورت تھی۔ ندیم کو اب پتا چلا تھا وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا اس نے طاہرہ کو تھپڑ مار دیا تھا۔ طاہرہ چیخنے چلانے لگی تھی لیکن ندیم پر تو خون سوار تھا۔ اس کے دل پر بھائی کو قتل کرنے کا بوجھ تھا اور جس کے لیے اس نے اتنا بڑا گناہ کیا اس کی دغا بازی۔۔۔ اس نے طاہرہ کے گلے پر ہاتھ رکھے تھے۔ چیخ پکار سن کر محلے والے آگئے تھے۔ سب نے ندیم کو دھکیل کر طاہرہ کو چھڑایا تو اس کا بے جان وجود زمین پر گرا تھا' طاہرہ دنیا سے جا چکی تھی۔ ندیم پھانسی کے پھندے تک پہنچ گیا تھا' ظہران بی بی نے آخری سانس لی اور بستر خالی کر دیا۔

"نتاشا... اگلے ہفتے سے رمضان شروع ہو رہا ہے' سامان لانا ہے یا نہیں۔" تسنیم نے منہ اندر کر کے باآواز بلند پوچھا۔

دوسری طرف بڑی خاموشی چھائی ہوئی ہے جواب کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ ولید نے چائے کا گرم گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر سوچا۔

"یہ... لڑکی... بتایا بھی تھا کہ تم شام کو آؤ گے... مگر جانے اندر گھسی کیا کر رہی ہے۔" تسنیم نے بسکٹ کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

"خالہ... مجھے دیر ہو رہی ہے۔" ولید خان نے جان بوجھ کر چائے جلدی ختم کی اور گھڑی پر نگاہ دوڑانے کے بعد عجلت دکھائی۔

"بیٹا! تم دو منٹ بیٹھو۔ میں اس کاہل لڑکی کو بلاتی ہوں۔" انہوں نے ولید کو پچکارا اور اٹھنے میں تیزی دکھائی اور وہ سرد آہ بھر کے انتظار کی کوفت سہنے لگا۔

وہ جب بھی نتاشا کو دیکھتا' محبت اس کے دل پر نرم ہاتھوں سے دستک دینے لگتی۔ اسی دستک کے جواب میں ولید نے اپنے دل کا دروازہ کھول کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا' مگر کسی ایک انسان کی وجہ سے نتاشا کے اعتماد اور بھروسے کا تاج محل زمین بوس ہو گیا تو' اس نے اپنے قدم محبت کی شاہراہ سے ہمیشہ کے لیے واپس موڑ لیے۔

"وہ ایک بار مجھ پر بھروسا کر کے تو دیکھے۔ میں دنیا جہاں کی ساری خوشیاں اس کے قدموں پر نثار کروں گا۔" تنہائی نے اس کی سوچ کو ہوا دی تھی۔

"صرف... ایک بار میری محبت کا یقین تو کرے۔" ولید کے دل نے دبی دبی فریاد کی۔

صدف آصف

"ہائے... ہائے' عصر کا وقت ہو گیا ہے اور تم پڑی سو رہی ہو۔" تسنیم نے بیٹی کو مزے سے سوتے دیکھا تو جھنجوڑ کر اٹھایا۔

"کیا ہو گیا ہے... مما... پلیز... سونے دیں نا۔"

نتاشا نے تکیہ دوبارہ منہ پر رکھا۔

"جانے کب عقل آئے گی۔ ولید کو دیر ہو رہی ہے۔ بے چارے کو اور بھی کام ہوتے ہیں۔" ان کے تیز لہجے پر اس نے نیند بھری آنکھیں کھولیں۔ اس کا معمول تھا کہ وہ مہینے کی شروع کی تاریخوں میں جا کر قریبی سپر اسٹور سے مہینے بھر کا سودا سلف ایک ساتھ

لے آئی تھی مگر اس بار رمضان کی آمد کی وجہ سے چنے کی دال، سفید کالے چنے، بیسن، چاٹ مسالا، املی، دہی بڑے کا سامان، کھجور اور بھی بہت ساری اضافی اشیا لسٹ میں شامل تھیں۔

"کل سامان کی جو لسٹ تیار کی تھی، وہ کہاں ہے؟" تسنیم نے بیٹی کے سوئے دماغ کو شانہ ہلا کر بیدار کیا۔

"دراز میں رکھی ہے۔" اس نے منہ پھاڑ کر جمائی لیتے ہوئے ذہن پر زور دیا، پھر ماں کو جواب دیا۔

"تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں، گیارہ ہوں پر وہ چلا جائے گا، پھر اکیلی سامان ڈھوتی پھرنا۔" تسنیم نے پکا منہ بنا کر بیٹی کو ڈرایا۔

"اف... اتنا سب کچھ اکیلے لاد کے لانا پڑ گیا تو..." سوچ کر ہی اسے جھرجھری آگئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس کے نخرے تو بہت ہیں، اگر چلا گیا تو بلاوجہ رکشے ٹیکسی کے پیچھے بھاگنا پڑے گا۔" اس نے خودکلامی کرتے ہوئے تیزی دکھائی اور چپل پہن کر واش روم کی جانب بھاگی۔

☆ ☆ ☆
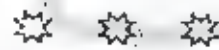
سادہ سا نیلا کرتا اور فان ٹراؤزر پہننے کے بعد اس نے گھنے بالوں میں جلدی جلدی کنگھا پھیرا، لمبے بالوں کو ایسے ہی لپیٹ کر اونچا جوڑا بنایا، کالی چپل میں گورے پاؤں کو اڑستے ہوئے، دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگایا، پھرتی سے دراز سے کلچ نکال کر کھولا، پیسوں کی موجودگی کا یقین کرنے کے بعد اسے بغل میں دبایا اور ماں کے دیے ہوئے ٹائم سے ایک منٹ پہلے باہر نکل آئی۔ تیزی سے ٹی وی لاؤنج کا دروازہ عبور کیا تو وہاں ایک الگ ہی سماں بندھا نظر آیا۔

"نہ جانے آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے، کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔" تسنیم اس کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھیں اور ولید مزے سے سر دھن رہا تھا۔

"کتنی بار سمجھایا ہے کہ ولی کے سامنے میرا ذکر یوں نہ کیا کریں... مگر مما... یہ سامنے ہو تو سب بھول جاتی ہیں۔" وہ جل بھن کر دانت پیسنے لگی۔

ولید نے سامنے سے آتی سونے کی ڈلی جیسی نتاشا وسیم کو بغور دیکھ کر دل میں سراہا، سادہ حلیے میں بھی اس کا حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ انتظار کی کلفت جیسے راحت میں تحلیل ہونے لگی۔

"مما... سنیں۔" اس نے ماں کو اشارے ہی اشاروں میں کچھ سمجھانا چاہا، مگر وہ بولنے میں مصروف تھیں، اسے دیکھا ہی نہیں۔

"السلام علیکم!" نتاشا نے مجبوراً بلند آواز سے سلام کیا، وہ پھر بھی اپنی باتوں میں مگن رہیں۔ وہ خود کو اس وقت بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے ولید نے زور سے جواب دیا، ہونٹوں کے کناروں پہ شرارتی مسکراہٹ مچلی۔

"ہماری ایسی تربیت نہ تھی، منہ اندھیرے اٹھتے تو رات کو ہی بستر پر کمر ٹکاتے، لیکن آج کل کی لڑکیوں کو کون سمجھائے۔" تسنیم نے منہ بنا کر کہا۔ اتنے دنوں بعد تو کوئی ہم خیال سامع ملا تھا، اسے ہاتھ سے کیسے جانے دیتیں۔

"مما... شاید... ان کو دیر ہو رہی تھی۔" اس کی برداشت جواب دے گئی تو طنز کیا، تسنیم کو بھی خیال آیا۔

"ہیں... ہاں... جاؤ... بچو جلدی سے نکل جاؤ۔" انہوں نے زبان کو بریک لگا کر سر ہلایا۔

"اور ہاں... دیکھو... چنے دیکھ کر لینا، کیڑے نہ لگے ہوں اور بیسن بھی دیکھ کے لینا، کم بخت مارے سارا منافع رمضان میں ہی کمانا چاہتے ہیں، آٹا ملا کر بیسن کے نام پر بیچتے ہیں۔" اب ان کی توپوں کا رخ دکان داروں کی طرف پھر گیا، اسے جاتے جاتے رک کر سمجھانے لگ گئیں۔

"خالہ... آپ کو فوڈ انسپکٹر ہونا چاہیے تھا۔" ولید نے ہنستے ہوئے کہا تو اس اعزاز پر ان کی باچھیں کھل گئیں۔

"چلیں..." وہ ان دونوں کی ایسی ہم آہنگی پر تپ

جاتی تھی' ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں تو کب سے ہوں تیار.... چلو نا۔" اس کا لٹھ مارنے والا انداز دیکھ کر وہ شوخی سے کی چین انگلی میں گھماتا گنگناتا باہر کی جانب بڑھ گیا' نتاشا نے بھی پیر پٹخ کر ماں کو دیکھا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

ولید' تسنیم عباس کے مرحوم شوہر وسیم عباس کا منہ بولا بیٹا تھا۔ وہ بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ شروع سے ہی وسیم نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ اپنا دست راست بھی بنا لیا' ان کا سونے کے زیورات بنانے کا کارخانہ تھا۔ جہاں بننے والے زیورات اپنی نفاست اور خوب صورتی کی وجہ سے شہر کی دکانوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے' اس کام میں بے ایمانی کا بہت خدشہ ہوتا ہے' انہیں جس طرح کے ایمان دار آدمی کی ضرورت تھی' ولید ویسا ہی نکلا۔

ولید پہلے تو ان کے گھر کے عقبی حصے میں بنے ہوئے مہمان خانے میں ساتھ ہی رہتا تھا' مگر پھر وسیم عباس کے انتقال کے بعد اسے یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جانا ہی مناسب لگا۔ اس لیے اپنے ایک دوست کے ساتھ شراکت میں کرائے کے ایک کمرے میں رہنے لگا۔ وسیم عباس نہ رہے تو کاروبار بھی آہستہ آہستہ مختصر ہو کر ختم ہو گیا۔ ولید بھی کم عمر تھا' اپنے طور پر سنبھالنے کی بہت کوشش کی' مگر گھاگ دنیا کے پینتروں کو ابھی سمجھتا نہیں تھا۔ گھاٹے پر گھاٹا ہوتا دیکھ کر پریشان ہو گیا اور سب کچھ بیچ باچ کے جو پیسے حاصل ہوئے لا کر تسنیم کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ وہ اس کی ایمان داری پر حیران رہ گئیں۔ کیوں کہ شوہر کے جانے کے بعد دنیا کے بڑے عجیب سے رنگ دیکھنے کو ملے تھے۔ انہوں نے ساری رقم اپنے بھائی کے کاروبار میں لگا دی' اور اس کے منافع سے گھر چلنے لگا۔

ولید شروع سے نتاشا کو دل ہی دل میں بہت چاہتا تھا' اسے یہ تر و تازہ کلی سی لڑکی بہت پیاری لگتی تھی' مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا' اس کی خواہش تھی کہ پہلے کچھ بن کے دکھائے' پھر تسنیم خالہ سے نتاشا کا رشتہ مانگے' اسی لیے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا' کئی سال دھکے کھائے' تکلیفیں سہیں' مگر نتاشا کا خیال جینے کی وجہ بنا رہا۔ آخر ایک اعلا مقام تک پہنچ کر خوشی خوشی وطن لوٹا یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا کہ اب جبکہ وہ نتاشا کے قابل ہو چکا تھا تو اس کے ساتھ قسمت نے دغا کر ڈالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے' اس عید پر تمہارے "وہ" ملنے نہیں آ رہے۔" اس نے گروسری کا سامان کچن میں رکھتے ہوئے جتایا۔

"نہیں.... ولی.... انہیں چھٹی نہیں مل رہی۔" اس کا لہجہ لڑکھڑایا' جو اس بات کا غماز تھا کہ کچھ تو ایسا ہے جس کی پردہ داری ہے۔

"تمہیں.... یہ بات کیسے پتا چلی؟" ولید کے سوال نے نتاشا کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

"افوہ بھئی.... کل.... میری ان سے بات ہوئی تھی۔" اس نے ماتھے پر آیا پسینہ' ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" ولید نے اس کی ہچکچاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑی بد تہذیبی دکھائی۔

"کچھ خاص نہیں.... اور سنو.... تمہیں میری پرسنل.... باتوں سے کیا؟" اس نے نگاہیں چرائیں' پھر خیال آیا تو اسے آنکھیں بھی دکھائیں۔

"سوال تو اعلا ہے.... واقعی.... مجھے کیا؟" وہ کرسی پر دراز' مسلسل پاؤں ہلاتے ہوئے اسے چڑانے پر تلا ہوا تھا۔

"اب.... پلیز.... یہاں سے جاؤ' تاکہ میں کچھ کام کر لوں۔" اس نے انگلی اٹھا کر سنجیدگی سے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔

"اچھا سنو.... اب کی بار کال آئے تو میری بھی بات کرانا۔" ولید نے کھڑے ہو کر سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"کیوں.... تمہیں کوئی کام ہے؟" وہ بھڑک اٹھی۔

"میں کوئی مطلبی انسان ہوں جو کام ہونے پر ہی کسی سے بات کروں۔" وہ جو سستی سے انگڑائی لے رہا تھا' اچھا خاصا برا مان گیا۔

"تو۔۔۔ پھر۔۔۔؟" نتاشا نے دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"بھئی۔۔۔ تمہارے۔۔۔ "ان" کا۔۔۔ ایسے بھی حال احوال پوچھا جا سکتا ہے۔" ولید نے بظاہر منہ بگاڑا مگر اندر سے مزا لیا۔

"ہاں۔۔۔ اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔" وہ اس کی برباد دینے والی شربتی آنکھوں سے بچنے کے لیے بیٹھ موڑ کر لسٹ نکال کر سامان دیکھنے لگی۔

"نتاشا۔۔۔" ولید نے اس کے پشت پر بکھرے ریشمی بالوں کی چمک سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے بے اختیار پکارا۔

"ہاں۔۔۔ کہو۔" اس نے منہ موڑے موڑے جواب دیا' سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"ایسا کرو۔۔۔ کہ مجھے کامل صاحب کا نمبر دے دو۔۔۔ میں انہیں خود ہی کال کر لوں گا۔" ولید نے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا چاہی۔

"نمبر۔۔۔؟" وہ لحظہ بھر تو سن کھڑی رہی' پھر دماغ لڑانے لگی۔

"اب۔۔۔ تو یہ سچ اگلے گی۔" ولید کے دل نے خوشی میں قلابازی لگائی۔

"ہاں بھئی۔۔۔ لاٹری کا نمبر نہیں۔۔۔ فون نمبر مانگ رہا ہوں۔" وہ بھولا بن کر مسکرایا۔

"مجھے وہ زبانی تو یاد نہیں۔ اچھا بعد میں سیل فون سے نکال کر دے دوں گی۔" فوری طور پر یہ ہی بہانہ سمجھ میں آیا۔

"کمال ہے۔۔۔ تمہیں۔۔۔ اپنے منگیتر کا نمبر بھی یاد نہیں۔" ولید کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری مگر اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

☆ ☆ ☆

کئی سالوں بعد جب اس نے "وسیم ولا" کا دروازہ کھٹکھٹایا تو نتاشا' ولید کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اس کے اندازوں سے بڑھ کر خوش شکل ہو گیا تھا۔ دراز قامت' شربتی آنکھوں پر گھنی پلکیں' سرخ و سفید رنگت اور ماتھے پر بکھرے سنہرے گھونگھریالے بال اس پر بہت جچ رہے تھے۔ تسنیم بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

چائے کے ساتھ نتاشا کی منگنی کی مٹھائی پیش کی تو وہ جہاں کا تہاں رہ گیا' دو دن قبل ہی تو اس کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی تھی۔

نتاشا ان دنوں بہت خوب صورت ہو گئی تھی' کامل یزدانی اور وہ ایک دوسرے کو کئی سالوں سے پسند کرتے تھے۔ منگنی کی تصاویر دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس رشتے پر کتنی خوش ہے۔ کامل کے ساتھ اس کی جوڑی جچ بھی بہت رہی تھی۔ دونوں ہر تصویر میں ہنستے مسکراتے ساتھ بیٹھے بہت مطمئن لگ رہے تھے۔ ولید نے دل کا درد چھپاتے ہوئے مبارک باد پیش کی۔ بالات کی اس کروٹ پر چائے کے ساتھ صبر کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

اس کے کام کی نوعیت ایسی کہ وہ تین مہینے ابوظہبی میں گزارتا تو ایک مہینے کے لیے اپنے ہیڈ آفس میں کام کرتا جو پاکستان میں واقع تھا۔ کئی سالوں سے اس نے عادت بنالی کہ وہ جتنے دن یہاں ہوتا' نہ صرف تسنیم سے ملنے جاتا' بلکہ ان کے سارے کام بھی نپٹا دیتا۔ تسنیم جو بیٹی کے ساتھ اس بڑے سے گھر میں تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ ولید کا وجود ان کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔

وہ کبھی کبھی حیران ہوتا کہ گزرتے وقت کے ساتھ کامل کا ذکر دونوں ماں بیٹی کے لبوں پر کم سے کم ہوتا چلا گیا تھا' نہ ہی وہ خود یا اس کے گھر والے اسے کسی موقع پر دکھائی دیے۔۔۔ اس نے تسنیم کو کریدنے کی کوشش بھی کی تو وہ بڑے مزے سے بات بدل دیتیں' مگر ان کے چہرے پر چھائی یاسیت اسے ضرور چونکاتی۔۔۔ پھر

ایک دن اس کی دبئی میں اچانک کال سے ملاقات ہوگئی اور وہ ششدر سا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"نتاشا... یہ لو... افطاری کے لیے میں نے آم کاٹ دیے ہیں۔" تسنیم نے چھری پلیٹ میں رکھنے کے بعد اطمینان سے بیٹی کو پکارا۔

"ٹھیک ہے' رکھ دیں۔" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"میں نے ولید کو کہہ دیا ہے کہ وہ پورے رمضان اب ہمارے ساتھ ہی روزہ افطار کرے گا۔" انہوں نے جانے اطلاع دی۔

"یہ... بہت اچھا کام کیا آپ نے۔ اب وہ سارا رمضان میرے سر پر ناچے گا۔" نتاشا کی بڑبڑاہٹ ان کے کانوں تک جا پہنچی۔

"تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" انہوں نے بیٹی کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے... لائیں میں انہیں فروٹ چاٹ میں مکس کردوں۔" اس نے پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ..." تسنیم نے چھلکے شاپر میں ڈالتے ہوئے ٹیبل سے اٹھنے کا ارادہ کیا' مگر بیٹی کو مسلسل گھورتا دیکھ کر رک گئیں۔

"مما... آپ کی ولید سے کوئی بات ہوئی ہے۔" اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"بات... کیسی بات؟" ان کے پیٹ میں مروڑ تو اٹھا' مگر معصومیت سے نفی میں گردن ہلادی۔

"کوئی بھی... میرے حوالے سے؟" اس کو کرید لگ گئی۔

"نہیں... میں ایسا کیوں کروں گی۔" تسنیم نے جلدی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے انکار کیا۔

"حیرت ہے... پھر وہ منگنی والی بات کو لے کر اس قدر الٹے سیدھے سوالات کیوں کرتا رہتا ہے۔" نتاشا نے ہیجان میں سفید ہاتھوں کو مل مل کر سرخ کردیا۔

"میں... کیا جانوں۔" وہ جلدی سے بولیں' اور جانے کے لیے پر تولنے لگیں۔

"ایک بات یاد رکھیے گا... ولید کو کسی بات کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے' ورنہ وہ مزید پھیل جائے گا۔" نتاشا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دھمکایا۔

"میں... کوئی پاگل ہوں... بھلا..." انہوں نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

"میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔" اس نے ماں کو پیچھے سے بانہوں میں بھرلیا' اور ان سے چپک کر سرگوشی کی۔

"مجھے معاف کردینا میری بچی' مگر اب تمہاری اس بے وقوفی میں مزید ساتھ دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں' اس بار کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہے۔" انہوں نے نتاشا کا ماتھا چومتے ہوئے سوچا اور مطمئن انداز میں ہاتھ دھونے چل دیں۔ نتاشا سرد آہ بھرتے ہوئے ماضی کی تلخ یادوں میں کھو گئی۔

☆ ☆ ☆

"نتاشا... چھوڑو... یہ باتیں... تم جاکر اندر بیٹھو۔" تسنیم نے اسے وہاں سے ہٹانا چاہا۔

"کیوں... کیوں جاؤں اندر۔" آنکھیں ضبط سے لال سرخ انگارے برسا رہی تھیں۔ خلاف مزاج تیز لہجے میں بولی۔

"میں... ان لوگوں سے بات کررہی ہوں نا۔" تسنیم نے گھبرا کر ماں بیٹے کو دیکھا' جن کے تیور بدلنے لگے تھے اور بیٹی کو آنکھیں دکھائیں۔

"مما... سوال میری ذات کا ہے تو جواب بھی مجھے ہی دینے دیں...." اس نے ہاتھ ہلایا تو میز پر رکھا شربت کا گلاس زمین پر گر کر چور چور ہوگیا۔

"بس... آپ بعد میں سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔" رعنا نے اپنی شرط دہرانے کے بعد نتاشا کے تاثرات جانچتے ہوئے اٹھنے کا سوچا۔

"کامل... تم نے تو کہا تھا کہ جہیز کے نام پر تنکا بھی

نہیں لوگے۔" اس نے مڑ کر اپنے منگیتر کو دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ تو ہم جہیز کہاں مانگ رہے ہیں۔۔۔ بس۔۔۔ یہ مکان۔۔۔ وہ بھی تم دونوں کے اچھے مستقبل کی خاطر۔۔۔" رعنا کی فر فر چلتی زبان نتاشا کے گھورنے پر رک گئی۔

"آپ کیا چاہتی ہیں۔۔۔ میری مما کو سکون سے جینے کا حق بھی نہ ملے۔۔۔ ایک مکان ہے ان کے پاس' وہ بھی آپ اپنے بیٹے کے نام کروانا چاہتی ہیں۔" وہ ایک دم بھڑ اٹھی' اس کے گال تم ہوتے چلے گئے۔

"تم تو ایسے بول رہی ہو جیسے زمانے سے ہٹ کر کوئی بات کی گئی ہو۔ ارے بھئی' عورتیں تو اپنے داماد کا مستقبل بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتیں۔۔۔ تف ہے بھئی۔" رعنا نے طیش کے عالم میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو نتاشا نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔

"چپ کر جاؤ بیٹا۔ ابھی میں زندہ ہوں۔" تسنیم جو اس افتاد پر سن کھڑی تھیں' بڑھ کر نتاشا کے پاس گئیں اور خود سے لپٹا کر تسلی دی۔

"مما۔۔۔ میں تو صبر سے کام لینا چاہتی ہوں۔ مگر ان کی باتوں نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا ہے۔" اس نے بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں سے ہونے والی ساس کو گھورا۔

"بہن۔۔۔ آپ کی لڑکی کسی نفسیاتی عارضے کا شکار تو نہیں۔۔۔" رعنا نتاشا کی حالت پر ایک دم پریشان ہو کر پوچھنے لگ گئیں۔

"نہیں۔۔۔ آنٹی۔۔۔ مگر دنیا کی آنکھوں پر بندھی ہوس کی پٹی دیکھ کر واقعی میں دل چاہتا ہے کہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاؤں۔" وہ غرائی۔

"چلو بیٹا لگتا ہے ان لوگوں نے منگنی کے وقت ہم سے یہ بات چھپائی تھی کہ لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔" رعنا نے کامل کا ہاتھ پکڑ کر عجلت میں کہا۔

"ایک منٹ امی!" کامل نے ماں کو سمجھانا چاہا' اس کے منمناتے پر وہ مزید کھول اٹھی۔

"مٹی کے مادھو۔۔۔ تم تو میرے عشق میں مرے جا رہے تھے' اب کیوں ماں کے پیچھے سے جھانک رہے ہو۔" نتاشا کی آواز فرط جذبات سے پھٹ گئی۔

"نتاشا۔۔۔ تم ہماری انسلٹ کر رہی ہو۔" اس مٹی کے مادھو میں حرکت پیدا ہوئی' آنکھیں نکال کر غرایا۔

"بے عزتی اس کی ہوتی ہے۔ جس کی کوئی عزت ہو۔۔۔ میں چار سال تک تمہیں بڑا غیرت مند سمجھتی رہی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"بس۔۔۔ لڑکی۔۔۔ بہت کہہ لیا تم نے اور بہت سن لیا ہم نے۔" رعنا نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"چلو بیٹا۔ سب باتوں کو چھوڑ دو۔" تسنیم نے بیٹی کا ہاتھ دبایا' ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ ختم ہونے والا سیلاب جاری تھا۔

"کیسے بھول جاؤں۔۔۔ ان کا لالچ تو دیکھیں۔ شادی کی ڈیٹ فکس ہوتے ہی مکان بیٹے کے نام لکھوانے چلی ہیں۔" وہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی اور بری طرح سے بکھرنے لگی۔

"ہائے۔۔۔ تو میں نے کون سا انوکھا مطالبہ کر دیا؟" رعنا نے ناگواری سے پوچھا۔

"امی۔۔۔ بس کریں۔" کامل نے ماں کو زچ آکر چپ کرایا۔ کتنا سمجھایا تھا کہ ابھی یہ بات نہ نکالیں' شادی کے بعد وہ خود پیار سے نتاشا کو منا لیتا مگر وہ کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھیں اور سارا کام خراب ہو گیا۔

"ٹھیک ہے رعنا بہن۔ مجھے آپ کا مطالبہ منظور ہے' نکاح سے قبل یہ مکان نتاشا اور کامل کے نام ہو جائے گا اور میں کرائے کے گھر میں چلی جاؤں گی۔" تسنیم نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ سنایا' وہ خوشی سے کھل اٹھیں۔

"نہیں کیسے اپنی بیوہ ماں کے سر سے سائبان چھین کر اس پر اپنے خوابوں کا تاج محل بنا لوں!" اس نے درد و کرب کی شدت سے بے قرار ہو کر کامل کو دیکھا۔

"مجھے..... یہ بات منظور نہیں ہے مما!" اس نے تیز لہجے میں بولتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔

"ہائے اللہ! ان کی ساری جائیداد بعد میں تمہیں ہی تو ملے گی..... آخر کو اکلوتی اولاد ہو..... پھر اتنا واویلا کیوں مچایا ہوا ہے۔" رعنا نے اس کے انکار پر جل کر تیز انداز میں ہاتھ نچا کر پوچھا۔

"یہ..... جائیداد جس کو بھی ملے..... مگر آپ کے بیٹے کو نہیں ملنے والی۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے، مضبوط لہجے میں کہا۔

"تم اپنے فیصلے پر پچھتاؤ گی۔ امی کا مطالبہ کچھ اتنا ناجائز بھی نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو میں ڈاکٹر ہوں اور تمہارا یہ گھر ایک مہنگے کمرشل علاقے میں واقع ہے۔ اگر ہم یہاں میڈیکل سینٹر کھول لیتے ہیں تو سوچو مہینے میں کس قدر کمائیں گے۔ یہ ہمارے روشن مستقبل کا سوال ہے، مگر تم بلاوجہ اس قدر جذباتی ہو رہی ہو۔" کامل نے جھک کر اسے پیار سے اٹھانا چاہا۔

"پلیز..... چھوڑ دو۔" وہ ہاتھ چھڑانے لگی۔ اسے اس لالچی شخص سے گھن آرہی تھی، جس نے اتنے دنوں تک اپنے چہرے کو خوش نما نقاب تلے چھپایا ہوا تھا۔

"اچھا..... ایسا کریں گے..... ہم تسنیم آنٹی کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لیں گے..... بس خوش....." وہ اس کے برابر میں بیٹھ کر دھیرے سے جھک کر بولا، جو بھی تھا نتاشا اس کی اولین چاہت تھی، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو کامل کو بے چین کیے دے رہے تھے۔

"میری..... ماں پر یہ احسان۔ اف۔" نتاشا کی آنکھوں میں تمسخر اتر آیا، وہ جو منگنی کی انگوٹھی اتارتے ہوئے جھجک رہی تھی، اس بات سے فوری فیصلہ ہو گیا۔

"نتاشا..... یہ کیا کر رہی ہو؟" کامل ایک دم گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"وہ ہی کر رہی ہوں..... جو مجھے پہلے کر لینا چاہیے تھا۔" اس نے اپنے دل کے تقاضوں کا گلا گھونٹتے

ہوئے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمادی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسک اٹھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ... لو... تمہاری پسند کے دہی بڑے لایا ہوں۔" ولید نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میز پر شاپر رکھا۔

"آں... ہاں... تھینکس۔" وہ جو ماضی میں کھوئی ہوئی تھی، چونک کر اسے دیکھنے لگی، آنکھوں سے درد ٹپکا۔

"پیاری لڑکی... ایک بار مجھ پر اعتبار کر کے تو دیکھو، دنیا میں سب اچھے نہیں تو سب برے بھی نہیں ہوتے۔" دل سے نکلتی صدا، نتاشا تک نہیں پہنچ پائی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ولید نے اسے کھویا کھویا سا... دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے۔ بالکل فٹ فاٹ ہوں۔" وہ حال میں لوٹتے ہوئے جان بوجھ کر مسکرائی۔

"ایسا لگتا تو نہیں ہے۔" وہ اس کی ہٹ دھرمی پر چڑ کر طنز پر اتر آیا۔

"نہیں تو، تمہارا وہم ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" نتاشا نے سادگی سے کہا۔

"محترمہ! آپ نے شاید گھڑی میں ٹائم نہیں دیکھا ہے۔" اس نے دیوار پہ لگی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"اف... روزہ کھلنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے۔" وقت دیکھا تو وہ ایک دم چیخی۔

"جی... اور آپ ہیں کہ افطاری بنانے کی جگہ خیالوں میں کھوئی ہوئی ہیں۔" ولی نے بڑے تہذیب و تمیز کے ساتھ اسے ذلیل کیا۔

"اوہ... مائی گاڈ ابھی تو پکوڑے بھی تلنے ہیں۔" نتاشا جواب دینے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"سنو... کیا... کامل میاں کی یادوں میں گم تھی۔" مسکراتے ہونٹوں کے پیچھے چھپے طنز پر وہ انگاروں پر لوٹ گئی۔

"نہیں، بس یوں ہی... سستی میں بیٹھی رہ گئی۔" اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے بڑے آرام سے جواب دیا اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔ ولید نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مکا مارا۔ وہ اپنے طور پر بڑی کوششیں کر رہا تھا کہ نتاشا خود سے سچ اگل دے، مگر وہ گھنی، میسنی بنی، اس کی ساری باتوں کو سہے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

نتاشا نے روزہ کھولنے کے بعد نماز پڑھی اور لان میں چلی آئی، تھوڑی دیر ننگے پاؤں گھاس پر چہل قدمی کرنے کے بعد اسے تھکان سی محسوس ہوئی تو وہ کرسی پر دراز ہوگئی، ہوا کے فرحت انگیز جھونکوں سے نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا، اس نے بے اختیار خم دار پلکیں موند لیں۔

ولید مسجد سے گھر لوٹا تو لان میں اسے بیٹھا دیکھ کر وہیں چلا آیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کتنی دیر تک کھڑا اسے دیکھے گیا، گلابی رنگت اور شفاف جلد والے گول چہرے کے سبک نقوش میں عجیب سی جاذبیت تھی۔

"میری محبت کی آگ اتنی، بے اثر کیوں ہے، جو تم تک اس کی آنچ نہیں پہنچ پا رہی۔" ولید کے اندر کم مائیگی کا احساس جاگا، اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"تم... نے مجھ سے کچھ کہا؟" نتاشا ایک دم چونک کر اٹھی اور بے اختیار پوچھا۔

"میری... اتنی مجال..." ولید نے مرچیں چبا کر اس پری پیکر کو دیکھا، جس پر وہ زمانوں سے فدا تھا، مگر وہ اثر لینے کو تیار ہی نہ تھی۔

"کہنا کیا چاہتے ہو؟" سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے دوپٹا ٹھیک کیا تو ولی نے احتراماً نگاہیں ہٹا لیں۔

"وہی جو تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔"

"دیکھو... ایک منگنی شدہ لڑکی سے ایسی باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔" نتاشا نے مدبر بن کر اسے چڑایا۔

"ایسی لڑکی کا کچھ نہیں ہوسکتا۔" نتاشا کے سفید جھوٹ پر ولید اندر ہی اندر جل گیا' مگر کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

"یہ کیا سمجھتی ہے' مجھے اس بات کی خبر نہیں کہ جو کچھ یہ کہتی ہے' سب قصہ کہانی ہے۔" وہ ماتھا پیٹنے کی حسرت دل میں لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر پیروں کے قریب پڑا پھول اٹھایا اور احتیاط سے سائیڈ پر رکھا' کسی تلخ سوچ کا عکس اپنے چہرے پر بکھرنے سے قبل جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' میں نے کوئی کچی گولیاں کھیلی ہیں۔ ایک بار شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا تو اس پر تاعمر قائم رہوں گی۔" نتاشا کے ہونٹوں پر۔ مبہم سی مسکان پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا' وہ نتاشا کی باتوں سے خفا خفا سا رہنے لگا تھا' ہر وقت اپنے منگیتر کی بلاوجہ کی تعریفیں کر کرکے' جانے خود کو فریب دے رہی تھی یا اسے بے وقوف بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ ولید نے تسنیم خالہ سے حتمی بات کرنے کی ٹھانی اور ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

"خالہ۔ ایسا کب تک چلے گا؟" ولید نے ادھر ادھر نظریں گھما کر اس کی غیر موجودگی کا یقین کیا' پھر پوچھا۔

"کیسا۔۔۔؟" انہوں نے سرخ آنکھوں کو پونچھتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ وہ پکوڑوں کے لیے باریک پیاز کتر رہی تھیں۔

"یہ نتاشا کا' منگنی ڈراما۔۔۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"وشی۔۔۔ دھیرے سے بولو۔ اس نے سن لیا تو ہنگامہ مچادے گی۔" گھبراہٹ میں' تسنیم کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔

"کمال ہے' ایسا لگتا ہے جیسے۔۔۔ آپ اس کی ماں نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ خیر۔۔۔" اس نے تسنیم کے گھورنے پر بات نامکمل چھوڑ دی۔

"ولی! تم اس بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ نتاشا نے صرف میری وجہ سے اپنی زندگی کی خوشیوں سے منہ موڑا۔" تسنیم کے لہجے میں نمی آگئی۔

"خالہ۔۔۔ وہ جو کچھ کررہی ہے۔ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی وقت اس کے ہاتھ میں ہے۔ مگر کل کو سب کچھ ایسا نہیں رہے گا۔" وہ جذباتیت سے چیخ پڑا۔

"آہستہ۔۔۔ اس کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک بھی پڑگئی تو قیامت ڈھادے گی۔" انہوں نے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے ولید کا منہ بند کیا۔

"آپ۔۔۔ اس سے۔۔۔ اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟" ولید نے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ہنس کر مذاق اڑایا۔

"ولی۔۔۔ تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔۔۔ میں۔۔۔ واقعی میں ڈرتی ہوں۔ مگر۔۔۔ اسے تکلیف میں دیکھنے سے۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے سے بہت ڈرتی ہوں۔" انہوں نے اداسی سے سر ہلایا اور بولتی چلی گئیں۔

"سوری خالہ۔۔۔ شاید آپ ہرٹ ہوئی ہیں۔۔۔ مگر نتاشا کے لہجے کا کھوکھلا پن مجھے دکھ دیتا ہے۔" وہ جھلا کر تیز لہجے میں بولا۔

"اسی لیے تمہاری پوچھنے پر۔۔۔ میں نے سچائی کا اقرار کرلیا۔ میں خود اپنی نتاشا کو برباد ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔" تسنیم نے نڈھال ہوتے ہوئے کہا۔

"جانے وہ خود فریبی کی کون سی منزلیں طے کرتی چلی جارہی ہے' میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کی واپسی مشکل نہ ہوجائے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تمہیں۔۔۔ میرے لیے اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" اچانک وہ کمر پر ہاتھ رکھ کمرے میں داخل ہوئی اور زور سے چیخ پڑی۔

"نتاشا۔۔۔" تسنیم کے لب کپکپائے۔

"بیٹی۔۔۔ میں۔۔۔ اور۔۔۔ ولی۔۔۔ تو۔۔۔" تسنیم نے بیٹی کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر صفائی دینا چاہی' مگر ناکام رہیں۔ وہ جانے کب سے باہر کھڑی ان دونوں کی

باتیں سن رہی تھی۔

"مما۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" ولید حیران و ششدر کھڑا اسے ماں پر غصہ کرتا دیکھتا رہا' پھر تیزی سے ان کی جانب بڑھا۔

"خالہ نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے۔ اور اب جبکہ سچ سامنے آگیا ہے' کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں یوں زندگی برباد کرنے نہیں دوں گا۔" اس نے تسنیم کو اپنے قریب کرتے ہوئے سخت لہجے میں اسے جھاڑا۔

"مسٹر۔ میں اپنا برا بھلا خوب جانتی ہوں۔ آپ اس معاملے سے دور رہیں تو اچھا رہے گا۔" نتاشا نے بے خوف ہو کر ولید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"ایک منٹ... تم خود کو کیا سمجھتی ہو۔ ان کے لیے بڑی قربانی دینے چلی ہو۔ تمہیں پتا بھی ہے' تمہاری فکر میں انہیں راتوں کو نیند نہیں آتی' گولیاں لیتی ہیں' تو کچھ گھنٹے سو پاتی ہیں۔" اس کے انکشاف پر نتاشا نے ماں کو حیران ہو کر دیکھا' جو پوری جان سے لرز رہی تھیں۔

"مما... ولی کیا کہہ رہا ہے؟" وہ ماں کے پاس جا کر سوال کرنے لگی۔

"ان سے کیا پوچھتی ہو' مجھ سے پوچھو۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ اس طرح کا ڈیپریشن انہیں بہت جلد زندگی سے دور کر دے گا۔ پھر بیٹھ کر اپنی عظمت کے قصے لوگوں کو سناتی رہنا۔" ولید نے اسے بازو سے گھسیٹ کر اپنے مقابل کھڑا کیا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر چیخا۔

☼ ☼ ☼

"مما... آپ نے مجھ سے یہ سب چھپا کر اچھا نہیں کیا۔" وہ روتے روتے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"بیٹی... میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔" تسنیم بیٹی کو چپ کرانے میں ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔

"آپ نے کامل والا قصہ بھی ولید کو بتا دیا۔" اس نے سرگوشی میں کہا' مگر اس کے کان بہت تیز تھے' سن لیا۔

"اس معاملے میں خالہ کا کوئی قصور نہیں' مجھے اس بات کی خبر چند مہینوں قبل ہی ہوئی ہے۔" وہ تھوڑی دیر تک تو اس کا واویلا سنتا رہا' پھر اس کا دماغ درست کرنے کی ٹھانی۔

"یہ... جھوٹ ہے۔" وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

"یہ... سچ ہے۔ نتاشا! ویسے مجھے تم جیسی پڑھی لکھی لڑکی سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔" ولید کا لہجہ نرم ہوا' وہ بھی اسے تکلیف میں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

"تو کیا کرتی میں... اپنی مما کو بڑھاپے میں تنہائی کا زہر پینے کے لیے اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی۔" آنسو بہاتے ہوئے وہ شکستہ انداز میں اعتراف کرنے لگی۔

"اس کے لیے تم نے یہ ڈراما کیا۔ جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" اس نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی اور تسنیم کو سامنے بچھی کرسی پر بٹھا دیا۔

"ہاں... اسی لیے میں نے اپنی منگنی ٹوٹنے کی بات کسی کو نہیں بتائی اور سب یہ ہی سمجھتے رہے کہ کامل اسپیشلائزیشن کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔ اس طرح میرا پیچھا روز کے آنے والے الٹے سیدھے رشتوں سے چھوٹ گیا تھا' جنہیں میری ذات سے زیادہ میری جائیداد میں دلچسپی تھی۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"تم... کتنی عقل مند ہو۔ اس بات کا مجھے اس دن ہی پتا چل گیا تھا' جب میری کامل سے دبئی میں ملاقات ہوئی اور اس کے پہلو میں ایک خوب صورت عورت کو بیوی کے روپ میں دیکھا۔" اس کے منہ سے تکلیف دہ انکشاف سن کر وہ لرز گئی۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تمہیں سب خبر ہے۔" وہ ایک دم شکست خوردہ ہو گئی۔

"پاگل لڑکی! ایسی باتیں بھلا کب تک چھپتی ہیں اور

تم... اس طرح سے کیسے زندگی گزار سکتی ہو؟" ولی نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ان لوگوں کا لالچ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک بیوہ عورت کے سر کا سائبان بھی چھین لینا چاہتے تھے ہمیں تنہا سمجھ کر من مانی کرنے لگے تھے۔ نہیں ولی مجھے یہ گوارا نہیں تھا مجھے... بس یہ طریقہ ہی درست لگا۔ منگنی توڑ دی اور مما کو بھی سختی سے خاندان میں یہ بات بتانے کو منع کر دیا۔" اس نے نگاہیں چرا کر کہا۔

"دنیا میں سب ایک سے نہیں... کسی پر تو اعتبار کرتیں۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہمیں تو ایسے لوگ ہی ملے جنہیں مجھ سے زیادہ میری جائیداد میں دلچسپی تھی۔" اس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹ لیے۔

"نہیں... ایک شخص ایسا بھی ہے جسے نتاشا وسیم کی جائیداد سے نہیں۔ بس اس کی ذات سے دلچسپی ہے۔" ولید نے سوچا کہ اب بھی نہ کہا تو پھر کبھی اقرار نہیں کر پائے گا۔

"کو... کون..." اس کے ہونٹ کانپے۔

"ولید خان... یعنی میں..." اس نے بڑے جذب کے عالم میں کہا اور دلکشی سے مسکرایا۔

"تم... مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔" وہ ایک دم بدکی۔

"ہاں... کیونکہ تم لولی لنگڑی اور کانی ہو نا۔" اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا وہ زور سے چیخا۔

"میں جانتی ہوں... مما نے تمہیں رو رو کر منایا ہے... مگر... مجھے ایسی ہمدردی نہیں چاہیے۔" نتاشا نے نفی میں سر ہلایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"خالہ... پہلے تو مجھے شک تھا۔ مگر آج یقین ہو گیا۔" ولید نے سر کھجا کر تسنیم کو دیکھا۔

"کس بات کا بیٹا؟" وہ جو نتاشا کی حرکت پر ہکا بکا تھیں بے اختیار پوچھنے لگیں۔

"یہ سچ مچ میں جھلی ہے۔" ولید کے انداز پر تسنیم چونکیں، پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ان کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

☆ ☆ ☆

بیٹی کی ہٹ دھرمی اور ضد پر تسنیم کی طبیعت رات سے خراب تھی۔ ولید ان کی دوائیں پہنچانے آیا تو انہوں نے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ نتاشا ماں کے برابر میں بیٹھی سر دبا رہی تھی وہ تسنیم کے کہنے پر چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

"دل میں چاہ رہی تھی کہ عید کے بعد تم دونوں کا سادگی سے نکاح کر دوں اُدھر تم اکیلے ہو اور مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد کہیں... وہ..." تسنیم نے ولید کا ہاتھ تھام کر عاجزی سے بولتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اللہ نہ کرے خالہ... ابھی تو آپ کو میرے ساتھ پورا ابوظہبی گھومنا ہے۔" اس نے تسنیم کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

"بس... بیٹا... میں تو تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں مجھ بوڑھی کا ساتھ جانے کب تک ہو... یا نہ ہو۔" وہ جانے کیوں اتنی مایوس ہو رہی تھیں۔

"آپ نے نتاشا کی بھی رائے لی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔" تسنیم نے اٹھنا چاہا تو ولید نے تکیہ کے سہارے انہیں بٹھایا۔

"ہاں... تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ میں بھی تو وسیم ابو کا بیٹا ہوں... آپ کو اکیلا تھوڑی چھوڑوں گا۔ شادی کے بعد آپ دونوں میرے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گی۔" ولید نے دل کی مسرت کو چھپاتے ہوئے حل پیش کیا۔

"نہیں بیٹا... میرا کوئی مسئلہ نہیں... میں تو اسی گھر میں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے پھیکی مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔

"خالہ... آپ پر یہ بیماری ویماری بالکل سوٹ نہیں کرتی۔ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔" اس نے خوشی سے بولتے ہوئے ان کا ذہن بٹانا چاہا۔

"بس نتاشا کا گھر بس جائے تو میری آدھی بیماری دور ہو جائے گی۔" تسنیم کی پُرامید نگاہیں اس پر جم گئیں۔

"دیکھیں۔۔۔ آپ کو میری جاب کی نوعیت پتا ہے' مجھے کئی مہینے ملک سے باہر رہنا پڑتا ہے' ایسے میں اگر آپ نتاشا کے ساتھ رہیں گی تو مجھے بھی سکون رہے گا اور اس کی ضد بھی پوری ہو جائے گی۔" اس نے تفصیل میں جا کر انہیں سمجھایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"مگر دنیا کیا کہے گی۔" وہ نیم رضامند دکھائی دیں' مگر پھر ایک اور خدشہ جاگا۔

"یہ ہی کہ ایک ماں اپنے بیٹے کے گھر رہ رہی ہے۔" ولید نے مضبوط ہاتھوں میں ان کے کمزور ہاتھ تھام کر مستحکم لہجے میں فیصلہ سنا دیا۔

"وسیم صاحب کو ہیروں کی پرکھ تھی' انہوں نے تم پر جو اعتبار کیا' وقت نے اُسے غلط ثابت نہ ہونے دیا۔" تسنیم نے ولید کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی تو وہ خیالوں سے لوٹ آیا۔

☼ ☼ ☼

ولید دو دن سے اس کے نخرے برداشت کر رہا تھا۔ نتاشا افطاری بھی الگ کرنے لگی تھی۔ جہاں وہ موجود ہوتا' وہاں سے اٹھ کر چلی جاتی۔ پتا نہیں اپنے جھوٹ پر شرمندہ تھی یا اس کے اقرار پر خفا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر اسے کوئی جلدی نہیں تھی' وہ اسے سوچنے کے لیے ٹائم دینا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اپنی خوشی اور رضامندی سے اس کی زندگی میں آئے۔ صبح تسنیم نے فون کر کے اس سے شکایت کی تھی کہ ابھی تک نتاشا نے عید کی کوئی تیاری نہیں کی' اس لیے وہ آج اسے ضرور بازار لے جائے اور ساری شاپنگ کرا دے۔ روزہ کھولنے کے بعد جب وہ نماز پڑھ کر آیا تو اس نے شاپنگ کا عندیہ دیا۔ تسنیم نے بجھے انداز میں بتایا کہ نتاشا نے جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اس کا دماغ گھوم گیا وہ ہونٹ بھینچ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اتنے میں ٹی وی پر عید کا چاند دکھائی دینے کا اعلان ہو گیا تو اس نے زبردستی کرنے کی ٹھانی۔

"نتاشا کہاں ہے۔" ولید نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ شاید چھت پر ہو گی۔" تسنیم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور کچن کی جانب چل دیں' صبح کے پکوانوں کی تیاری کرنی تھی۔

"محترمہ کا دماغ درست کرنا ہی ہو گا۔" وہ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا تو وہ آسمان کی طرف منہ کیے' جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

"تم کیا یہاں مجھ سے چھپ کر بیٹھی ہو؟" وہ اس کے قریب آ کر غصے میں چلایا' وہ ڈر کر بے اختیار مڑی تو اس سے ٹکرا گئی۔

"میں۔۔۔ تم سے کیوں چھپوں گی؟" اس نے ایک دم سنبھل کر دور ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر میرے ساتھ شاپنگ پر جانے سے انکار کیوں کیا۔" اس نے خشک انداز میں پوچھا۔

"ہاں' وہ۔۔۔ میرے پاس بہت سارے کپڑے موجود ہیں۔" نتاشا نے پہلی بار اسے یوں طیش میں دیکھا تو ہکلا کر بہانہ بنایا۔

"چپ چاپ چلو۔۔۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" ولید نے اس کا ہاتھ تھاما اور گھسیٹتا ہوا زینے کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی دھمکی پر نتاشا کی جان نکل گئی۔ خاموشی سے مسکے ہوئے لباس کو دوسرے ہاتھ سے درست کرتی' اس کے ساتھ چل دی۔ تسنیم انجان بنی' سر جھکائے کباب بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ ویسے بھی انہیں عید کے لیے بہت سارے دوسرے لوازمات تیار کرنے تھے' اگر نتاشا سے سر کھپانے بیٹھ جاتیں تو پوری رات اسی میں کٹ جاتی' مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

☼ ☼ ☼

ولید نے تسنیم خالہ اور اس کے لیے ڈھیروں شاپنگ کی دو' دو ریڈی میڈ سوٹ دلائے۔ چپلیں

خریدیں' وہ جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتی خرید تا چلا گیا۔ اس نے پیسے دینے کی کوشش کی تو بڑی کڑی نگاہوں سے اسے گھورا' نتاشا نے اپنے کلچ کا منہ جلدی سے بند کردیا۔ ان دونوں کے لیے مہنگی سے مہنگی اشیا کی خریداری کے بعد اسے خاص طور پر ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں دلائیں اور مہندی بھی خریدی' تاکہ وہ مہندی لگوا سکے۔ اس کے تاثرات ایسے ہو رہے تھے کہ نتاشا خلاف توقع اس کی ہر بات مانتی جارہی تھی' ورنہ عام لڑکیوں کے مقابلے میں اسے ان چیزوں سے شروع سے رغبت نہیں تھی۔ درحقیقت وہ ولید کے بدلے ہوئے تیوروں سے تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی' شاپنگ کے دوران اس کی سرد مہری اسے دہلائے دے رہی تھی۔

ولید نے سوائے ضروری بات کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔

"تم... مجھ سے ناراض ہو...." گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے سامنے دیکھ کر ڈرائیونگ کرتے ولید سے پوچھا۔

"وہ کیوں...؟" اس نے انجان بنتے ہوئے الٹا سوال کیا۔

"لگ رہا ہے' کچھ عجیب ساری ایکٹ کررہے ہو۔" نتاشا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اور تم.... تم کیا کررہی ہو؟" رفتار تیز کرتے ہوئے اس کا لہجہ بھی تیز ہوا۔

"کیسی باتیں کررہے ہو.... میں نے کیا کیا ہے؟" وہ الٹا برہم ہونے لگی۔

"میں نے جب سے تم پر اپنی پسندیدگی ظاہر کی ہے' تمہارے مزاج ہی نہیں مل رہے' میرے ساتھ اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا تک چھوڑ دیا ہے۔ شاید میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ' بکھرا بکھرا سا تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی' دونوں کی نگاہیں ملیں' ایک شعلہ سا لپکا۔

"یہ بات نہیں ہے ولی۔" نتاشا نے بے چینی سے اس کی طرف سے لگائی گئی فرد جرم سے انکار کیا۔

"پھر.... میں کیا سمجھوں؟" ولید نے اسے مڑ کر دیکھا اور پھر گیئر پر ہاتھ رکھا۔

"تم نے پاپا کے جانے کے بعد جس طرح سے میرا اور مما کا خیال رکھا اور اب بھی.... جو کچھ تم ہم لوگوں کے لیے کررہے ہو۔ وہ ناقابل فراموش ہے۔ اسی وجہ سے میرا کھویا ہوا اعتبار بحال ہوا ہے۔" کلی سے لب کھلتے بند ہوتے گئے اور وہ نامحسوس انداز میں اسے دیکھے گیا' مگر اس کے منہ سے کچھ خاص سننے کی خواہش' من میں اضطراب برپا کیے ہوئے تھی۔

"ہم دونوں کے بیچ.... بس اعتبار کا رشتہ قائم ہوا ہے۔ اور کچھ نہیں۔" (وسیم ولا) کے کاریورچ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے کچھ سوچ کر نتاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں.... مجھے تمہارے پیار پہ پیار آگیا ہے۔" نتاشا نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ سحر زدہ سا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا' کتنی دیر وہ گاڑی میں بت بنا بیٹھا اس ایک بات کی بازگشت بار بار سنتا رہا' جو نتاشا نے جاتے ہوئے کہی تھی۔

"یقین ہوگیا کہ تم سچ مچ میں اپنی پوری رضامندی کے ساتھ میری ہوگئی ہو۔"

ولی نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب کیا اور پرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی بے رنگ زندگی میں اچانک سے ملنے والی اقرار کی نوید نے خوشیوں کے رنگ بھر دیے تھے' کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھا جو یقین دلا رہا تھا کہ محبت کے یہ رنگ صرف اس عید پر نہیں بلکہ تاعمر اس کے ساتھ رہنے والے ہیں۔

نمرہ احمد

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی' سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت وزندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے.... ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

حنین اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں ''اینٹس ایور آفٹر'' کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جڑواں تھا۔

سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے۔ جس میں زمر کا سابق منگیتر حماد بھی آئے گا۔ زمر سعدی سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

مکمل ناول

سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔

ہاشم کی سیکریٹری کال کرکے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا' وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔

ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔

دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہوجاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھوجاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہوگئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہوجاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آفس اوور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہوجاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فند سے زمر کی بات طے کردیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کررہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کردیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضایع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کررہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کردیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈالتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کرسکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہوجاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہوجاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

جواہرات زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کرسکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کررہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کرلے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کردیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہوچکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو ماردیں گے۔

ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔

سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلا" کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلا"... مثلا" ہاشم کاردار..." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصے سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

زمر' فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی' وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے' یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔

جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی' ڈاکٹر توقیر بخاری' ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ۔ فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔

سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتا دیا ہوگا۔

ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔

ہارون عبید مشہور سیاست دان جواہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے، جو سعد کے ساتھ بڑھتی رہی ہے۔

فارس، زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔

(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کرکے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے، وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کرچکا ہے۔

تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔

حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک اوسی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہوسکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے، جہاں احمر شفیع، ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔ زمر اور فارس، حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔

ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔

حنین اور زمر ہاشم کی سیکریٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔

ہاشم، سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہوجاتا ہے، پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے، تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے، جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ اوسی پی کو قتل کررہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے اوسی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔

زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہوچکا ہے۔

پچیسویں قسط

اک مسافت عالم تنویم میں....

لوگ کہتے ہیں کہ
زبردست محبت وہ ہوتی ہے
جو تمہیں بٹھاتی ہے
پینے کو پانی دیتی ہے
اور تسلی آمیز انداز میں
تمہارے سر پہ تھپکی دیتی ہے
مگر میں کہتی ہوں کہ
زبردست محبت وہ ہے
جو تمہیں اڑا دے فضا میں
بھڑکا دے تمہارے وجود میں شعلے
تم آسمانوں میں جلتے ہوئے اڑتے جاؤ
اور رات کو ہما پرندے کی طرح روشن کردو۔

ایسی محبت جو تمہیں جنگل کی آگ کی طرح
بھگاتی جائے اور تم۔۔۔
تم دوڑتے دوڑتے رکو نہیں۔
اور جس شے کو بھی تم چھوؤ
اسے جلا کر راکھ کرتے جاؤ۔
میں کہتی ہوں یہ ہے اچھی محبت۔
جو تمہیں جلا ڈالے
جو تمہیں اڑا ڈالے
اور تم اس کے ساتھ
بھاگتے چلے جاؤ۔۔۔

(سی جوائے بیل سی)

سرما کو اپریل کے سورج نے پگھلا کر گویا بھاپ بنا کے اڑا دیا تھا۔ وہ ایسا گیا کہ اب نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ فضا گرم تھی۔ ہوا ساکن تھی۔ گزشتہ برسوں کی نسبت اس سال موسم گرما موسم بہار کے درمیان سے ہی شروع ہوا چاہتا تھا۔

کچہری کا بے قابو ہجوم ویسے ہی بھانت بھانت کی بولیاں بولتا راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ البتہ وہ کمرہ عدالت بند دروازوں کے باعث آوازوں و شور سے محفوظ تھا۔ چبوترے پہ اونچی کرسی پہ براجمان سیشن جج جناب عابد آغا صاحب اپنے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ سامنے دونوں اطراف کرسیاں لگی تھیں۔ کورٹ رپورٹر اپنے کی بورڈ پہ ہاتھ جمائے تیار بیٹھا تھا۔ بولنے والوں کا ہر سچ اور ہر جھوٹ صفحہ قرطاس پہ منتقل کرنے کو بے تاب تھا۔

دونوں جانب کی کرسیوں کے درمیان گزرنے کا پتلا سا راستہ تھا۔ ہاشم کاردار ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ ساتھ سوٹ' ٹائی اور جھکے سر والا شیرو موجود تھا' اور مزید آگے دیکھو تو جواہرات بیٹھی بے زاری سے اپنے نیکلس کو انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ دائیں جانب بھی دیکھ لیتی جہاں دوسری میز کے پیچھے زمر اور سعدی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ سر ایک دوسرے سے جوڑے' وہ دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ پچھلی کرسیوں پہ حنین اور اسامہ بیٹھے تھے۔ بالکل خاموش۔

اب واپس ہاشم کاردار کی طرف آجائیں تو وہ اسی طرح مطمئن سا بیٹھا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی' اور چہرہ سنجیدہ سا لگتا تھا۔

"زمر صاحبہ' آپ شروع کریں۔" جج صاحب نے کاغذات سے نظریں اٹھا کر زمر کو اشارہ کیا۔ ٹرائل شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بولنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ سعدی سے آہستہ سے کچھ کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کوٹ ذرا کھینچ کر درست کیا۔ بال کان کے پیچھے اڑسے۔ اس کی ناک میں ننھے سے ہیرے کی لونگ دمک رہی تھی۔ ہاشم یوں ہی اسے دیکھے گیا۔ وہ اس لونگ اور اس میں چھپی داستانوں سے بے خبر تھا' مگر اس کی چمک سے اسے کچھ یاد آرہا تھا۔۔۔ ذہن پیچھے کہیں تیرنے لگا تھا۔۔۔ اور ایک دم وہ دو ماہ پہلے کی اس صبح میں غوطہ زن ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

"ڈاکٹر ایمن!" سبزہ زار پہ اپنی کار کے ساتھ کھڑا' وہ مسکراتے ہوئے اس عورت سے کہہ رہا تھا جس نے ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔
"تو وہ آپ تھیں نا۔ جنہوں نے مجھے وہ پاسپورٹ بھیجا تھا۔"

ڈاکٹر ایمن نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ جو کچھ اور کہنے جا رہی تھی' رک گئی۔ بھنویں نا سمجھی سے اکٹھی ہوئیں۔ "سوری' کون سا پاسپورٹ؟"
"آپ۔۔۔ نے۔۔۔ مجھے۔۔۔" وہ توڑ توڑ کر کہتا اس کے سامنے آیا۔ "ایک۔۔۔ پاسپورٹ بھیجا تھا۔۔۔ سعدی یوسف کا۔"

اس نے اچنبھے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ "نہیں' میں نے آپ کو کچھ نہیں بھیجا۔ میں نے تو دو تین دفعہ بس آپ کے آفس کال کی تھی' ملنا

چاہتی تھی۔ اگر آپ کو کسی نے میرے خلاف کچھ کہا ہے تو یقین مانیں' اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔"
ہاشم نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے اسے دیکھا۔ انداز سے لگتا تھا' وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس نے سر جھٹکا۔

"خیر... کیوں ملنا چاہتی تھیں آپ مجھ سے؟" انداز ذرا روکھا ہو گیا تھا۔ دلچسپی گویا ختم ہو گئی تھی۔
"میں فارس غازی کے خلاف آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ جب آپ ٹرائل میں اس کے بھانجے کے خلاف دلائل دیں گے تو..."
"ایک منٹ بی بی۔" اس نے انگلی اٹھا کر روکا۔
"کوئی ٹرائل نہیں ہو رہا۔ نہ کبھی ہو گا۔ یہ آپ لوگوں کی بھول ہے کہ ہم اور "وہ" کبھی دو خاندانوں کی طرح استغاثہ اور دفاع کی کرسیوں پہ کسی کورٹ روم میں بیٹھے ہوں گے۔ اور مجھے اگر آپ کی مدد کی ضرورت پڑی... "اگر" پڑی تو میں خود آپ کو یاد کر لوں گا۔ ابھی آپ جا سکتی ہیں۔"
اور بن گلاسز آنکھوں پہ چڑھاتا' ہاتھ جھلا کر ڈرائیور کو اشارہ کرتا وہ گاڑی کے اندر آ بیٹھا۔ باادب ملازم نے کالے شیشے والا دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی زن سے سامنے سے گزر گئی اور ڈاکٹر ایمن جو ابھی کچھ کہہ ہی نہیں سکی تھی' تلملا کر اسے جاتے دیکھتی رہیں۔

آج

"زمر صاحبہ... آپ شروع کریں۔" جج کی آواز کی بازگشت تھی جو اسے سنائی دی تھی۔
ہیروں کی چمک مدھم ہوئی۔ قدرے چونک کر ہاشم سیدھا ہوا' اور پھر اپنے اطراف میں دیکھا۔ وہ کمرہ عدالت میں بیٹھا تھا' اپنے خاندان کے ساتھ' اور دوسری طرف... اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہاں پچھلی کرسیوں پہ حنین کے ساتھ فارس بیٹھا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی آیا تھا۔ اور ذرا پیر لمبے کر کے بیٹھا مسلسل چیونگم چباتے ہوئے سامنے دیکھ رہا تھا۔ صرف وہی تماشائی لگتا تھا۔ باقی سب شدید تناؤ کا شکار تھے۔
ہاشم کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے اس نے نگاہیں گھمائیں۔ سنہری آنکھیں' سیاہ آنکھوں سے ملیں۔ ہاشم سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا' مگر سنہری آنکھیں مسکرائیں۔ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر' سر کو ذرا سا خم دیا۔ (سلام!) ہاشم نے نخوت سے رخ واپس پھیر لیا۔
"یور آنر!" زمر چبوترے کے سامنے زمین پہ کھڑی بات کا آغاز کر رہی تھی۔ "سرکار بنام نوشیرواں کا ردار کو درست طور پہ سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے سعدی یوسف کو سمجھنا ہو گا۔ ایک رشتے دار کی حیثیت سے نہیں' ایک وکیل کی حیثیت سے میں معزز عدالت کو بتانا چاہتی ہوں کہ سعدی یوسف کون ہے؟ اور سعدی یوسف کون تھا؟ میں آپ کو سعدی یوسف کی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔"
جج صاحب توجہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ حنین کی نظریں بھی زمر کی پشت پہ جمی تھیں۔ وہ اس کے الفاظ پہ اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہتی تھی' ایک ایک لفظ دھیان سے سننا چاہتی تھی' مگر کورٹ رپورٹر کے کی بورڈ پہ ٹھک ٹھک چلتے ہاتھوں کی آواز' زمر کی آواز پہ سے اس کا دھیان ہٹا رہی تھی۔ پھر یکایک ساری آوازیں پس منظر میں چلی گئیں اور دھیرے دھیرے کمرہ عدالت اس کے بیڈ روم میں تبدیل ہو تا گیا...

دو ماہ پہلے

وہ اپنے کمرے میں کھلی کھڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ پریشان نگاہیں باہر لگی تھیں۔ زمر' سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا اور سعدی تیزی سے اندر داخل ہوا۔
"وہ بھاگ چکا ہے۔ سرخ مفلر والا آدمی۔ گارڈ کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے پیچھے بھاگا تھا مگر تب تک وہ گلیوں میں گم ہو چکا تھا۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "اب وہ کسی ہمسائے کے گھر میں کود چکا ہے۔ گارڈز گئے ہیں مگر میرا نہیں خیال کہ وہ اب ملے گا۔"

پھر حنین کو دیکھا۔

"تمہارا میموری کارڈ۔۔۔ کیا تھا اس میں؟"

وہ ابھی تک کھڑکی میں دیکھ رہی تھی سعدی کی آواز اس نے آہستہ سے چہرہ گھما کر سعدی کو دیکھا۔ آنکھوں میں بددلی تھی۔

"وہ علیشا نے ہمیں دیا تھا۔ ہم اتنے سال اس کو لے کر پھرتے رہے آپ کی 'کی چین' میں مگر اس کو استعمال نہیں کر سکے۔"

"مگر اس میں تھا کیا؟" زمر نے تھکی تھکی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ حنین نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کرنل خاور کے بیٹوں کو ہاشم نے مروایا تھا اور مسز کاردار نے۔۔۔ پھر الزام ایک آفیسر پہ ڈال دیا جو خاور کے کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔ یہ اگلے سو سال کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگ ہیں۔ اس لیے یہ اتنے امیر اور اتنے کامیاب ہوتے ہیں۔ جب یہ کسی کو اپنا دست راست بناتے ہیں تو اس کی ساری کشتیاں جلا دیتے ہیں۔ خاور نہیں جان سکا۔ اس نے اس بریگیڈیئر کی آنکھوں کے سامنے اس کے خاندان کو مارا اور پھر اس کو بھی مار دیا۔ اس کو بعد میں علم ہوا کہ اس بریگیڈیئر کا ایک اور بیٹا بھی ہے جو امریکہ میں زیر تعلیم ہے اور اس کو وہ خفیہ اولاد کی طرح چھپا کر رکھتا ہے۔"

حنین سانس لینے کو رکی۔ یہ باتیں بتانا عجیب لگ رہا تھا۔ سعدی غور سے اور زمر عدم توجہی سے سن رہی تھی۔

"خاور کا اس بچے سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اس نے صرف بریگیڈیئر کو اذیت دینی تھی۔ جب وہ دی تو انتقام ختم ہو گیا۔ اس نے اس لڑکے کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ اس کو مار کر کیا کرتا؟ بریگیڈیئر بنگش کے دوستوں نے اسے چھپا دیا۔ خاور کو صرف اس کی ایک گھڑی ملی تھی جس پہ اس لڑکے کا پارشل فنگر پرنٹ تھا۔ اس کارڈ میں ایک ویڈیو بھی جو یقیناً "مسز کاردار" نے بنوائی تھی۔ اس میں خاور ان کے سامنے آکر اعتراف جرم کرتا ہے اور وہ اس کو نوکری پہ رکھ لیتے ہیں گویا اپنے پیروں میں چھپا لیتے ہیں۔ یوں ان کو وفادار ملازم بھی مل گیا اور اس کی دکھتی رگ کو بھی ہاتھ میں لے لیا جس سے وہ کبھی بھی اس کو اپنے جوتے تلے مسل سکتے ہیں۔ علیشا نے وہ پورا فولڈر کاپی کیا تھا۔ اس میں کچھ تصاویر تھیں۔۔۔ وہ ویڈیو تھی۔ اور ایک پارشل فنگر پرنٹ کی فائل تھی۔ جواہرات کے لیپ ٹاپ سے لیا تھا اس نے یہ سب اور مجھے یاد ہے وہ کبھی بھی خاور کو اپنے کمپیوٹر کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ علیشا ہیکر تھی۔ ان ہی جرائم کی وجہ سے وہ جیل گئی تھی۔ اس کی نیشنل ڈیٹا بیس تک رسائی تھی۔ اس نے اس پارشل فنگر پرنٹ کو ڈھونڈ نکالا۔ شاید خاور امریکہ میں ہوتا اور دلچسپی لیتا اور کاردار نے اسے مصروف نہ کر رکھا ہوتا تو وہ اسے بھی ڈھونڈ نکالتا مگر اس کا تو انتقام پورا ہو گیا تھا۔ مگر انتقام کے سائیکل میں ایک سروائیور رہ جاتا ہے۔ اور وہ اس چکر کو الٹا چلاتا ہے۔ وہ لڑکا سلطان کئی برس کی انتھک محنت کے بعد اورنگزیب کاردار کے پاس ملازمت کرنے آتا ہے۔ اس کے ڈرائیونگ لائسنس کی کاپی اس کارڈ میں تھی اور میں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی کہ یہ احمر شفیع کی پرانی تصویر ہے۔"

"احمر؟ وہ اسٹیپنی؟" سعدی کو دھکا لگا تھا۔ زمر خاموش رہی۔ اسے اب کوئی بھی بات حیران نہیں کرتی تھی۔

"میں نے یہ ساری باتیں فارس ماموں کو بتائیں تو انہوں نے احمر سے یہ سب پوچھا۔ یہ بات احمر نے انہیں بتائی کہ اس کے والد نے نہیں 'کاردارز نے خاور کے بیٹوں کو مارا تھا۔ چونکہ فارس ماموں نے خود اس دن خاور کو جانے دیا تھا' زمر کے کہنے پہ' حالانکہ بعد میں خاور نے زمر پہ گولی بھی چلانی چاہی تھی۔ انہوں نے احمر سے کہا کہ وہ اسے جانے دے ورنہ خاور اس کو اکسا کر اسے کہے گا کہ مجھے مار ڈالو اور یوں احمر مجرم بن جائے گا۔ انتقام کا چکر الٹا ہو جائے گا۔ خاور کا تیسرا بیٹا ابھی زندہ ہے۔ وہ احمر کو جینے نہیں دے گا۔ مگر احمر نے بات نہیں مانی۔ اس نے ہی کیا ہے جو بھی کیا ہے خاور

کے ساتھ۔ خاور کے ایکسیڈنٹ اور فالج کے بارے میں تو آپ سب نے ہاشم کے ٹوئٹر پہ پڑھ لیا ہو گا۔ خیر مجھے خاور سے کوئی ہمدردی نہیں ہے' اس لیے میں نے اس کے بیٹے کو سب بتا دیا ای میل کر کے۔ فارس ماموں بھی صبح ادھر ہی گئے تھے۔ وہ ایک دفعہ۔۔۔"

"تم نے اسے کاپی کیوں نہیں کیا؟ ہم اسے کورٹ میں استعمال کر سکتے تھے۔" سعدی جھنجلایا تھا۔ خاور سے وہاں کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔

"بھائی! وہ کاپی نہیں ہو رہی تھی اور میں نے وہ بہت سنبھال کر رکھی تھی۔"

"حنین۔" زمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کس کس کو علم تھا کہ وہ تم نے کہاں رکھی ہے؟ کسی ملازم نے دیکھا تھا تمہیں وہ رکھتے ہوئے؟"

"نہیں زمر! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ' اس دراز کی چابی کی جگہ' میرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔ "پہلے وہ فلیش ڈرائیو خالی نکلی' اور اب یہ سارے ثبوت گئے۔ شاید یوسفز اتنی بھیانک اور تاریک چیزیں رکھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔" حنین نے دل گرفتی سے ایک اور سچ بولا۔ سعدی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اونہوں۔ مجھے یقین ہے جب سونیا کی سالگرہ کی رات میں نے ہاشم کے کمرے میں جا کر وہ فلیش ڈرائیو کاپی کی تھی تو اس کے اندر کافی سارا مواد موجود تھا۔ میموری تقریباً" فل ہو گئی تھی۔ اور اب اس میں فروزن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یقیناً" کسی نے اہم ڈاکومنٹس اس میں سے مٹائے ہیں۔"

"کوئی میری ناک کے نیچے میری فلیش سے کیسے کچھ مٹا سکتا ہے؟"

"جیسے کوئی تمہاری دراز سے کارڈ نکال کر لے جا سکتا ہے۔ یقیناً" اس شخص کو ہاشم نے بھیجا ہو گا اور اسے اس فلیش کا پاس ورڈ معلوم ہو گا۔ نہ ہم خود محفوظ ہیں' نہ ہمارا گھر۔" سعدی تلخی سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

حنین نے بے اختیار زمر کو دیکھا تھا۔ "اب کیا ہو گا؟ ٹرائل کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

ذرا دیر بعد زمر نے چہرہ اٹھایا تو لگتا تھا وہ خود کو قدرے سنبھال چکی ہے۔

"پاکستان میں ایسے ہی ہوتے ہیں ٹرائلز۔ مخالف فریق ٹرائل شروع ہونے سے قبل ہی ہمارے ثبوت مٹا دیتے ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں۔" وہ بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل دیتی اپنی جگہ سے اٹھی۔

"ہمارے پاس ہماری زبانیں' ہمارے دلائل اور ہمارے گواہ موجود ہوں گے۔ ٹرائل ہو گا اور ضرور ہو گا' اور اسے ہم ہی جیتیں گے اور نہ بھی جیت سکے تو کم از کم۔۔۔" اس نے سنجیدگی سے حنین کو دیکھا۔ "اٹ وڈ بی ورتھ ٹرائنگ۔"

✲ ✲ ✲

آج:

"یور آنر!" حنین نے سر جھٹکا۔ ارد گرد چلتا منظر بجلی جانے پہ بند ہونے والی ٹی وی کی طرح غائب ہو گیا۔ وہ ذرا سنبھل کر سیدھی ہو کر بیٹھی۔ کمرہ عدالت اس کے اطراف میں آبسا تھا اور وہاں سب دم سادھے زمر کو سن رہے تھے جو جج کے چبوترے کے سامنے کھڑی بات کا آغاز کر رہی تھی۔ یہاں سے اس کی پشت نظر آتی تھی۔ سیاہ کوٹ کے اوپر گھونگھریالے بال آدھے بندھے گر رہے تھے اور وہ وقفے وقفے سے کان کے پیچھے ایک لٹ اڑستی تھی۔

"میرے مؤکل سعدی یوسف کی کہانی اکیس مئی سے ہی نہیں شروع ہوئی تھی۔ یہ اس سے بہت پہلے شروع ہوئی تھی۔" چہرہ موڑے بغیر سعدی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ وہ بس زخمی آنکھوں سے سامنے دیکھے گیا۔

"جو سعدی یوسف اس وقت کمرۂ عدالت میں انصاف کا طالب بن کر بیٹھا ہے' یہ وہ سعدی نہیں ہے جس کو اس کے گھر والے گزشتہ کئی برسوں سے جانتے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہیں۔ وہ سعدی اور تھا۔ وہ زندہ دل تھا۔ لوگوں کو معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا تھا۔ ملک کی خدمت کا جذبہ لے کر اس نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایک محنتی اور قابل نوجوان تھا۔ اس کے پاس ٹیلنٹ تھا، ہنر تھا، ذہانت تھی۔ اگر اس کو کام کرنے دیا جاتا، اس کو مواقع ملتے تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ مگر یور آنر، میرے ملک کے نوجوانوں کو اگر اسی طرح پھلنے پھولنے دیا جائے تو معروف اور امیر آئی پی پیز کے آتش دان ٹھنڈے نہ پڑ جائیں؟ اگر ان نوجوانوں کو یوں ہی بڑے بڑے پراجیکٹس پہ محنت اور لگن سے کام کرنے کی اجازت دے دی جائے تو وقت کے ہر فرعون کی غلامی کون کرے گا؟"

ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا ہاشم، گال تلے انگلی رکھے اطمینان سے زمر کو دیکھ رہا تھا۔ آخری بات پہ آگے جھکا، نوٹ پیڈ اٹھایا اور اس پہ الفاظ تحریر کیے۔

"سعدی یوسف۔ غریب کارڈ۔ محب وطن کارڈ۔"

نوٹس لے کر اس نے پیڈ ڈال دیا اور توجہ سے سننے لگا۔ وہ اب چبوترے کے سامنے چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ ہلا کر۔ دائیں سے بائیں ٹہلتی ہوئی۔

"سعدی یوسف کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی اس کی معصومیت تھی۔ اس نے سمجھا کہ شاید دوسرے لوگ بھی اس کی طرح ہوتے ہیں، ان کو اللہ کا خوف دلاؤ تو وہ سدھر جاتے ہیں اور اسی خیال کے تحت وہ اکیس مئی کی صبح ہاشم کاردار کے بلانے پہ اس کے آفس گیا تھا۔ یور آنر! وہ وہاں پر ان سے جھگڑا کرنے یا ان کو مارنے کی نیت سے نہیں گیا تھا، بلکہ وہ وہاں ان کو قانون کی حرمت کا احساس دلانے گیا تھا۔"

ہاشم سنجیدگی سے سنتا رہا۔ چہرے پہ وہی تاثرات برقرار رہے۔

"اس موقعے پہ ہاشم کاردار نے سعدی یوسف کو تیس کروڑ روپے لے کر اپنا منہ بند رکھنے کی پیشکش کی، جسے اس نے ٹھکرا دیا۔ یہ ہی وقت تھا جب ملزم نوشیرواں کاردار سے اس کی تلخ کلامی ہوئی مگر نہ ہی سعدی یوسف نے کسی پہ ہاتھ اٹھایا نہ ہی تکرار کی بلکہ چند الفاظ کہہ کر وہ وہاں سے چلا آیا۔ ایک پچیس سال کے نوجوان کے خاندان کی عورتوں کے بارے میں نازیبا باتیں کی جائیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ مخالف کا منہ نہ توڑ دے۔ مگر سعدی یوسف نے تلخ کلامی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ وہ قانون توڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ قانون کی بالادستی اور انصاف قائم کرنے کے لیے ان کو نصیحت کرنے گیا تھا۔ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی سے پہلے وہ خیر کا ایک آخری راستہ دکھانے گیا تھا ان کو، شاید کہ وہ نادم ہوں، شاید کہ وہ پلٹ آئیں، تو ان کی سزا میں کمی ہو جائے۔ ایسا تھا ہمارا سعدی۔ دشمنوں کا بھی خیر خواہ۔"

زمر نے رک کر چہرہ موڑا۔ سعدی اب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ہاشم البتہ انہماک سے پیڈ پہ الفاظ کا اضافہ کر رہا تھا۔ "ڈرامیٹکلی؟ بکٹرا اسکیچ۔ مسیحا، ہمدرد۔ غریب بمقابلہ امیر۔ مختصر یہ کہ فرشتہ کارڈ کھیل رہی ہیں پراسیکیوٹر۔" اس کا دماغ زمر کے ہر کارڈ کا توڑ سوچ رہا تھا۔ پہلے نوٹ پیڈ پہ نظریں جمائے وہ زمر کی باتیں سن رہا تھا مگر بار بار دھیان بٹ سا جاتا تھا۔ نوٹ پیڈ کے صفحے بالکل زرد تھے۔ سورج مکھی کے پھولوں جیسے زرد۔ اور اس زردی میں بہت سے بلب جگمگانے لگے۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ پہلے

اس کے آفس کا کاریڈور صبح کے باوجود زرد بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ ذہن میں ڈاکٹر ایمن کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ جمع تفریق کر رہا تھا۔ جوڑ توڑ کر رہا تھا۔

اپنے آفس کے دروازے پہ وہ ٹھہرا۔ چہرے پہ خوشگوار مسکراہٹ در آئی۔ موڈ ایک دم اچھا ہو گیا۔

"ریڈ؟" اس نے مسکرا کر آفس میں قدم رکھا۔ وہ جو کرسی پہ بیٹھی تھی، چونک کر مڑی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔

چہرے پہ بدقت چھلکی سی مسکراہٹ لائی۔ سرخ رومال سر پہ لپیٹ کر گردن کے پیچھے گرہ لگا ئی ہوئی تھی' اور کانوں میں آنسو شکل کے سرخ یاقوت لٹک رہے تھے۔ سبز مائل آنکھیں بے خوابی کے باعث۔۔۔۔ گلابی ہو رہی تھیں' مگر پھر بھی وہ سنبھل کر مسکرا رہی تھی۔

"گریم ریپر!" ہاشم اس طرز تخاطب پہ ہولے سے ہنستا ہوا اندر آیا اور میز کے پیچھے جا کر' کوٹ کا بٹن کھولتے ہوئے اپنی کرسی سنبھالی۔

"مجھے اس نام سے پکارنا بند کر سکتی ہو' آبی؟" کرسی کو میز کے قریب لاتے ہوئے اس نے چند چیزیں اٹھا کر الٹ پلٹ کیں۔ چہرے پہ وہی وجیہہ مسکراہٹ تھی۔ سارا ماحول گویا معطر ہو گیا تھا۔

آب دار دھیرے سے کرسی پہ واپس بیٹھی۔ اس کی گم صم نگاہیں ہاشم کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"ناشتہ کیا ہے؟ کیا منگواؤں تمہارے لیے؟"

"میں سمندر کی گیلی ریت پہ لیٹی تھی۔۔۔ میرا وجود پانی میں ڈوب چکا تھا۔" وہ کسی گہرے خیال میں بول رہی تھی۔ "کیا دھڑ ے اور کیا دل۔۔۔ سب پانی تھا۔۔۔ ایسے میں کوئی میرے اوپر جھکا تھا۔ اس کی شرٹ کی پشت پہ ننھی سی سیپ چپکی ہوئی تھی۔۔۔ اس سیپ میں تین رنگ تھے۔۔۔ گویا رگوں کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔۔۔ تب میں نے اسے فرشتہ سمجھا تھا۔۔۔ موت کا فرشتہ۔۔۔ مگر اس موت کے فرشتے نے مجھے نئی زندگی دی۔"

وہ جو فون اٹھا کر آرڈر کرنے لگا تھا' ریسیور واپس ڈال کر مسکرا کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ گم صم سی دیوار کو دیکھتی بول رہی تھی۔ "اور اب وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی زندگی میں شامل ہو جاؤں۔" (ہاشم مسکراتا رہا۔) اب۔۔۔ جبکہ ایک دنیا۔۔۔ اسے شیطان کہنے لگی ہے۔"

ہاشم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ دماغ گویا بھک سے اڑا۔ اس نے لب کھولے مگر پھر بھینچ لیے' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"اور وہ چاہتا ہے کہ میں۔۔۔ اس کی زندگی میں شامل ہو جاؤں۔ سمر ویڈنگ یا اسپرنگ ویڈنگ۔" آبی کی گم صم نگاہیں اس کے چہرے پہ آٹھہریں۔ "سمر ویڈنگ یا اسپرنگ ویڈنگ۔۔۔ یہی پوچھا تھا نا تم نے؟"

"آبی! تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتی ہو اور پھر۔۔۔"

"اور پھر میں وہ عورت بن جاؤں گی جو شہر کے ساتویں الی جیبل بیچلر کی ملکہ بن کر اس کی زندگی میں آئے گی' اور اس کے ساتھ ہر جگہ' ہر تصویر' ہر میگزین کور پہ کھڑی ہو گی' اس کے ساتھ سیاہ گلاسز لگائے' کالے شیشوں والی لمبی گاڑی سے نکلا کرے گی۔ مگر لوگ۔۔۔" وہ آگے ہوئی۔ مسکراہٹ نہیں تھی' آنکھوں میں آنچ تھی۔ سرخی تھی۔ "مگر لوگ سامنے سرخ قالین بچھا کر اس کے انتظار میں پھول لیے نہیں کھڑے ہوں گے۔ لوگ پوسٹرز اور بینرز اٹھا کر کھڑے ہوں گے' رپورٹرز مائیک لہرا لہرا کر پوچھیں گے کہ سعدی یوسف کی زندگی کا خون کرنے کے بعد تم لوگ سر اٹھا کر کیسے جی رہے ہو؟"

"وہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے اس کو صرف اغوا کیا تھا' مگر اس کے خاندان کے افراد ہم نے قتل نہیں کیے' نہ ہی شیرو نے اسے گولیاں ماری تھیں۔" وہ تلملا کر بولا تھا۔ "اسے نیاز بیگ نے مارا تھا' میں صرف اسے اس کے دشمنوں سے محفوظ رکھ رہا تھا' مگر وہ اتنا ناشکرا ہے کہ۔۔۔" شدت جذبات سے سرخ پڑتے چہرے کے باعث وہ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

"وہ ناشکرا ہے یا شکر گزار' وہ۔۔۔ بول رہا ہے' اور دنیا اس کو سن رہی ہے۔ دنیا اس کو دیکھ رہی ہے۔ دنیا اس کے انکشافات سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ اس کا کیس اگلے بیس سال عدالت میں چلے گا' مگر بیس سال کس نے دیکھے ہیں۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔ "میری زندگی کے۔۔۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کے پہلے دو سال۔۔۔ وہ کریم ایئرز وہ لے لے گا۔ کم از کم دو سال تو میڈیا اور لوگ اس کو یاد رکھیں گے نا۔ میں دو سال تک اخبارات' ٹی وی اور سوشل میڈیا پہ الزامات پڑھتی رہوں گی۔ وہ بولتا رہے گا اور لوگ اسے سنتے رہیں

گے۔ میں جب گھر سے نکلوں گی' پبلک مجھے نفرت سے دیکھے گی۔ کیونکہ وہ تمہارا اور نوشیرواں کا میڈیا ٹرائل کر چکے ہیں۔ پبلک تمہیں مجرم قرار دے چکی ہے۔ ان کی باتیں مجھے گھر میں قید کر دیں گی۔ میں باہر تک نہیں نکل سکوں گی۔ سنا تم نے۔ جرم تم پہ ثابت ہوگا اور جیل مجھے ہو جائے گی۔"

"ہم کسی اور ملک چلے جائیں گے' تمہیں کچھ نہیں سننا پڑے گا۔" وہ آگے کو ہو کر جلدی سے کہنے لگا۔

"لیکن اگر تم قاتل نہیں ہو' اگر تم نے کچھ غلط نہیں کیا تو ہم کیوں بھاگیں؟ اگر تم اور نوشیرواں بے قصور ہو تو اس کی زبان بند کیوں نہیں کرتے؟" آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔ گود میں رکھے اس کے ہاتھ ہولے سے کپکپا رہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر وہ بظاہر جذباتی چہرہ بنائے' کہے جا رہی تھی۔ "ان کو چپ ہونا ہوگا ہاشم ورنہ میں تمہارے خاندان سے' خود کو کبھی منسلک نہیں کروں گی' جب تک یہ گندگی تمہارے ساتھ ہے۔"

"میں کیا کروں؟ تم کیا چاہتی ہو' میں کیا کروں؟" وہ آگے ہوتے ہوئے بولا۔ بار بار وہ سر جھٹکتا تھا' کبھی انگلیاں باہم پھنسا کر کھولتا تھا۔

"ان کو چپ کراؤ' پبلک کی رائے کو بدلو۔" اگلے الفاظ کہنے سے پہلے اس نے دل میں کہا تھا۔ (وہ تمہارے لیے.... فارس غازی.... یہ کبھی نہیں کرنے گی۔) اپنا دفاع کرو۔ اپنی بے گناہی ثابت کرو۔ یوں کہ دنیا مان جائے' تم سچے تھے۔ تمہارا بھائی سچا تھا۔ میڈیا.... سوشل میڈیا.... نوجوان.... سب اس کے ساتھ کھڑے ہیں۔ وہ مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ہیرو بن رہا ہے۔ کیونکہ اس کا میڈیا ٹرائل نہیں ہو رہا۔ تمہارا ہو رہا ہے۔ تم پہلے ہی ٹرائل کی زد میں ہو۔ تو اب.... اس کو گھسیٹو ٹرائل میں' ہاشم کاردار....." اس نے میز پہ ہاتھ رکھ کر' آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ "اس کو عدالت میں لے کر آؤ اور اس کے سارے الزامات کا توڑ کرو۔ اس کو وہاں تباہ کرو۔ اس کو جھوٹا ثابت کرو مگر ایسا کرنے کے لیے تمہیں اس کے ساتھ ایک کورٹ روم میں کھڑا ہونا ہوگا۔ اور پھر' جب خود کو دنیا کی نظروں میں بری کروالو... اور چونکہ تم بے گناہ ہو تو یقیناً" کرا ہی لو گے۔ تب مجھے پرپوز کرنا۔ میں اپنا فیصلہ تب تک کے لیے محفوظ رکھتی ہوں۔" اور پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اف یو وانٹ می' ارن می۔" اپنا بیگ دبوچنے والے انداز میں اٹھایا اور اسے دل گرفتی سے خود کو دیکھتے چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔ دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے حلیمہ کی میز پہ آئی' پانی کی بوتل اٹھائی اور غٹاغٹ پانی پیتی گئی۔ حلیمہ بے اختیار کام سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ آبی نے بے ترتیب سانسوں کے درمیان بوتل رکھی اور آستین سے تر پیشانی پونچھتی آگے بڑھ گئی۔

اندر بیٹھے ہاشم کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ ٹائی ڈھیلی کیے' سوچتی نظروں سے خالی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج

"یور آنر ہوا یوں کہ...." زمر کی آواز دور کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاشم نے ذہن سے تمام خیالات کو جھٹک کر نگاہیں اٹھائیں اور خود کو واپس کمرہ عدالت میں لے آیا۔ وہ جج کے چبوترے کے سامنے کھڑی تھی' یہاں سے اس کا آدھا رخ دکھائی دیتا تھا۔ گھنگھریالی لٹ گال کو چھو رہی تھی اور بھوری آنکھیں جج کے چہرے پہ جمی تھیں۔

سب خاموشی اور محویت سے اسے سن رہے تھے۔

"ہوا یوں کہ ایک مئی کی شام جب ایک خوش باش' زندگی سے بھرپور سعدی یوسف گھر واپس آتا ہے' اور اپنے سارے خاندان کو ڈنر پہ مدعو کرتا ہے' اس وقت بھی اس کو خاندان کے اس ایک فرد کا بھی خیال ہوتا ہے جو وہاں نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر سارہ جو خود کو خاندانی جھمیلوں سے دور رکھتی ہیں' اس وقت وہ ان کو وہاں بلاتا ہے۔ ان کو اپنے خاندان اور زندگی کی

طرف لوٹ کر آنے کے لیے منانے' ان کو ان کے اصل دشمنوں کی خبر دینے' کیونکہ اب اس کے پاس ثبوت بھی تھے۔ مگر وہاں.... اس تاریک گلی میں اس کا پیچھا کرنے' اس کو دھمکانے اور زبانی تلخ کلامی کا بدلہ گولی سے لینے کے لیے ملزم نوشیرواں کاردار آتا ہے اور وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جاتا جب تک وہ سعدی کے جسم میں تین گولیاں اتار کے' اس کو مارپیٹ کر نیم مردہ حالت میں نہیں پہنچا دیتا۔ یور آنر... پولیس اور گواہوں کو خرید کر میرے زخمی موکل کو اسپتال سے غائب کرا دینے کے بعد اسے آٹھ ماہ اور ایک دن تک حبس بے جا میں رکھنے کا ذمہ دار نوشیرواں کاردار ہی ہے۔ ہاشم کاردار اس کا ایک معاون تھا' مگر اصل مجرم نوشیرواں ہے۔ یہ سب کچھ اس کے حکم پہ اور اس کی ایما پہ ہوا۔ امیر لڑکوں کا یہی مسئلہ ہے۔ اگر ان کے نام کے آگے پیچھے ۔۔۔ بڑا نام ہے۔ لگتا ہے تو ان کو کسی دوسرے نوجوان سے حسد نکالنے کے لیے اس کو مارنے کا کوئی بہانہ مل جاتا ہے۔ میرے لیے سب کی ذات برابر اور قابل احترام ہے لیکن ہمارے یہ رئیس اپنی حرکتوں سے اپنی ذات کو خود بدنام کرتے ہیں یور آنر۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کا احتساب کیا جائے؟"

ہاشم نے پیلے کاغذ پہ ایک سطر مزید کھینچی۔

"صرف شیرو کیوں؟ ہاشم کاردار کیوں نہیں؟" لکھ کر پر سوچ نظروں سے پرے بیٹھے سعدی کو دیکھا۔ اور پھر زمر کو۔ زمر نے اس کی نگاہوں کی حدت محسوس کر لی تھی یا کیا' اس نے پلٹ کر ہاشم کو دیکھا۔ ہاشم نے رخ موڑ لیا مگر زمر ادھر ہی دیکھتی رہی۔ یوں ہی' بے مقصد۔ پھر یکایک نظروں کے سامنے سے عدالتی کمرے کی کرسیاں اور وہ تماشائیوں جیسے لوگ غائب ہوتے گئے۔ ہوا نے اس کے ذہن کو پیچھے کھینچا' اور وہ بس روم میں بہتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ پہلے

مور چال کے اندر وہی سوگوار ماحول تھا۔ زمر نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رک کر کچن میں دیکھا۔ وہاں حنین اور سعدی آمنے سامنے کھڑے صبح والے واقعے پر بات کر رہے تھے۔

"ہمارے سب ثبوت ختم ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔ حنین ناخن ۔۔۔ دانت سے کترتی اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ ویڈیو تو ہے نا جو آپ نے ہاشم کے آفس میں بنائی تھی۔ جس میں ہاشم نے اعتراف جرم کیا تھا۔"

"ہم اسے عدالت میں استعمال نہیں کر سکتے۔" زمر نے چوکھٹ پہ رک کر کہا تو دونوں مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ "قانونی پیچیدگیاں' ایک طرف' اس ویڈیو میں ہاشم نے یہ بھی کہا ہے کہ کس طرح اس نے حنہ کے ایگزام کے دوران اس کی مدد کی۔ لاء کالج کے اس سینئر وکیل صاحب کی کال بھی ہے اس میں۔ ہم وہ ویڈیو جج کو نہیں دکھا سکتے۔"

حنین کا چہرہ بجھ گیا مگر سعدی تیزی سے بولا۔ "اگر ہم اسے ایڈٹ کر دیں تو؟"

"تو وہ اوریجنل نہیں رہے گی' اور عدالت میں قابل قبول نہیں ہوگی۔"

"یہ اچھا حساب ہے۔" وہ بے زار سا ہو گیا۔ حنہ ابھی تک ناخن کتر رہی تھی۔ زمر چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ اسٹڈی ٹیبل تک آئی اور فون پہ ایک کال ملانے لگی۔

"احمر! فارس کہاں ہے؟" چھوٹتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"آخری اطلاعات تک میں اس کی بیوی نہیں تھا۔ سو مجھے کیسے پتا ہوگا؟"

زمر کے لبوں پہ سوگوار مسکراہٹ بکھری۔ عرصے تک خود کو چھپا چھپا کر اور لوگوں کو ان کے دائرے سے باہر نکال رکھنے کی عادت ڈال لینے والا احمر آج مدتوں بعد

پہلے جیسا لگا تھا۔

"منیر کیا یہ سب سچ ہے؟"

"کیا؟" وہ محتاط سا ہو کر بولا۔

"جو میں سن رہی ہوں۔"

احمر نے گہری سانس لی۔ "غازی کا میسج آیا تھا۔ کہہ رہا تھا میں اسے جانے دوں۔ مگر مجھے یاد ہے 'آپ نے اس کے 'اپنے ریسٹورنٹ میں آنے کے بارے میں پولیس رپورٹ میں کہا تھا کہ جب غازی نے اسے جانے دیا تو بھی اس نے آپ پہ گولی چلانی چاہی۔ کیا ایسے شخص کو چھوڑ دینا چاہیے؟" ایک دم سنجیدہ اور گہرا سا احمر... کچھ اچھا نہیں لگا۔ زمر نے گہری سانس لی۔

"میں تو اس نک نیم کی بات کر رہی تھی 'جو آپ نے میرا رکھا ہوا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

احمر گویا کرسی سے اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "کون سا نک نیم؟ میں دیکھیں 'بہت مہذب انسان ہوں۔ یہ آپ کا شوہر ہے انتہائی دو نمبر آدمی۔ اس کی عادت ہے اپنے کیے ہوئے کام دوسروں کے سر ڈالنے کی۔ مجھے اس معاملے سے دور رکھیں۔"

"اصل میں آپ دونوں ہی بہت مہذب ہیں۔ بس میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ زیادہ مہذب کون ہے۔ اور زیادہ شریف کون۔ بہرحال 'جلد سے جلد خود کو کاردار ز کی قید سے نکال لیجیے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ آپ کی حقیقت جانیں 'آپ کو یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہیے۔" یہ وہ آخری بات تھی جو اس نے کال پہ احمر سے کہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج

جج صاحب کھنکھارے تو زمر نے چونک کر انہیں دیکھا 'پھر سر جھٹک کر آگے آئی۔

"یور آنر 'ہمارے پاس گواہ ہیں جو حلف لے کر گواہی دیں گے کہ کس طرح سعدی یوسف کو کولمبو کے ایک ہوٹل کے زیر زمین تہہ خانے میں رکھا گیا۔ اس کو وہاں مختلف طریقوں سے ٹارچر کیا گیا۔ ہم اس کو وہاں مقید دیکھنے والے ایک ایک شخص کو عدالت میں پیش کریں گے اور ان کے بیانات سے یہ پتا لگانا مشکل نہیں ہو گا کہ یہ لڑکا سچ بول رہا ہے۔ اور یہ ایک بہت کٹھن جنگ لڑ کر آیا ہے۔"

حاضرین میں بیٹھے فارس نے بےزار ہو کر گردن کو دائیں کندھے کی طرف جھکایا 'پھر بائیں کندھے کی طرف۔ گویا پٹھوں کو آرام دیا۔ پھر ایک سرسری سی نگاہ ارد گرد دم سادھے بیٹھے حاضرین پہ ڈالی۔ ذہن کے نہاں خانوں میں ایک منظر لڈ لڈ کر اوپر آنے لگا تو اس نے اسے چھو لیا... گویا پیالے میں رکھی کوئی یاد ہو جسے چھونے سے انسان ماضی میں چلا جائے۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

لونگ روم کی کھڑکی سے پہاڑوں کی گردن تک اترے اجلے اجلے بادل دکھائی دے رہے تھے۔ کھڑکی کے نیچے رکھے صوفے پہ بیٹھا نو عمر لڑکا سامنے بیٹھے فارس کو الجھن سے دیکھ رہا تھا۔

"کیسی کہانی سنانا چاہتے ہیں آپ؟ اور آپ کو کیسے علم ہوا کہ ہم یہاں ہیں۔"

فارس اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے 'بھوری لیدر جیکٹ اور سیاہ جینز پہنے 'وہ ٹھنڈی مگر نرم نگاہوں سے اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پہ گردن موڑی۔ نگاہ وہیل چیئر پر مفلوج پڑے خاور تک جا ٹھہری۔

"تمہیں حنین نے ای میل کی ہو گی یقیناً" اور یہ کہا ہو گا کہ تمہارا باپ ایک قاتل ہے۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔" وہ سخت لہجے میں نفی میں سرہلا کر بولا۔

فارس نے کافی دیر تک جواب نہیں دیا 'بس وہ سرد نظروں سے خاور کی دائیں جانب ڈھلکی گردن دیکھتا رہا۔ آکسیجن ماسک سے وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا 'چہرے پہ مونچھیں داڑھی سب شیو کیا جا چکا تھا

اور اب اگنے والے ننھے ننھے بال زیادہ تر سفید تھے۔
البتہ آنکھیں، بدقت بائیں طرف کو گھوم گھوم کر فارس کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں وہ سارے جذبات اور تاثرات اب بھی تھے جو اس "حادثے" سے قبل ان میں ہوتے تھے۔ ان میں زندگی تھی۔ اور انتقام کی خواہش۔

"تم سوچتے ہو گے خاور کہ اتنا عرصہ ان کے ساتھ کام کرنے کے باوجود تم کیوں نہ جان سکے کہ تمہارے بیٹوں کو بھی انہوں نے ہی مروایا تھا۔" لڑکا چونک کر اسے دیکھنے لگا مگر فارس اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

"انہوں نے تمہارا اعتراف جرم بھی ریکارڈ کیا، تمہیں اپنا بھی لیا، تم سے کام بھی کروائے، مگر تمہیں اصلیت معلوم نہیں ہونے دی۔ وہ کیا ہے کہ ہر علم والے پہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے۔ جس بھاڑے کے ٹٹو سے انہوں نے یہ کام کروایا ہو گا یقیناً" اس نے سارے ثبوت اور شواہد کا رخ بریگیڈیئر بنگش کی طرف موڑ دیا ہو گا۔ یقیناً" وہ تم سے زیادہ ذہین ہو گا۔ نہ ہو تب بھی جب انسان کی ذات انوالوڈ ہو جائے کسی حادثے میں تو غم اور غصہ اس کی سمجھ داری کو دھندلا کر دیتا ہے۔ ہر شخص کا ایک بلائنڈ اسپاٹ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ذہین مار کھا جاتے ہیں۔ کیا زمر کیا ہاشم اور کیا میں۔ اگر ہم سارے ذہین لوگ گھر کے بھیدیوں کی ڈھائی لنکاؤں کا شکار نہ ہوں تو ہم تو خدا بن بیٹھیں۔ اور فرعون نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تھا مگر اپنے گھر میں پلتے بچے کے بارے میں درست اندازہ نہ لگا سکا۔ ایسے ہی تو نہیں وہ خود کو خدا سمجھتا تھا۔ ٹیلنٹڈ، ذہین، سحر انگیز، بہت کچھ ہو گا وہ مگر مار کہاں کھائی؟"

خاور مزاحمتی انداز میں غصے سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا مگر ماسک کے باعث وہ گھٹ جاتی تھیں۔ لڑکا اس کی کرسی کے عین پیچھے جا کھڑا ہوا اور فکر مندی سے اس کا کمبل درست کرنے لگا۔

"میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھے تمہاری حالت دیکھ کر افسوس نہیں ہوا۔ میں اپنے ساتھ وہ تمام ثبوت بھی لایا ہوں جن کو دیکھ کر تمہاری اپنی اولاد، تمہاری بیوی اور تمہاری ماں تمہاری اصلیت جان لیں گی اور میں جانتا ہوں، وہ تم سے تب بھی محبت کریں گی لیکن وہ تمہاری عزت نہیں کریں گی۔ تم بھی تو جانو خاور کہ بغیر عزت کے محبت کیسی ہوتی ہے۔ بغیر عزت کے وفا کیسی ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ ایک طویل اور تکلیف دہ زندگی گزارو۔ تمہیں ہر پل یاد دلایا جائے کہ یہ لوگ کون تھے۔"

اس نے فولڈر کھولا اور اندر سے بڑی بڑی تصویریں نکال کر سامنے میز پہ ڈالیں۔ خاور کی آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی اور ان میں نمی سی تیر رہی تھی۔

"یہ زرتاشہ ہے، یہ وارث ہے اور یہ سعدی۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تمہارا بیٹا بھی ان کی کہانی مجھ سے سنے۔ کیا تم سنو گے؟" اس نے نگاہیں اٹھا کر اس لڑکے کو دیکھا۔ وہ بالکل محو ہو کر، مگر بدستور متذبذب سا، اسے دیکھ رہا تھا، اس سوال پہ معمول کی طرح سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ واپس گھر پہنچا، زمر اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل کے آگے یوں ہی کھڑی تھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو وہ نہیں مڑی۔ جانتی تھی وہ آچکا ہے بلکہ کافی دیر سے آیا ہوا ہے، اور اس تازہ نقب زنی کی واردات کا کھوج لگاتا پھر رہا ہے۔ باہر گارڈز کو ڈانٹنے، غصہ کرنے کی آوازیں سب نے سنی تھیں۔ اور جب کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو پھر وہ اندر آیا تھا۔ وہ ریک میں رکھی کتابوں پہ خواہ مخواہ انگلی پھیرتی رہی۔ گھونگھریالی لٹ گال کو چھوتی گردن پہ گر رہی تھی اور آنکھیں سوگوار لگتی تھیں۔ ناک کسی بھی زیور سے خالی تھی۔

"تم نے کچھ دیکھا؟ کسی سرخ مفلر، واٹ اور والے آدمی کو؟" چابی اور والٹ میز پہ ڈالتے ہوئے اس نے ٹھہر کر زمر کو دیکھا۔

"نہیں۔ تم کہاں تھے سارا دن؟" وہ اس کی طرف گھومی۔ نظریں ملیں۔

"نہیں... یوں ہی بس نہیں تھا۔" وہ چہرہ جھکا کر رسٹ واچ اتارنے لگا۔

"کیا ہم نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ اب ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپائیں گے؟" فارس کا گھڑی اتارتا ہاتھ رکا۔ چونک کر نظریں اٹھائیں۔ غور سے اسے دیکھا۔ ناک کو خالی دیکھ کر چونکا مگر پوچھا نہیں۔

"میں خاور سے ملنے گیا تھا۔ اس کے بیٹے کو اس کے بارے میں سب کچھ بتانے۔"

"احمر سے بات ہوئی تمہاری؟"

"سرسری سی ہوئی تھی ٹیکسٹ پہ۔ مل نہیں سکا۔ اس سے بھی حساب کتاب کرنا ہے ابھی۔"

"تم جانتے تھے اس کی اصلیت؟" وہ سوال در سوال کر رہی تھی۔

"نہیں، زمر بی بی، مجھے دلوں کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ حنین نے ہی بتایا تھا۔ خیر... تم نے کیا کیا؟" اب وہ پھر سے اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔

زمر پھیکا سا مسکرائی۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ قمیص کی آستینیں موڑتا پلٹ گیا۔

"میں نے تمہیں گروی رکھ دیا۔"

فارس واپس گھوما۔ "مجھے کیا رکھ دیا؟"

"میں ہارون عبید سے ملنے گئی تھی۔" فارس کے تاثرات تیزی سے بدلے۔ ماتھے پہ بل پڑے۔ کچھ کہنے کو لب ابھرے...

"نہیں، پہلے میری بات سنو۔" وہ آگے بڑھی اور اس نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ "میں سعدی کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ تمہیں بھی نہیں کھو سکتی تھی۔ میں کڈنی پیشنٹ ہوں، میں کبھی اپنی فیملی نہیں بنا سکوں گی۔ میرے ساتھ بھی ظلم ہوا ہے اور مجھے اپنے لیے بھی انصاف چاہیے۔ ہارون عبید نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فارس یا سعدی میں سے ایک کو چنوں۔ مگر میں نے خود کو چنا۔ میری جتنی بھی زندگی رہ گئی ہے اس میں ایک واحد امید کی کرن، انصاف ہے۔ مجھے یہ ٹرائل چاہیے اور تم مجھے یہ نہیں دے سکتے تھے۔ تم اٹھتے بیٹھتے کہہ رہے تھے کہ ٹرائل کبھی نہیں ہوگا۔ اس مسئلے کا حل تمہارے پاس نہیں تھا۔ ہارون صاحب کے پاس تھا۔"

"ٹرائل واقعی نہیں ہوگا زمر!" وہ نرمی سے بولا۔ ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھے۔

"ہارون اسے منا سکتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح مگر وہ اس کو ٹرائل تک لے جا سکتے ہیں۔ اگلی جنگ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم لڑیں گے، جان لگا دیں گے مگر وہ میدان میں تو آئے نا؟"

"اور بدلے میں کیا مانگا ہارون صاحب نے؟" اس نے اسی درشتی سے پوچھا تھا۔ اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ زمر کی بے چین نگاہیں اس کے چہرے پہ بھٹک رہی تھیں۔

"تمہیں مانگا تھا۔"

"اور میں تو جیسے کوئی کھلونا ہوں... ہے نا!"

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دوں گی اگر وہ ہاشم کو ٹرائل تک لے آئے۔ وہ صرف تمہیں اپنی بیٹی کے لیے چاہتے ہیں۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر لیں گے۔"

"تم مجھے چھوڑ دو گی؟" اس کی آواز آخر میں... بس آخر میں کانپی تھی، خوف سے، غصے سے۔

"جو میرا ہے فارس، وہ میرا رہے گا۔ موت کے علاوہ کوئی بھی ہمیں الگ نہیں کر سکتا۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم میری بات کو... اس گیم کو غلط نہیں لو گے تو میں کبھی یہ ڈیل نہ کرتی۔ کیا بگاڑ لیں گے وہ میرا اگر میں بعد میں انکار کر دوں تو...؟"

"اچھا۔" وہ اس کے ہاتھ تھامے اسی سنجیدگی سے میز کے کنارے بیٹھا۔ "تو بعد میں تم اپنی بات سے کیسے مکرو گی؟"

"یہ سوچنا اور اس معاملے کو سنبھالنا تمہارا کام ہے۔ تم میری حفاظت کرو گے، تم میرا دفاع کرو گے اور جس دلدل میں، میں نے خود کو پھنسا لیا ہے، تم مجھے اس سے نکالو گے۔ ایک تمہاری وجہ سے ہی مجھے بے فکری تھی۔" اس نے گردن اکڑا کر بہت اعتماد سے کہا

تھا۔ فارس کی پیشانی کے بل غائب ہونے لگے۔ ایسے
کہ وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔
"تم یہ سب کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ بھی سکتی
تھیں۔"
"میں نے کہا نا' میں نے خود کو چنا ہے۔" وہ اب
متلاشی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ "تم خفا
ہو؟"
"نہیں' مگر مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک
تمہیں یہ یقین نہیں دلاسکا کہ میں تمہیں کسی کام سے
نہیں روکوں گا۔ آئی ایم سوری۔ اگر میری کسی بات
سے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہے کہ تم مجھے اعتماد میں لوگی
تو میں تمہیں تمہاری مرضی کے کام کرنے سے منع
کردوں گا۔"
"اب اگر غصہ کرو گے تو کیسے آئے گا مجھے یہ
اعتماد؟" وہ تیزی سے بولی تھی۔ دل البتہ دھڑک رہا
تھا۔ وہ خفا تو لگ رہا تھا۔
"غصہ کیوں کروں گا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ
دو خوب صورت عورتیں میرے لیے لڑ رہی ہیں۔" وہ
غصے میں ہی لگ رہا تھا۔ زمر کے ابرو خفگی سے اکٹھے
ہوئے۔ ہاتھوں سے ہاتھ نکال لیے۔
"ایک خوب صورت عورت۔" تنبیہ کی۔
"ہاں' ایک خوب صورت عورت' ایک چڑیل سے
میرے لیے لڑ رہی ہے۔ حد ہے۔" سر جھٹک کر وہ اٹھ
کھڑا ہوا۔ اس کو برا لگا تھا اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کچھ
سخت نہ کہہ دے۔ زمر کہنا کچھ اور چاہتی تھی مگر منہ
سے کچھ اور نکلا۔
"انہوں نے ضمانت کے طور پر میری لونگ رکھ لی۔
جو تم نے دی تھی۔" وہ جو آگے جا رہا تھا' تیورا کر گھوما۔
چہرے پر بے یقینی ابھری۔ آنکھیں پھیلیں۔
"واٹ؟" وہ غرایا تھا۔ زمر دو قدم پیچھے ہوئی۔
چہرے پہ زمانوں کی سادگی طاری کرلی۔
"اس روز پولیس اسٹیشن میں وہ میرے پرس میں
تھی' میں بار بار اس کی ڈبی کو نکال کر کھول' بند کرتی
تھی۔ کورٹ میں ضمانت کی سماعت کے دوران بھی وہ
میرے پرس میں تھی اور میرا ہاتھ پرس کے اندر جا رہا
رہا تھا۔ میں اتنے دن سے اسے پہننا چاہ رہی تھی۔
ہمت نہیں کرپا رہی تھی۔ پھر جب میں ان کے آفس
گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ جانتے ہیں اس لونگ
کا قصہ۔"
"اس کو کیسے پتا؟" وہ پھر غرایا تھا۔ غصے سے اس کا
چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
"جب میں نے تم سے لونگ کے پیچھے جھگڑا کیا تھا تو
صداقت وہیں تھا۔ ملازموں کی عادت ہوتی ہے۔ ادھر
کی ادھر کرتے ہیں۔ اس نے کاردارز کے کسی ملازم
سے کہا ہوگا' اور اس نے آگے۔ ہارون عبید ہمارے
خاندان پہ عرصے سے نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو پتا
ہوگا' ظاہر ہے۔ جب میں وہاں گئی تو انہوں نے مجھ
سے وہ مانگ لی۔" وہ یاسیت سے بتا رہی تھی۔
"اسے کیسے پتا چلا کہ وہ تمہارے بیگ میں ہے۔"
"سیکورٹی چیک پوائنٹ پہ میرا پرس اسکین ہوا تھا نا'
ایک جگہ پرس کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ انہوں نے کہا
کہ امیج دیکھ کر ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ وہی لونگ ہے۔
شاید وہ میرے اوپر اپنی دھاک بٹھانا چاہ رہے تھے۔"
"اور تم نے وہ ان کو دے دی؟"
"اور کیا کرتی؟ مجھے ان کو یقین دلانا تھا کہ میں سچ
بول رہی ہوں۔"
"زمر۔ زمر۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بہت کچھ کہنا چاہتا
تھا' پھر ہاتھ گرا دیے۔ پہلے سر جھٹکا۔ پھر دائیں سے
بائیں چکر کاٹنے لگا۔
"اب تم یوں کرو' مجھ سے خفا ہو جاؤ۔ تاکہ ہم آپس
میں ہی لڑتے رہیں' اور باہر کے لوگوں سے لڑنے کی
ضرورت ہی نہ پڑے۔ ہم یوں ہی خود ہی لڑتے لڑتے
ختم ہو جائیں۔"
"تمہارے نزدیک اس تحفے کی کوئی اہمیت نہیں
تھی؟" وہ گھوم کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور برہمی
سے اسے دیکھا۔
"وہ ایک پتھر تھا فارس! ایک پتھر کھو کر میں ایک
انسان کو نہیں کھو سکتی' مجھے یقین تھا۔" وہ سادگی سے

کہہ رہی تھی۔ وہ لاجواب ہوا تھا۔ پھر چند لمحے گہرے سانس لے کر خود کو بدقت نارمل کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ ایک پتھر تھا۔ لیکن اگر تمہیں کوئی کام تھا تو تم میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟"

"تم یہ نہیں کرسکتے تھے۔" وہ اسی میز کے کونے پہ بیٹھ گئی جہاں چند لمحے قبل وہ بیٹھا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ میں یہ کرسکتا تھا یا نہیں؟ اور ہارون صاحب کیسے کریں گے یہ معلوم ہے تمہیں؟"

"وہ ہاشم کے دوست ہیں' کسی بھی طرح اسے راضی کرلیں گے اور۔۔۔۔"

"وہ اپنی بیٹی کو اس کے پاس بھیجیں گے تاکہ وہ اس سے جھوٹے وعدے کرے اور ہاشم کو راضی کرے۔"

زمر چونک کر کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں ڈھیروں استعجاب در آیا۔

"بے کار باتیں مت کرو' فارس! کوئی اپنی بیٹی کو یوں استعمال نہیں کرسکتا۔"

"زمر! ہر امیر آدمی جواہرات کی طرح نہیں ہوتا جو اولاد پہ جان چھڑکے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے کوئی خاص لگاؤ ہے' نہ وہ اس کا خیال رکھتا ہے۔ محبت ضرور ہوگی کیونکہ وہ فطری چیز ہے' لیکن وہ یہ سب آبدار کی خوشی کے لیے نہیں کررہا۔"

"وہ یہ سب آبدار کے لیے ہی کررہے ہیں۔" وہ بے یقین تھی۔

"غلط۔۔۔" فارس نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ "وہ صرف کاروارز کی بربادی چاہتا ہے۔ دونوں کاروبار میں شراکت دار ہیں' ایک ڈوبے گا تو اس کی ساری دولت' شیئرز' تعلقات' سب دوسرا حاصل کرلے گا۔ وہ دل سے چاہتا ہے کہ ہاشم مقدمے میں الجھے۔۔۔۔ اس کے لیے وہ تمہیں اور آبدار دونوں کو استعمال کررہا ہے۔ آبدار ہاشم کو راضی کرے گی' اور تم اپنی کشتیاں جلا کر اس مقدمے کے لیے اپنی جان لگادو گی۔ سب سے زیادہ فائدہ اسی کو ہوگا۔" وہ کتنی ہی دیر شل بیٹھی رہی' پھر چونکی۔

"اور آبدار کا کیا ہوگا؟" زندگی میں پہلی دفعہ یہ نام

لیتے ہوئے اس کی آواز میں پریشانی جھلکی تھی۔

"ہارون صاحب کو اس کی اتنی پرواہ ہوتی تو اس کو اس جنگ میں کیوں دھکیلتے؟ کس کو کال کررہی ہو؟" وہ جو تلخی سے کہہ رہا تھا' رک کر بولا۔

زمر سنے بغیر فون پہ نمبر ملا کر اسے کان سے لگا چکی تھی۔ فارس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔

"چوبیس گھنٹے کے اندر اندر آپ کی کال موصول ہوئی ہے' کیا ارادہ بدل گیا ہے آپ کا' زمر صاحبہ؟" ہارون عبید کا نرم اور نپا تلا لہجہ کانوں سے ٹکرایا۔

"مجھے میرا ہیرا واپس چاہیے' میں اس ڈیل کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر ہے فارس کو نہ پتا چل جائے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ پلیز مجھے بلیک میل مت کریں اور اسے واپس کردیں۔" وہ منت کررہی تھی۔ فارس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"اب بہت دیر ہوچکی ہے زمر۔"

"دیر کیسے ہوئی ہے؟ اب تک ہاشم سے بات تو نہیں ہوئی ہوگی آپ کی۔"

"میری بیٹی آپ کی وجہ سے اس سے بات کرنے گئی تھی' اور اب جبکہ اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لے ہی لیا ہے تو آپ پیچھے نہیں ہٹ سکتیں۔"

"آپ اپنی ہی بیٹی کو کیسے۔۔۔۔ کیسے استعمال کرسکتے ہیں؟" وہ غصے بھری بے بسی سے بولی تھی۔ فارس اب سامنے صوفے کے کنارے جا بیٹھا تھا۔ ہارون اور بھی کچھ کہہ رہے تھے مگر زمر نے "آپ بیمار ہیں' سنا آپ نے؟ آپ۔۔۔ بیمار ہیں۔" کہہ کر موبائل پرے ڈال دیا۔ وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"اچھا پریشان مت ہو۔ آبدار کے ساتھ جو کیا ہے اس کے باپ نے کیا ہے۔" وہ اب کے ذرا نرمی سے بولا۔ زمر نے چہرہ اٹھا کر مغموم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں مجھ پر بہت غصہ آرہا ہوگا' ہے نا؟"

"ساری عمر آتا رہا ہے' کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ لیکن خیر۔۔۔ تم مجھے بتاؤ۔ تم کیا چاہتی ہو؟"

"تم سے نہیں ہو گا تو کیوں۔۔۔۔"

"زمر۔۔۔! تم بتاؤ۔۔۔ تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے زور دے کر کہا۔ زمر چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میں چاہتی ہوں کہ ہاشم عدالت میں پیش ہو۔ وہ پوری ایمان داری سے یہ ٹرائل لڑے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر گواہ عدالت میں پیش ہو اور سچ بولے۔ سعدی نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے ساتھ اس رات ڈاکٹر سارہ تھیں' مگر ڈاکٹر سارہ کتنے دن سے میرا فون نہیں اٹھا رہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ گواہی دیں۔" جذبات میں تیز تیز بولتے اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تب ہی دروازہ بجا۔ فارس اسی خاموشی سے اٹھا اور دروازہ کھولا۔

سامنے سعدی کھڑا تھا' ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ اس نے فارس کے کندھے کے پیچھے سے اندر جھانکا۔

"زمر۔۔۔ یہ وہ ڈاکومنٹس ہیں جو مجھے آپ کو دکھانے تھے۔" الجھا ہوا سا آگے بڑھنے لگا پھر رک کر پوچھا۔

"میں اندر آجاؤں۔"

"ہاں' تم اندر آجاؤ۔ میری خیر ہے۔" آخری الفاظ زیر لب بڑبڑا کر وہ خفا سا باہر نکل گیا۔

کچن کے دروازے پہ حنین اسی طرح کھڑی ناخن کتر رہی تھی۔ وہ پاس سے گزرنے لگا تو وہ بولی تھی۔ "سعدی بھائی اور زمر کی ٹیم کتنی بورنگ لگتی ہے نا!" وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

آج

فارس غازی کو گہرے خیال سے۔۔۔ گہری نیند بھرے سفر سے کورٹ رپورٹر کی کی بورڈ پہ چلتی انگلیوں کی ٹھک ٹھک نے جگایا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر زمر کی طرف دیکھنے لگا جس کی آواز کمرہ عدالت میں چھائی خاموشی کو چیر رہی تھی۔

"نوشیرواں کاردار نے قید کے ان آٹھ ماہ میں اپنے بھائی کے ساتھ مل کر پورا آرنہ صرف سعدی یوسف کو قید رکھا بلکہ اس کو مختلف نوعیت کے ذہنی اور جسمانی ٹارچرز کا بھی نشانہ بنایا۔ اس سے اس کے پراجیکٹ کے اہم راز دباؤ اور تشدد کے ذریعے اگلوانے کی بھی کوشش کی' اس کو اس کے خاندان کو نقصان پہنچانے کا ڈراوا بھی دیا۔ 22 جنوری کی رات جب سعدی یوسف اپنی ذہانت اور بہادری کے بل پہ اس قید سے نکلا تو نوشیرواں کاردار اور ہاشم کاردار نے اس کی تصویر کے پوسٹرز بنوائے اور سارے کولمبو میں پھیلا دیے۔ ایک خونی مقابلے کے لیے شکار کی تلاش کا آغاز کیا گیا جس کا اختتام تب ہوا جب سعدی یوسف نے ملک واپس پہنچ کر اپنی ویڈیو ریلیز کی۔"

ہاشم سر جھکائے پیڈ پہ لکھ رہا تھا۔ "غیر قانونی سفر اور خاور کی تفصیلات گول۔"

"ان طویل اوپننگ آرگومنٹ کے بعد میری عدالت سے استدعا ہے کہ نوشیرواں کاردار کو قتل' اقدام قتل' اغوا' حبس بے جا میں رکھنا' تشدد اور غیر قانونی انسانی اسمگلنگ کے جرم میں قرار واقعی سزا دی جائے۔ پراسیکیوشن نوشیرواں کاردار کی پھانسی کا مطالبہ کرتی ہے۔"

ہاشم کے ساتھ بیٹھے نوشیرواں نے زخمی آنکھیں اٹھا کر زمر کو دیکھا اور پھر تڑپ کر اپنے بھائی کو دیکھا جو محویت سے نوٹ پیڈ پہ لکھتا جا رہا تھا۔

"دہشت گردی کی دفعات غائب۔ ہاشم کاردار کی نامزدگی غائب۔ کمزور استغاثہ۔" تبصرہ لکھ کر اس نے پیڈ رکھ دیا اور پھر اسی توجہ سے زمر کو دیکھنے لگا۔ وہ اب اپنے دلائل کا اختتام کر رہی تھی۔

کمرہ عدالت کی کھڑکیوں سے چھن کر آتی دھوپ میں موسم گرما کے اوائل کی تمازت محسوس ہوتی تھی۔ اگر تم کھڑکیوں کو دیکھتے جاؤ تو ان پہ پڑی گرد کی تہ سرکتے لمحوں اور بیت جانے والی شاموں کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر کسی روز بارش کی بوندوں نے اسے دھو ڈالا اور پھر نئے سرے سے گرد پڑنے لگی۔ واپس کمرہ عدالت کی جانب رخ پھیرو تو پراسیکیوشن کی

میز کے پیچھے زمر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔ آج اس کے بال اونچی پونی میں بندھے تھے اور گھونگھریالی لٹیں نکل نکل کر کوٹ کی پشت پہ جھول رہی تھیں۔ وہ قلم لبوں میں دبائے، نظریں سامنے کھڑے ہاشم پہ جمائے ہوئے تھی۔ ساتھ بیٹھا سعدی آدھی آستینوں والی سیاہ شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ پہلے سے بہتر نظر آرہا تھا۔ گردن اٹھی ہوئی تھی اور بھوری آنکھوں میں امید سی تھی۔ پیچھے... ساری کرسیوں سے پیچھے... آخری قطار میں فارس ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور مسلسل کچھ چبا رہا تھا۔

دفاع کی میز پہ نوشیرواں ڈیزائنر سوٹ ٹائی میں ملبوس پتھریلے تاثرات کے ساتھ براجمان تھا۔ پچھلی نشست پہ جواہرات اور احمر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ جواہرات مسلسل اپنے لاکٹ کو انگلی پہ لپیٹتے ہوئے پرسوچ نظریں چبوترے کے سامنے کھڑے ہاشم پہ جمائے ہوئے تھی۔ ہاشم کی اس جانب پشت تھی مگر آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

"یور آنر، مسز زمر کے ابتدائی دلائل اچھے لگے مجھے۔ جذباتی اور شاعرانہ۔ ان سے ہمیں یہ تاثر ملا کہ ایک معصوم شہزادہ... بلکہ شہزادی ظالم دیو کی قید میں پھنس گئی تھی اور اب چونکہ شہزادی واپس آگئی ہے تو لازم ہے کہ ظالم دیو کو چوک میں لٹکا کر پھانسی دی جائے۔ اور اس ظالم دیو کا جرم کیا ہے یور آنر؟ صرف یہی کہ وہ امیر ہے۔"

جواہرات یاقوت اور ہیرے جڑے لاکٹ کو مسلسل انگلی پہ لپیٹ کھول رہی تھی۔ شیرنی کی آنکھوں میں گہرے سائے لہرا رہے تھے۔ بادلوں جیسے سائے جن میں یادوں کے بہت سے قطرے لدے تھے۔ یکایک وہ قطرے اندر ہی اندر ٹپکنے لگے اور اس جھلملاتے پانی کے پردے پہ عکس سے ابھرنے لگے...

قصر کاردار کے لاؤنج میں اونچی کھڑکیوں کے اوپر اٹھے رومن بلائنڈز کے باعث تیز روشنی اندر آرہی تھی۔ جواہرات پرل وائٹ قمیص میں ملبوس، بالوں کا نفیس جوڑا بنائے، کان میں ایئر رنگ پہنتی ہوئی کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ ایسے کہ کہنی پہ پرس ٹنگا تھا اور کان کو پکڑے ہاتھ میں فون تھا جب وہ ٹھٹک کر رکی۔

لاؤنج میں... سامنے... مچھلیوں کے ایکوریم کے سامنے آبدار کھڑی تھی۔ جھک کر وہ ہولے ہولے شیشے کی دیوار پہ دستک دیتی۔ مچھلیاں سرعت سے دائیں بائیں تیر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ جواہرات اس کو مخاطب کرتی، سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی۔ آبدار سیدھی ہوئی اور اوپر دیکھا۔ اس کے سر پہ سرخ ریشمی رومال سبز آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ یقیناً "اوپر سے ہاشم اترتا ہوا آرہا تھا۔ جواہرات نے کھڑکی کے شیشے میں اس کا عکس دیکھا اور الٹے قدموں مڑ گئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ چوکھٹ تک لے گئی مگر پورا بند نہیں کیا۔ ذرا سی درز سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتی تھی۔

آبدار نے مسکرا کر اسے اترتے دیکھا یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"تم نے مجھے بلوایا تھا۔ کہو خیریت تو ہے؟" وہ جبراً مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔

"ہاں میں تمہاری باتوں پہ سوچتا رہا تھا۔ بیٹھو۔" وہ اشارہ کرتا، کوٹ کا بٹن کھولتا بڑے صوفے کے کنارے پہ جا بیٹھا۔ آبدار پرلے کنارے پہ ٹک گئی۔

"پھر... کیا سوچا تم نے؟" گود میں مٹھیاں رکھ کر باہم ملائے وہ ان کی کپکپاہٹ چھپانا چاہ رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ بے چین نظریں ہاشم کے چہرے پہ جمی تھیں جو سوچ میں ڈوبا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ آبی سے نظریں ملیں۔

"تمہاری ساری باتیں درست تھیں۔ جب تک اس کیس کا معاملہ حل نہیں ہو جاتا، تم اس خاندان میں آکر کبھی خوش نہیں رہو گی۔"

آبدار کے لب حقیقی مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ "یعنی کہ تم نے میری باتوں کو سنجیدہ لیا؟"

"ہاں، اور تم اپنی جگہ درست ہو۔ ہم شادی نہیں کر سکتے، جب تک کہ میں اس سارے میں سے نہ نکل آؤں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

آبدار نے طمانیت بھری گہری سانس لی۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک در آئی۔ "تو تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم اس کیس کو لڑو گے اور خود کو اور اپنے خاندان کو بے گناہ ثابت کرو گے!" اس کے دل میں ڈھیروں اطمینان در آیا تھا۔

"نہیں ریڈ۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "نہ کوئی ٹرائل ہوگا' نہ میں اپنا دفاع کروں گا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے ہم شادی کے معاملے کو کچھ وقت کے لیے ملتوی کردیتے ہیں۔ تب تک تم مزید سوچ لو اور اگر تم میرے خاندان اور اس کے تمام مسائل کے ساتھ سمجھوتا کرلو تو ہم شادی کرلیں گے۔" اس کا لہجہ اطمینان سے پُر تھا۔

آبدار کی مسکراہٹ اڑن چھو ہوئی۔ دل گویا اچھل کر حلق میں آگیا۔ چند لمحے وہ شل سی بیٹھی رہی' پھر ایک دم اٹھی۔ پرس دبوچ کر اٹھایا۔

"اگر تمہارے اندر اتنی ہمت ہی نہیں ہے کہ پبلک رائے کو بدلو تو ٹھیک ہے۔ میری طرف سے اس شادی سے انکار ہے۔ نہ اب۔ نہ پھر کبھی۔۔۔ ہمارے راستے جدا ہیں۔" درشتی سے کہتی وہ باہر کی طرف بڑھی۔

ہاشم اسی اطمینان سے آنکھیں اٹھائے اسے بغور دیکھتا رہا۔ "شاید یہ صرف ایک بہانا تھا۔ شاید تمہیں شادی سے انکار کی کوئی اور وجہ مل نہیں رہی تھی۔ یا شاید تمہارے بابا نے تمہیں ایسا کرنے کو کہا تھا؟ ہماری بربادی پہ سب سے زیادہ خوش وہی ہوں گے۔۔۔۔ ہے نا۔" وہ اب زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

"جو چاہو سمجھو۔" وہ تلخی سے کہتی باہر نکل گئی۔

وہ اپنی کار کے قریب پہنچی ہی تھی۔۔۔ اتھل پتھل سانسوں کے ساتھ۔۔۔ غصے اور بے بسی کی حالت میں جب۔۔۔۔

"سو تم نے خود ہی انکار کردیا۔" وہ چونک کر مڑی۔ جواہرات سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ اس کی پشت پہ تیز سورج تھا۔ کرنیں اس کے اطراف سے نکل کر آبی کی آنکھوں میں پڑ رہی تھیں یوں کہ جواہرات سفید لباس کے باوجود دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آبی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"اب کیا مجھے وہ ویڈیو مل سکتی ہے؟"

"جس دن آپ کا بیٹا مکمل طور پہ میری جان چھوڑ دے گا' اس دن' ہاں۔" وہ چبا چبا کر بولتی دروازہ کھول کر اندر بیٹھی۔ کرنیں ہنوز اس کے اطراف سے تیروں کی طرح اس کی جانب لپک رہی تھیں۔ روشنی' تیز روشنی۔۔۔ اور جب وہ بجھی۔۔۔ تو جواہرات کاردار نے خود کو عدالت کے کمرے میں بیٹھے پایا۔

☆ ☆ ☆

آج:

عالم تنویم سے نکل کر' وہ سر جھٹکتی سامنے کھڑے ہاشم کو دیکھنے لگی۔ کمرے میں خاموشی تھی اور سب توجہ سے اس کو سن رہے تھے۔ "بس ظالم دیو کا جرم صرف اتنا ہے یور آنر کہ وہ امیر ہے۔ مسز مرنے ان چند دنوں میں 'تقریباً' تین سو دفعہ اسے استعمال کیا ہے۔ درست تعداد کورٹ رپورٹر کو معلوم ہوگی۔" پھر رپورٹر کو ہدایت کرتے ہوئے بولا۔ "یہاں درست تعداد لکھ دیجیے گا۔" اور رپورٹر نے بنا تاثر لیے ٹائپ کیا۔

"یور آنر یہ کہانی نئی نہیں ہے۔" وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے چبوترے کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ "یہ کہانی' یہ مثالیں' یہ غریب کارڈ' یہ عرصے سے کھیلا جارہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ بہت جگہوں پہ بہت سے "امیر" درندوں نے معصوم شہزادوں کو کچلا بھی ہے مگر اسی کارڈ کو بہت سی غریب لومڑیوں نے اپنے مفاد کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس سارے جھمیلے' منظر نامے میں یور آنر میرے موکل کا صرف ایک ہی قصور ہے' اور وہ یہ کہ وہ ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوا۔ مسز مرکی دلفریب شاعری کے برعکس' سعدی یوسف نہ ہی اتنا انسان دوست ہے' نہ ہی اتنا معصوم اور سادہ۔ وہ بلاشبہ ایک محنتی نوجوان ہے' مگر وہ ایمبیشس بھی ہے۔" چبوترے کے سامنے ٹہلتے ہوئے وہ اب

چہرے کا رخ استغاثہ کی کرسیوں پہ بیٹھے سعدی کی طرف کیے کہہ رہا تھا۔ زمر اسی اطمینان سے ایک فائل پہ پوائنٹس لکھ رہی تھی۔ جبکہ سعدی کی پر تپش نظریں ہاشم کے چہرے پر یوں جمی تھیں گویا اندر تک اتر جائیں گی۔ کسی الی کی طرح۔

پیچھے بیٹھا فارس مطمئن لگتا تھا' البتہ اس کے ساتھ موجود حنین بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اس کی نظروں میں ڈھیروں زخم تھے اور وہ بار بار مٹھیاں بھینچتی تھی۔ پھر وہ فارس کی طرف جھکی۔ "یہ اسی طرح میرے بھائی کا کردار عدالت میں مسخ کرتا رہے گا' کوئی اس کو روکتا کیوں نہیں ہے۔"

"وہ جو کر رہا ہے' قانونی طور پہ یہ اس کا حق ہے۔ عدالت میں بولنے والے تمام لوگوں میں سے صرف ایک شخص سچ بولنے کا حلف نہیں لیتا اور وہ وکیل ہوتا ہے۔"

"اوہ! وکیل کو جھوٹ بولنے کا لائسنس ملا ہوتا ہے۔ واؤ۔" وہ سخت کبیدہ خاطر تھی۔

"زمر کے اپنے ابتدائی دلائل میں کتنا سچ تھا' کتنا جھوٹ' ہم دونوں واقف ہیں۔ عدالتوں میں یہی ہوتا ہے۔ ایک سچ کو ثابت کرنے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ تم ان بے وقوفوں کو عدالت میں ایک دوسرے سے لڑنے دو۔" اس نے نرمی سے حنہ کا ہاتھ دبایا۔

"سعدی یوسف ایک انتہائی ذہین' مگر ایک بہت ambitious لڑکا تھا یور آنر۔ genius evil۔ (شیطانی ذہانت) استغاثہ کی الف لیلوی داستان سے ہٹ کر ہمیں اس کیس کی اصل حقیقت کو دیکھنا ہوگا اور اصل کہانی یہ ہے کہ سعدی یوسف کا گزشتہ آٹھ سال سے یعنی اس واقعے سے سات سال قبل سے میرے موکل کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کو اس خاکسار نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کرتے ہوئے اس پہ کبھی اپنے گھر کے دروازے بند نہیں کیے۔ اس کو اپنی ہر دعوت میں بلایا۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھا۔ ان اچھے تعلقات کی مثال میرے اور سعدی کے فیس بک پہ لگی ہماری سیکڑوں تصاویر ہیں' مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔"

وہ یوں ترچھا ہو کر کھڑا تھا کہ گاہے بگاہے جج صاحب پہ نظر ڈالتا پھر اسی سادگی اور اطمینان سے استغاثہ کی کرسیوں کو دیکھتا۔

"اپنی ambitious اور manipulative (قابض) طبیعت سے مجبور' سعدی یوسف نے نوشیرواں کار دار سے راہ و رسم بڑھانا چاہی' وہ ہم دونوں بھائیوں کی گڈ بکس میں رہنا چاہتا تھا۔ اور تو اور' اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ نوشیرواں کس یونیورسٹی میں جانا چاہتا ہے تو اس نے بھی وہیں اپلائی کیا۔ برسوں تک وہ ساری دنیا کو یہ بتاتا رہا کہ وہ اسکالرشپ پہ پڑھ رہا ہے' مگر یہ صرف اس کی پاپولر اور ہر دل عزیز ہونے کی ایک اور کوشش تھی کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی فیس اس کے خاندان والے ہی دیتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسروں کی نظر میں متاثر کن بننے کے لیے مدعی کس حد تک جا سکتا ہے۔"

سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کر کے سر جھٹکا۔ بہت برداشت چاہیے تھی اپنے ہر سچ کو اپنے ہی خلاف استعمال ہوتا دیکھنے پر۔ صد شکر کہ قیامت کے روز اس بڑی عدالت میں یا تو فرشتوں' پتھروں' زمین اور انسان کے اپنے اعضا جیسے گواہ ہوں گے یا پھر ایک ہی منصف اعلا۔ صد شکر کہ اس دن کوئی وکیل نہیں بولے گا۔ صد شکر کہ اس دن زبانیں بند ہوں گی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

جج صاحب عینک ناک پہ لگائے بہت توجہ سے ہاشم کو سن رہے تھے۔ سیشن جج جناب عابد آغا صاحب ایک بے داغ اور شفاف ریکارڈ کے حامل تھے۔ رعب ایسا تھا کہ کوئی بالواسطہ رشوت دینے کی جرات بھی نہ کرتا تھا۔ سابق گورنر کے صاحبزادے تھے اور بھائی بیورو کریسی کے اہم افسران میں سے تھے۔ بلاواسطہ رشوتیں' مدد کی درخواستیں اور دھمکیاں سب آتا تھا' مگر کہتے تھے کہ وہ بہت حوصلہ اور عزت سے ہر شے کا

مقابلہ کرتے تھے۔ اور اس وقت استغاثہ اور دفاع کے وکیلوں کو اپنے اپنے گواہ اور ثبوت پیش کر کے خود کو سچا ثابت کرنا تھا۔

"سعدی یوسف نے نوشیرواں کاردار سے یونیورسٹی کے دنوں میں دوستی کرنے اور اس سے فوائد اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ نوشیرواں اس کے لیے ایک سونے کی مرغی تھا۔ ایک بے وقوف امیرزادہ۔ جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔" (نوشیرواں کی گردن اٹھی ہوئی تھی اور بے تاثر' ویران نظریں سامنے دیوار پہ جمی تھیں۔ وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔) یور آنر لوگوں کو لگتا ہے کہ امیر آدمی کے مسئلے نہیں ہوتے۔ سو امیر آدمی کا استحصال کرتے جاؤ کیونکہ اس کا جرم ہے کہ وہ امیر ہے' وہ لوگوں کو لوٹ کر ان کا خون پی کر امیر بنا ہے۔ اس کو لوٹنا' مارنا' نقصان پہنچانا غریب کا حق ہے' غریب کا انتقام ہے' مگر کیا واقعی امیر ولی عہد کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا؟ کیا واقعی نوشیرواں ایسا تھا؟" کمرہ عدالت میں دبیز خاموشی تھی۔

اس نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ گویا سوال کا جواب مانگا ہو۔ پھر تلخی سے مسکرایا۔

"المیہ یہ ہے یور آنر کہ نوشیرواں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو غریب کا خون چوس کر امیر ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر سعدی یوسف اپنے کمپلیکس سے باہر نکلتا تو شاید وہ سمجھ پاتا کہ نوشیرواں عدم توجہی کا شکار تھا' اس کی دولت اس کے باپ اور بھائی نے برسوں کی ان تھک محنت اور ایمان داری سے کمائی تھی۔ ایسے میں وہ اپنے باپ سے وہ وقت اور توجہ نہ پا سکا جو مجھے ملا۔ وہ اندر سے بہت معصوم اور سادہ تھا۔ ہر ایک پہ یقین کر لینے والا۔ ہر ایک سے توجہ اور پیار چاہنے والا۔ اس کو سعدی کی دکھاوے کی دوستی نہیں چاہیے تھی۔ اس کو خلوص چاہیے تھا۔ امیر لڑکوں کے جانی دشمن بہت ہوتے ہیں۔ وہ سیکیورٹی کے بغیر نکل نہیں سکتے۔ وہ ہر جگہ جا نہیں سکتے۔ ان کو کچھ بھی کرنے سے پہلے اپنے عالی مقام خاندان کے نام کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ ایک مڈل کلاس لڑکے کی طرح نہ تھا جو جب دل چاہتا لیڈز کی گلیوں میں نکل جاتا' کسی بار میں بیٹھ کر کسی دوست کے ساتھ کچھ بھی کرتا۔ نوشیرواں کو لوگ پہچانتے تھے۔ وہ ایک سیاست دان کا بیٹا تھا۔ وہ ہر وقت مختلف مافیاز کی ہٹ لسٹ پہ ہوتا تھا۔ یہ دولت اس کے لیے ایک قید سے کم نہ تھی' مگر سعدی یوسف کو وہ صرف سونے کے انڈے دینے والی مرغی لگتا تھا۔ اس کا شان دار گھر جہاں سعدی اکثر آتا تھا' جہاں کھانے پینے کی مکمل آزادی تھی' ان کی دوستی کو مضبوط کرنے کی وجہ تھا' مگر یہ سب زیادہ دیر نہ چل سکا یور آنر۔ سعدی یوسف کی مطلبی اور مادیت پرست باتوں نے دھیرے دھیرے نوشیرواں کو اس سے برگشتہ کرنا شروع کیا۔"

"میرا دل چاہتا ہے' اس آدمی کے چہرے پہ تیزاب پھینک دوں۔" حنہ نے فارس کے قریب ہو کر سرگوشی کی تو اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

فارس نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اس کے کندھے تھپکے۔

"اسے بولنے دو حنہ۔ یہ زیادہ اچھا وکیل ہے' بلکہ ساحر ہے۔ اسے اپنے جادو کے بولوں سے ہمارے ہر پیچ کو مات دینے دو۔ جب وہ تھک جائے گا تو ہم اسے دیں گے۔ شہ مات۔ چیک میٹ" اس نے عزم دہرایا تو حنہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اس کے باوجود نوشیرواں نے اس سے دوستی نہیں چھوڑی۔ اسے اپنے گھر آنے دیا۔ اسے اپنی دولت کو لوٹنے دیا' مگر یہ کافی نہیں تھا۔ سعدی یوسف کے لیے یہ کافی نہیں تھا یور آنر۔ وہ صرف مادی چیزوں پہ خوش نہیں ہوتا تھا۔ وہ پاپولر ہونے اور ہر دل عزیز بننے کا بھی طالب تھا۔ ہمیں یہاں پہ سعدی یوسف جیسے لڑکوں کی سائیکی سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسے یونیورسل فیورٹ بننا اچھا لگتا تھا۔ ہر کوئی اس کی باتوں کی تعریف کرے' ہر کوئی دلچسپی سے اسے سنے۔ جب نوشیرواں کے رویے میں اس نے سرد مہری محسوس کی تو اس کی یہ نفسیاتی حس بار بار بھڑکنے لگی۔ خاکسار کے ساتھ غلط بیانی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا' سو اس نے مسز جواہرات کاردار کو اپنی میٹھی باتوں کے دام میں لیا۔

(سعدی نے مڑ کر جواہرات کو دیکھا اور لبوں کو بنا آواز ہلکے گھمایا۔ (واؤ)۔ جواہرات نے کوشش کی کہ وہ بالکل بھی اس وقت سعدی کی طرف نہ دیکھے۔) ہر ماں کی طرح وہ بھی بیٹے کے لیے پریشان رہتی تھیں' اس نے ماں سے بیٹے کی شکایتیں کرنا لگانی شروع کیں' وہ نشہ کرتا ہے' وہ غلط لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے تاکہ مسز جواہرات نوشیرواں کو مجبور کریں کہ وہ صحیح لڑکے یعنی کہ "ہمارے سعدی" کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرے۔ نوشیرواں ایوریج ذہانت کا لڑکا ضرور تھا' مگر گھامڑ نہیں تھا۔ اس نے سعدی کے ان جھوٹوں اور غلط بیانیوں پہ خود کو اس سے دور کرنا شروع کر دیا۔ سعدی کے مسلسل جواہرات کاروار کو بھڑکانے پہ دونوں میں تلخ کلامی بھی ہوئی اور یوں اس دوستی کا اختتام ہو گیا۔"

ساحرا اپنے مسحور کن انداز میں بول رہا تھا اور سب توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

تب ہی دروازہ کھلا اور بنا چاپ کے دھیرے سے آبدار اندر داخل ہوئی' پھر اسی طرح خاموشی سے فارس اور حنین کے ساتھ آبیٹھی۔ یوں کہ حنین دونوں کے درمیان میں تھی۔ چہرہ موڑ کر اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر فارس کو مخاطب کیا۔

"ہیلو غازی!"

فارس نے بس سر کو اثبات میں خم دیا۔ چہرہ تک نہیں موڑا۔ درمیان میں بیٹھی حنین ایک دم عجیب سا محسوس کرنے لگی۔

دلائل دیتے ہوئے ہاشم نے رخ حاضرین کی طرف پھیرا تو بس لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے وہ چونکا۔ آبدار پہ نظر جا رکی۔ مگر پھر اس نے بات جاری رکھی۔ گو کہ اس کی نگاہ بار بار اس طرف اٹھتی تھی۔ آبی سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔ شناسائی' قرابت داری' رسمی مسکراہٹ' اس کی آنکھیں ہر احساس سے عاری تھیں۔

(حنین نے نظریں جھکالیں۔ وہ آبدار کے لیے ہی مگر بار بار ادھر دیکھتا تو تھا اور اس کا دیکھنا دل کو دکھی کر دیتا تھا۔ محبت رہے یا نہیں' یادیں تو آخری سانس تک رہتی ہیں۔)

اس کے دلی جذبات سے بے خبر آبدار سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ البتہ اس کی خوب صورت پیشانی پہ دو بل پڑے ہوئے تھے۔ ان دو بلوں کی تہ میں جاؤ تو پرت در پرت داستانیں رقم تھیں۔ یکایک وہ پرتیں عیاں ہوتی گئیں اور سنہری پیشانی سنہری روشنی میں بدلتی گئی۔۔۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

ہارون عبید کے آفس کے کوریڈور میں تیز سنہری بتیاں روشن تھیں۔ آبدار ماتھے پہ سلوٹیں لیے' تیز تیز چلتی آرہی تھی۔ آفس کا دروازہ زور سے کھولا۔ ہارون سیٹ پہ براجمان سامنے بیٹھی دو خواتین سے محو گفتگو تھے۔ آبدار سرخ چہرے کے ساتھ اندر آئی' ہاتھ جھلا کر گویا "تخلیہ" کا اشارہ کیا۔ ہارون نے شدید ناپسندیدگی سے اسے دیکھا' پھر خواتین سے معذرت کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ آخری دفعہ تھا پاپا! آئندہ میں آپ کے ہاتھوں کبھی استعمال نہیں ہوں گی۔" وہ دونوں تنہا رہ گئے تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے تلخی سے بولی۔ ہارون کے ابرو بھنچ گئے۔

"مسئلہ کیا ہے؟ یہ میرے اہم مہمان تھے۔ تم نے۔۔"

"ہاشم نہیں مانا۔ وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ کیس نہیں لڑے گا۔"

چند لمحے کے لیے ہارون کچھ بول نہ سکے۔

"سنا آپ نے بابا۔۔۔ ہاشم کو نہیں منا سکی میں۔ کوئی ٹرائل نہیں ہو گا اب۔"

"مگر۔۔۔" وہ لاجواب ہو گئے تھے۔ "تم نے اس کو سمجھانا تھا کہ تم اس کے پرپوزل پہ غور کرو گی اور۔۔۔"

"بابا۔۔۔! میں کیا ہوں آپ کے لیے؟ ہاں؟ میں کیا صرف آپ کے دشمنوں کو نیچا دکھانے کا ایک ہتھیار

ہوں؟ اوزار؟ میری ماں کے ساتھ بھی یہی کیا تھا آپ نے۔ مجھے بھی ان ہی کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔"
اس کی آنکھوں کے کٹورے بھیگ گئے تھے۔

"بیٹے! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں یہ سب تمہارے لیے ہی کر رہا ہوں۔" انہوں نے پینترا بدل کر نرمی سے کہنا چاہا مگر وہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔

"مجھے اب یقین نہیں آتا۔ کیس واٹ بابا! اب اگر ٹرائل ہوا بھی تو میں بھی اس میں جاؤں گی اور آپ سب کے خلاف گواہی دوں گی۔ عدالت مجھے بھی سمن جاری کرے گی۔ میں سچ بولوں گی۔ سب کچھ بتا دوں گی۔ آپ لوگ اسی قابل ہیں۔ یہ سب ٹرائل کے لیے کر رہے تھے نا آپ تو میں....."

"میں تمہارے لیے کر رہا تھا بچے۔ تم چاہتی تھیں کہ اس کی بیوی اسے چھوڑ دے۔ اس نے اسے چھوڑ بھی دیا۔ تم نے میرا کام نہیں کیا، مگر میں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔" وہ اس کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہہ رہے تھے، ساتھ میں جھک کر دراز بھی کھول رہے تھے۔ آبی کے آنسو پلکوں پہ ہی ٹھہر گئے۔ آنکھوں میں بے یقینی در آئی۔

"بابا۔" اس کا سانس رک گیا۔ "کیا کیا ہے آپ نے؟ میں نے منع کیا تھا آپ کو، آپ ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔"

"اس نے اپنی مرضی سے مجھے یہ دی ہے، میں نے اسے مجبور نہیں کیا تھا۔" سادگی سے کہتے ہوئے انہوں نے ایک ڈبی اس کے سامنے رکھی۔ آبدار نے تحیر سے انہیں دیکھا۔ "میں نے آپ کو اس کے بارے میں اس لیے تو نہیں بتایا تھا کہ آپ...."

"یہ اب تمہاری ہے۔ جیسے بھی اسے استعمال کرو۔"

✵ ✵ ✵

آج:

کوئی کاغذ سا اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تو وہ گہرے خیال سے چونکی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کمرہ عدالت میں بیٹھی تھی اور ساتھ بیٹھی حنین اس کی طرف ایک کاغذ بڑھائے ہوئے تھی۔ آبدار کی نظریں فارس کی طرف اٹھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ حنین اپنی گود میں دیکھ رہی تھی۔ آبی نے کاغذ تھاما۔ اس پہ تحریر تھا۔

"آپ کا دل بیمار ہے، میں جانتی ہوں۔ میں بھی اس بیماری میں مبتلا رہ چکی ہوں۔ میرے پاس ایک ایسی کتاب ہے، جس میں اس مرض کی دوا ہے۔ اگر آپ نے اپنا علاج نہیں کیا تو بہت نقصان اٹھائیں گی۔"

ساتھ میں قلم بھی تھا۔ آبدار کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ پھیلی۔ اس نے سرعت سے قلم تھاما اور لکھا۔ "نہ میں بیمار ہوں، نہ مجھے کسی علاج کی ضرورت ہے۔ جس کیفیت کی میں شکار ہوں، وہ دنیا کا سب سے خوب صورت جذبہ ہے۔ میں کیوں نکلوں اس سے؟ میں اسی میں خوش ہوں۔"

حنین نے جب کاغذ واپس تھاما تو وہ تحریر پڑھ کر اس کا دل دور اندر ڈوب گیا۔

اس نے یہ کیوں کر سمجھ لیا تھا کہ ہر بیمار علاج کا سن کر شفایاب ہونے دوڑا چلا آئے گا۔ عشق تو وہ مرض ہے جس کے مریض کو یہ معاشرہ، اس کا میڈیا، اس کا لٹریچر، میٹھی نیند سلا کر برسوں تھپکتے رہتے ہیں کیونکہ جو چیزیں رواج میں آجائیں ان کا غلط ہونا ذہنوں سے نکل جاتا ہے۔ اس نے کیسے سوچ لیا کہ ہر مریض عشق اپنی بیماری سے واقف بھی ہوتا ہے؟ کیا وہ بھول گئی تھی کہ ایسے مریضوں کے پاس ہر وقت خود کو دینے کے لیے ڈھیروں من گھڑت دلیلیں اور بہانے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی توانائی خود کو صحیح ثابت کرنے میں ہی صرف کر دیتے ہیں اور زندگی میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ قیس ہو یا رانجھا، یہ سب مجنوں بھی تھے اور فارغ بھی۔

"یور آنر.... سعدی یوسف سے دھیرے دھیرے موکل کا خاندان برگشتہ ہوتا چلا گیا۔" ساحر کے جادو کی بول جاری تھے۔ وہ ان کی طرف پشت کرکے کھڑا جج کی آنکھوں میں دیکھ کر بول رہا تھا۔ "تقریباً" ڈیڑھ سال

تک سعدی یوسف کے گھرانے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نوشیرواں سے میرے باپ اور ماں کو بدظن کرنے کے لیے ایک رات یہ اچانک سے ہمارے گھر آیا اور اس نے کہا کہ نوشیرواں دو دن سے رابطے میں نہیں ہے 'یقیناً' وہ اغوا ہو چکا ہے۔ نوشیرواں ساؤتھ کوریا میں تھا اور دو دن تک کسی سے کوئی رابطہ اس نے نہیں رکھا تھا تو اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعدی یوسف نے میرے باپ سے کہا' بلکہ ان کو ایک فیس بک میسج بھی دکھایا جس میں لکھا تھا کہ شیرو اغوا ہو چکا ہے اور تاوان کی رقم اس اکاؤنٹ نمبر تک پہنچا دیں۔ تب سعدی یوسف ماشاء اللہ اتنا محتاط اور شاطر نہیں ہوا تھا۔ اس کی بات پہ وقتی طور پہ یقین کرنے کے باوجود میں نے جانچ پڑتال کروائی تو معلوم ہوا یور آنر! کہ شیرو کو سعدی نے یہ پرینک (مذاق) کھیلنے کو کہا تھا۔ رقم کا تو ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ جب نوشیرواں کو علم ہوا تو وہ فوراً" ملک واپس آ گیا۔ اس کو سامنے دیکھ کر شرمندگی سے بچنے کے لیے سعدی نے الزام لگایا کہ یقیناً" وہ خود روپوش ہو کر خود ہی اپنے آپ کو اغوا کرنے کا ڈراما کر کے باپ سے رقم بٹورنا چاہتا ہے۔ ہم نے اس کا یقین نہیں کیا' اور اس کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اکاؤنٹ نمبر بھی اسی کا تھا' اور یہی نہیں یور آنر' موقع کا فائدہ اٹھا کر اس رات جب میں لاؤنج میں بیٹھا تھا تو یہ میرے کمرے میں گیا' میرا لاکر کھولا اور اندر سے ایک خطیر رقم نکال لی۔ میرے لاکر کا کوڈ میری ڈیٹ آف برتھ ہے' اس کے لیے گیس کرنا آسان تھا۔ اس

واقعے کے بعد میرا دل اس سے بہت برا ہو گیا۔ اور میں نے اس سے ترک تعلق کر لیا۔ جب کاردار ز سے کچھ نہ ملا تو یہ میری سابقہ بیوی شہرین کاردار کے پاس گیا' اور اسے مختلف حیلوں بہانوں سے بلیک میل کرتا رہا اور رقم بٹورتا رہا۔"

"کیا میں تالیاں بجاؤں؟" زمر پیچھے سے اونچا سا بڑبڑائی تھی۔ جج صاحب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ احمر سر جھکائے گردن کھجانے لگا اور سعدی۔۔۔ وہ بس ہاشم کو دیکھتا رہا۔ اب اسے گویا ہاشم پہ افسوس ہو رہا تھا۔

"اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں ہے' سو وہ مدعی کا کردار اتنا مسخ کر دے گا کہ اگر نوشیرواں پہ جرم ثابت ہو بھی جائے تو جج کو لگے' سعدی جیسے لڑکے کو مار کر اس نے اچھا ہی کیا تھا۔ قتل کے کیس سے بچ نکلنے کا یہ سب سے اچھا طریقہ ہوتا ہے۔ مقتول یا زخمی کا کردار مسخ کر دو۔" زمر نے اس کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کی پھر سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں سنجیدگی تھی اور ناک کی لونگ چمک رہی تھی۔ وہ مسلسل بائیں انگوٹھے سے تیسری انگلی میں پہنی بڑے سے نگینے کی خوب صورت انگوٹھی اوپر نیچے کر رہی تھی۔ اس میں جڑا نگینہ دور سے نیلا ہیرا لگتا تھا۔ اس کی روشنی مدھم' مگر شفاف تھی۔ ایسی شفاف کہ گویا سیاہ رات میں چمکتے تارے ہوں' جو ٹوٹ کر جڑے ہوں' اور ان کی نیلگوں روشنی زندگی کی ساری سچائیوں کو منعکس کرتی جائے۔۔۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

اس صبح فوڈلی ایور آفٹر کی بالائی منزل کی کھڑکیوں سے تیز روشنیاں اندر آ رہی تھیں۔ زمر اداس بیٹھی' گھونگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتی' شیشوں کے پار سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ فائلز سامنے بکھری پڑی تھیں اور وہ ان سے لاتعلق لگتی تھی۔ یکایک وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ نیچے پارکنگ میں اس نے کار سے اسے نکلتے دیکھا تھا۔ سرخ رومال والی لڑکی کو۔ زمر تیزی سے فائلز اٹھا کر نیچے لپکی۔

جس وقت آبی نے ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا' زمر کچن کے دروازے کے قریب کرسی پہ بیٹھی محویت سے کتاب سے نوٹس بنانے میں مگن نظر آتی تھی۔ آبدار کی نظریں اس کی ناک میں پہنی سونے کی نتھ پہ

اٹک گئیں۔ ایک ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پہ ابھری۔ پھر وہ زمر کو نظر انداز کیے 'کاؤنٹر' تک آئی۔ وہاں گاہکوں کی طرف پشت کیے سعدی کھڑا رجسٹر کھول کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی پرانی زندگی کے پرانے کام کرنے کے باوجود اب پرانے سعدی جیسا نہیں لگتا تھا۔

"کہو پھر، تم ڈالو گے یا ہم ڈالیں؟" وہ مسکرا کر بولی تو سعدی نے چونک کر گردن موڑی۔ آبدار کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

"تم؟ ادھر؟" پھر آس پاس دیکھا۔ زمر کام میں منہمک نظر آتی تھی۔ گاہک آگے پیچھے کرسیوں پہ بیٹھے مصروف تھے۔

"ویلکم ہوم۔ اچھا لگا تمہیں دیکھ کر۔ سنا ہے کل تمہارا انٹرویو آرہا ہے۔ انٹرویو میں تو کہو گے نہیں، مگر مجھے سامنے دیکھ کر شکریے کا ایک بول تو کہہ ہی سکتے ہو۔ آخر میں نہ ہوتی تو تم گھر کیسے آتے؟" تفاخر سے مسکرا کر وہ بولی تھی۔

"بہت شکریہ۔" وہ رکھائی سے کہہ کر واپس گھوم گیا۔ آبی کے ابرو خفگی سے بھنچے۔

"سعدی یوسف خان، میرا ادھار ہے تم پہ۔"

وہ پھر اچنبھے سے واپس مڑا۔ "کیا؟"

"تمہارا انٹرویو لینا تھا میں نے۔ اپنا کام تو نکلوا لیا تم نے، میرے کام کا کیا ہوگا؟" اس نے یاد دلایا۔

"میرے پاس بتانے کے لیے کوئی کہانی نہیں ہے۔" مگر آبدار نے پرس سے کارڈ نکال کر اس کی شرٹ کی اوپری جیب میں ڈالا۔

"میں اپنے کلینک میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہاری نیند کی حالت کی مسافت کا قصہ سننا ہے مجھے۔" اداسی سے مسکرا کر وہ جنید کی طرف گھومی۔

"فارس کہاں ہیں؟" سعدی سر جھٹک کر واپس کام کرنے لگا۔ جنید نے کچن کا بتایا تو وہ زمر کو نظر انداز کر کے اندر چلی گئی۔

زمر کے لکھتے ہوئے ہاتھ سست پڑ گئے۔ چہرے پہ بے بسی در آئی۔ کوفت اور غصہ۔ اس نے زور سے قلم بند کیا اور ایک عزم سے اٹھی۔ کچن سے ورکرز باہر آرہے تھے۔ فارس نے شاید ان کو نکالا تھا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی، وہ دونوں دوسری جانب تھے۔ درمیان میں اونچے ریکس تھے۔ وہ وہیں رک گئی۔ ایک اندھیرے ریک کی اوٹ میں۔

"بی آبدار! آپ کیوں ملنا چاہتی تھیں؟"

وہ دونوں برنر کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ باربی کیو کا دھواں اور اشتہا انگیز خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ فارس گرمی کے باعث دونوں آستینوں کو موڑے، دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سادگی سے پر تھا۔ نہ کوئی کوفت، نہ شکوہ۔ وہ جیسے اسے سننا چاہتا تھا۔

زمر کا دل برا ہوا۔ (مجھے نہیں بتایا کہ اس کو ملنے کے لیے بلا رہا ہے۔ ہونہہ۔)

"بابا نے ایک کام کہا تھا مجھے۔" وہ سینے پہ بازو لپیٹے مسکرا کر رسان سے بولی۔ "کہ ہاشم کو مناؤں، وہ کیس کے لیے راضی ہو جائے۔"

"کس کیس کے لیے؟" وہ اچنبھے سے بولا۔ زمر کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے اس پہ بھروسا تھا مگر پھر بھی۔ وہ سب بتا چکی تھی پھر بھی۔

"سعدی یوسف بنام نوشیرواں کاردار۔ واٹ ایور، اور میں نے اپنے آپ کو بہت خطرے میں ڈال کر ہاشم سے کہا کہ میں اس سے شادی کر لوں گی اگر وہ خود کو بے گناہ ثابت کر دے عدالت میں اور اس گند سے ہمیشہ کے لیے نکل آئے۔ آپ کے لیے ... آپ کے خاندان کے لیے میں نے یہ رسک مول لیا۔"

"ابھی تو آپ نے کہا کہ آپ اپنے بابا کے کہنے پہ یہ کر رہی تھیں۔" وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔ آبی لمحے بھر کو چپ ہوئی۔

"انہوں نے کہا تھا، مگر کیا تو میں نے آپ کے لیے ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تو نہیں کہا تھا۔

آپ نہ کرتیں خیر تھی۔" فارس نے شانے اچکائے۔ "میں تو ویسے ہی عدالت وغیرہ کے چکر کے خلاف ہوں۔ یوں ہی آپ نے اپنا وقت ضائع کیا۔"

آبدار پھر سے لاجواب ہوئی۔ "بہرحال وہ نہیں مانا۔"

زمر نے چونک کر سر اٹھایا اور ریکس کے پار 'دور کھڑے ان دونوں کو دیکھا۔ اس کے دل میں بے پناہ مایوسی اتر آئی۔ یعنی ہاشم نہیں مانا؟ وہ اس کیس کو لٹکاتا جائے گا؟

"اچھی بات ہے۔ ملک و قوم کا بہت سا پیسہ بچ گیا۔ یہی بتانے آئی تھیں آپ؟" فارس غازی پہ تو جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ آبدار نے گہری سانس لی۔

"فارس... یہ بات زمر نے کی تھی بابا سے۔"

وہ چونکا۔ "کیا بات؟"

آبدار کی رکی سانس بحال ہوئی۔ ہمت بڑھی۔

"یہی کہ اگر میں راضی کرلوں ہاشم کو تو وہ آپ کو چھوڑ دیں گے۔ میرے لیے۔"

آخری دو الفاظ نے یکدم چھناکے سے جیسے بہت سا بھرم اور لحاظ توڑ دیا تھا۔ فارس غازی لاجواب ہو گیا۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ اپنے منہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ زمر نے بے اختیار ریک کو تھاما۔ بہت کچھ اپنی دسترس سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"میرے بابا اور زمر کی ڈیل ہوئی تھی۔ آپ کے اوپر اور زمر نے کچھ گروی بھی رکھوایا تھا۔ مجھے دو روز پہلے پتا چلا تو میں فوراً" یہ واپس لے آئی۔ بابا کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" پرس سے اس نے سیاہ مخملیں ڈبی نکالی اور فارس کی طرف بڑھائی۔ فارس سنجیدگی سے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس رخ پہ کھڑا تھا کہ زمر کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اس کی آنکھوں میں زخمی پن سا در آیا تھا۔ اور اس کی ان آنکھوں کو دیکھ کر

زمر کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ تیزی سے وہاں جانا چاہتی تھی 'یہ ڈبی اس لڑکی کے ہاتھ سے چھیننا چاہتی تھی' مگر قدموں میں جان ہی نہیں رہی تھی۔

"آپ یہ زمر کو واپس دے دیں۔ یہ ان کی ہے۔ ان ہی کی رہنی چاہیے۔"

اس نے فارس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے 'بنا پلک جھپکے' ڈبی بڑھا کر کہا تھا۔ فارس نے آہستہ سے ڈبی اس کے ہاتھ سے اٹھائی۔ پھر کھولی۔ اندر رکھا ہیرا زمانوں کی داستانیں خود میں سموئے جگمگا رہا تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے وہ ہیرا نکال کر دیکھا۔ بدلتی روشنی میں وہ مزید خوب صورت لگنے لگا تھا۔

"آپ کو برا تو لگا ہوگا۔ مجھے بھی لگا۔ معذرت کے ساتھ مگر مسز زمر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ معصومیت سے افسوس کر رہی تھی۔

"اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ دو انگلیوں میں لونگ پکڑے دھیرے سے بولا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے آپ کو دکھانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے شاید۔ یا شاید..." وہ اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔ "شاید... مسز زمر نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ آپ برا محسوس نہ کریں۔ ہر شخص میں قربانی دینے کا جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ... آپ کے لیے... وہ سب کبھی نہیں کریں گی جو قربانی دینے والے کرتے ہیں۔"

اندھیرے ریک کے اوٹ میں کھڑی زمر نے بے اختیار کنپٹی مسلی۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

"نہیں میرا دل نہیں دکھا۔" اس نے گہری سانس لے کر آبدار کو دیکھا۔ آبی کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔ زمر نے بے اختیار ریک زور سے تھاما۔

"اس نے آپ کا تحفہ یوں کسی کو دے دیا' آپ کا دل نہیں دکھا؟"

"یہ تو ایک چیز ہے۔ چیزوں کا کیا ہے؟ آتی جاتی رہتی ہیں۔" وہ دو انگلیوں سے پکڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ "میں یا زمر چیزوں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔" یہ کہتے ہوئے وہ دائیں جانب گھوما' برنر کا بٹن گھمایا۔

آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ تو اس نے ہیرے کی لونگ آگ میں ڈال دی۔ آبدار کا منہ کھل گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ تو آپ کو بہت عزیز تھی۔ آپ نے خود مجھے بتایا تھا' جب ہم کولمبو جا رہے تھے۔" بے اختیار اس کے منہ سے پھسلا۔

"یہ تو ایک پتھر ہے اور مجھے یہ عزیز نہیں ہے۔ میں اسے پہلے بھی ایک دفعہ پھینک چکا ہوں۔ مجھے وہ عزیز ہے جس کو میں نے یہ دیا تھا۔" وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا' الفاظ میں گویا کاٹ سی تھی۔ آبدار کے گال سرخ ہوئے۔ آنکھوں میں برہمی ابھری۔ حیرت بھری برہمی۔

"بات چیز کی نہیں ہے۔ اس نے "آپ" کو تین دن تک گروی رکھا ہے۔"

"اس نے مجھے چار سال تک جیل میں بھی رکھا تھا۔ میں اس کو ہزار دفعہ معاف کر سکتا ہوں۔"

کچن میں کوئلوں کے دہکنے کی تیز بو محسوس ہوئی تھی۔

"آبدار! آپ کو اگر لگتا ہے کہ ایک پتھر کے پیچھے ہم ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو آپ ہم دونوں کو نہیں جانتیں۔ ہم نے آگ اور خون کا دریا ایک ساتھ پار کیا ہے۔ ہم اچھے اور برے وقت کے ساتھی ہیں۔ موت کے علاوہ کوئی چیز ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتی۔"

زمر سے مزید سنا نہیں گیا۔ شدت ضبط سے اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں سے آنسو ابل جانے کو بے تاب تھے مگر وہ ان کو روکے ہوئے تھی۔

آبدار نے آنکھیں جھکا کر اپنی پٹی بندھی کلائی کو دیکھا' پھر شعلہ بار نگاہیں اس پر جمائیں اٹھائیں۔ "وہ تمہارے لیے .... یہ کبھی نہیں کرے گی۔" طرز تخاطب بدلا' جذبات بدلے۔ انداز بدلا۔ وہ کہہ کر رکی نہیں۔ تیزی سے وہاں سے نکل آئی۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے دیکھا۔ زمر وہاں کھڑی تھی۔ وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ بس سنجیدہ سی کھڑی تھی۔ آنکھیں ذرا بھیگی ہوئی تھیں۔ آبدار پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔

وہ اب برنر کی طرف گھوم چکا تھا۔ بھڑکتے شعلے میں وہ جلتی لونگ کو دیکھ رہا تھا جس کا سونا پگھل پگھل رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ نرمی سے اس کا بازو تھاما۔ وہ چونک کر مڑا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ فوراً" دروازے کو دیکھا۔

"میں سمجھا تم اوپر ہو۔ تم کب آئیں۔" برنر تیزی سے بند کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ وہ واقعی اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

"جب تم اس سے کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" فارس نے گرم چولہے سے ننھا ہیرا اٹھانا چاہا' مگر تیز تپش لگی تو جھٹکے سے ہاتھ واپس کھینچا اور انگلی ہونٹوں سے لگائی۔ پھر چونک کر اسے دیکھا۔

"ایک منٹ۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔"

"تم نے کہا تھا۔ میں نے سنا ہے۔ میں نے صرف یہی سنا ہے۔"

"اپنے کانوں کا علاج کرواؤ۔" وہ خفگی سے بازو چھڑا کر اب کپڑے سے لونگ چولہے سے ہٹا رہا تھا۔

"میں نے خود سنا ہے۔ تم بار بار یہی الفاظ دہرا رہے تھے۔ مجھے ہر لفظ ایسا ہی لگ رہا تھا۔" آنسو اب کے اس کی آنکھوں کو بھگونے لگے تھے۔ "میں تمہیں ڈیزرو نہیں کرتی۔ میں بہت بری ہوں فارس۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ ابھی تک خفا تھا۔ وہ روتے روتے ہنس دی۔ پھر ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"اس کا کیا کرو گے اب؟"

"تم نے میرا تحفہ پھینک دیا' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کالک زدہ ہیرا کپڑے سے اٹھا کر ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔ وہ نم آنکھوں سے مسکراتی ہوئی اسے یہ کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"تم مجھ سے کبھی خفا تھے ہی نہیں۔ موقع ملنے پہ تم نے خود بھی اسے پھینک دیا۔ تم نے اچھا کیا فارس۔ ہمارے گھر والے' ہمارے ملازم' آبدار' یہ سب لوگ

سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ صرف میں اور تم جانتے ہو کہ یہ ہمارے راستے کا وہ پتھر تھا جو ہر خوب صورت لمحے کے آخر میں ہمارے پاؤں میں آکر چبھتا تھا۔ یہ ایک اچھا تحفہ نہیں تھا۔ اس میں دھوکا تھا۔ دنیا سے چھپا کر کچھ کرنے کا عنصر تھا۔ یہ ہم دونوں کے لیے ڈھیروں شرمندگی کا باعث تھا۔ تم نے اچھا کیا جو اسے پھینک دیا۔ میں نے بھی اچھا کیا جو اسے پھینک دیا۔" وہ ڈسٹ بن میں گرے ہیرے کو دیکھ کر بے خودی کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔ فارس کی پیشانی کی شکنیں کم ہوئیں۔ وہ گہری سانس لے کر اس کی جانب گھوما۔

"ٹرائل نہیں ہوگا۔" وہ لونگ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ذکر کبھی بھی ندامت اور عجیب سے اجنبی پن سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ اور میں کوشش کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔" وہ واقعی تھکی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ "لیکن میں پھر سے کسی ایسے شخص کو ڈھونڈوں گی جو ہاشم کو منا سکے۔ اس کے لیے مجھے بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"چلو۔۔۔ مل کر سوچتے ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"مل کر کیسے؟"

"دو تین دن کے لیے کسی لمبی مسافت پہ نکل جاتے ہیں۔ اس سارے شور ہنگامے سے دور۔ ان مسلوں، تھانے کچہریوں اور ان لوگوں سے دور۔ تم تھک گئی ہو۔ کچھ دن آرام کرو گی تو دماغ سے ساری آلودگی چھٹ جائے گی۔"

"جو تم کہو۔" وہ ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرا کر بولی تھی۔

"مگر یاد رکھنا، میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔" وہ انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتے ہوئے بولا تھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"تمہاری معافی کی پرواہ ہے کسے؟ تم تو شکر کیا کرو کہ میں نے تمہیں معاف کر کے تم سے شادی کر لی ورنہ تم جیسے دو نمبر آدمی کو میں ڈیز رو نہیں کرتی تھی۔"

"مجھے ایک کورٹ رپورٹر کو ساتھ لے کر گھومنا چاہیے جو تمہاری ہر بات ساتھ ساتھ لکھ کر ریکارڈ کرتا جائے، تم وکیلوں کا کیا بھروسا، جب چاہو مکر جاتے ہو۔" وہ جل کر بولا۔ وہ جواب میں جھک کر کچھ کہہ رہی تھی مگر آوازیں مدھم ہو رہی تھیں۔۔۔ گویا دور کسی کنویں سے آ رہی ہوں۔۔۔ ڈسٹ بن میں گری لونگ کا ہیرا جلنے کے باوجود مدھم سا جگمگا رہا تھا۔۔۔

٭ ٭ ٭

آج:

"۱۴ مئی سے چند دن پیچھے آ ئیں یور آنر۔" ہاشم کی آواز نے اسے عالم تنویم (گہری سوچ، نیند hypnosis) سے نکالا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ کمرہ عدالت میں سب کے سامنے کھڑا ہاشم پورے اعتماد سے جج کو بتا رہا تھا۔

"یور آنر سونیا کاردار کی سالگرہ کے موقع پہ سعدی یوسف کو کاردار خاندان نے مدعو نہیں کیا۔ ہمارے تعلقات اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے، لیکن جب کورٹ میں مجھے مسز مریلیس (زمر نے ماتھے پہ ہاتھ لے جا کر اس کی سچائی کو سلام کیا) تو ان کی درخواست پہ میں نے سعدی یوسف اور زمر یوسف کے لیے کارڈ بھجوا دیے۔ ہم نے سوچا یور آنر کہ شاید اب یہ نوجوان تو بہ تائب ہو چکا ہو۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ عین پارٹی کے وقت، جب میں باہر مہمانوں میں تھا، سعدی یوسف میرے کمرے میں گیا، اور میرا لاکر کھولنا چاہا۔ پاس ورڈ بدل چکا تھا، وہ اسے تو نہ کھول سکا مگر میرے دراز میں رکھا میری بیٹی کا نیکلس جو اسے میری ماں نے سالگرہ کے تحفے کے طور پہ دیا تھا اور جو اس نے میرے دراز میں ڈال دیا تھا، بچوں کی لاپروائی، یونو، سعدی یوسف نے وہ نکال لیا اور یور آنر اس کی میرے کمرے سے چوروں کی طرح نکلنے کی پوری فوٹیج موجود ہے ہمارے پاس۔ جب وہ باہر آیا تو نوشیرواں نے اس سے باز پرس کی، جس پہ دونوں کی تلخ کلامی ہوئی۔ سعدی کو ایک دم جانے کی جلدی ہو گئی۔ جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایگزٹ تک آیا تو گارڈ نے اسکینر

کے الارم کے باعث اس کو روک کر تلاشی لینی چاہی جس پہ زمر یوسف نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں اس وقت صورت حال سے ناواقف تھا۔ یہ سب دیکھ کر میں نے گارڈز کو جھڑکا اور سعدی کو جانے دیا۔ چند دن بعد جب ہم ایک شادی کی تقریب میں اس سے ملے تو میں نے اس سے کہا کہ وہ یہ نیکلس واپس کر دے۔ وہ میری بیٹی کو بہت عزیز ہے۔ مگر سعدی یوسف نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ مجھے بھی بے عزت کیا۔ اس دن کے بعد میں نے سعدی یوسف کی شکل صرف اخبارات اور ٹی وی پہ دیکھی۔ اگلے آٹھ نو ماہ تک ہم نے اس کو نہ دیکھا' نہ اس سے ملے۔ یہ فرعون کے دربار والی کہانی مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ من گھڑت ہے۔ سعدی یوسف اکیس مئی کو ہمارے آفس نہیں آیا تھا۔ یور آنر! ہماری بلڈنگ کی لاگ بک انٹری ڈیٹا' سی سی ٹی وی فوٹیج' سب ہم عدالت میں جمع کرا چکے ہیں۔ استغاثہ کے پاس ایک بھی گواہ یا ثبوت نہیں ہے جو ثابت کرے کہ ہم نے اس روز سعدی سے ملاقات کی بھی یا شیرو اور سعدی کا کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ یور آنر! ہم نے تو اتنا عرصہ صرف یوسفز کی مدد کی' ہر مشکل میں ان کے ساتھ کھڑے رہے' فارس غازی کو جیل سے نکلوانے میں کتنا ساتھ دیا ان کا' یہ جانتے ہیں۔

("جی بالکل۔ بجا فرمایا۔" گال پہ ہتھیلی جمائے بے زاری سے سنتے ہوئے زمر بولی تھی)

"یور آنر! ہمارے لیے ان کا ایک دم ہمارے خلاف اٹھ کھڑا ہونا شدید دکھ اور صدمے کا باعث ہے۔ فارس غازی نے ہماری انیکسی ہمیں ہی فروخت کی مارکیٹ سے تین گنا زیادہ قیمت پر۔ شاید وہ رقم بھی کافی نہیں تھی' جو اب یہ ایک ایسا کیس کر رہے ہیں جس کے درمیان میں ان کو لگتا ہے ہم لوگ ان کو منہ بند کرنے کے لیے ایک خطیر رقم دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہو گا یور آنر' نوشیرواں کا کردار ایک معصوم اور بے گناہ لڑکا ہے' اس کی عزت' اس کی نیک نامی' اس کی کریڈیبلٹی ہر شے کو اس الزام نے ٹھیس پہنچائی ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ نوشیرواں کا کردار کو نہ صرف باعزت بری کیا جائے بلکہ سعدی یوسف کی ملک دشمن سرگرمیوں کا بھی نوٹس لیا جائے۔ یہ آٹھ ماہ تک کہاں تھا اور کون سے جرائم پہ پردہ ڈالنے کے لیے الزام ہمارے سر تھوپ رہا ہے اس سب کی تحقیقات ہونی چاہیے۔ اور یہ کام جلد سے جلد ہونا چاہیے۔ کیونکہ میرا خاندان' میرے دوست' میرا کاروبار' ہماری ساکھ' ہمارے رشتے' ہر چیز اور ہر شخص کو اس بے بنیاد الزام نے شدید دھچکا لگایا ہے۔ ہمیں ہمارے امیر ہونے کی' برسوں کی محنت کے بعد حلال رزق سے یہ امپائر کھڑی کرنے کی' اپنا پیٹ کاٹ کر خون پسینہ اس کمپنی میں لگا کر اس کو اس مقام تک پہنچنے کی سزا دی جا رہی ہے۔ یور آنر' میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام گواہوں اور ثبوتوں کو اچھی طرح پرکھ کر انصاف کے عین تقاضے پورے کر کے فیصلہ سنائے اور عدالت جو بھی فیصلہ سنائے گی ہمیں وہ قبول ہو گا۔ تھینک یو یور آنر!"

سر کو خم دے کر وہ واپس اپنی کرسی تک آیا تھا۔ جواہرات اب مطمئن سی مسکرا رہی تھی اور زمر' سعدی' حنین تینوں ہاشم کو بھوکے شیروں والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ایسے میں صرف نوشیرواں تھا جس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں' اور وہ ایک نقطے پہ پتلیاں ساکت کیے' بنا پلک جھپکے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ جج صاحب کچھ کہہ رہے تھے مگر نوشیرواں کا دماغ اس کی نگاہوں کی طرح ایک ہی نقطے پہ آکر جم گیا تھا گویا برف کا کوئی تودہ ہو جس کی تہ در تہ برف میں یادیں اور قصے ثبت ہو کر امر ہو گئے ہوں.... ٹھنڈے یخ۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

برف کی موٹی موٹی ڈلیاں مشروب کے گلاس کی سطح پہ تیر رہی تھیں جب بارٹینڈر نے کاؤنٹر پہ وہ گلاس اس

کی جانب دھکیلا۔ اونچے اسٹول پہ بیٹھے شیرو نے اسے اپنی طرف کیا اور اس کے اندر ذرا سا اسٹرا ہلایا۔ ساتھ ہی وہ موبائل چیک کر رہا تھا۔

"تمہاری اینکل اسٹریپ کہاں ہے شیرو؟" دو نوجوان وہیں اس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے اونچی سی آواز کسی۔ دوسرا ہنسا۔ (امریکہ میں اس طرح اگر کسی کو ضمانت پہ رہا کیا جائے اور ہاؤس اریسٹ کر دیا جائے تو اس کے ٹخنے پہ ایک پٹا باندھا جاتا ہے جو اس کی پوزیشن کو مانیٹر کرتا رہتا ہے۔) نوشیرواں نے چہرہ اٹھا کر تندہی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"تمہارے باپ کو جب نیب والے پکڑ کر لے گئے تھے تو میری اسٹریپ ادھار میں ساتھ لے گئے تھے۔" دوسرا نوجوان پھر سے ہنسا۔ مگر پہلے نے ابرو اچکائے۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یہ جیل جانا' عدالتوں سے گزرنا' یہ تو شان کی باتیں ہوتی ہیں۔" آگے بڑھ کر اس نے شیرو کا کندھا زور سے تھپکا۔ نوشیرواں نے (ہونہہ) کندھا جھٹکا اور موبائل کی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اور پھر اچانک ہی سارے میں ایک شناسا سی آواز گونجنے لگی۔ کسی ڈراؤنے خواب کی سی کیفیت میں اس نے سر اٹھایا۔ کسی نے لاؤنج کی دیوار پہ لگی انسان کے سائز کی ایک ایل ای ڈی کی آواز تیز کر دی تھی۔ مدھم بتیوں کے باعث سارے ماحول میں نیم اندھیرا پھیلا تھا اور اسکرین کسی سینما کا ماحول پیش کر رہی تھی۔ نوشیرواں کی نگاہیں وہاں جا کر ٹھہریں تو واپس پلٹنا بھول گئیں۔

معروف اینکر کے سامنے صوفے پہ پیچھے کو ہو کر بیٹھا' وہ ویران مگر سنجیدہ چہرے والا لڑکا.... ٹھہرے ہوئے مگر مضبوط لہجے میں کتھا بیان کر رہا تھا۔ "میں اسے وہاں اس زیر تعمیر گھر میں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔"

"اور پھر اس نے آپ کو گولی ماری۔" آگے کو ہو کر بیٹھا اینکر تاسف اور ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ سلور گرے ڈریس شرٹ میں ملبوس سعدی کے بال ذرا بڑے ہو گئے تھے۔ گھنگھریالے بال اب نظر آنے لگے

تھے۔ ان کو جیل لگا کر اس نے پیچھے کو جمار کھا تھا۔ بھوری آنکھوں میں یہ سنتے ہی گہرا درد آبسا۔ آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ کہنی صوفے کے ہتھے پہ جمائے' وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم مسل رہا تھا۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ یہ نہ کرے۔ نہیں' میں نے اس کی منت نہیں کی۔ مگر میں نے کہا کہ وہ اپنے بھائی جیسا نہیں ہے۔" نیم روشن لاؤنج میں لڑکے لڑکیاں گلاس چھوڑ کر سننے لگے تھے۔ موسیقی بند ہو گئی تھی۔ پلیٹوں میں چلتے چمچے کانٹے رک گئے تھے۔ دم سادھ کر گویا اسے سنا جا رہا تھا جو بڑی اسکرین پہ اتنا بڑا سا لگ رہا تھا۔ اپنی زندگی سے بھی بڑا۔

"میں نے اس سے کہا کہ میں جانتا ہوں وہ یہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں وہ اندر سے ایک اچھا انسان ہے۔ اور پھر میں نے وہی کہا جو ہابیل نے قابیل سے کہا تھا۔ اگر تم مجھے قتل کرنا چاہو' تب بھی میں تم پہ ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ کیونکہ وہ میرا مسلمان بھائی تھا۔ مجھے آخری لمحے تک یقین نہ تھا کہ وہ مجھ پہ گولی چلا سکتا ہے۔ وہ ہائی تھا (نشے میں تھا)۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ مجھے اس پہ ترس بھی آ رہا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ وہ میرے اوپر گولی نہیں چلائے گا۔ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ مجھے لگا وہ کبھی نہیں بھول سکے گا کہ جب وہ ڈرگز کی زیادتی کے باعث مر رہا تھا تو میں اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ مجھے لگا وہ یاد رکھے گا کہ کبھی ہم دوست تھے۔ مگر نوشیرواں کا دار نے کچھ یاد نہیں رکھا۔ میں ان آخری لمحوں میں بھی اسے شیرو' کہہ کر پکار رہا تھا۔ اور پھر اس نے مجھے تین گولیاں ماریں' اور کہا کہ میرا... نام... نوشیرواں ہے۔"

پروگرام کے سیٹ پہ چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ گویا سانسیں تک رک گئی ہوں۔

"گولی لگنے کے بعد کیا ہوا؟ آئی نو یہ آپ کے لیے تکلیف دہ ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ ملک بھر میں' بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی بی این نیوز کی نشریات جاری ہیں' اور لوگ آپ کو دیکھ رہے ہیں' ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت کیا ہے۔"

سعدی نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے تین گولیاں ماریں اس نے۔ پیٹ میں' کندھے میں' ٹانگ میں' میں نیچے گر گیا۔ زمین پہ۔ مجھے لگا اب وہ بھاگ جائے گا' مگر وہ نہیں بھاگا... میں اب تک بے یقین تھا۔ شاک میں تھا۔ پھر وہ میری طرف آیا۔ مجھے لگا کہ شاید اب یہ مجھے اٹھائے گا۔ وہ میرا دوست تھا۔ وہ میرا اچھا دوست رہا تھا۔ مگر اس نے مجھے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ میرے منہ پہ..." رک کر سانس لیا۔ "وہ میرے منہ پہ جوتے سے ٹھوکریں مارتا رہا۔ ساتھ میں وہ مجھے گالیاں بھی دے رہا تھا' وہ کہہ رہا تھا کہ میری وجہ سے وہ ہمیشہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ میرے سامنے وہ بیسٹ نہیں لگ سکتا۔ وہ مجھے مار گیا۔ بری طرح۔ گولی سے زیادہ تکلیف دہ وہ ٹھوکریں تھیں۔ وہ بوٹ کی ٹھوکریں جو میرے منہ پہ لگ رہی تھیں۔"

اسکرین پہ اب زخمی سعدی یوسف کی پولیس فوٹوز دکھائی جا رہی تھیں۔ زخم زخم چہرہ۔ زخمی جسم۔ بند آنکھیں۔ رستا خون۔

"لوگ کہتے ہیں روحانی اذیت زیادہ ہوتی ہے مگر میں آپ کو بتاؤں' جسمانی اذیت زیادہ برا حال کرتی ہے۔ اسی لیے تو قیامت کے بعد برے لوگوں کے لیے جہنم کا وعدہ ہے۔ جسمانی اذیتوں کی جگہ۔ یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ مشرکوں کو ڈپریشن ہو گا یا ان کے دل ٹوٹ جائیں گے' ان کو طنز و طعنوں سے اداس کیا جائے گا بلکہ جسمانی عذاب کی وعید سنائی گئی۔ وہ تکلیف' وہ اذیت... وہ بہت زیادہ تھی اور اس لمحے میرے منہ سے ایک ہی بات نکلی تھی... "اللہ حساب لے گا۔"

اینکر اب بریک پہ جا رہا تھا۔ کوئی ٹرانس سا ٹوٹا تھا۔ گردنیں مڑیں۔ نگاہیں اٹھیں۔ سب نوشیرواں کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ بس نظریں اس پہ گاڑ دیں۔ وہ ملامتی' وہ اندر تک اتر جانے والی غصیلی نظریں' وہ نفرت انگیز نظریں... وہاں موجود ہر شخص مدھم زرد بتیوں میں صاف نظر آتے اسٹول پہ بیٹھے شیرو کو دیکھ رہا تھا۔

نوشیرواں چیخ چلا کر بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ دم

توڑ گئے تھے۔ وہ دھیرے سے اٹھا۔ والٹ اور چابیاں اٹھائیں‘ فون جیب میں ڈالا۔ سب اسے گھور رہے تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ سب کی نظریں انی کی طرح اس کے پورے وجود میں اتر رہی تھیں۔ اسے پسینہ آنے لگا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ دروازہ دور تھا۔ نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس کا تنفس تیز اور بے ترتیب ہو رہا تھا۔ نفرت‘ ملامت‘ غصہ‘ وہ سارے جذبات آگ کی لپٹوں کی طرح اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ گویا یہ لپٹیں اس کو کھا جائیں گی۔ بدقت وہ باہر نکل پایا تھا۔ مگر اس ساری تپش نے کاؤنٹر پہ رکھے گلاس میں تیرتی برف کی ڈلیوں کو پگھلا دیا تھا۔ برف پانی بنتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج

"استغاثہ اگلی پیشی پہ گواہوں کو پیش کرے۔ تمام کاغذات عدالت میں جمع کرا کے۔۔۔" جج صاحب کی سخت کھردری آواز نے نوشیرواں کو چونکایا۔ وہ ایک دم بے اختیار گردن موڑ کر استغاثہ کی کرسیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں سعدی اسی طرح اداس سا بیٹھا تھا۔ زمر اب اٹھ کر جج صاحب کے ڈیسک کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ہاشم ہاتھ میں کاغذ پکڑے کچھ کہہ رہا تھا اور احمر فائل سے کاغذ نکال نکال کر اسے تھما رہا تھا۔ مگر شیرو کی نظریں اس کے اداس چہرے پہ جم سی گئیں۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ پہلے

سعدی وہاں نہیں تھا۔ اس کا گہرا خیال اسے یہاں سے دور کسی جنگل‘ بیاباں سے گزار کر۔۔۔ برف کے سمندر اور سنہری ریت کے محل عبور کرا کے۔۔۔ نیلی جھیل اور سفید چوٹیوں کے اوپر سے اڑا کے۔۔۔ اونچی آبشاروں کی منجلج پہ تیرا کے۔۔۔ اس کا خیال اس کو ماضی میں لے جا رہا تھا۔

مورچال کی دیواروں سے چمٹی سبز بیلیں اداس اور

ویران لگتی تھیں۔ زمر اپنے کمرے میں کھڑی تھی۔ بیڈ پہ سفری بیگ کھلا پڑا تھا‘ اور وہ اس میں کپڑے تہہ کر کے رکھتی جا رہی تھی۔ انداز سے شدید اکتائی ہوئی لگتی تھی۔ دفعتاً" سر اٹھا کر کونے میں کھڑے‘ خفا اور برہم سعدی کو دیکھا۔ "میں نے یہ تمہارے لیے نہیں کیا۔ دسویں دفعہ بتا رہی ہوں۔"

"آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟" وہ ذرا پریشانی سے اس کے قریب آیا۔ "اگر آپ ٹرائل کے لیے فارس ماموں کو چھوڑ دیں گی تو کیا میں یوں خوش ہوں گا۔"

"میں ان ٹپیکل عورتوں میں سے نہیں ہوں جو ہر دوسرے دن کسی ٹی وی ڈرامے میں شوہر کے لیے قربانی دے رہی ہوتی ہیں۔ میں تو صرف۔۔۔" سر جھٹکا اور بیگ کی زپ بند کی۔ "میں صرف ایک کوشش کر رہی تھی۔ مگر بہرحال اب کوئی ٹرائل نہیں ہو گا۔ کیس فائلوں میں دب جائے گا۔ اس لیے میں۔۔۔ کچھ دن کے لیے یہاں سے جا رہی ہوں۔ پلیز مجھے مت روکنا۔"

وہ خفگی سے اسے دیکھتا رہا۔ "آپ جا رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ میں آپ کو نہ روکوں؟" پھر گہری سانس لی۔ "آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں آپ کو روکوں گا؟ کب سے لگنے لگا میں آپ کو اتنا خود غرض۔ کیا میں آپ کو سکون سے چند دن گزارنے نہیں دوں گا؟ نہیں چاہیے مجھے ایسا ٹرائل جس کے لیے مجھے آپ دونوں کی قربانی دینی پڑے۔"

زمر کے لبوں پہ اداس مسکراہٹ بکھری۔ "مگر مجھے تو چاہیے تھا نا۔ خیر‘ جب میں واپس آؤں گی تو ہم مل کر کچھ حل نکالیں گے اور پھر۔۔۔"

"اور پھر کوئی کیس نہیں لڑ رہے ہم۔ کم از کم آپ کے واپس آنے تک میں اس موضوع پہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"اوکے!" زمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دی۔

"اب میں پیکنگ کر لوں۔"

"اور یہ آبدار صاحبہ کب سے آپ کو تنگ کر رہی ہیں؟ اس کو تو میں کل ہی فکس کرتا ہوں۔" وہ شدید غصے میں تھا۔ زمر ایک دم ہنس پڑی۔

"نہیں کیوں؟"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کوئی غنڈہ بدمعاش مجھے بس اسٹاپ پہ روز تنگ کرتا ہو۔ ارے یار! وہ ایک اچھی لڑکی ہے اور اس کو تمہارے دو نمبری ماموں اچھے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی ہمت بڑھائی ہو گی ان صاحب نے جو بات یہاں تک پہنچی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی آخر میں لہجہ ذرا جل سا گیا۔ سعدی کے ماتھے کے بل ڈھیلے پڑے۔ ذرا سا مسکرایا۔

"ایک وقت تھا کہ وہ آپ کو زہر لگتے تھے۔"

"شہداب بھی نہیں لگتا۔ زہر ہی ہے۔" سر جھٹک کر وہ پرس میں چیزیں ڈالنے لگی۔ پھر اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے چہرہ اٹھایا۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔" ہنس کر سر جھٹکا۔ "آپ آرام سے جائیں۔ اب ہم کسی ٹرائل کا نہیں سوچیں گے۔" زمر اسے چند لمحے تک دیکھتی رہی۔ جیسے کنفیوژ ہو۔ پھر امید بندھی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو نا۔ میرا مطلب ہے۔ تم ٹھیک ہو نا؟"

"اب ہو گیا ہوں ٹھیک۔ آپ کو خوش دیکھ کر ٹھیک ہوں میں۔ اور وہ جو باتیں گروپ پہ آپ میرے لیے لکھتی ہیں نا ان کو پڑھ کر مزید ٹھیک ہو گیا ہوں۔ فکر نہ کریں اور آرام سے جائیں۔" وہ مسکرا رہا تھا اور تسلی بھی دے رہا تھا۔ زمر کا دل جیسے ہلکا سا ہو گیا۔ وہ سکون سے پیکنگ کرنے لگی۔

پھر باہر سے استری شدہ کپڑے اٹھانے آئی تو کمرے کے سامنے لاؤنج کے صوفے پہ حنہ بیٹھی تھی۔ یقیناً وہ کھلے دروازے کے باعث سب دیکھ اور سن چکی تھی۔ (گھر میں اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ سب سارہ خالہ کی طرف گئے تھے۔ ندرت کو بہت گلے تھے ان لوگوں سے۔)

"اس کو جج مت کریں۔" زمر کو استری اسٹینڈ سے تہہ شدہ کپڑے اٹھاتے دیکھ کر وہ بے خودی کے عالم میں بولی تھی۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "آبدار بیمار ہے زمر! اس کو جج مت کریں۔"

زمر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس کپڑے اٹھاتی رہی۔ دونوں کے بیچ سعدی کے آنے کے بعد سے در آنے والا تناؤ ایک دم زیادہ محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر حنین شکستگی سے بولی۔

"سوری مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میرا مقام ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کو غلط یا صحیح بتا سکوں۔" زمر ایک جھٹکے سے اس کی طرف گھومی۔ پیر اوپر کر کے بیٹھی اس اداس لڑکی کو سنجیدگی سے دیکھا۔

"تم سعدی کی جگہ نہیں لے سکتیں حنین۔ تم کبھی نہیں بن سکتیں۔ جو میرے لیے سعدی ہے' وہ تم نہیں ہو سکتیں' کبھی بھی۔"

حنین ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دل اتنے زور سے ٹوٹا تھا کہ اسے اپنے کانوں میں کرچیاں بکھرنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

"ہر شخص کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ تم سعدی نہیں بن سکتیں' نہ تم اس کی طرح ہو۔ تم حنین ہو۔ اور جو تم میرے لیے ہو' وہ سعدی میرے لیے نہیں بن سکتا۔ اسی طرح فارس' سعدی' یا دنیا میں کوئی بھی شخص خواہ اس سے میں کتنی ہی محبت کروں یا وہ مجھ سے محبت کرے' وہ میرے لیے حنین نہیں ہو سکتا۔ حنین کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ خونی رشتوں میں موازنہ اور مقابلہ نہیں کرتے۔ کر ہی نہیں سکتے۔ ہر شخص کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ تمہاری بھی ہے اور اس جگہ کو کوئی نہیں بھر سکتا۔"

آنسو حنین کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ لب ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھلے۔

"اور ایسے ہی تمہاری زندگی میں کوئی زمر کی جگہ نہیں لے سکتا' جس کے جانے کے بعد تم کھڑکی میں کھڑی ہو کر اس کے واپس آنے کا انتظار کرو۔ جس کی بھولی ہوئی چابیاں اور گلاسز لوٹانے کے لیے تم اس کا کچ راستے سے مڑ کے آنے کا انتظار کرو۔ جب تم زمر کا مقابلہ سعدی سے نہیں کر سکتیں تو میں بھی حنین کا

مقابلہ سعدی سے نہیں کر سکتی۔"

حنین نے اثبات میں سرہلا دیا۔ آنکھوں پہ چھائی گرد کو زمر نے پانی ڈال کر جیسے دھو دیا تھا۔ زمر کپڑے لے کر آگے بڑھ گئی اور وہ ایک خوشگوار احساس میں گھری بیٹھی رہ گئی۔ ایک محبت کھو گئی تو کیا ہوا۔ بہت سی مل بھی تو گئیں۔

سعدی آہستہ سے اس کے ساتھ آکر بیٹھا تو حنہ چونکی۔ اس کی مسکراہٹ غائب تھی۔ اور چہرے پہ ویرانی تھی۔ "ہم نے ٹرائل لڑنا ہے حنہ' مجھے بتاؤ کیسے؟"

حنین کے دل کو دھکا سا لگا۔ "تو وہ سب جو ابھی کہا۔"

"یہ میری جنگ ہے' مجھے لڑنی ہے' ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔"

"سوری مگر میں ٹیم فارس ہوں' اور میرا خیال ہے آپ کو بالکل بھی انصاف نہیں ملے گا۔ یہ سب بے کار ہے بھائی۔" وہ الٹا اسے سمجھانے لگی تھی۔ سعدی بنا تاثر لیے بس اسے دیکھے گیا۔

☼ ☼ ☼

آج

اپنے عالم تنویم سے وہ نکلا تو خود کو عدالتی کمرے میں پایا۔ پھر سر جھٹک کر وہ اٹھا اور جانے والوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کی کرسی وہیں پڑی رہی۔ دیوار پہ لگی گھڑی کی سوئیاں اپنی مسافت طے کرتی رہیں۔ روشنی' اندھیرا' بارش' آندھی' پھر اندھیرا' پھر روشنی۔ کھڑکی سے باہر آسمان کے سارے بدلتے عکس اس کرسی پہ پڑتے رہے یہاں تک کہ وہ واپس آکر اس پہ بیٹھا' آج سیاہ کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس یوں لگتا تھا گویا بالخصوص تیار ہوا ہو۔ تازہ شیو' تازہ قلموں سے تراشے بال' نیا کرتا شلوار' پیروں میں پشاوری چپل' وہ گویا تیار تھا۔

گواہی دینے کے لیے۔

نظر اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔ تو سب اپنی معمول کی نشستوں پہ آ بیٹھے تھے۔ ہلچل اور آوازوں کے بیچ بھی وہ دیکھ سکتا تھا' نوشیرواں چپ چاپ ہاشم کے پہلو میں بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ ویران اور آنکھیں رتجگے کے باعث سرخ تھیں۔ وہ بالکل لاتعلق سا سامنے دیکھ رہا تھا۔ کسی غیر مرئی نقطے کو۔ شاید اس کی نظروں میں بہت سے نقطے تھے..... سفید نقطے.....ٹی وی اسکرین کے سفید شور کی طرح.....

اس نے چینل بدلا تو اسکرین پہ سفید دانے سے آ رہے تھے۔ ہاشم نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اگلا چینل لگا لیا۔ وہ اس وقت آدھی آستین کی شرٹ اور ٹراوزر پہنے' بازو صوفے کی پشت پہ پھیلائے ہوئے اور پاؤں میز پہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ اس کے آرام کا وقت تھا۔ بیڈ روم کی بتیاں بھی مدھم تھیں۔ ایسے میں دروازہ دستک کے بعد کھلا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ چوکھٹ میں شیرو نظر آ رہا تھا۔ نیم روشن ماحول میں بھی وہ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ سکتا تھا۔

"تم نے ڈرگز لی ہیں کیا؟" ہاشم بولا تو لہجہ نہ سخت تھا نہ نرم۔ بس وہ جاننا چاہتا تھا۔ نوشیرواں خاموشی سے اندر آیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ لاک کے چوکھٹ میں گھس کر "کلک" ہونے کی آواز آئی۔ شیرو ہاتھ پیچھے دروازے پہ رکھے یونہی کھڑا رہا۔

"میں انٹرویو نہیں دے سکتا۔"

ہاشم کے نہ ابرو بھنچے نہ برہمی ظاہر کی۔ بس نا سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھے گیا۔

"میں سعدی کی طرح انٹرویو نہیں دے سکتا۔ آپ نے جو انٹرویو میرے لیے رکھوایا ہے' اس کو منسوخ کر دیں۔"

"کیوں؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔ سیاہ آنکھیں نوشیرواں کی سنہری آنکھوں پہ جمی تھیں۔

چند پل سرکے۔ زرد روشنیوں کا نیم اندھیرا' مدھم سی ٹی وی کی آواز' کھڑکی کے باہر بہتی' بھیگتی رات..... سب خاموش تھے۔

"مجھ سے وہ سب..... وہ اسکرپٹ نہیں بولا جائے گا۔ بھائی! لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔" وہ پھٹی

ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”جب سے اس کا انٹرویو آیا ہے میں جس جگہ جاؤں لوگ یا تو مجھے باتیں سناتے ہیں یا نفرت سے دیکھتے ہیں۔ میں کسی پارٹی میں کسی ٹیبل پہ بیٹھوں تو لوگ وہاں سے اٹھ جاتے ہیں۔ میں قابل نفرت' قابل حقارت بن کر رہ گیا ہوں۔“

اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”اس نے ساری زندگی میرے ساتھ یہی کیا۔ مجھے ہمیشہ اندھیروں میں دھکیل کر ساری روشنی خود سمیٹنی چاہی۔ وہ اب بھی میرے ساتھ یہی کر رہا ہے۔ جو ووٹ میں نے اس کے منہ پہ مارے تھے' وہ میرے ہر دوست' ہر عزیز' پبلک کے ہر آدمی سے میرے منہ پہ لگوا رہا ہے۔ میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔“

”ملک سے باہر چلے جاؤ۔“

”اس سے کیا ہو گا؟ میرا سوشل سرکل تو وہی رہے گا نا۔ میں ایک دفعہ بھاگا تھا' اب نہیں بھاگوں گا۔“ ایک عزم سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں انٹرویو نہیں دوں گا' کچھ نہیں بولوں گا۔ کیونکہ میرے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔ برڈن آف پروف (ثابت کرنے کی ذمہ داری) الزام لگانے والے پر ہوتا ہے' کہ انہیں ثابت کریں۔ عدالت میں ان کے خلاف میرا دفاع کریں بھائی! مجھے بری کروا دیں تاکہ میں فخر سے کہہ سکوں کہ میں بے گناہ تھا تب ہی مجھے بری کیا گیا ہے۔“

ہاشم چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ شیرو کے چہرے سے واضح تھا کہ وہ بہت مشکل سے اس فیصلے پہ پہنچا ہے۔

”ہم ٹرائل پہ نہیں جا رہے شیرو! میں اس کیس کو فائلوں میں دبا دوں گا۔“

”مگر بھائی! ہم۔۔۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے میں یہ کیوں کر رہا ہوں؟“ ہاشم ریموٹ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا لہجہ تند ہو گیا تھا۔

”کیا؟“

”یہی۔ بار بار کہنا میں ٹرائل پہ نہیں جاؤں گا۔“ نوشیرواں سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ہاشم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آ رکا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں یہ تمہیں بچانے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ میں یہ خود کو بچانے کے لیے کر رہا ہوں۔“

”مگر آپ کا تو نام ہی نہیں۔۔۔“

”میں یہ اپنی روح بچانے کے لیے کر رہا ہوں۔ جانتے ہو ٹرائل میں جائیں گے تو کیا ہو گا؟“ وہ تیزی اور درشتی سے بولا تھا۔

”مجھے ان کے خاندان کے ایک ایک شخص کو عدالت میں گھسیٹ کر بے عزت کرنا ہو گا۔ مجھے زمر کو ایک کرپٹ وکیل اور ایک منافق عورت ثابت کرنا ہو گا جو اپنے شوہر کے خلاف بھی پلاننگ کرتی رہی ہے۔ مجھے سعدی کو دہشت گرد' مجرم اور ہوس پرست لالچی نوجوان ثابت کرنا ہو گا' حنین کو بدکردار اور فارس کو قاتل ثابت کرنا ہو گا۔ جب ہم ان سب کے کردار مسخ کر چکے ہوں گے' فائلیں کھول کھول کر جج کو دکھائیں گے کہ ندرت یوسف نے ناجائز زمین پہ قبضہ کر رکھا ہے اور ان کے بڑے ابا اپنی ملازمت کے دوران کتنی دفعہ رشوت لے چکے ہیں اور جب یہ کہانیاں اخباروں میں چھپیں گی اور ٹی وی پہ دکھائی جائیں گی' تب۔۔۔ تب عدالت سعدی کی بات پہ یقین کرنا ختم کرے گی۔ تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لیے یا تو میں اس پورے خاندان کو نئے سرے سے تباہ کروں یا اس کیس کو ہی دبا دوں۔ دونوں صورتوں میں جیتیں گے ہم ہی۔ تو پھر میں کیوں کروں ان کے ساتھ دوبارہ ایسے؟ کیا ہم نے کم نقصان کیا ہے پہلے ان کے خاندان کا؟ کتنے لوگ مارے' کتنے ابھی تک ہماری وجہ سے بیمار ہیں' اور سعدی۔۔۔ کیا میں اسے دہشت گرد ثابت کروں؟ کیا یہ اس کو مار ڈالنے کے برابر نہیں ہو گا؟ تم کیوں چاہتے ہو کہ میں آگے نہ بڑھوں؟ اس سب کو چھوڑ کر نئی زندگی نہ شروع کروں؟ بہت دفاع کر لیا میں نے تمہارا! اب نہیں کروں گا اور تم چپ چاپ وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔ یہ میں اپنے مفاد کے لیے نہیں کر رہا۔ مجھے عدالت میں کوئی نہیں ہرا سکتا نوشیرواں! زمر اور

سعدی مل کر بھی نہیں۔ مگر یہ سب میں اپنی روح اور ان کی زندگیوں کے لیے کررہا ہوں۔"

نوشیرواں حق دق سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس سب کی امید نہ تھی.....

ٹی وی اسکرین ہنوز چل رہی تھی۔ سگنل پرابلم کی وجہ سے اس چینل پہ رنگ برنگے دانے سے ابھرتے نظر آنے لگے تھے... ساتوں رنگ کے دانے...

☆ ☆ ☆

آج

"ریکارڈ کے لیے اپنا نام بتایئے۔" کسی مقناطیس نے لوہے کے ان سارے ذرات کو گہرے کنویں سے باہر کھینچ نکالا۔ نوشیرواں سنبھل کر' اپنے گرد موجود عدالتی کمرے کا احساس کرکے' کٹہرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سعدی کھڑا تھا۔ کٹہرے کے اندر۔ وہ حلف لے چکا تھا اور اب اس کے سامنے' تین قدم نیچے کھڑی زمر گردن اٹھا کر اسے دیکھتی' نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

"سعدی ذوالفقار یوسف خان۔" اس نے کٹہرے کی ریلنگ پہ دونوں ہاتھ جمائے پوری طمانیت سے کہا تھا۔

"آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟"

"اسلام آباد۔"

"مذکورہ واقعے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

سب خاموشی سے ان دونوں کو سن رہے تھے۔

"میں.... کیمیکل انجینئر تھا۔"

"ذرا اونچا بولیں۔" زمر نے اشارہ کیا۔ وہ ہلکا سا کھنکار کر بولا۔ "میں کیمیکل انجینئر ہوں' یونیورسٹی آف لیڈز سے میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اور میں نیسکام میں بطور سائنس دان کام کرتا تھا۔ تھرکول پاور پراجیکٹ کا میں سینئر انجینئر تھا۔" سعدی کے چہرے پہ طمانیت تھی۔ وہ اٹھی گردن اور ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ بتا رہا تھا۔ جج صاحب رخ اس کی جانب ترچھا کیے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"سعدی یوسف! آپ کے والد کیا کرتے تھے؟" زمر دونوں ہاتھ باہم پھنسائے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"وہ ایک ٹیچر تھے۔ میں تیرہ سال کا تھا جب ان کی ڈیتھ ہوئی۔"

"اور آپ کی والدہ؟"

"ابو کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے ٹیچنگ شروع کی۔ ہمیں بڑا کیا۔ پھر بعد میں انہوں نے ریسٹورنٹ کھول لیا۔ کرائے پہ جگہ حاصل کی تھی۔ ہمارا گھر بھی کرائے کا تھا۔"

زمر نے ذرا چہرہ موڑ کر جج صاحب کے تاثرات دیکھے' پھر واپس اس کی طرف گھومی۔ جج صاحب عینک کے پیچھے سے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

"تو آپ پھر لیڈز پڑھنے کیسے گئے؟"

"میں نے ایک اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا تھا' مجھے بتایا گیا کہ مجھے اسکالرشپ ملی ہے' ایک امیر آدمی مجھے اسپانسر کرے گا۔"

"کیا واقعی ایسا ہی تھا؟"

"میں کئی برس تک سمجھتا رہا کہ ایسا ہی ہے' مگر بہت دیر سے مجھے معلوم ہوا کہ میری فیس زمر یوسف دیتی ہیں۔"

"اور میں نے آپ کو اس بات سے کیوں آگاہ نہیں کیا تھا۔"

"کیونکہ میں آپ کو آپ کا واحد پلاٹ اپنے لیے نہ بیچنے دیتا کبھی۔ آپ نے مجھے بتائے بغیر اسے بیچا اور پھر میری فیس بھری' پانچ سال تک بھری۔"

وہ اداسی سے مسکرایا۔ زمر بھی ہلکا سا مسکرائی۔ ماحول میں ایک نرم سی' خلوص بھری محبت کی خوشبو آنے لگی۔

"Too poetic" پیچھے کرسی پہ براجمان ہاشم نے اونچی آواز میں تبصرہ کیا تھا۔ زمر اس کی طرف گھومی ہی تھی کہ جج صاحب بولے۔

"آپ کو کوئی اعتراض کرنا ہے کاردار صاحب؟"

"نہیں یور آنر۔ میں تو محض اونچا سوچ رہا تھا۔" اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔ اس خوشبو کا اثر

ایک دم ٹوٹ سا گیا۔ زمر واپس گھومی۔ سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا۔

"سو جب بھی آپ یہ کہتے تھے کہ آپ اسکالر شپ پہ گئے ہیں' آپ اس اسکالر شپ کی حقیقت سے ناواقف ہوتے تھے؟"

"جی۔"

"اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے کبھی "شو آف" نہیں کیا؟"

سعدی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جہاں تک مجھے یاد ہے' ایسا ہی ہے۔"

نوشیروان فوراً" ہاشم کی طرف جھکا۔ "جب میں اس کے ریسٹورنٹ گیا تھا' اور ایک بچہ میری کار کے نیچے آتے آتے بچا تھا' تب اس نے بھرے مجمعے کے سامنے اسکالر شپ کی بات کی تھی۔ تب تو اس کو پتا تھا' یہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ اسے یاد نہیں ہوگا۔"

"تو آبجیکٹ کریں نا۔" شیرو جھنجلایا۔ ہاشم نے اسے گھورا۔

"تاکہ ثابت ہو جائے کہ تم اس کے ریسٹورنٹ گئے تھے' چپ کر کے بیٹھو!" شیرو کڑوا سا منہ بنا کر پیچھے کو ہو گیا۔

دوسری جانب والی کرسیوں پہ پیچھے آبدار بیٹھی تھی۔ آج اس کی قطار خالی تھی۔ حنین اگلی قطار میں تھی اور فارس نہیں تھا۔ آبدار گود میں رکھے سیل فون کی سیاہ اسکرین پہ بے خیالی میں انگلی پھیر رہی تھی۔ اس کا ذہن منتشر خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ سیاہ اسکرین پہ نظریں ساکن کیے وہ اس میں جھلملاتا اپنا عکس دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

وہ اپنے کلینک میں کرسی پہ بیٹھی تھی سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی سیاہ بجھی ہوئی اسکرین میں اسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم لگتی تھی۔ اس کے عین پیچھے دیوار گیر کھڑکی سے سورج کی تیز روشنی کے علاوہ اوپر سے نیچے لٹکتی سبز بیلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ تب ہی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ آبدار نے نظریں اٹھائیں۔ ذرا سا مسکرائی۔

ایک متذبذب مگر سنجیدہ سا سعدی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ آئی اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔ بس سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا آپ اپنے مریضوں کو کاؤچ نہیں پیش کرتیں؟" وہ سامنے والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"آپ مریض نہیں ہیں۔ سبجیکٹ ہیں میرے لیے۔ کچھ پئیں گے؟" انٹرکام پہ ہاتھ رکھے اس نے استفسار کیا۔

"اونہوں.... صرف بولوں گا۔"

"کہیے۔ میں سن رہی ہوں۔" سعدی چند لمحے سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ وہ ہلکے سے سفید سوئیٹر اور جینز میں ملبوس تھا۔ سوئیٹر کے اندر سے کالر بھی جھلک رہے تھے۔ چہرے سے اداس لگتا تھا۔

"تمہیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے سعدی یوسف کا ghost (سایہ) بیٹھا ہے۔ تم وہ شخص نہیں رہے۔" آبدار کو افسوس ہوا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جو لڑکا میں تھا' اگر وہ لڑکا اب مجھے دیکھے تو کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔ کھڑکی سے باہر لان میں ٹہلتے موز' درختوں پہ بیٹھے پرندے.....

"یہی سوچے گا کہ تمہیں راہ راست پہ لانے کو کون سا لیکچر دیا جائے۔ وہ لڑکا ہر وقت دوسروں کو فکس کرنے والی باتیں سوچتا تھا۔" پھر شرارت سے مسکرا کر آگے ہوئی۔ "کہیں مجھے بھی فکس کرنے تو نہیں آئے۔"

"سوچا یہی تھا مگر تم میرے لیے میری بہن کی طرح ہو۔ اور اس نے کہا تھا کہ تمہیں جج نہ کیا جائے۔ سو میں یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ مگر مجھے افسوس ہے میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کوئی لمبا چوڑا NDE نہیں ہے۔"

آبدار حیران ہوئی۔ "مگر تم تو موت کو چھو کر آئے ہو۔ ہے نا۔"

"یہ صرف میرے ڈاکٹر کا اندازہ تھا' ورنہ میں گہرے خواب سے نکل کر موت تک نہیں گیا تھا۔ میں پہلے بھی بتا نہیں سکا' مگر میں اس لیول تک نہیں جا سکا۔ میں نے صرف ایک خواب دیکھا تھا۔"

"آ۔ ہاں۔" وہ توجہ سے سننے لگی۔ "کیا خواب؟ یہ کرسی آرام دہ ہے' تم ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ۔" سعدی نے ہلکی سی ٹیک لگائی' مگر سر پیچھے نہیں لگایا۔ وہ کھڑکی سے باہر نظر آتے مور کو دیکھ رہا تھا۔ مور اپنے بھدے پیروں کے ساتھ دھیرے دھیرے ٹہل رہا تھا۔ اس کے پنکھ دھنک کے ساتوں رنگ اپنے اندر سموئے اس کے وجود کے گرد پھیلے تھے۔

"تم نے کیا دیکھا تھا؟" اسے آبدار کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ نگاہوں کے سامنے بس وہ مور تھا۔ اس کے پیروں کے رنگ تھے۔

"میں نے۔۔۔ خواب دیکھا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ ہم لوگ گئے تھے کسی پہاڑی وادی میں۔ نام یاد نہیں۔ وہاں ایک چشمے پہ بیٹھے ہوئے زمر نے مجھے کہا تھا کہ۔۔۔"

مور دفعتاً ٹہلتے ٹہلتے رک گیا تھا۔ گویا غور سے کسی کو دیکھنے لگا ہو۔ سامنے سے مورنی چلتی آرہی تھی۔ وہ سفید تھی' برائلر مرغی جیسی سفید اور واجبی سی بلکہ بدصورت سی۔

"زمر نے کہا تھا کہ زندگی میں چاہے کچھ بھی ہو جائے' وہ میری Keeper (محافظ) بنیں گی۔ میرا خیال رکھیں گی۔ میری حفاظت کریں گی۔ مگر کوئی بھی میری حفاظت نہیں کر سکا۔"

"تم غصہ ہو سب پہ؟" مورنی اب مور کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔ گول گول۔

"میں دکھی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔"

"جیسے یہ سب پھر سے دہرایا جائے گا اور تم اس دفعہ سروائیو نہیں کر پاؤ گے۔"

وہ چونک بھی نہیں سکا۔ اس کی توجہ موروں پہ تھی۔ مور کسی راج کمار کی طرح پر پھیلائے اکڑ کر کھڑا تھا اور مورنی اس کے گرد گھومے جا رہی تھی۔

"ہاں۔ مجھے اندر سے یہی خوف لاحق ہے۔ کہ میں پھر سے کسی ٹریجڈی کا شکار ہو جاؤں گا۔"

"کیا تم نے اس خوف کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے کچھ کیا ہے؟"

"کیا کروں؟"

"سوچو۔ کوئی راستہ نکالو۔" وہ آواز گو کہ دور سے آ رہی تھی مگر اس میں رعب تھا۔ اثر انگیزی تھی۔ ایسی مضبوطی کہ وہ اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ جیسے اس کا حکم ماننے پہ مجبور ہو۔ نظریں موروں پہ تھیں۔ مورنی اب مور کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"کیسے نکالوں راستہ؟"

"صرف تم نکال سکتے ہو راستہ۔"

"مجھے انصاف چاہیے۔"

"ہم زندگی میں اکثر چیزوں کی تمنا کر کے سوچتے ہیں کہ جب ہمیں یہ مل جائیں گی تو ہم بہت خوش ہو جائیں گے۔ غلط۔ خوشی ہمارے اندر ہوتی ہے۔ اگر کچھ نہ ہو کر بھی ہم خوش نہیں ہیں تو کچھ پا کر بھی نہیں ہوں گے۔ ابھی سے ٹھیک ہونے کی مشق کرو گے تو ٹھیک ہو بھی جاؤ گے۔"

"کیا کروں؟" اس کا وجود کمزور پڑ رہا تھا۔ آواز کمزور تھی۔

"انصاف ڈھونڈو مگر یہ بھی سوچو کہ اگر انصاف نہ ملا تو کیا تم سنبھل سکو گے؟ کیا دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہو سکو گے؟"

"کیا ہو جاؤں گا؟"

"ہاں۔ ہو جاؤ گے۔" آواز میں یقین تھا' مضبوطی تھی۔ دھونس تھی۔ اس کا اثر دل تک ہوتا تھا۔ اس کا اثر دماغ پہ بھی ہوتا تھا۔

"کیا کرنا ہو گا مجھے انصاف کے لیے؟"

"جو کرنا ہے' تمہیں ہی کرنا ہے۔ نہ میں کچھ کر سکتی ہوں' نہ بابا' نہ زمر' نہ فارس۔ سب نے اپنی اپنی کر کے دیکھ لی۔ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے ہاشم

اس مقام تک لانا چاہا کہ وہ تمہارا مقابلہ کورٹ میں کرے 'مگر کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ صرف تم یہ کر سکتے ہو۔" مور اب چپ چاپ اپنی مورنی کے قریب بیٹھ گیا۔ پروں کو سمیٹ لیا تھا۔

"میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں خود گناہ گار ہوں۔" اس کی آواز کانپی۔

"یہاں سب گناہ گار ہیں سعدی۔ ہر ایک کو برے کاموں میں' بری لتوں نے جکڑ رکھا ہے۔ کوئی اپنے گناہوں کو جسٹی فائی کرتا رہتا ہے اور کوئی سیاہ کاریوں کے اندھیرے میں بھی ننھا سا دیا جلائے رکھتا ہے۔ سب ہی گناہ گار ہیں۔ تم ہو تو کیا بڑی بات ہے؟"

"میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ جو کوئی نہ کر سکا وہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"کیونکہ تم ہمیشہ وہی کرتے آئے ہو جو کوئی اور نہیں کر سکا۔ میں نے عرصہ پہلے تمہیں کہا تھا' تمہارے اندر ایک ہی خوبی ہے۔ تمہاری باتیں۔ اس کو استعمال کرو۔ ایک دفعہ پھر۔"

موروں کے جوڑے نے یکایک کسی شے کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں اٹھ کر آگے کو بھاگے۔ کھڑکی سے نظر آتے لان کے حصے سے وہ غائب ہو گئے۔ سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ دھیرے دھیرے اس کے شل اعصاب بیدار ہونے لگے تھے۔ اس نے آنکھیں مسلیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اسی طرح سادگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا میں...؟" وہ پوچھ بھی نہیں سکا۔ وہ حیران تھا۔ وہ اچنبھے میں تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا تمہارے ساتھ۔ تم معمولی سے hypnosis (عالم تنویم) میں تھے۔ جیسے کوئی کتاب پڑھتے ہوئے ہم اس میں کھو جاتے ہیں۔ تم بھی گہرے خیال میں تھے۔" سعدی چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں۔"

"میری باتوں پہ غور کرنا۔" اس نے تاکید کی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر سر ہلا رہا تھا۔

"پہلی دفعہ آپ کا ہاشم کاردار سے تعارف کب ہوا تھا؟" ابدار نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ کورٹ روم میں بیٹھی تھی اور دور سامنے 'کٹہرے کے پیچھے کھڑی زمر سوالات کر رہی تھی۔ وہ سنبھل کر سیدھی ہوئی۔

"آٹھ سال پہلے' جب وہ اپنے مرحوم والد کے ساتھ میرے گھر آئے تھے اپنے ولیمے کا کارڈ دینے۔" اسٹینڈ میں کھڑا سعدی بتا رہا تھا۔

"آپ کا ان کے بارے میں پہلا تاثر کیا تھا؟"

"یہی کہ وہ ایک بہت اچھا آدمی ہے۔"

"اور اب آپ کو لگتا ہے کہ آپ غلط تھے۔"

"آب جیکشن یور آنر!" پیچھے بیٹھا ہاشم پکارا تھا۔ "مسز زمر گواہ سے رائے مانگ رہی ہیں۔" (گواہ سے گواہی یعنی Fact مانگے جاتے ہیں' رائے نہیں۔) ہاشم نے ایک دو واجبی سے اعتراضات کے......

"سسٹینڈ" جج صاحب نے زمر کو اشارہ کیا' اس نے سر کو خم دیا۔

"نوشیرواں کاردار سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟"

"چند دن بعد جب میں ہاشم کاردار کے گھر گیا تھا۔"

"تبھی آپ کو ان سے ملے چند دن ہی تو ہوئے تھے اور آپ ان کے گھر بھی چلے گئے؟"

"میں اس لیے گیا تھا کیونکہ وہاں میرے ماموں رہتے تھے۔ واپسی پہ میں ہاشم کی طرف چلا گیا۔"

"اور پھر؟"

"میں اسٹڈی میں تھا جب میں نے کراہنے کی آواز سنی۔ دیکھا تو ساتھ والے کمرے کی بالکونی میں نوشیرواں گرا پڑا ہے۔ وہ ڈرگز کی اوور ڈوز کی وجہ سے قریب المرگ لگتا تھا۔ میں نے میری اینجیو کو کار نکلوانے کا کہا اور پھر ہم اسے اسپتال لے گئے۔ بہرحال وہ جلد ٹھیک ہو گیا تھا۔"

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے اس کی جان بچائی۔"

"میں کہہ نہیں رہا۔ سب گواہ ہیں اس کے۔"

"او کے!" زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ کن انکھیوں سے وہ مسلسل جج صاحب کے تاثرات بھی دیکھ رہی

تھی۔ وہ اب ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے، کہنی ڈیسک پہ ٹکائے، متوجہ مگر سپاٹ چہرے کے ساتھ سعدی کو دیکھ رہے تھے۔

"مسز کاردار سے آپ کا کیسا تعلق تھا؟"

"میں اپنی اور مسز کاردار کی تمام ای میلز کا ریکارڈ کورٹ میں جمع کرا چکا ہوں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنے بیٹے کی جاسوسی کرنے کے لیے کہتی تھیں اور میں محض اس کی بھلائی کے لیے ان کو بتاتا تھا اگر نوشیرواں کسی غلط کام میں ملوث ہوتا تو۔ بہت دفعہ میں نے نوشیرواں کا پردہ بھی رکھا، مگر یہ ایک ماں کا حق تھا۔"

"لیکن جب نوشیرواں کو آپ کے سامنے یونی میں مارا پیٹا گیا تو آپ نے اسے کیوں نہیں بچایا؟"

"میں نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ میں نے اسے اس لیے نہیں بچایا کیونکہ ہاشم کاردار نے مجھے منع کیا تھا، کیونکہ اس نے خود اپنے بھائی کو پٹوایا تھا تاکہ وہ اس کی دوست آبدار عبید کو تنگ نہ کرے۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" جواہرات بے یقینی سے ہاشم کے قریب ہوئی۔ "تم نے اس کو نہیں بتایا تھا۔"

"کیا اس کو پتا تھا بھائی!" شیرو ہلکا سا غرایا۔ ہاشم خود بھی چونکا تھا۔ "نہیں!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔" وہ حیران تھا۔

"سو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہاشم جس لڑکی کو پسند کرتا تھا نوشیرواں اس کو ہراساں کرنے لگا تھا، سو ہاشم نے اپنے ہی بھائی کو پٹوایا؟" زمر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ہاشم ابرو اکٹھے کیے آگے کو ہوا۔ وہ متحیر تھا۔

"جی۔ جیسا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا، ہاشم کی میل ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے اور میں اس کی کاپی آپ کو دے چکا ہوں۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتی ہیں کہ ہاشم ہی اپنے بھائی کا دشمن تھا، میں نہیں۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

جب زمر نے ایک کاغذ جج صاحب کو اور ایک ہاشم کو پکڑایا تو ہاشم نے تیزی سے ناک پہ عینک لگائی اور اسے پڑھا۔ جواہرات اس کے کندھے سے جھک کر اسے پڑھ رہی تھی۔ سعدی اور زمر نے مسکراتی نظروں کا تبادلہ کیا۔ یوں لگتا تھا دفاع کی کرسیوں پہ کھلبلی سی مچ گئی ہو۔

"یہ تمہارا ہی لکھنے کا اسٹائل ہے۔ ای میل بھی درست لگ رہی ہے۔ فارنزک میں بھی درست ثابت ہوگی ورنہ زمر اس کو جمع نہ کرواتی۔ ہاشم یہ سب کیا ہے؟" جواہرات نے تلملا کر اسے گھورا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"یہ درست ہے، مگر یہ کسی نے بیک ڈیٹ میں جا کر اب بھیجی ہے، کوئی جس کو ان امور میں مہارت ہو اور..." چونک کر اس نے گردن موڑی۔ استغاثہ کی کرسیوں پہ پیچھے بیٹھی حنین کو دیکھا۔ وہ (جج صاحب سے نگاہ بچا کر) ہاتھ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر، ہتھیلی ہاشم کو دکھائی۔ "BINGO" ہاشم نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے شانے اچکا کر سامنے دیکھنے لگی۔

ہاشم گہری سانس لے کر سیدھا ہوا۔ "وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔" اس نے مدھم سرگوشی کی۔ "وہ کہہ رہا ہے کہ یہ سب میں نے انٹرویو میں کہا۔ یہ سچ ہے کہ وہ یہ سب انٹرویو میں کہہ چکا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ ایسا ہوا بھی تھا۔ **ٹیکنیکلی** یہ جھوٹ نہیں ہے اور وہ پکڑا نہیں جا سکتا۔ لعنت ہے!"

"تو اس نے انٹرویو دنیا کو ایموشنل کرنے کے لیے نہیں دیا تھا؟ بلکہ عدالت میں اپنے الفاظ کی ہیرا پھیری کرنے کے لیے دیا تھا!"

"میں نے ایک دفعہ بھی اس کا انٹرویو نہیں سنا۔ ڈیم اٹ!" ہاشم کاغذ لے کر اٹھا۔

"یور آنر! یہ ای میل خود ساختہ ہے، میں نے ایسی کوئی میل سعدی کو نہیں کی۔"

"ریئلی ہاشم؟ کیا تم پروو کر سکتے ہو؟" زمر نے سادگی سے آنکھیں جھپکائیں۔ ہاشم گہری سانس لے کر واپس بیٹھ گیا۔ ایک تیز نظر سعدی پہ ڈالی۔ اس نے بھی مسکرا کر کندھے اچکائے تھے۔

زمر واپس سعدی کی طرف گھومی۔ استغاثہ کے بینچ

میں واضح تبدیلی آتی دکھائی دی تھی۔ مسکراہٹیں بڑھ چکی تھیں۔ آرام دہ ماحول بن چکا تھا۔ زمر نے اگلا سوال پوچھنے سے پہلے غیرارادی طور پہ انگلی میں پہنی انگوٹھی کو گھما کر پیچھے دھکیلا۔ اس کا نیلا ہیرے جیسا چمکتا نگینہ ڈھیروں روشنیاں بکھیرنے لگا۔ ایسی خوب صورت روشنیاں کہ اگر تم ان میں دیکھنے لگو تو تمہاری آنکھیں چندھیا جائیں اور پھر تم کچھ اور نہ دیکھ سکو.... ہیروں جیسی روشنیاں....

☼ ☼ ☼

دو ماہ پہلے

اور جب یہ روشنیاں چھٹیں تو سامنے ایک خوب صورت وادی تھی۔

سبز پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی نیلی سڑک کسی آبشار کی طرح اونچائی سے نیچے گر رہی تھی۔ سڑک پہ چہل قدمی کرتے سیاح' دکانوں کا رش' اپنا اپنا سامان بیچتے خوانچہ فروش' اوپر تیرتے بادل' ان سب سے بے نیاز وہ دونوں سڑک کنارے چلتے اوپر سے نیچے آرہے تھے۔ فارس نے اپنی بھوری جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے' سر پہ پی کیپ تھی' اور زمر سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بال ڈھیلے جوڑے میں باندھے' گردن جھکائے قدم قدم نیچے اتر رہی تھی۔ دفعتاً" اس نے سر اٹھایا اور کچھ اداسی سے بائیں طرف چلتے فارس کو دیکھا۔

"ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ بلکہ میں ادھر کیا کر رہی ہوں؟ مجھے تو اس وقت کورٹ میں ہونا چاہیے تھا۔"

فارس کے چہرے پہ خفگی ابھری۔ کیپ والا سر موڑ کر اور آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کم از کم ان تین چار دنوں میں ہم نوشیرواں کے ٹرائل کی بات نہیں کریں گے۔"

"میں اس ٹرائل کی بات نہیں کر رہی۔ کل اس کی پیشی تھی اور نہ ہاشم گیا نہ میں۔ میں اپنے کورٹ کیسز کی بات کر رہی ہوں۔ میں ایسے ہی ادھر آگئی۔

میرا اتنا کام پڑا تھا پیچھے۔" اس نے سر کو ذرا جھٹک کر گال کو چھوتی گھونگھریالی لٹ پرے ہٹانی چاہی۔ (گرم جیبوں سے ہاتھ نہیں نکالے۔) لٹ کان تک گئی اور پھسل کر واپس گال پہ آگئی۔

"جی ہاں۔ جانتا ہوں۔ پتا ہے مجھے آپ وکیل کیا کیا کرتے ہیں۔ لمبی لمبی فیسیں لے کر تاریخ پہ تاریخ دیتے جاتے ہیں۔ آپ کی چند دن کی غیر حاضری سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ویسے بھی عدالت میں جا کر آپ نے جھوٹ ہی بولنا ہوگا۔ اچھا ہے نا' چند دن آپ کے اس بائیں کاندھے والے نگہبان کو ریسٹ ملے گا۔"

"ہاں! ہاں! تم تو جیسے جیل میں نعتیں پڑھتے تھے۔ لنگر بٹوایا کرتے تھے۔" وہ مسکرا کر مگر تندہی سے بولی تھی۔

فارس نے جیبوں سے ہاتھ نکال کر جیکٹ کا کالر جھٹکا۔

"سوشل ورک کرتا تھا میں۔"

"ہاں' کسی کی پسلی توڑی تو کسی کا جبڑا۔ سوشل ورک رائٹ۔"

"استغفراللہ۔ کیوں میری مقبولیت سے جلتی ہیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ٹھنڈی سی سرمئی سڑک کے ارد گرد پھیلے سرسبز پہاڑوں سے قطعاً" بے نیاز وہ دونوں چلتے جارہے تھے۔

"جیل میں لوگ مجھے پسند کرتے تھے۔"

"غلط! تم سے ڈرتے تھے۔"

"کچہری میں لوگ آپ سے نہیں ڈرتے کیا؟"

"میری عزت کرتے ہیں۔"

"جی ہاں' بڑی عزت سے آپ کو چڑیل کہتے ہیں۔"

"فارس غازی!" وہ خفگی سے ایک دم گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ فارس کے قدم رک گئے۔ مسکراہٹ دبا کر اس کے چہرے کو دیکھا جو برہمی سے تمتمانے لگا تھا۔

"ہم تین دن کی بریک پہ آئے ہیں اور تم اس طرح

کی باتوں سے باز نہیں آرہے جو مجھے غصہ دلاتی ہیں۔"

"آپ کو کون سی باتیں غصہ نہیں دلاتیں؟" اس نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"وعدہ کرو مجھ سے کہ کم از کم ان تین دنوں میں اب تم کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کرو گے۔۔۔۔۔۔۔"

فارس نے تابعداری سے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"رئیلی سوری۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ ہمارا یہ سفر خوش گوار رہے۔ اس لیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان تین دنوں میں۔۔۔ کوئی سچ نہیں بولوں گا۔"

اسے پھر سے غصہ آیا مگر ہنس دی اور سر جھٹک کر واپس چلنے لگی۔ وہ بھی مسکرا کر نیچے اترنے لگا۔ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ کندھے سے کندھا' کہنی سے کہنی۔ برابر۔ ہم قدم۔

رش بڑھ رہا تھا۔ وہ جس گلی میں اتر آئے تھے وہاں دونوں اطراف میں دکانیں تھیں۔ لوگوں کا شور' گھما گھمی عروج پہ تھی۔ کہیں سے پکوڑوں اور باربی کیو کی مہک بھی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ زمر نے شاپس کی قطار کو دیکھ کر کہا۔

"ویسے تم نے مجھے کبھی کوئی گفٹ نہیں دیا۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ فارس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اور وہ' جسے آپ میرے تیسرے سسر کے حوالے کر آئی تھیں' وہ کیا تھا؟"

"ونہوں!" زمر نے ناک سکیڑی۔ "تب میں تمہاری بیوی نہیں تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اب مجھے کچھ لے کر دو۔ ڈھیر سارے پیسے خرچ کر کے ایک قیمتی سا گفٹ۔"

"معفت کی تو وہ لونگ بھی نہیں تھی۔ اس میں solitaire ڈائمنڈ تھا۔ پتا ہے کتنے کا آتا ہے؟" وہ جل کر بولا تھا۔

"اف فارس!" اس نے شدید خفگی سے اسے دیکھا۔ دونوں وادی کے بازار کے بیچ میں سڑک پہ آمنے سامنے رک گئے تھے۔

"آپ کیا تحفے کی قیمت بتاؤ گے؟"

"دل بھی دکھا سکتا ہوں۔"

"کتنے کنجوس ہو۔ ایک تحفہ تک نہیں لے سکتے میرے لیے۔ پہلی بیوی کو تو بہت تحفے دیتے تھے۔ ساڑھیاں' ہینڈبیگز۔"

"اس کو شوق تھا۔"

زمر نے پلکیں جھپکا کر کھولیں۔ "مجھے نہیں ہے کیا؟"

"تمہیں؟" فارس ہنسا اور ناک سے مکھی اڑائی۔ "تمہیں ساڑھیاں اور ہینڈبیگز کون دے۔ تمہارے لیے سب سے بڑا تحفہ پتا ہے کیا ہوگا؟ کسی وکیل کے کمپیوٹر کا ڈیٹا چرا کر دے دو تاکہ تم اسے بلیک میل کر سکو۔ کسی کے غیر قانونی پلاٹ پر قبضے کے خلاف ثبوت اکٹھے کر کے دو' تاکہ تم اس کو جیل بھیج دو۔ تمہیں میں اس طرح کے بہت سے تحفے دے سکتا ہوں۔ چلو بتاؤ شروع کہاں سے کریں؟"

زمر نے خفگی سے اس کے بازو پر مکا مارا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے پیچھے آیا۔ "یار میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔" پھر رکا۔ آنکھوں میں چمک اتری۔ ہلکا سا مسکرایا۔ "بلکہ میرے پاس پیسے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے "تمہیرے پیسے۔"

"واٹ ایور۔ تم بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟" اس کے انداز پہ وہ رکی' گردن گھما کر ابرو اٹھا کر اسے سوالیہ انداز میں دیکھا۔ فارس نے سر کو خم دیا۔

"مجھے؟"

"مجھے ڈائمنڈز چاہئیں۔ بہت خوب صورت اور قیمتی ڈائمنڈز۔ بلکہ ادھر مارکیٹ میں آگے جا کر بہت اچھے اچھے جیولرز ہیں۔ چلو میرے ساتھ اور مجھے کچھ لے کر دو میں بہت خوش ہوں گی۔"

"جو حکم!" وہ گہری سانس لے کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ (یہ خوش ہو لیں' اگلا بندہ چاہے کنگال ہو جائے۔ ڈائمنڈز چاہئیں۔ ہونہہ۔) چہرے کے زاویے بگڑے بگڑے سے تھے۔

چند ثانیے دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ مختلف

بولیاں اور شور سنتے رہے۔ پھر وہ بولا۔ "ویسے تم نے اُس سب سے پہلے کبھی میرے بارے میں سوچا تھا؟ برسوں پہلے۔"

"ان باتوں کا اب کیا فائدہ فارس؟"

"بتاؤ نا!" وہ مصر تھا۔ پھر ایک دم سمجھنے والے انداز میں بولا۔ "ویسے میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ یاد کرنا مشکل ہوگا کیونکہ تم فطرتاً" ایک انتہائی خود غرض، سیلف سینٹرڈ خود پرست لڑکی واقع ہوئی ہو لیکن پھر بھی۔ کبھی موقع ملا کسی دوسرے انسان کے بارے میں سوچنے کا؟"

زمر چپ رہی۔ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے چلتی رہی۔

"تم مجھے برے کبھی نہیں لگے۔ بلکہ میں تمہاری بہت عزت کرتی تھی۔ ہمیشہ تمہیں ہاشم سے کمپیئر کرتی تھی۔ تمہاری سب کے سامنے تعریف کرتی تھی۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہارا میرے لیے پرپوزل آیا ہے تو میں کبھی انکار نہ کرتی اور سوچنے کے لیے ایک دن سے زیادہ وقت نہ لیتی۔"

"اچھا!" وہ مسکرایا۔ "مجھے نہیں پتا تھا تم شروع سے مجھ سے محبت کرتی تھیں۔"

"ایک منٹ۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ غصہ ہوئی۔

"مجھے تو صرف یہی سنائی دیا ہے۔"

وہ اور بھی بہت کچھ کہنے لگا، پھر رک کر ساتھ چلتے ایک ریڑھی بان کی ریڑھی کو دیکھنے لگا۔ اس پہ رنگ برنگی ڈھیروں چیزیں رکھی تھیں۔ کلپ، پنیں، جیولری۔ زمر نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"تمہیں اچھی لگی یہ فارس؟" زمر نے دیکھا وہ ایک انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چونکا، پھر سنبھل کر مسکرایا۔ "نہیں میں اس لیے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اور میں مذاق کر رہا تھا۔ میرے پاس ہیں پیسے۔ میں تمہیں کسی اچھی سی جیولری شاپ سے قیمتی ڈائمنڈز لے دوں گا۔ چلو۔"

مگر وہ نہیں ہلی۔ آگے بڑھ کر ریڑھی سے پلاسٹک کی پنی میں لپٹی انگوٹھی اٹھائی اور الٹ پلٹ کر دیکھی۔ پھر فارس کو دیکھا۔ "تم مجھے یہی لے دو۔"

"مذاق اڑا رہی ہو کیا؟" وہ دبی آواز میں خفگی سے بولا۔

"اونہوں۔" وہ طمانیت سے مسکرائی۔ "مجھے قیمتی زیور چاہیے تھا۔ مہنگا نہیں۔ اتنا تو پڑھ سکتی ہوں تمہیں کہ معلوم ہو جائے یہ اچھی لگی ہے تمہیں۔ تحفوں کی قیمت نہیں دیکھی جاتی، ان کے ساتھ جڑی فیلنگز دیکھی جاتی ہیں۔ فرمائش ہمیشہ قیمتی چیز کی کرنی چاہیے، ضروری نہیں ہے کہ وہ مہنگی بھی ہو۔" اس نے انگوٹھی فارس کی طرف بڑھائی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر والٹ نکال کر ریڑھی بان کو ادائیگی کرنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ دونوں وہیں ٹھیلوں اور اسٹالز کے ساتھ کھڑے تھے اور فارس وہ نیلے پتھر والی ہیروں کی سی چمک لیے انگوٹھی اسے پہنا رہا تھا جو دو سو پچاس روپے کی تھی۔ زمر نے اسے پہن کر ہاتھ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ سورج کی کرنیں نقلی ہیرے سے ٹکرانے پر اصلی روشنیاں پھوٹنے لگی تھیں۔ گویا ہر جگہ پہ روشنی چھا گئی ہو...... تیز نیلی روشنی......

جب وہ جھپکی تو انگوٹھی زمر کی انگلی میں تھی اور ہاتھ سے اوپر کلائی پہ سیاہ کوٹ کی آستین جھلک رہی تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھو تو وہ اس روشن سے کمرہ عدالت میں کٹہرے کے سامنے کھڑی تھی اور سعدی یوسف سے پوچھ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

آج:

"قید کے دوران آپ سے کون کون ملنے آتا تھا؟"

"ہاشم کاردار، جواہرات کاردار، کرنل خاور، جس کو بعد میں میرے ساتھ قید کر دیا گیا، اس کے علاوہ چند ایک بار آبدار عبید آئی تھیں۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بتاتا گیا۔ حاضرین میں بیٹھی آبدار سر جھکا کر موبائل دیکھنے لگی۔

"میں جانتی ہوں یہ آپ کے لیے تکلیف دہ ہوگا

سعدی! لیکن کیا آپ قید کے پہلے دن سے آخری دن تک کی داستان مختصراً یہاں سنانا چاہیں گے۔"

"جی بالکل یہ میرے لیے تکلیف دہ ہے۔" سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں۔ "مگر اپنی کہانی کا ان کہا یا ان سنا رہ جانا زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بہرحال' جیسا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا' مجھے سب سے پہلے ایک اسپتال لے جایا گیا' وہاں ایک دفعہ میں نے باتھ روم کے روشن دان کو....."

اور ہاشم نے تپ کر نفی میں سر جھٹکا تھا۔ "واہ۔ اب یہ انٹرویو کے نام پہ اپنی مرضی کی کہانی کاٹ چھانٹ کر سنائے گا۔"

سعدی کو دیکھو تو وہ کٹہرے پہ ہاتھ رکھے کھڑا کہانی سنا رہا تھا۔ اس کے لب ہل رہے تھے' مگر اسے خود کو اپنی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بھوری آنکھوں میں شعلے سے جل بجھ رہے تھے۔ ہر دفعہ پلکیں جھپکنے پہ نیا منظر ابھرتا اور ایسے تیزی سے ابھرتا کہ دیکھنے والا اندر ڈوب جائے..... دور اندر تک.....

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

مورچال میں زمر اور فارس کی غیر موجودگی نے عجیب ویرانی کر رکھی تھی۔ حنین کو نت نئے شوق چڑھ گئے تھے۔ ہر وقت گھر کے کسی کونے میں کھڑی ہوتی گردن اٹھائے تنقیدی نگاہوں سے در و دیوار کا جائزہ لیتی نظر آ رہی ہوتی۔ بلکہ نظر کہاں آتی تھی۔ وہ تو مصروف ہو گئی تھی۔ بیٹھ کر خاکے بناتی رہتی یا گھر کو سجانے اور بنانے کی ویب سائٹس دیکھتی رہتی۔ اب وہ لوگوں سے بات کم کرتی تھی' ان کے پیچھے کھڑی دیواریں زیادہ دیکھتی۔ یہاں ایسا فریم لگاؤں' یہاں ایسا تھری ڈی آرٹ ہونا چاہیے۔ یہاں وال مورل ہونا چاہیے۔ یہ وہ۔

ایسے میں سعدی اپنے کمرے میں یوں ہی اداس سا بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا تھا اور سامنے والے کمرے سے ندرت کی لتاڑنے' ڈانٹنے اور پھر رک کر سمجھانے کی آواز آ رہی تھی۔ مخاطب اسامہ تھا ۔۔۔۔ قد لمبا ہو گیا تھا' مگر سمجھ نہیں۔ ندرت کا موقف تھا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے سیدھا گھر آئے گا۔

"اور اگر تمہارا کوئی دوست کبھی گھر کے دروازے تک آیا نا تو میں نے جوتا اٹھا کر اسے مار مار کر وہیں گنجا کر دینا ہے۔ یہ گھروں تک لانے والی دوستیاں ذرا پسند نہیں مجھے۔" آگے سعدی کی مثالیں۔ اسامہ کو برا لگ رہا تھا۔ "میں کوئی برے لڑکوں سے دوستی تو نہیں کرتا اور سعدی بھائی کا زمانہ اور تھا۔ اور آپ مجھ پہ شک کیوں کرتی ہیں۔"

سعدی آرام سے اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ آوازوں کا راستہ رک گیا۔ جانتا تھا یہ مسئلے اگلے پانچ' چھ سال تک چلیں گے۔ بچوں کی آنکھوں پہ بندھی پٹی اترنے کے لیے کم از کم بھی بیس سال کی عمر کو پہنچنا ہوتا ہے۔ کھینچے تو چٹخے یا سوراخ چھیدنے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ بس دھیرے دھیرے پٹی ڈھیلی کرنی ہوتی ہے' بہت سی باتوں سے صرف نظر اور ڈھیر ساری توجہ۔ مگر ابھی وہ امی کو سمجھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی وہ خود سمجھنا چاہتا تھا۔ اپنا دماغ سوچوں سے خالی کرنا چاہتا تھا۔ کوئی روزن کھلے' کوئی روشنی آئے۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پہ آ بیٹھا۔ یہ اس کے چھوٹے پائیں باغیچے والے گھر سے مختلف اور زیادہ خوب صورت تھی' مگر اجنبی لگتی تھی۔ کونے میں چند کتابوں کے اوپر قرآن مجید رکھا تھا۔ سعدی نے اسے اٹھایا اور چند لمحے اس کتاب کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ وہ بھاری تھی' مگر دلوں کو ہلکا کر دیتی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے صفحے پلٹے۔

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی' دھتکارے ہوئے شیطان سے۔"

"اور کہا انہوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ جب ہو جائیں گے ہم مٹی اور ہمارے باپ دادا بھی تو کیا ہم (پھر قبروں سے) نکالے جائیں گے؟ بلاشبہ ہوتا رہا ہے ہم سے یہ وعدہ۔ ہم سے اور ہمارے باپ دادا سے اس

سے پہلے۔ نہیں ہیں یہ مگر پہلوں کی کہانیاں۔ کہہ دو کہ چلو پھرو زمین میں پھر دیکھو کہ کیا انجام ہوا مجرموں کا اور نہ غم کرنا ان پر اور نہ تنگی میں ہونا اس سے جو چالیں یہ چل رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کب ہوگا یہ وعدہ پورا اگر تم سچوں میں سے ہو۔ کہہ دو شاید کہ آپہنچا ہو نزدیک تمہارے کچھ اس میں سے' جس کی تم جلدی کررہے ہو۔"

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"اللہ تعالیٰ' میرا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے' بہت ویران ہے اور اب میں امید بھی کھوتا جارہا ہوں کہ کبھی مجھے بھی انصاف ملے گا کیا؟ دور اندر مجھے لگتا ہے کہ میں بھی تو گناہ گار ہوں۔ کسی پہ قتل کا الزام لگایا ہے' دو قتل بھی کیے ہیں۔ یہی تو ہاشم کے جرائم تھے۔ قتل کا الزام فارس پہ اور دو لوگوں کا قتل۔ گناہ ویسے ہی ہیں تو کیا گناہ گار بھی ویسا ہوں؟"

ہولے سے سر جھٹکا۔

"پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہوگا' لیکن کیا ان کے ساتھ بھی کچھ ہوگا یا نہیں؟ کیا مجھے انصاف ملے گا اللہ؟ مجھے قیامت والے حساب سے پہلے یہاں کا حساب چاہیے۔ تاکہ کوئی تو عبرت پکڑے۔ مگر اللہ تعالیٰ! جب انسان کے باپ دادا کو سزا نہیں ملتی' والدین کو ان کی سیاہ کاریوں کے باعث کوئی نہیں پکڑتا یا خود ہمارے ماضی میں ہمارے گناہوں پہ کوئی پکڑ نہیں ہوتی' تو ہمیں لگتا ہے وہ گناہ justified (صحیح) تھے۔ اللہ کو وہ برے نہیں لگے۔ ہم نئے گناہ کرتے جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ایسے فتوے اور ایسی تصحیحیں پہلے بھی سن رکھی ہیں مگر اللہ راضی ہے ہم سے۔ لیکن اللہ کی شریعت میں تبدیلی نہیں ہے نا۔ کہ ہر کسی کے لیے الگ الگ رخ پہ مڑ جائے۔ اصول تو برابر ہیں۔ سب کے لیے۔ پھر ہم اتنے لاپروا کیوں ہوتے جارہے ہیں؟ پھر وہ لوگ اتنے لاپروا کیوں ہیں؟"

اور پھر وہ چونکا۔

"لیکن اگر میں یہ سمجھوں کہ ان کو سزا نہیں ملے گی ان کے باپ دادا کی طرح تو یہ "کفر" ہے۔ امید چھوڑنا کفر ہے۔ تو پھر۔"

اس نے اچنبھے سے کلام مجید کے اوراق کو دیکھا۔

"کیا میں امید رکھوں؟ کیا میں زمین میں چل پھر کر دیکھوں؟ ان تمام کیسز کو دیکھوں جن کے فیصلے آئے تھے؟ ان تمام لوگوں کا انجام دیکھوں جو عدالتی حکم کے بغیر ہی قدرتی آفات کا شکار ہوئے تھے؟ تو کیا ہمیں کبھی امید نہیں چھوڑنی چاہیے؟ میں غم کو ترک کردوں' دل کی تنگی سے خود کو نکالوں اللہ؟ ان آیات پہ غور کرو تو میرے کرنے کا کوئی کام نہیں ہے' انصاف اور عذاب اللہ دے گا' مجھے بس وہ یہ کہتا ہے کہ غم نہ کرو۔ دل کی تنگی کا شکار نہ ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں امید لے جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی مدت شاید قریب ہو' بہت قریب۔ میں نے کچھ نہیں کرنا۔ صرف ترک غم کرنا ہے۔ یہ وسائل' پیسہ' تعلقات' عدالتی کارروائی کی جنگ نہیں ہے۔ یہ اعصاب کی جنگ ہے اور غم مجھے کھلا دے گا۔ مجھے اب غم نہیں کرنا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی بات ماننی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم' اپنی اپنی کشادگی کا انتظار کرتے ہم لوگ اپنے آپ کو غموں اور ڈپریشن سے نکالیں۔ مجھے اب غم نہیں کرنا۔ تب ہی حل نظر آئے گا۔" وہ بے خودی کے عالم میں بولتا جارہا تھا۔ لب ہل رہے تھے' آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے' مگر اپنی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

٭ ٭ ٭

آج

کٹہرے میں کھڑے سعدی نے بھوری آنکھیں زمر پہ جمائے گہرا سانس لیا۔ خواب سا ٹوٹا۔ وہ اب پوچھ رہی تھی۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں یہ بات انٹرویو میں بھی کہہ چکا ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ پھر مجھے کینڈی میں دوبارہ پکڑا گیا' مگر ہاشم کو اطلاع ابھی نہیں کی گئی تھی یا شاید وہ پہنچا نہیں تھا۔ اگلی صبح ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ چند دن بعد مجھے پاسپورٹ اور پیسے دے دیے

جائیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ مجھے پاسپورٹ دے دیا گیا اور مجھے جانے دیا گیا۔ غالباً" وہ لوگ ہاشم سے دغا کر رہے تھے۔ ہاشم کے اپنے پارٹنرز جیسے کہ ہارون عبید چاہتے تھے کہ میں آزاد ہو کر ہاشم کے خلاف بولوں۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کہا گیا تھا۔ میں پاکستان آ گیا اور یہاں آ کر اپنی ویڈیو ریلیز کر دی۔ اب چونکہ میں مشہور ہو گیا ہوں اس لیے یہ لوگ مجھے مار نہیں سکتے۔"

"آبجیکشن یور آنر!" ہاشم نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے بے زاری سے کہا۔ زمر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "دس بنیاد پہ؟ ویسے آپ اپنی باری کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟ گواہ کو کراس کرتے وقت سب پوچھ لیجیے گا۔"

ہاشم خاموش ہو گیا۔ زمر واپس مڑی۔

"کیا پاکستان واپس آنے کے بعد آپ سے ہاشم کاردار نے کسی قسم کا رابطہ کیا؟" سوالات، الفاظ، سب مدھم ہوتے گئے۔ کمرۂ عدالت میں گونجتی ساری باتیں گڈمڈ ہو کر عجیب سا منظر بنانے لگیں.... یوں کہ حرف حرف الگ ہو گیا اور نئے لفظ بننے لگے....

ہوٹل کے خوب صورت سے بیڈ روم کے بیج کلر کے پردے کھڑکیوں کے سامنے سے ہٹے تھے اور جالی وار سفید پردے شیشوں کے آگے لہرا رہے تھے۔ پردوں کی جالی نے منظر کو قدرے دھندلا دیا تھا۔ دھندلا سا دکھائی دیتا تھا کہ باہر بالکونی ہے اور نیچے دور تک پھیلے سبز پہاڑ اور ان کے بیچ بستی وادیاں۔ کھڑکی کے آگے دو آمنے سامنے رکھی کرسیاں پڑی تھیں۔ زمر اور فارس مقابل بیٹھے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز تھی جس پہ اسکریبل کا کالج کا بورڈ کھلا پڑا تھا۔ لکڑی کے ننھے ننھے چوکور ٹکڑوں پہ لکھے حروف ان دونوں کے سامنے اسٹینڈز پہ پڑے تھے۔ زمر ٹیک لگائے، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی، پیر جھلا رہی تھی۔ وہ آگے ہو کر بیٹھا، غور سے کبھی بورڈ کو دیکھتا کبھی اپنے پاس موجود حروف کو۔

"مان لو ہار۔ میں تمہیں شرمندہ نہیں کروں گی۔" زمر نے مسکراہٹ دبائے فیاضی سے کہا تھا۔ آگے کو جھکے فارس غازی نے محض ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا جب آپ سے ہار مانی جائے۔ مجھے سوچنے دیں۔"

"ویسے اتنے سال تم نے جیل میں سوشل ورک کرنے کے بجائے تعلیم کی طرف توجہ دی ہوتی تو پڑھی لکھی بیوی کے سامنے شرمندہ نہ ہو رہے ہوتے۔" وہ مسکرا کر پیر جھلا رہی تھی۔

"آپ مسلسل چیٹنگ کر کے جیت رہی ہیں، ہونہہ پڑھی لکھی۔" خفگی سے سر جھٹکا۔ پھر حروف کو دیکھنے لگا۔

"بیچ بیچ۔ ہر ہارنے والا یہی کہتا ہے۔"

فارس نے جواب دیے بنا چند حروف اٹھائے اور پہلے سے.... rise کے پیچھے لگا دیے۔ اب وہ یوں بن گیا zumarise (زمرائز)۔

"زمرائز" زمر ایک دم سیدھی ہوئی۔ "یہ کوئی لفظ نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں۔ یہ ایک لفظ ہے۔" وہ بتانے والی مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ اٹھا کر بولا۔ "اور اس کا مطلب ہوتا ہے، جھوٹ کو سچ کے پردے میں لپیٹ کر پیش کرنا۔ محتاط الفاظ کا چناؤ کر کے عدالت میں حلف دلوا کر گواہ سے جھوٹ بلوانا، مگر کہنا، ٹیکنیکلی یہ سچ ہے۔ ہر دوسری بات پہ کسی شریف انسان کو بلیک میل کرنا اور دھمکانا۔ باتوں کے ہیر پھیر سے اپنا مطلب نکالنا اور دھونس جمانا۔ یہ واقعی ایک لفظ ہے۔"

زمر اب آنکھیں تیکھی کر کے اسے گھور رہی تھی۔ "یہ چیٹنگ ہے۔"

"نہیں زمر بی بی! یہ ڈبل ورڈ اسکور ہے جو میرے کھاتے میں لکھا جائے گا۔" اب وہ قلم اٹھا کر نوٹ پیڈ پہ بنے کالمز میں سے ایک میں لکھ رہا تھا۔ زمر نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"فارس، یہ آخری دفعہ تھا، اب اگر تم نے کوئی لفظ بنایا جو ڈکشنری میں نہ ہوا تو تم ہار جاؤ گے۔"

"مجھے یقین ہے یہ ڈکشنری میں ہو گا۔ چیک کر لیں بے شک۔" ساتھ رکھی ویبز ڈکشنری کی طرف اشارہ کیا۔ زمر ناک سکیڑ کر آگے ہوئی اور اپنی پلیٹ میں لگے حروف پہ غور کرنے لگی۔ وہ مزے سے مسکراتا

ہوا' اسے دیکھ رہا تھا۔ گھنگریالے بال کھول کر چہرے کے ایک طرف ڈالے' اس کی پلکیں پلیٹ پہ جھکی تھیں اور بار بار حروف کو چھوتی انگلی میں انگوٹھی موجود تھی۔ اس نے چند حروف کو دیکھا جو بورڈ پہ سجے تھے اور پھر مسکرائی۔ ان کے درمیان چند حروف گھسا دیے اور فاتحانہ نظریں اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

"Farcissism" (فارسزم)

"یہ کوئی لفظ نہیں ہے' پراسیکیوٹر صاحبہ۔" اس کا موڈ خراب ہوا۔

"ہے نا۔" وہ ہتھیلی پہ ٹھوڑی گرائے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہوتا ہے ایک خاص قسم کا برتاؤ۔ اور جانتے ہو' ایسا برتاؤ کرنے والا کون ہوتا ہے؟ انتہائی اکھڑ' ریزرو' کسی پہ اعتبار نہ کرنے والا' غصیلا' بدمزاج' ہر بات چھپا کر رکھنے والا' اداکار۔۔۔"

"اور گڈلکنگ!" اس نے لقمہ دیا۔

"اور گڈلکنگ اور ہر وقت لڑنے کو تیار' گہرے راز رکھنے والا' خود کو عقل کل سمجھنے والا' آرسونسٹ' جیل یافتہ' بلیک میلر۔۔۔ یہ سب ہوتا ہے اس کا مطلب۔" وہ انگلیوں پہ گنواتی گئی۔

"استغفراللہ۔ میں آپ کو ایک شائستہ اور ٹھنڈے مزاج کی خاتون سمجھتا تھا۔" وہ افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لفظ بناؤ' غازی۔ باتیں نہ بناؤ!" اس نے چیلنج کیا۔

وہ سر جھٹک کر اگلا لفظ بنانے لگا۔ m سے اس نے mat بنایا تھا۔ زمر کی نظریں ابھی تک زمرائز کے "زی" پہ تھیں جس کے نیچے ڈبل ورڈ اسکور کا خانہ تھا اور ذرا پیچھے ٹرپل ورڈ اسکور۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے چوکور ٹکڑے بورڈ پہ رکھے۔ زی کے اوپر نیچے حروف سجائے۔

Ghazi (غازی)

"یہ چیٹنگ ہے۔ یہ لفظ ڈکشنری میں نہیں ہے اور یہ اصول تھا کہ ہم نام نہیں بنائیں گے۔"

"دنیا تمہارے نام کے گرد نہیں گھومتی۔ یہ ڈکشنری میں ہے۔" وہ گردن اکڑا کر بولی تھی۔

"زمر بی بی اگر یہ ڈکشنری میں نہ نکلا تو؟" اس نے ڈکشنری پہ ہاتھ رکھا۔ زمر نے جھٹ اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

"اگر یہ نہ نکلا تو میں ہار جاؤں گی' تم جیت جاؤ گے۔ نکل آیا تو میں جیت جاؤں گی اور تم ہار دو گے۔" فارس کے ہاتھ پہ اس کا ہاتھ تھا اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یہ ڈکشنری میں نہیں ہے۔" وہ چبا چبا کر بولا کتاب کھینچی اور اسے کھولا۔ صفحے پلٹائے۔ انگلی دوڑاتا گیا۔ اوپر سے نیچے۔

"جی ایچ۔۔۔ جی ایچ۔۔۔" وہ مطلوبہ کالم تک آیا۔ لبوں پہ مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چونک کر سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ ادھر صفحے پہ لکھا غازی (مسلم وار ہیرو) اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"لکھا تھا نا' تھوڑا بہت پڑھ لیا ہوتا جیل میں تو آج کام آجاتا۔ خیر میں تمہیں شرمندہ نہیں کروں گی۔" وہ آگے کو جھکی اور بازو لمبا کر کے ہاتھ سے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔ فارس نے "اونہوں" اپنا چہرہ جھٹک کر پیچھے ہٹایا۔ ماتھے پہ خفگی سے بل پڑ گئے تھے۔

"آپ مسلسل چیٹنگ کر کے جیتی ہیں۔ ہر دوسری باری پہ آپ مجھے اسکریبل کا نیا اصول بتاتی ہیں جو میرے باپ دادا نے بھی نہیں سنا۔ جب کہ میں پوری ایمان داری سے کھیلتا رہا ہوں۔"

"ہاں' ایک اس بات کا تو یقین ہے مجھے کہ اب تم میرے ساتھ پورے ایمان دار ہو۔ اور یہ بھی کہ کم از کم اب تم مجھ سے کوئی بات چھپا نہیں رہے۔" وہ مسکرا کر سارے ٹکڑے بورڈ سے اٹھا رہی تھی۔ حروف بکھر گئے۔ الفاظ ٹوٹ گئے۔

فارس بالکل سُن سا بیٹھا رہا۔ اندر تک اس کا وجود ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی انسان برف کے صحرا میں ٹھنڈ سے مرجائے۔ سفید۔۔۔ نیلا۔۔۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

لمحے بھر میں وہ پیچھے چلا گیا۔۔۔
وہ ڈاکٹر قاسم کے کلینک میں بیٹھا تھا۔۔۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔
"مگر میں۔۔۔ برا آدمی نہیں ہوں۔"
فارس اٹھنے لگا۔ "میں اب چلتا ہوں' مگر یاد رکھیے گا کہ زمر سے آپ وہی کہیں گے جو میں نے آپ کو سمجھایا ہے' ورنہ میرا انسان بھی آپ کو کسی بھی وقت نشانہ بنا سکتا ہے۔" وہ موبائل جیب میں ڈالتا ہوا کھڑا ہوا۔
"کیا آپ جانتے ہیں فارس غازی کہ اس ملک میں بلکہ اس دنیا میں ہر سال ہزاروں عورتوں کو جبرا" seterlize (بانجھ) کیا جاتا ہے؟"
وہ بالکل ٹھہر گیا تھا۔ بہت سے چکرا لٹے ہوئے تھے۔ "سوری؟"
"امریکی کی جیلیں ہوں یا پاکستان کے اسپتال یا دیہات میں لگے فری کیمپ' یہاں زخم کسی اور شے میں ہوتا ہے اور سرجری کے بہانے اس عورت کو seterlize (بانجھ) کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں کہا جاتا ہے کہ آپریشن کے دوران یہ ناگزیر تھا۔ بعض عورتوں کے رشتے دار بھی یہ کام کرواتے ہیں۔ صرف ایک ڈاکٹر ڈھونڈ کے اسے پیسے دو اور یہ ہو جاتا ہے۔"
وہ بالکل سن رہ گیا تھا۔ "کاردار نے پیسے دیے تھے اس کی غلط سرجری کرنے کے لیے؟ وہ ان گولیوں کی وجہ سے ایسی نہیں ہوئی تھی' بلکہ' اس کو بعد میں یہ نقصان پہنچایا گیا تھا۔" وہ سفید پڑ رہا تھا۔ متحیر' بے یقین۔
"مسز کاردار چاہتی تھیں کہ وہ شادی نہ کر سکے تاکہ وہ ایک مضبوط گواہ کے طور پہ آپ کو جیل بھیج دے۔ اس کے گردے واقعی گولیوں کی وجہ سے خراب ہوئے تھے' مگر اس سرجری کے لیے ڈاکٹرز کے پینل کو مسز کاردار نے خریدا۔ اس کے بعد بھی مسز زمر صرف ان ڈاکٹرز کے پاس گئیں جن کی طرف ہم ان کو ریفر کرتے تھے۔ مسز کاردار چاہتی تھیں کہ ہم ان کو بالکل تباہ کر کے۔۔۔"
ڈاکٹر قاسم اپنی بات مکمل نہیں کر سکے تھے۔ وہ کسی بھوکے شیر کی طرح ان پہ جھپٹا تھا۔ گریبان سے پکڑ کر زمین پہ گرایا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ دھند سی چھا گئی۔ وہ دیوانہ وار اس کو مار رہا تھا' پیٹ رہا تھا' اس کا کتنا خون نکلا' کون سی ہڈی ٹوٹی' کتنے دانت خون میں لتھڑ کر باہر گرے' اسے کچھ ہوش نہیں تھا' مگر اس سرخ دھند میں اس نے اس کی دبی دبی سی کراہ سنی۔
"میری پوری بات سنو' مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ میری بھی ایک بیٹی ہے۔ میں نے صرف رپورٹس میں ادل بدل کیا تھا۔ مسز کاردار کو نہیں معلوم۔ کسی کو نہیں معلوم' مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔" وہ خون آلود منہ اور اکھڑی سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اب یہ بات کھل جائے گی۔ وہ ٹھیک ہے۔ وہ ماں بن سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔ مشکل سے ہوگا۔ اس کے گردوں کی وجہ سے کافی مشکل ہوگا' مگر ممکن ہے۔ بہت زیادہ ممکن ہے۔ میں نے صرف رپورٹس اور دوائیاں بدلی تھیں' اور۔۔۔"
وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کے سفید سوئیٹر پہ خون لگ گیا تھا۔۔۔ سرخ تازہ خون۔۔۔
فارس نے زمر کو دیکھا جو اسکریبل کے نئے ٹکڑے سجا رہی تھی اس کے جھکے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتے گئے۔ جڑ جڑ کر ٹوٹتے گئے۔۔۔

☼ ☼ ☼

آج

"سعدی یوسف! کیا آپ کی ہاشم کاردار سے پاکستان آنے کے بعد اپنے وکلا کی غیر موجودگی میں کوئی ملاقات ہوئی ہے؟" زمر اس سے پوچھ رہی تھی۔
کٹہرے میں کھڑے سعدی نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے ہاشم کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔
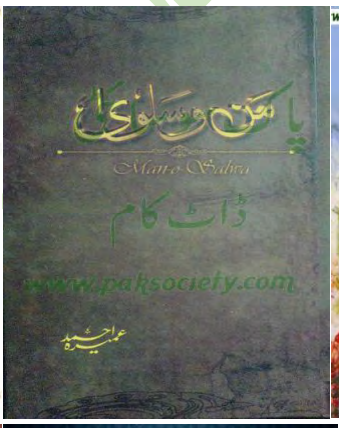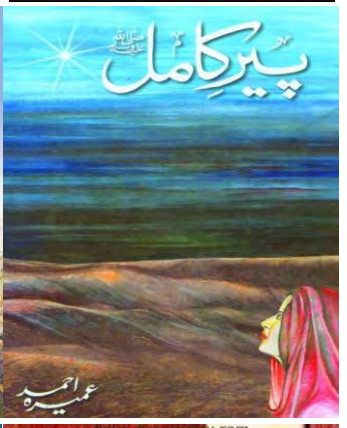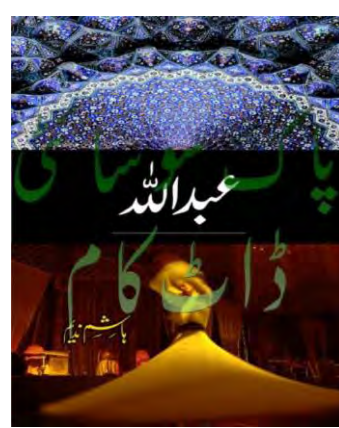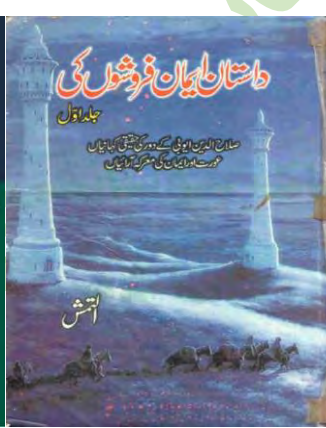
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

پرانے دنوں کے بہت سے سائے لہرا گئے۔ ”تو۔۔۔“

”مجھے یاد نہیں۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ہاشم ہلکے سے مسکرایا۔ بس ایک ثانیے کو اس نے آنکھیں بند کیں تو اندھیرا چھا گیا۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ پہلے

نیم اندھیرے کلب میں لاؤنج کی طرح جگہ بنی تھی۔ مدھم رنگ برنگی بتیاں سارے میں محو رقص تھیں۔ کچھ بھی صاف نظر نہ آتا تھا۔ بڑے صوفے پہ ارد گرد کھاتے پیتے ٹہلتے لوگوں سے بے نیاز ہاشم کاردار ڈنر جیکٹ میں ملبوس، موبائل پہ بٹن دبا رہا تھا۔ ٹائی ندارد۔ کالر کا اوپری بٹن کھلا تھا۔ وہ آرام دہ سا بیٹھا تھا۔ پس منظر میں بجتی موسیقی اعصاب کو سکون دے رہی تھی۔ ایسے میں کوئی اس کے ساتھ آکر بیٹھا تھا۔ وہ اپنی اسکرین کو دیکھتا رہا۔ ہلا تک نہیں۔ نظر بھی نہیں اٹھائی۔ بس اسکرین پہ انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

”قانوناً“ تم اپنے وکلا کی غیر موجودگی میں مجھ سے نہیں مل سکتے۔ تم سے کورٹ میں اس بارے میں پوچھا جا سکتا ہے۔ سعدی یوسف!“

”میں یہاں سے گزر رہا تھا تو ادھر آگیا۔ اور اب یہاں ایک پبلک پلیس میں بیٹھا ہوں۔ اتفاق سے تم میرے ساتھ بیٹھے ہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہوا؟“

ہاشم نے اب کے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔ سعدی ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، سیاہ آدھی آستین کی ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر ہاشم کو دیکھا۔ ہلکا سا مسکرایا۔

وہ آنکھیں اندر تک زخمی تھیں، مگر لگتا تھا ان زخموں پر کھرنڈ آنے لگے ہیں۔

”کہو۔ کیا چاہتے ہو؟“ ہاشم نے فون رکھ دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کبھی سوچا تھا تم نے ہاشم! کولمبو کے اس تہہ خانے میں جب ہم ملتے تھے، کبھی وہاں بیٹھے سوچا تھا کہ ایک روز ہم یوں بھی ملیں گے؟“

”اگر تو تم مجھ سے کوئی اعتراف جرم کروانا چاہتے ہو“

”وہ میں کروا چکا ہوں۔ وہی دکھانے آیا ہوں۔ میں تمہارے آفس 21 مئی کو اسی لیے آیا تھا۔“ اس نے موبائل اسکرین پہ ویڈیو پلے کی اور موبائل ہاشم کو دے دیا۔ اندھیرے کمرے میں اتنے رش اور شور کے باوجود بھی وہ اس ویڈیو میں چلتی آواز صاف سن سکتا تھا۔ اسکرین پہ وہ پاور سیٹ پہ بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ بولے جا رہا تھا۔ بہت سے اعتراف جرم۔ HD کوالٹی ویڈیو۔ صاف آواز۔

ہاشم کاردار کی گردن پہ پسینہ آنے لگا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ٹائی ڈھیلی کرنے کو گریبان تک ہاتھ لے کر گیا، مگر ٹائی تو گردن کو کسے ہی نہیں ہوئے تھی۔ پھر؟

”تم اسے کورٹ میں استعمال نہیں کر سکتے۔“ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ سونی کی آنکھیں نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔

”مگر میں اسے یوٹیوب پہ لیک تو کر سکتا ہوں۔ ایڈٹ کر کے۔ دیکھو نا، تمہارا اعتراف جرم کتنا دلچسپ ہے۔ مزے دار اور سنسنی خیز۔ میڈیا کتنے ہی دن اس کو چلائے گا۔“ وہ اب مزے سے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

”اور پھر میں اس ویڈیو کو سونیا کے ٹیب پہ اپ لوڈ کر دوں گا۔ تم وہاں سے مٹاؤ گے تو میں سونیا کے ہر کلاس فیلو کے فونز اور ٹیب پہ اسے بھیج دوں گا۔ میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ تمہاری بیٹی اس ویڈیو کو دیکھ لے۔ اس کو زبانی رٹ لے۔ وہ اس ویڈیو کے ساتھ بڑی ہو گی۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلی جائے، یہ ویڈیو اسے ڈھونڈ لے گی۔ وہ اس سے کبھی بھاگ نہیں سکے گی۔ اور وہ جتنی دفعہ اسے دیکھے گی، تم پہ بے یقینی اور اس ویڈیو پہ یقین بڑھتا جائے گا۔ وہ اگلے دس سال تک اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گی۔“

وہ اس کے ساتھ بیٹھا، گردن موڑ کر اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سرد تھیں، مسکراہٹ بھی سرد تھی اور ہاشم کی رنگت زرد پڑ رہی تھی۔ وہ کوئلے جیسی رات میں سونے کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ تنفس تیز ہو گیا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہاری بیٹی کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کو ضائع کردوں گا۔ زبان دیتا ہوں۔ نہ عدالت میں استعمال کروں گا۔ نہ انٹرنیٹ پہ ڈالوں گا۔ تم میری اور سونیا کی ویڈیو ضائع کردو' جس میں میں نے اسے اغوا کیا تھا۔ آؤ ہم دونوں اپنے سب سے بڑے ثبوت گنوا کر نہتے اس میدان میں لڑتے ہیں۔ اپنی زبانوں' اپنے سچ اور جھوٹ کے ساتھ۔ تم اپنی دلیلیں دو' میں اپنی دوں گا۔ آؤ اس کیس کو ختم کرتے ہیں' مگر لڑکر۔ بھاگ کر نہیں۔"

ہاشم کتنی دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ کبھی بے چینی سے۔ کبھی ترحم سے۔

"مجھے تمہیں عدالت میں ذلیل کرنا ہوگا۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ "میں یہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک دفعہ تمہاری زندگی برباد کرچکا ہوں۔ دوبارہ نہیں کرنا چاہتا۔ تم شاید یقین نہ کرو' لیکن تم اب بھی مجھے سونی' شیرو' ممی اور آبی کی طرح ہی عزیز ہو۔" سعدی کے لبوں پہ زخمی سی مسکراہٹ گویا بلبلائی تھی۔

"عزت اور ذلت وکیلوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے' وہ چاہے تو سب ٹھیک ہوسکتا ہے' چاہے تو سب بگڑ سکتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رہنے دو عزت کو۔ اور تمہیں جو کرنا پڑے۔ تم کرو۔"

"مجھے ہر حد تک جانا ہوگا۔ سب سے پہلے تم گواہی کے لیے پیش ہوگے۔ میں ایک فقرے میں تمہیں تباہ کردوں گا۔ میں جیت جاؤں گا' سعدی! میں کیس سے نہیں ڈرتا۔"

"تمہیں جس حد تک جانا ہے' تم جاؤ۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے' مگر اس کیس کو لڑو۔ ایک اسپیڈی ٹرائل لڑو تاکہ چند ماہ میں فیصلہ آجائے۔ آر یا پار۔" اس کے لہجے میں عزم تھا۔ ہاشم اسے دیکھے گیا۔ پھر اس نے واپس منہ موڑ لیا۔ سامنے دیکھنے لگا۔

سعدی موبائل جیب میں ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا تم مجھے معاف کرسکتے ہو؟" سعدی یوسف کے قدم زنجیر ہوئے۔ اس نے چہرہ موڑا۔

"ہاشم!" وہ اداسی سے مسکرایا۔ "یہ کیس میں تمہارے خلاف نہیں لڑرہا۔ یہ میرے اور نوشیرواں کے درمیان ہے۔ اور وہ مجھ سے معافی مانگے بھی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ سی یو ان کورٹ!" وہ اب دور جارہا تھا۔ نیم اندھیرے میں وہ گم ہوگیا تھا۔

ہاشم کاردار نے موبائل اسکرین روشن کی۔ فوٹو گیلری کھولی۔ اس نوٹ کی تصویر نکالی جو اس نے چند دن پہلے لے کر محفوظ کرلی تھی۔ اس پہ لکھا نمبر زبانی از بر کیا اور پھر ٹوئٹر کھولا۔

"ہر حد!" اس نے تازہ ٹویٹ میں وہ نمبر "گڈ ایوننگ پاکستان!" لکھ کر آگے ڈالا اور ٹویٹ پبلک کردی۔ ابھی اس نے موبائل واپس رکھا ہی تھا کہ وہ تھرتھرایا۔ ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ بلاکڈ نمبر سے پیغام موصول ہوا تھا۔

"اپنے کمرے کی سنگھار میز کی سب سے نچلی دراز کھولو۔ سعدی یوسف کا پاسپورٹ.... مکمل پاسپورٹ تمہیں وہیں ملے گا۔"

ہاشم والٹ اور چابیاں اٹھا کر تیزی سے باہر کو لپکا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج

"مجھے یاد نہیں۔" سعدی یوسف ایک اور سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ سب حاضرین تماشائیوں کی طرح خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان میں حنین بھی تھی جو مسلسل دانت سے ناخن کتر رہی تھی۔ سوچتی نظریں زمر پہ تھیں جو سعدی سے سوال در سوال پوچھ رہی تھی۔

اس کی ناک کی لونگ سونے کی تھی اور پچھلی لونگ سے ذرا مختلف تھی' مگر ہیرا ہو بہو تھا۔ حنہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر آئی.... اور اسے یوں لگا گویا ارد گرد پھولوں کی پتیاں بکھر گئی ہوں' یہ خوشبو سی خوشبو تھی۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ پہلے

زمر اپنے کمرے سے نکلی تو جنین سامنے کھڑی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں لپیٹ کر گول مول باندھتی زمر نے چونک کر جنین کو دیکھا۔ مورچال میں صبح کی مخصوص گہما گہمی تھی۔ کچن سے سیم اور سعدی کی آوازیں آرہی تھیں مگر جنین یہاں کھڑی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"جنید کو خالی ڈبی کچن کے فرش پہ ملی تو اس نے پورا کچن چھان مارا۔ کچرے کی ٹوکری سے آپ کی لونگ ملی۔ سونا ذرا اکھل چکا تھا۔ سو میں آپ کے پیچھے...."
اس نے کمر پہ کیا ہاتھ سامنے کیا تو اس پہ سفید مخملیں ڈبی رکھی تھی۔ "اس کو جیولر کے پاس لے کر گئی۔ اس نے ڈائمنڈ کو نکال کر نئی لونگ میں جڑ دیا۔ یہ وہی لونگ ہے۔ اور وہ نہیں بھی ہے۔ اندر وہی ہے' مگر بیرونی سانچہ فرق ہے۔ احساس وہی ہے' مگر گلٹ اور بوجھ جیسی آلائشوں سے پاک ہے۔ میں نیا ڈائمنڈ نہیں لینا چاہتی تھی۔ کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا زمر!"

مسکرا کر اس نے وہ ہیرا پیش کیا۔ زمر کے ہاتھوں نے جوڑے کو چھوڑ دیا۔ بال پھسل کر نیچے بہتے گئے۔ وہ متحیر سی اس ڈبی کو کھول کر دیکھ رہی تھی....

ادھر کچن میں سیم سعدی سے ناخوشی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"آپ کو وہ ویڈیو ان کے خلاف استعمال کرنی چاہیے تھی۔"

"یہ میرا طریقہ ہے اسے استعمال کرنے کا ہاشم کے خلاف۔ یقین کرو سیم! ہم اس کو ویسے استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ ہر گیند کھیلنے والی نہیں ہوتی۔ کسی کسی گیند کو روکنا بھی ہوتا ہے۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

اسامہ مسکرا دیا۔

"انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔"

سعدی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "یہ کس کا ڈائیلاگ ہے۔"

"سلمان خان کا ہے بھائی!" اس نے برا سا منہ بنا کر بتایا تھا۔

وہ ان سب کی آوازوں سے بے نیاز اپنی سنگھار میز کے سامنے کھڑی اس لونگ کو اپنی مغرور ناک میں سجا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لبوں پہ مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور فارس باہر نکلا تو وہ اس کی طرف گھومی اور شانے اچکائے۔ فارس کی نظریں ٹھہر گئیں۔

"وہی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے چہرے سے ہی سب ظاہر تھا' وہ مبہوت ہوا تھا۔ گردن میں ڈوب کر ابھرتی گلٹی واضح نظر آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک چمک بھی اتری تھی جو شاید زمر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ محض تائید میں سر کو خم دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ان تاثرات کے لیے وہ جان بھی دے سکتی تھی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا۔ مسکرا کر وہ بال برش کرنے لگی تھی۔

* * *
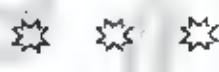
آج

"Your witness" (آپ کا گواہ) زمر کٹہرے کے سامنے سے نیچے اتر آئی تھی۔ دو لفظوں میں ہاشم کو اشارہ کیا۔ اب گواہ ہاشم کا کردار تھا۔ وہ جیسے چاہے اس کو کراس کرے۔ (جرح کرے۔)

ہاشم کوٹ کا بٹن بند کرتا' دو کاغذ ہاتھ میں لیے قدم قدم چلتا آگے آیا۔ سب ہنوز خاموش تھے۔ سب کی نظریں ہاشم پہ جمی تھیں۔ پرسکون کھڑے سعدی کی بھی۔

سامنے آکر ہاشم مسکرایا۔ دونوں پرنٹ آؤٹ سعدی یوسف کے سامنے لہرائے۔

"کیا آپ کمار نامی اس سنہالی باشندے کو جانتے ہیں؟ کیا آپ فصیح نامی اس پاکستانی باشندے کو جانتے ہیں سعدی یوسف؟ کیونکہ ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ کمار کو زہر کا ٹیکہ لگا کر اور فصیح کو گردن توڑ کر آپ نے قتل کیا ہے۔ کیا آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اپنے انٹرویو کا حوالہ دیے بغیر بتائیں گے کہ آپ ان دو لوگوں کے قاتل ہیں یا نہیں؟"

بہت سی سانسیں ایک ساتھ رکی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آسیہ رزاقی
بہار کی دستک

کرکٹ کا سیزن چل رہا تھا۔ ٹی وی پر پاکستان کا میچ تھا۔ گھر والے بڑے ذوق شوق سے دیکھ رہے تھے۔ آخری اوور تھا۔ جیتنے کے لیے بیٹس مین کو چھ رن درکار تھے۔ دوسری ٹیم کو ایک وکٹ۔ دو گیندیں خالی گئیں۔ سب نے سانس روک لیے۔ کیمرہ بار بار اسٹیڈیم میں بیٹھے پُرجوش لوگوں کو دکھا رہا تھا۔ لڑکے ہوٹنگ کر رہے تھے۔ لڑکیاں تالیاں بجا کر، گا نے گا کر اپنے بیٹس مین کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔

مومنہ کو اپنا نوجوانی کا زمانہ یاد آگیا۔ وہ بھی اسی طرح تالیاں بجا کر شور مچا کر کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔ اوور کی تیسری بال پر امپائر نے نو بال کا اشارہ دیا۔ جوش و خروش اور بڑھا۔ چوتھی بال پر ایک رن۔ اب ایک چوکے کی ضرورت تھی۔ چوکہ پانچویں بال پر چوکا لگا کر آخر کار... فتح ہوگئی۔ اسٹیڈیم شور سے گونج گیا۔

ایاز نے بھی نعرہ لگایا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ فراز صاحب کی طنزیہ نظریں مومنہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

"چل دیے صاحب زادے۔" منہ بنا کر بولے۔

"میچ کا تو بہانا تھا۔ اب جائیں گے اپنے لوفر دوستوں کے پاس، اسی لیے کالج سے چھٹی کی ہے۔ اپنے شہر میں میچ ہوتا تو اسٹیڈیم پہنچ جاتے۔ میچ دیکھنا تو ضروری بلکہ فرض تھا۔ تعلیم ضروری نہیں۔ آخر ماں کی طرف سے کوئی شوق تو ورثے میں ملنا تھا۔"

مکمل ناول

"جوانی میں سب کو شوق ہوتا ہے۔ کھیلنے کا بھی اور کھیل دیکھنے کا بھی۔ آپ بھی فٹ بال میچ ٹی وی پر رات بھر دیکھا کرتے ہیں۔" مومنہ کو ورثے میں ملنے والے شوق پر اعتراض تھا۔

"امریکہ میں دن ہوتا ہے، میچ دن میں ہوتے ہیں۔ یہاں رات ہوتی ہے اور میچ بھی کیا کانٹے کے ہوتے ہیں۔ کرکٹ کی طرح نہیں۔ ہونہہ جواری

سٹے باز کھلاڑی، ارے کوئی دین ایمان نہیں ان کا۔ سب کو لے کر بند کر دینا چاہیے جیل میں۔ جب چکی پیسنی پڑے گی تو مزا آئے گا۔"

"خیر اب ہر ملک میں تو شہ نہیں ہوتا اور شاید اب جیل میں چکی بھی نہ ہو۔ کم از کم کھلاڑیوں کو تو چکی کی سزا نہ ملے۔ وہ تو حسرت موہانی کو ملی تھی جب انہوں نے کہا تھا۔ اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

۔پہلا مصرع آپ بتائیے۔"

"بات نہ ٹالو بیٹے کی آوارگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش فضول ہے۔ صاحب زادے کو گھر کی فکر نہ گھر والوں کی بس آوارہ دوست' بے حسی کی انتہا ہے۔ اور آج کی بے سبب' بلا جواز چھٹی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جب فائنل کے امتحان میں بیٹھیں گے صاحب زادے۔"

"کرلے گا محنت' رات دیر تک پڑھتا ہے۔ کبھی کسی کلاس میں فیل نہیں ہوا۔ احساس ہے اسے۔"

"خاک احساس ہے۔ بے فکرے لونڈوں سے دوستی ہے۔ کبھی کوئی ٹورنا منٹ ہو رہا ہے۔ تو کبھی ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ یہ تو ان کے شوق ہیں۔ کبھی اتفاق سے کتاب کھول لی۔ تو بڑا ہم پر احسان کیا۔ میں کہتا ہوں۔ ہوش کرو' ابھی سے ان کے یہ پچھن ہیں۔ آگے ہمارے سفید سروں پر راکھ ڈالیں گے۔ کبھی سنا کہ عامر' یاسر یہاں وہاں سیر تفریح کو جا رہے ہیں۔ ان کے تو شوق ہی ختم نہیں ہوتے۔ کبھی کاغان' کبھی سوات' کبھی ہنزہ' کبھی نتھیا گلی' باپ کا پیسہ اڑانے میں حاتم طائی بن جاتے ہیں۔"

"وہ ہر جگہ کالج کے ساتھ ٹور پر جاتا ہے۔ کبھی تحقیقاتی دورہ ہوتا ہے کبھی۔" مومنہ کو ان کے "پیسے اڑانے میں "حاتم طائی" کے حوالے پر زور کی ہنسی آرہی تھی۔ ضبط مشکل سے ہوا جملہ پورا نہ ہوا۔

"ہم نے تو کبھی کالج کا منہ نہیں دیکھا شاید یا ہوا میں ہی تعلیم حاصل کرلی۔ واہ آخر کون سا نرالا کالج ہے جو ہر تین چار ماہ بعد تحقیقاتی دورے کراتا ہے۔ وہ بھی پہاڑی فرحت افزا مقامات پر۔" جھلا گئے۔

"کیوں؟ پچھلے سال رحیم خان۔ فیصل آباد بھی تو گئے تھے۔ مشینری کے سلسلے میں۔" مومنہ نے یاد دلایا

"بس۔ تم صفائیاں ہی دیتی رہنا۔ ان سے نہ پوچھنا کہ حضور ارادے کیا ہیں۔ نہ جی 'وہ ٹھہرے ولی عہد بہادر' سر جھکانا پڑتا ہے ان کے سامنے۔ ہمت ہے نہ جرات سوال کرنے کی۔"

مومنہ زچ ہو گئیں' فراز صاحب جب بھی بھائی جان کے گھر جاتے یا بھابھی یہاں آتیں۔ فراز صاحب کے منہ میں اپنی زبان ڈال جاتیں۔ اور وہ پھر بیٹے کے شوق اور بے حسی کو یاد کر کر کے جھلایا کرتے۔

مومنہ نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا تھا کہ ان کے بیٹے کیا پڑھ رہے ہیں۔ کہاں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے کیا مشاغل ہیں۔ مگر بھابھی کو خصوصا" دلچسپی تھی۔ ایاز اور عائشہ کیا کرتے ہیں کون دوست ہے کس سے ملتے ہیں۔ وہ خود ہی اپنی معلومات کے مطابق اطلاع بھی دیتی رہتی تھیں۔ ایاز آج فلاں جگہ دیکھا گیا ہے۔ وہ کچھ مشکوک حلیے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا پایا گیا۔ نہ جانے ان کو یہ خبریں کہاں سے ملتی تھیں۔ ان خبروں کے ذرائع کون سے تھے۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھیں کہ انہیں کدھر سے اطلاعات ملتی ہیں۔ لیکن وہ اس کا موقع بھی نہیں آنے دیتی تھیں۔

مومنہ نے کئی بار ان کی غلط بیانی کہہ کر مکر جانے کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے پیارے دیور کو سنا کر جاتی تھیں۔ اس طرح کہ مومنہ کو بھنک بھی نہ پڑے۔ فراز ہی راز اگل دیتے۔ وہ ان کو جھٹلانا نہیں چاہتی تھیں۔ فراز پر بھابھی کا بہت اثر تھا۔ اور انہیں ان کی سچائی کا یقین تھا شاید کوئی ماں بھی اپنی اولاد پر نکتہ چینی اعتراض یا الزام پسند نہیں کرتی۔ مومنہ بھی ماں تھیں مگر انہیں صفائی کا حق تھا نہ احتجاج کا' وہ طبعا" بہت نیک اور امن پسند تھیں۔ فراز خود بھی نیک شریف تھے۔ مگر بھابھی کی خیر خواہی پر بھی یقین رکھتے تھے۔ اگر کوئی تجزیہ کرتا تو فراز کو ان کی نوجوانی کا زمانہ یاد دلا کر شرمندہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ تقابلی جائزے کے مطابق تو ایاز بھی فراز کی نوجوانی کی ہو بہو تصویر تھا۔ لاپروائی۔ بے نیازی دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرنا۔ مگر یہ اپنا وقت بھول گئے تھے۔

مومنہ کو بحث کی عادت نہ تھی۔ کبھی کبھار وہ صفائی میں کچھ کہہ دیتی تھیں۔ جب تعلیم پر اخراجات کا ذکر ہوتا ولی زبان سے کہہ ہی دیتیں۔

"تعلیم اس لیے حاصل کررہا ہے کہ کچھ بن جائے۔خالی ہلا گلا ہی تو نصب العین نہیں ہے ۔دوست تو سب کے ہوتے ہیں۔"

عائشہ کہتی۔"امی! آپ ابا سے اس موضوع پر بحث نہ کیا کریں۔ابا' چچی اماں کو بتادیتے ہیں۔وہ مذاق اڑاتی ہیں۔"

"جانتی ہوں۔ان کی باتیں تمہارے ابا مجھے بتادیتے ہیں۔میں نے اب پروا کرنی چھوڑ دی ہے۔بہت کچھ سنتی ہوں۔عرصے سے سن رہی ہوں۔پہلے غصہ آتا تھا۔اب ہنسی آتی ہے۔"

فراز بہت لاابالی اور بے فکرے نوجوان تھے۔ان کی شادی ان کی والدہ کی پسند سے ہوئی تھی۔اتفاق تھا کہ ان دنوں بڑی بھابھی اپنے میکے کی شادی میں شرکت کے لیے ایک ہفتے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔اسی زمانے میں اماں کو مومنہ کا سراغ لگا اور انہوں نے پسند کرکے رشتہ دے دیا اور جلد شادی کی تاریخ بھی دے دی۔"

شریف لوگ' خوبرو اور برسرروزگار لڑکا' مومنہ کے والدین کو انکار کا جواز نہ ملا۔فراز کی والدہ کی تجویز کردہ تاریخ پر بھی اعتراض نہ ہوا۔اور جب بھابھی صاحبہ میکے کی شادی سے فارغ ہوکر آئیں۔دیور کی شادی کی خوش خبری سننے کو ملی۔تاریخ بدلی نہیں جاسکتی تھی۔یہ نہیں کہ وہ اپنی کسی بھانجی 'بھتیجی سے دیور کو بیاہنا چاہتی ہوں۔مگر ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ اپنی پسند کی 'اپنی مرضی کی دیورانی لائیں۔جس پر احسان جتا کر اس پر حکومت کرسکیں۔مگر۔یہاں تو "آنا" فانا" فیصلہ ہوچکا تھا۔وہ بھی دو ماہ بعد۔پسند بھی اماں جان کی۔وہ تلملا کر رہ گئیں اور مجبورا" خوشی خوشی تیاری کرنے لگیں (بظاہر)۔

شادی کی پہلی رات 'پہلی ملاقات میں۔دولہا دلہن سے یوں مخاطب ہو۔۔۔۔تو حیرانی کے ساتھ پریشانی تو ہوگی۔جو کہ سیدھی سادی سچی کھری مومنہ کے حواس غائب کرنے کے لیے کافی تھا۔

"تم۔تم وہی ہونا۔جو اسٹیڈیم میں ملی تھیں مجھے۔پاکستان انڈیا کے میچ میں۔"

مومنہ کو کچھ یاد نہ تھا اور بات کو کئی سال بھی گزر گئے تھے۔یہ سچ ہے کہ اسے کرکٹ کا کھیل بہت پسند تھا۔اس کا شوق یوں بھی بڑھا کہ اس کی ایک دوست کے چچا قذافی اسٹیڈیم کے انچارج تھے۔یا کوئی عہدے دار 'اپنی دوست کی فیملی کے ساتھ وہ بھی میچ دیکھنے چلی جاتی 'مگر شادی کی رات کو اس سوال سے خائف ہوگئی۔دولہا کو مگر بہت کچھ یاد آگیا تھا۔وہ تیز طرار 'جوشیلی لڑکی جو سبز رنگ کے دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کی نعرہ بازی کے ساتھ ہمت بڑھائی۔مومنہ کو پہلے پہل تو یاد ہی نہ آیا' فراز صاحب کو بالکل نہ پہچانی۔لیکن جب انہوں نے اس میچ کی نشان دہی کی۔ کپیل دیو کی بالنگ' ماجد خان کا جلال' جب متواتر تین بار وائڈ بال ہوئیں۔ماجد خان نے وکٹ اکھاڑ کر اس جگہ نصب کردی۔جہاں پر اب تک بال گرتی رہی تھی۔

یہ واقعہ اسے یاد تھا۔اور پورے اسٹیڈیم کا ماجد کی اس حرکت پر جوش و خروش۔وہ مسکرائی 'یاد آگیا پھر پوری رات اسٹیڈیم اور میچ کے دلچسپ واقعات دہراتے گزر گئی۔صبح خوشی سے سرشار دولہا نے بہنوں کو دلہن سے شناسائی کے بارے میں سنایا۔تو بات پھیل گئی۔خاندان کے کچھ لوگوں نے لطف لیا۔بعض نے گل پھندنے لگانے میں دیر نہ کی۔اور بھابھی پیش پیش تھیں۔یہاں تک کہ مومنہ کے کردار پر بھی حملہ کرنے لگیں۔یہ کہ ان دونوں کا معاشقہ چل رہا تھا۔ میچ دیکھنے کے بہانے اسٹیڈیم میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔زور شور سے عشق چلا۔

مومنہ کے والدین نے شادی کرنے میں جلدی کی۔فراز کی والدہ کے علم میں آیا تو وہ حیران ہوگئیں۔فراز کا تو اس شادی کے سلسلے میں کوئی کردار نہ تھا۔وہ تو جانتے بھی نہ تھے کہ ماں اور بہنیں آج کل کس گھر کے چکر لگا رہی ہیں' یہ تو ماں بہنوں کی پسند سے رشتہ ہوا تھا۔لیکن وہ کس کس کے سامنے صفائی پیش

کرتیں۔ بیٹے کو ہی ڈانٹ دیا کہ آخر ضرورت کیا تھی اس شناسائی کے اظہار کی۔ وہ بھی عین شادی کے اگلے دن جب گھر میں کئی مہمان بھی تھے۔ کسی نے سن کر اپنے ذہن کے مطابق بات کو بڑھایا۔ اور پھر بے چاری معصوم مومنہ الزام 'شکوک اور سرگوشیوں کی زد میں آگئی۔ لیکن... آخر کار 'وقت کی دھول نے بہت کچھ دھندلا دیا۔ لیکن بھابھی کی اول دن سے مومنہ سے رنجش ختم نہ ہوئی۔ وجہ مومنہ کی خوبیوں کی بدولت ساس نندوں کا اس سے التفات 'حمایت اور بھابھی پر اسے ترجیح دینا۔ جب بھی کوئی موقعہ ملتا بھابھی مومنہ کو نیچا دکھانے کی بھرپور کوشش کرتی تھیں۔ اور کمزور پہلو مومنہ کا تھا۔ اس کا اپنا شوہر فراز 'جو بھابھی سے مرعوب اور ان کی بات پر دھیان دینے اور یقین کرنے میں بھی کم نہ تھا۔ لیکن اب مومنہ کو زیادہ پروا نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"چچی اماں آئی ہیں۔" یہ عاشی تھی۔ جو اعلان کرکے رفوچکر ہوگئی۔ وہ زیادہ دیر ان کا سامنا نہیں کرتی تھی۔ مومنہ بھی الجھن محسوس کرنے لگیں۔ فراز کی غیر موجودگی میں وہ کم ہی آتی تھیں اور اگر آتی تھیں تو کسی دوسرے کے بھید کھولنے۔ اس تاکید کے ساتھ کہ کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے تم کو بتایا ہے۔ مومنہ بغیر سوال کیے ان کی بات سن لیتی تھیں اور بھابھی کے لیے یہ امر تسکین کا باعث تھا۔ عاشی کو چائے کی تاکید کرکے وہ بھابھی کا استقبال کرنے لاؤنج میں آئیں۔ بھابھی نے مگر وہاں نہیں کمرے میں بیٹھنا پسند کیا۔ مومنہ مزید فکر مند ہوگئیں۔ ایسی کیا بات کرنے آئی ہیں جو۔ پوشیدہ طور پر کرنا چاہتی ہیں۔

یوں بھی مومنہ کو بدنام کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ مومنہ نے ان سے ڈر کر ہی زندگی گزاری۔ خصوصاً" ساس کے انتقال کے بعد۔ وہ تو سب سے بڑی حمایتی تھیں۔ بھابھی کو دوسروں کے قصے سنانے دہرانے کی عادت تھی 'جن میں کچھ سچائی 'زیادہ مبالغہ ہوتا تھا۔ مبالغہ آرائی کی ماہر تھیں۔ ہر واقعہ اس طرح سناتیں۔ جیسے آنکھوں دیکھا حال سنا رہی ہوں۔ اگر خود موجود نہیں تو ان کی کوئی بہن بھائی یا دوست کے سامنے ایسا واقعہ ہو گزرا۔

اسی طرح انہوں نے فراز اور مومنہ کی اسٹیڈیم میں ملاقاتوں کی ریل چلائی تھی۔ کسی نے اعتراض کیا کہ جب تو آپ لاہور میں تھیں بھی نہیں۔ اور آپ کو کرکٹ کا شوق اب بھی نہیں ہے تو انہوں نے اپنی عزیز اور رازدار دوست کا نام لے دیا۔ اس واقعہ کو بہت وثوق سے سنانے کے بعد لمبا سانس لیا۔ "وہ تو دلہن کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ کہ ارے یہ تو وہی لڑکی ہے جو اسٹیڈیم میں روز آتی تھی اور فراز بھی وہیں ہوتے تھے۔"

بہن نے اعتراض کیا۔ "فراز کو ملاقات کرنی تھی تو کہیں اکیلے میں کرتے۔ ہزاروں کے مجمع میں کون کسی لڑکی سے ملتا ہے۔"

مگر بھابھی کے فرمودات کا چرچا بھی خوب ہوا۔ کسی کو یقین آیا ہو نہ آیا ہو 'مگر بات پھیلی خوب 'ایک ساس بے چاری ہی صفائیاں دیتی رہیں۔ انہیں بڑی بہو کی کذب بیانی کا بھی خوب تجربہ تھا۔ مگر وہ کھل کر یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ یہ سب جھوٹ اور افترا ہے۔

چائے پی کر۔ عاشی کے ہاتھ کا بنا کیک کھا کر تعریفیں کرنے کے بعد رازدارانہ انداز میں بولیں۔

"تمہارے سوا اور کسی پر بھروسا بھی نہیں کرسکتی۔ ایک تم ہو 'جو میری بری بھلی سن کر بھی خاموش رہتی ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس کے سامنے دکھڑا روؤں۔" بہت دل گرفتہ تھیں۔

مومنہ کی تو سٹی گم ہوگئی۔ اچانک اپنا دکھ سنانے کے لیے انہیں مومنہ کا خیال کیوں آیا۔ کبھی تو انہیں اس قابل سمجھا نہ تھا کہ اپنی کوئی بات ان سے کریں۔ مضحکہ اڑانے میں البتہ ان کا ثانی نہ تھا۔ وہ کھسک کر مزید مومنہ کے نزدیک ہوگئیں۔

عاشی نے دوبارہ اندر جھانکا۔ وہ برتن اٹھا کر لے جانا

چاہتی تھی۔ مگر اندر تو مذاکرات چل رہے تھے۔ نہ جانے کون سے مسائل لے کر آئی تھیں آج۔ وہ چاہتی تھی 'برتن دھو کر رکھ دے۔ پھر پڑھنے بیٹھ جائے۔ آج رجو نے چھٹی کی تھی۔ اس لیے عاشی پر کام کا بوجھ آپڑا تھا۔ خدا خدا کر کے چچی اماں آنسو خشک کرتی باہر نکلیں اور عاشی پر نظر ڈالے بغیر باہر چلی گئیں۔ وہ برتن اٹھانے اندر آئی۔ مومنہ کو دیکھا۔ گم صم پریشان۔ الٰہی خیر!

"کیا ہوا؟ تائی اماں آج کس پر بجلی گرا گئی ہیں۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

"چپ رہو۔ بچوں کو بڑوں کے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔" انہوں نے اسے ڈانٹا۔

"بچے...؟" وہ طنزیہ ہنسی۔ "آپ بھول رہی ہیں امی۔ پچھلے دنوں آپ کی اس بچی پر بھی وہ بجلی گراتی رہی ہیں۔ جب تو آپ نے ان سے نہیں کہا کہ بچوں پر تہمت لگانا بڑوں کا کام نہیں۔"

"مجھے بولنا آتا۔ تو اپنے لیے بولتی۔ اب وہ جو چاہیں کرتی رہیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح پسپا ہو گئیں۔

"آپ نے خاموش رہ کر انہیں شیر بنا دیا ہے۔ اسی لیے وہ من مانی کرتی ہیں۔ جب چاہے ہمیں ذلیل کرتی ہیں۔"

"اچھا چپ رہو۔ بس کرو۔ آج وہ اپنا ہی مسئلہ لے کر آئی تھیں۔"

"اچھا۔ تب ہی آنسو پونچھتی گئی ہیں۔ آپ کو بھی پریشان کر دیا۔ اب بتائیے کیا کہا انہوں نے۔"

"کچھ نہیں۔ ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ تم جاؤ۔ جا کر پڑھو۔ رازداری کا وعدہ کیا ہے میں نے۔"

"میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے راز میں شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کہیں وہ راز صدف کے بارے میں..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مومنہ کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئیں۔

"صدف؟ یعنی کہ... صدف..."

"جی۔ سارا جہان جس راز سے واقف ہو چکا ہے۔ آپ کو ہمدردی کا جھانسا دے کر۔ اپنا پن جتا کر رازدار بنا گئیں۔ سب بچے بچے کو جس راز سے آگہی ہے۔ آپ کو مگر ہر طرف ہریالی نظر آرہی ہے۔ جبکہ خزاں کا موسم جوبن پر ہے۔"

"کیا کہے جا رہی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" جھلا گئیں۔ "مجھے اور پریشان نہ کرو۔"

"آپ کو چچی اماں کی زبان تو خوب سمجھ میں آتی ہے۔ کیا فرما گئی ہیں اب۔" وہ بھی ایک ضدی۔

"کچھ نہیں۔ اور میں ادھر ادھر دماغ نہیں کھپاتی نہ دوسروں کے معاملات کی ٹوہ لیتی ہوں۔ مجھے اپنے گھر کے بچوں کے معاملوں سے ہی فرصت نہیں۔ بلاوجہ کسی اور کی کھوج کیوں کروں۔"

"بہت نیک ہیں آپ۔ مگر کبھی آس پاس نظر دوڑا لینی چاہیے۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"مجھے کسی اضافے کی خواہش نہیں ہے۔ تمہیں کس نے صدف کے بارے میں بتایا؟"

"کسی نے نہیں۔ میں آنکھیں اور کان کھلے رکھتی ہوں۔ عرصہ گزرا صدف کو چچا ابا کے گھر گھستے دیکھا۔ چچا ابا کے گھر کے سامنے سے گزرتی ہوں۔ صدف تو لان میں نظر آتی ہیں۔ ان کے میاں کو یا ان کی گاڑی کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیا مطلب نکلتا ہے اس بات سے؟"

"اتفاق۔ اتفاق ہو سکتا ہے۔ میکے میں رہنے آتی ہی ہیں لڑکیاں۔"

"اور اب۔ چچی اماں کے بتانے پر آپ کو علم ہوا کہ... آگے جملہ پورا کریں۔" ہنس رہی تھی۔

مومنہ کو غصہ آگیا۔ "عاشی۔ بری بات 'ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ افسوس کی بات ہے۔"

"اچھا۔ آپ افسوس کرتی رہیں۔ میں جا رہی ہوں پڑھائی کرنے۔" برتن اٹھا کر چل دی۔

مومنہ کو واقعی افسوس تھا۔ بے چاری لڑکی! ایک سال ہی تو ہوا تھا شادی کو۔ دونوں خوش تھے۔ کبھی سنا نہیں کہ ان کے درمیان ان بن ہے۔ مگر سناتا کون؟ شادی کے بعد مومنہ نے صدف کی دعوت بھی کردی تھی۔ اس کی ساس 'نندیں اور میکے کے سب

لوگ آئے تھے۔ مومنہ نے بڑی نند کو بھی بلا لیا تھا۔ چھوٹی نند تو امریکا میں تھیں۔ اس کے بعد بھی ایک دوبار صدف میاں کے ساتھ آئی۔ خوش تھے بظاہر۔ سنا تو تھا کہ صدف آئی ہے۔ غالباً" رجو نے بتایا تھا۔ مگر لڑکیاں میکے آتی رہتی ہیں۔ انہیں ٹوہ لینے کی عادت بھی نہ تھی۔

وہ تو آج بھابھی نے عقدہ کھولا۔ پریشان تھیں۔ صدف سے شوہر' ساس' نندوں کو شکایتیں تھیں۔ "صدف کی لاپروائی۔ بدزبانی اور نکھٹے پن پر' صدف کا شوہر پرویز ماں کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اسے بھی صدف کی بے باکی پسند نہ تھی۔ جو ہر کسی مرد سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگتی۔ صدف نندوں کو منہ نہیں لگاتی۔ الگ تھلگ رہتی ہے۔ اپنے دوستوں جن میں لڑکے' لڑکیاں سب ہوتے۔ اپنے گھر بلا کر ہلا گلا کرتی ہے ان دوستوں کے ساتھ سیر کے لیے۔ فلم دیکھنے پکنک تک پر چلی جاتی ہے۔ شوہر کے بغیر' کیونکہ پرویز اس کے دوستوں کی کمپنی پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے مشاغل ترک نہیں کر سکتی۔ صدف کو سسرال کے طور طریقے پسند نہیں۔ وہ بلند آواز میں ٹھٹھے لگاتی ہے۔ صدف کو منع کیا جاتا ہے کہ خواتین کو کم از کم لڑکوں کے ساتھ زور سے ہنسنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ بھئی' وہ احتیاط کریں۔ صدف پر پابندی کا کیا جواز ہے۔ وہ تو جیسی تھی۔ ویسی ہی ہے۔

شوہر اعتراض کرتا ہے تو صدف کا جواب ہوتا ہے کہ "یہ میری اپنی زندگی ہے۔ میں اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہوں۔ پرویز اپنی مرضی سے خواہ دوستوں کو گھر بلائے۔ یا ان کے ساتھ چلا جائے۔ مجھے تو اعتراض نہیں ہے۔ مگر میرے دوستوں کو روکنے کا کسی کو حق نہیں۔" بھابھی کا کہنا تھا کہ وہ تو شروع سے ایسی ہی ہے۔ پرویز اس کی ہر عادت سے واقف تھا۔ کالج کے زمانے میں دوستی ہوئی تھی۔ بھابھی کو تو وہ پسند نہ تھا۔ بھابھی کے بھائی کے سالے کا بیٹا تھا۔ بھائی کی سسرال انہیں کب پسند تھی۔ صدف کی ساس نندیں۔ نخرے' اُفوہ بھابھی کو تو ان کا گھر بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ پرانے زمانے کا۔ ساس' نندیں دقیانوسی خیالات کی۔

"نہ جانے صدف نے پرویز میں کیا دیکھا اور کیا پسند کیا' اب گھر آکر بیٹھ گئی ہے اور کسی قیمت پر جانے کو تیار نہیں۔" آج پہلی بار بھابھی مومنہ کو دل کی بات سنا رہی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے پرویز کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ اب ان کا کہنا تھا وہ بہت اکھڑ ہے۔ آدم بے زار اور کھردرے مزاج کا' صدف کی ساس زیادہ میل ملاپ کی حامی نہ تھیں۔ ان کا حلقہ احباب بس پڑوسیوں تک تھا' مومنہ حیران تھیں' متاسف بھی۔ پہلے تو بھابھی صدف کی خوش قسمتی کے راگ الاپا کرتی تھیں اور یک لخت انہیں مومنہ میں کون سی اپنائیت نظر آئی کہ رازدار بنا کر ممنون احسان کر لیا۔

☼ ☼ ☼

رات کو سونے سے پیشتر انہوں نے میاں کو رازدار بنایا۔ بھابھی کی آمد۔ صدف کی شوہر سے ان بن بھابھی کی پریشانی' فراز نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

"اچھا۔ نئی خبر ہے۔ مگر تمہارے لیے۔ میں تو جانتا ہوں۔ کافی دن سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔"

مومنہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ حیرت۔ "آپ کو معلوم تھا' اور مجھے بتایا تک نہیں۔"

"کیا بتاتا۔ تمہیں کسی سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ بھابھی صحیح کہتی ہیں۔ تمہیں سسرال کے کسی معاملے سے سروکار نہیں۔ نہ تم جاننا چاہتی ہو۔ کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔"

چلو جی ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

"میرے جاننے سے کیا ہوگا۔ جہاں جو ہو رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ لیکن آپ تو مجھے بتاتے۔"

"اچھا ہے۔ نہیں بتایا۔ پھر بھابھی کہتیں۔ تمہیں خبر تھی تو افسوس بھی نہیں کیا۔"

"آپ گئے تھے افسوس کرنے؟"

"میں نے بھی ظاہر نہیں کیا۔ مجھے انہوں نے کب بتایا۔ اڑتی اڑتی خبر سن لی۔ وہ مجھے رازدار بناتیں تو چلا جاتا۔"

"بھتیجی ہے آپ کی۔ آپ کو اسے تسلی دینا چاہیے تھی۔ نہ جانے کیا سوچتی ہوگی۔"

"اب سوچنے سے کیا حاصل۔ بگاڑ ہونے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"پہلے اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ آپ اس لڑکے یعنی پرویز سے تو مل لیتے۔ پوچھتے کہ کیا ہوا؟"

"صدف کے ماں باپ مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں۔ انہوں نے پوچھ لیا ہوگا۔ اور میں کیوں پوچھوں۔ بھئی مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ نہ ان کے گھر سے کوئی آیا۔ نہ میں وہاں گیا۔ مجھے فرصت ہی کب ہے بابا۔"

"خیر۔ آپ بزرگ ہیں صدف کے۔ ہمدردی میں اسے سمجھاتے۔ اونچ نیچ بتاتے اپنے ہی کام آتے ہیں۔"

"مشورے دیے جا رہی ہیں بیگم، مفت کے مشورے ارے میں کیوں سمجھاؤں، وہاں سمجھانے والوں کی کمی ہے؟ اور بھئی، مجھے تو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بھائی جان کہتے تو میں ضرور اسے سمجھاتا۔"

"کمال ہے رشتے داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ خون کا تعلق، انسانیت کا رشتہ، ایک لڑکی کا گھر بکھر رہا ہے۔ اس کو سمجھانے کے لیے دعوت دینی چاہیے کیا؟ بھئی وہ ہماری اپنی ہے۔ اسے عقل نہیں نا تجربے کار ہے، کوئی بھی سمجھا سکتا ہے۔ اتنا تو حق ہے ہمارا۔" مومنہ بہت مضطرب تھیں۔ ہائے بے چاری بچی۔

"اچھا۔ تو آپ حق ادا کریں۔" فراز نے بات ختم کرنی چاہی۔ "بھابھی نے آپ کو جج مقرر کیا ہے۔ تو بسم اللہ... جایئے۔"

"نہیں خیر! مجھ سے تو انہوں نے کچھ ایسی بات نہیں کی۔ اپنا دکھ سنانے آئی تھیں۔ مگر آپ کو رشتے کا احساس۔۔۔"

"بیگم صاحبہ! رشتے کا احساس مجھے تو ہے۔ مگر بھائی جان کو میرا احساس ہوتا۔ تو میں ان کی دل جوئی کے لیے ان کے پاس جاتا۔ تم بھول گئیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے بھابھی نے عاشی کے لیے کس قسم کے الفاظ استعمال کیے۔ کیا بھائی جان نے میرا احساس کیا؟ ایک لفظ بھی معذرت کا... یا دل جوئی کا..." فراز کو بھابھی سے شکایت تھی۔ وہ حق پر تھے۔ بھائی کو تو بھابھی سے پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں انجان بن گئے۔

مومنہ انہیں کہہ نہ سکیں۔ بھابھی تو ایاز پر بھی طرح طرح کے الزام لگاتی ہیں۔ وہ آپ کو برے نہیں لگتے۔ بلکہ آپ ان ہی اعتراضات پر یقین کر کے مجھے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ مومنہ کو سوچ میں گم دیکھ کر فراز سمجھے، وہ صدف کے مسئلے پر ہی متفکر ہیں۔ لیٹتے ہوئے تاکید کی۔

"نیند خراب نہ کریں۔ صدف کے ماں باپ تمام مراحل سے گزر چکے ہیں۔ اس کی فکر نہ کریں۔ فی الحال اپنے لاڈلے کے لیے ہمدردیاں جمع کریں۔ اسے اچھا برا سمجھا لیں۔ اگر میں نے اپنا حق استعمال کر لیا۔ تو وہ آپ کو ناگوار ہوگا۔ لاڈلے کو رسی سے باندھنے کی ضرورت ہے۔ وہ بہت بے نیاز ہے۔ رشتے داروں کو چھوڑو۔ وہ ماں باپ کی ہی فکر کر لے تو بڑی بات ہے۔"

وہی ہوا۔ ہر پھر کر ایاز پر برہمی۔ کیا یاد دلاتیں کہ آپ خود کون سے رشتے کی پروا کرتے ہیں۔ مومنہ کو تو یہی لگتا تھا کہ فراز کو ایاز سے محبت ہی نہیں ہے۔ لوگوں کی زبانیں، ان کے ذہن میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ وقت پر وہی اگل دیتے ہیں۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ مومنہ کو کتنی اذیت ہوتی ہے۔ ماں تا بیٹے پر غلط نکتہ چینی برداشت نہیں کرتی۔ وہ خود تو باپ ہونے کے فرائض سے ناآشنا رہے۔ شروع سے ہی انہیں ایاز سے ضد ہو گئی تھی۔ اسے نظر انداز کرتے رہے۔ اس کے مقابلے میں عائشہ سے بہت پیار جتاتے۔

ایاز جب پیدا ہوا، بھائی جان کے دو بیٹے عامر، یاسر تھے۔ فراز ان دونوں پر بہت فدا تھے۔ آپا کا بیٹا چند ماہ بڑا تھا۔ چھوٹی آپا کا بیٹا بھی ایاز کے برابر تھا، شاید ایک ماہ بڑا تھا۔ ایاز پیدا ہوا۔ تو اس کی اہمیت ہی نہ تھی۔ وہ پیدا ہوا تو سانولا، دبلا پتلا تھا۔ پھر آئے دن بیمار رہتا۔ فراز کو وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بھتیجے بھانجوں میں ہی خوش رہتے۔

مومنہ کو بہت دکھ ہوتا، مگر ایاز کی دادی اس پر بری

طرح فدا تھیں۔ انہیں فراز سے محبت بھی تھی چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے۔ اس کی اولاد اور زیادہ پیاری لگتی۔ اصل میں انہیں مومنہ بھی بہت عزیز تھیں۔ وہ سیدھی خاموش گھر کو سنوارنے اور کچن سنبھالنے میں مصروف رہتیں۔ ساس کو ان کی ہر ادا بہت پسند تھی۔ وہ ان کی پسندیدہ بہو تھیں۔ بہت لاڈلی' بھابھی کو ان کا مومنہ سے التفات ہی پسند نہ تھا' ان کے بچوں سے لاڈ سخت ناگوار۔

وہ ساس کے سامنے مومنہ کو نیچا دکھانے کی کوشش میں ساس کی ستائش کو مٹی میں ملا دیتیں۔ ساس نے ہی تلقین کی تھی کہ خاموش رہ کر ان کی ہر بازی پلٹ دیا کرو۔ مومنہ نے ایسی خاموشی اختیار کی کہ بھابھی کی چرب زبانی' تلخ تیور اور طنزیہ جملوں سے مرعوب ہو گئیں۔ فراز نے بھابھی کو اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا۔ مومنہ نے بھی اپنی صلاحیتوں سے متاثر نہیں کیا۔ ساس کے انتقال کے بعد تو وہ اور بھی بجھ کر رہ گئیں۔

آپا کا سسرال کافی بڑا تھا۔ وہ سسرال میں بڑی بہو تھیں۔ ان کا آنا کم ہوتا تھا' چھوٹی آپا بھی امریکا چلی گئیں۔ مومنہ کا کوئی ہمدرد نہ رہا۔

جوں جوں ایاز بڑا ہوتا گیا' اس کا رنگ نکھرتا گیا۔ صحت بھی اچھی ہو گئی۔ بہت خوب صورت ہو گیا۔ عائشہ بھی بڑے ہونے پر خوب نکھر گئی۔ اور عامر' یاسر کے رنگ کم ہو گئے۔ بھابھی کو بہت ہی صدمہ تھا۔ کہتی تھیں۔

"بھئی ہمارے بچے مرغی کی نسل سے ہیں۔ پیدا ہوئے تو خوب صورت بچپن بھی پیارا۔ بڑے ہوتے گئے۔ مرغوں کی طرح رنگ بدل گیا۔ تمہاری اولاد کبوتر کی نسل ہے۔ کبوتر کے بچے انڈے سے نکلتے ہیں تو گوشت کا لوتھڑا۔ بدشکل مگر پر نکلتے ہی حسین ہو جاتے ہیں۔ کینچلی بدل لیتے ہیں۔"

لوگ ان کی منطق پر ہنسنے لگتے۔ بھابھی کی کذب بیانی سے تو آپا بھی خوف زدہ تھیں۔ بھابھی کو بہت فخر تھا کہ سب ان سے مرعوب ہیں۔ انہیں اپنی عقل و فہم

اور تربیت پر بھی فخر تھا۔

عامر کو بہت اچھی جاب مل گئی۔ بھابھی نے مٹھائی تقسیم کی۔ فراز کو موقع مل گیا۔ عامر اور ایاز کا مقابلہ کرنے لگے۔ یہ سوچے بغیر وہ عامر سے چار پانچ سال چھوٹا ہے۔ پڑھ رہا ہے اور ابھی یاسر بھی پڑھ رہا ہے۔ اس سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے کو کہ وہ بھی ایاز سے بڑا ہے۔

"اول جلول دوستوں کی صحبت میں پڑ کر کوئی کارنامہ انجام دیں گے آپ کے صاحب زادے۔"

"آپ ان سے ایک بار مل لیں۔ کوئی خرابی کسی لڑکے میں نظر آئے۔ تو ملنے سے منع کر دیں۔"

"اچھا اور وہ بڑے سعادت مند ہیں کہ میں منع کروں گا۔ وہ اسے چھوڑ دیں گے۔"

"کبھی کچھ بات کر لیا کریں۔ بیٹا ہے نصیحت کرنا آپ کا حق ہے۔ ویسے سب اچھے گھرانے کے لڑکے ہیں۔"

"تمہیں تو اپنے بیٹے میں ہی کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ اس کے دوست تو ہیرا موتی لگتے ہوں گے۔"

"میرا بیٹا خود اعلا نسل کا ہیرا ہے۔" مومنہ کے لہجے میں پیار تھا' فخر تھا' وہ چڑ گئے۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔ ان لفنگوں کو گھر میں آنے کی اجازت کیوں ہے؟ لفنگے ہیں سب۔"

"گھر میں اسی لیے آتے ہیں کہ سب شریف اور پڑھائی کے شوقین ہیں۔ مل کر پڑھ لیتے ہیں۔"

"تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ گھر میں جوان بیٹی ہے اور تم انجام سے بے خبر ہو۔"

یہ نکتہ بھی بھابھی نے سمجھایا تھا۔ "بھئی میں نے تو عامر' یاسر کے دوستوں کو گھر آنے کی اجازت نہیں دی۔ گھر میں جوان بیٹی ہے۔ آج کل کے لونڈوں لپاڑوں کا کیا اعتبار۔ تمہارے گھر کے نئے دستور ہیں۔ ایاز کے دوست گھر میں آکر ہاؤ ہو کرتے ہیں۔ بند کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ کسے خبر؟" وہ پورے وثوق سے حملہ کرنے کی قائل تھیں۔

"بھئی بہت ہی سیدھی ہے تمہاری بیوی۔" طنز ہے یا تعریف۔

مومنہ جانتی تھیں۔ وہ کس طرح مخالف کو پچھاڑنے کی طاقت رکھتی ہیں مگر یہاں معاملہ بیٹے کے کردار پر تھا تو ان کی عقل پر وار۔

"میں خیر خبر رکھتی ہوں بھابھی۔ کبھی چائے دینے کے بہانے۔ کبھی یونہی کچھ پوچھنے چلی جاتی ہوں۔ سب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔" مومنہ نے صفائی دی۔ بھابھی کا منہ بن گیا۔

"میں تو جب آتی ہوں۔ اندر سے ہاؤ ہو قہقہوں کی آواز آتی ہے۔"

"تو بھابھی ہنسنا جرم تو نہیں ہے۔ جوان بچے ہیں۔" وہ تو حیران ہو گئیں "یہ بھلا کیا بات ہے۔" بھابھی کو اعتراض کا جواب سننے کی عادت نہیں تھی۔

"تمہیں جانے کب ہوش آئے گا۔ جب پانی سر سے گزر جائے گا تو سر پکڑ کر روؤ گی۔"

مومنہ خوف زدہ ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔ اس بات سے کیا مراد ہے۔ سمجھ نہ سکیں۔

ایاز آیا تو اس سے انہوں نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔ اس نے ماں کو بازوؤں میں لے لیا۔

"میری بھولی ماں! چچی سے کہیے ذرا اپنے گھر کی بھی خبر لے لیا کریں۔ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر سنگ زنی کرنے سے اپنا نقصان ہی ہوتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

وہ اس وقت تو سمجھ نہ پائیں۔ مگر کچھ دن بعد ہی عامر ایک کلاس فیلو لڑکی سے کورٹ میرج کر کے گھر لے آیا۔

"امی! میں آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ یہ ہے آپ کی بہو۔ دیکھیں کتنی آسانی کر دی میں نے آپ کے لیے۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری۔ رنگ دیکھیں کیسا چوکھا آیا۔"

بہت فخر تھا عامر کے لہجے میں۔ اسما واقعی بہت خوبصورت تھی مگر۔۔۔ بھابھی کو ڈپریشن کا دورہ پڑ گیا۔ اسپتال جانا پڑا' ادھر عامر کے سسرال والوں نے

عامر کے خلاف اغوا کا پرچا کرادیا۔ عامر دو دن لاک اپ میں بند رہا۔ پھر فراز نے بھاگ دوڑ کی۔ اور اسما کے مجسٹریٹ کے سامنے بیان دینے پر اس کی گلو خلاصی ہوئی۔ مگر خاندان میں خوب چرچا ہوا۔ بھابھی عرصے تک کسی کا سامنا نہ کرسکیں۔ اسی غصے میں انہوں نے اسما کو گھر سے نکل جانے کا آرڈر دیا۔ عامر سے بھی دوبدو بحث ہوئی۔ اور آخر کار عامر کو ہی گھر سے جانا پڑا۔

دو دن کسی دوست کے گھر رہے پھر ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر اسما کو لے گیا۔ عامر پر تو گھر میں داخلے پر پابندی تھی۔ یاسر نے ہی تھوڑا بہت سامان گھر سے لے جاکر عامر کو دیا۔ گو کہ یاسر کو بھی ڈانٹ سننا پڑی۔ مگر اس نے کہا۔

"امی! بغیر میز کرسی اور بیڈ کے تو گزارا ہو سکتا ہے۔ بستر کے بغیر ایک رات بھی آپ گزار سکتی ہیں۔"

یاسر نے تو خانساماں کو اعتماد میں لے کر کچھ ضروری برتن بھی کچن سے اڑا لیے۔ امی کو پتا چلا تو خوب چلائیں۔

"کرے خود اپنا انتظام وہ قطفی۔ جس طرح دیدہ دلیری سے اکیلی شادی کرکے آگئی۔ اب اپنے لیے سب کچھ چاہیے۔ ہم پر کیا حق ہے۔"

"امی۔ اپنا ظرف بڑا کریں۔ آپ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہوگئی چار برتنوں سے۔ خدا کا خوف کریں۔ اگر یہی بہو جہیز لے کر آتی تو آپ سر آنکھوں پر بٹھاتیں۔"

"سب کی مرضی سے آتی۔ تو مجھے کیا اعتراض ہوتا' نہ جانے کس خاندان کی ہے بے حیا' بے شرم' دیدہ دیکھو۔ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ گھٹیا خاندان کی ذلیل خون ہے۔"

"اس میں آپ کے بیٹے کا بھی حصہ ہے۔ اب معلوم نہیں آپ کس خاندان پر فخر کر رہی ہیں۔" تلملا کر رہ گئیں۔ مگر انہوں نے یاسر پر بھی پابندی عائد کردی کہ آئندہ عامر سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ "اگر میں نے سنا کہ تم اس سے ملے ہو یا اس کے گھر گئے ہو۔ تو پھر میرا مرا ہوا منہ دیکھو۔"

عامر کو خود سری کی سزا دے کر وہ مطمئن تھیں۔ پھر کچھ دن بعد صدف کے بارے میں خبر آئی۔ کسی لڑکے سے دوستی اور صدف کی آزاد روی نے ماں باپ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔

بھابھی نے اس شکست کو بڑا خوب صورت موڑ دیا۔ اور اس لڑکے سے صدف کی شادی کردی۔ اب وہ سب سے یہی کہہ کر خود کو تسلیاں دیتی نظر آئیں۔

"ارے وہ کوئی غیر تو نہیں۔ میری بھابھی کا بھتیجا ہے۔ بھئی ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا۔ اب کسی کو یہ رشتہ پسند نہیں۔ تو وہ اپنے گھر خوش رہے۔"

نہ جانے یہ کس کا ذکر تھا۔ لیکن بہرحال شادی بے حد عجلت میں ہوئی۔ عامر کو بلانے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ مومنہ کو اسما پر ترس آتا تھا۔ بے چاری اپنی غلطی کی وجہ سے میکے سے تو محروم ہو ہی گئی تھی۔ سسرال نے بھی قبول نہ کیا۔ بھابھی نے تو دل سخت کرلیا تھا۔ مگر مومنہ اتنی سنگ دل نہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس روز وہ ایاز کے ساتھ اسٹور گئی تھیں۔ گھر کے سودا سلف کے لیے۔ واپسی میں ایک جگہ اشارے پر گاڑی رکی۔ تو انہیں فٹ پاتھ پر عامر کھڑا نظر آیا۔ غالباً سڑک کراس کرنا چاہتا تھا۔ ٹریفک رکتے ہی وہ فٹ پاتھ سے اترا۔ ایاز نے آواز دی۔ وہ متوجہ ہوا۔ مومنہ کو سلام کیا۔

"بیٹھو۔ جہاں جانا ہے۔ تمہیں پہنچا دیں گے۔" عامر بیٹھ گیا۔ پوچھنے پر جھینپ کر بتایا۔

"گھر کے لیے سودا لینے نکلا تھا۔ دیکھا تو بٹوہ جیب میں نہیں۔ گھر بھول آیا۔ اب واپس جارہا تھا۔ قریب ہی میرا گھر ہے۔"

اپنی جلد بازی پر ایاز کو پچھتاوا ہوا۔ عامر کے گھر جانے کی خبر۔ چچی اماں کو ہوگئی تو وہ... لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ مومنہ کو ایسا کوئی خدشہ نہ تھا۔ وہ بہت خوشی سے عامر کے ساتھ گھر میں آگئیں۔ اسما بہت

خوش ہوئی۔
"اس گھر میں آپ پہلی مہمان ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا' آپ کی کیا خاطر کروں۔"
وہ چائے بنانے کچن میں گئی تو مومنہ بھی آگئیں۔ وہ ٹرے میں برتن رکھ رہی تھی۔ کبھی الماری کھولتی کبھی فریج' مومنہ سمجھ گئیں۔ وہ "خاطر" کے لیے چیزیں تلاش کر رہی ہے۔
"تم مجھے مہمان نہ سمجھو۔ صرف چائے ہی لے آؤ۔"
کہہ کر وہ باہر نکلیں۔ ایاز کو بلایا۔ وہ عامر کے کمرے میں تھا۔ اس کو قریب بلا کر کہا۔ "گاڑی میں نمکو بسکٹ اور سموسے رکھے ہیں۔ لے آؤ۔"
ایاز سب چیزیں لے آیا تو عامر نے اعتراض کیا۔ مومنہ نے اس کے کندھے تھپکے۔
"ایک تو بغیر پروگرام کے آگئی۔ پہلی بار کچھ تو لاتی۔ مٹھائی نہ سہی۔ یہ جو کچھ ہے۔ ہم بھی کھائیں گے۔"
اسما چائے لے آئی تو اس نے ساری چیزیں دیکھیں۔ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ چائے کے ساتھ وہ کباب فرائی کر کے لائی تھی۔ چائے پیتے ہوئے عامر نے کہا۔
"چچی! اسما کو گھرداری کا تجربہ نہیں ہے۔ مہینہ ختم نہیں ہوتا' چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ آپ اسے موٹے موٹے گر بتادیں۔ سکھادیں کچھ۔"
مومنہ نے کہا۔ "تجربہ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ اسما کو طریقہ آتا ہے۔ یہ کباب فرز کیے ہوں گے۔ یہ چھوٹی سی مثال ہے سلیقے کی۔ ابھی نیا نیا گھر سنبھالا ہے تم کسی دن ہمارے گھر لاؤ اسما کو۔"
عامر بہت سمجھ دار تھا۔ بولا۔ "چچی ابھی نہیں۔ امی پھر آپ کو بھی الزام دیں گی۔ انہوں نے میرا حقہ پانی بند کر رکھا ہے اپنے حساب میں۔ آپ کے آنے کی خبر نہیں سے ملی۔ وہ بھی نہ جانے... خیر اسما کو بجٹ بنانا سکھا دیں۔ کتنا گوشت' کتنی سبزی' کتنی دال بنانی چاہیے۔ کبھی تو کھانا زیادہ بن جاتا ہے۔ کبھی بہت ہی کم۔"
"ہاں خیر! ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ گھر میں کسی بڑے کا ہونا بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ تمہارے دو آدمیوں کے لیے تو دو وقت کا سالن آدھا پاؤ گوشت میں ایک پاؤ سبزی بہت ہے۔"
"کیا؟ آدھا پاؤ؟" عامر کی چیخ..... "یہ تو ایک کلو گوشت دو دفعہ میں ختم کر دیتی ہے۔"
"جی۔ سالن چار پانچ دن کھا کھا کر بے زار ہو جاتے ہیں ہم۔" اسما نے خوش دلی سے کہا۔
مومنہ نے اپنے پاس سے مسالوں کے پیکٹ بھی کچن میں لا کر رکھ دیے اور منہ دکھائی کے نام سے بھی رقم مٹھی میں دبادی۔ وہ خاصی شرمندہ ہوئی۔
واپسی میں ایاز نے کہا۔
"امی! عامر بھائی کو تو بھابھی سے بہت شکایتیں ہیں۔ خرچ کی تنگی اور بے برکتی پر بھابھی کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔ خود اپنی فضول خرچی انہیں نظر نہیں آتی۔ اپنی شاہ خرچی کو ضرورت کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ابھی اتنی جلدی اے سی اور کمپیوٹر خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب لیپ ٹاپ لینے کی بات کر رہے تھے۔ فریج اور فرنیچر بھی آفس سے ادھار پر لیا ہے۔ سوچے سمجھے بغیر خرچ کر رہے ہیں۔ بھابھی کے پھوہڑپن پر سارا ملبہ ڈال دیا۔"
مومنہ کو بہت خوشی ہوئی۔ اتنا سمجھ دار بیٹا۔ "تمہیں اندازہ ہو گیا۔ واہ....."
"امی! کوئی بچہ بھی دیکھ کر سمجھ سکتا ہے۔ ماں باپ کی مدد بھی نہیں۔ گھر کے اخراجات' کرایہ' بل اور ان کے اعلا درجے کے شوق۔ ذرا صبر تو کرتے۔ اس وقت بھی ان کی جیب خالی تھی۔ سودا لینے گئے تھے۔ بٹوہ بھول جانے کا بہانا تھا۔ آپ عامر بھائی سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں۔"
مومنہ کو ایاز کی باتوں پر پیار آگیا۔ "ہائے میرے بچے کی باپ کے پاس کوئی قدر نہیں۔"
"بیٹا جی! اب آپ بھی مجھے خوش خبری سنائیں۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔"
"چلیے آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ بس دعا کریں۔ ان شاء اللہ چند ماہ کے اندر آپ خوش خبری سن لیں

گی۔"

مومنہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ چہرے پر سرخی چھا گئی۔ اس کی زندگی' خوشیوں اور ترقی کی دعا کرنے لگیں۔

"امی! آپ جو مسالے وغیرہ بھابھی کو دے آئی ہیں'وہ لے لیں۔"

"نہیں چھوڑو۔ فوری ضرورت نہیں ہے۔ پھر لے لیں گے۔" مومنہ نے ٹال دیا۔

"مجھے معلوم ہے امی! آپ نے اسما بھابھی کے لیے اپنا پرس خالی کر دیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ آپ نے انہیں منہ دکھائی دے دی۔ مگر آپ کا بیٹا بھی اس قابل تو ہے کہ کچھ سامان گھر کے لیے خرید سکے۔"

مومنہ نے انکار نہیں کیا۔ انہیں بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ ایاز سمجھ دار ہے۔ حساس ہے' ہمدرد ہے' کاش فراز کو بھی علم ہو جائے۔ مگر وہ خود انہیں نہیں بتا سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اسما کا اکثر فون آ جاتا۔ کبھی کھانے کی ترکیب معلوم کرنے' کبھی اپنی کوئی فکر اور جب مومنہ نے عامر کو سمجھانے کا ارادہ کیا' کہ وہ اخراجات پر کنٹرول کرے۔ اسما کو موردالزام نہ ٹھہرایا کرے تو عاشی کو ماں کی ہمدردی ذرا بھی پسند نہ آئی اس نے خود مومنہ کو سمجھایا۔

"امی! آپ کو کیا ضرورت ہے ان لوگوں سے تعلق رکھنے کی۔ ان کے معاملات میں دخل دینے کی۔ چچی اماں کو جانتی ہیں آپ۔ آپ کی ہمدردی اور خلوص کو دشمنی کا رنگ دینے میں ایک لمحہ نہیں لگائیں گی۔ یہی کہیں گی۔ آپ چچی کی مخالفت میں عامر بھائی سے دکھاوا کر رہی ہیں۔ امی! چچی آپ کو معاف نہیں کریں گی۔"

"دکھاوا کیسا۔ میرا اپنا بچہ ہے۔ اچھے برے کی عقل دینا بڑوں کی ذمہ داری ہے۔"

"اور چچی اماں۔ وہ بڑی نہیں ہیں؟" انہوں نے بھی کچھ سکھایا ہو گا بیٹے کو یا یہ بھی آپ کی ذمہ داری ہے؟ پلیز امی! بھول جائیں اسما کو۔"

"کیسے بھول جاؤں۔ اس بچی کا دکھ' اس کی محرومی میرے دل کے بوجھ کو بڑھا دیتی ہے۔ جس کی نادانی نے میکہ چھڑوا دیا اور عامر کی حماقت نے سسرال بھی۔ عامر بھی نادان ہے۔"

"اف وہ۔ نادانی' اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ پسند کی بیوی مل گئی۔ آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ ماں باپ کا ڈر' نہ روک ٹوک' اپنی ہر خواہش پوری کر رہے ہیں۔ اتنے بھی نادان نہیں کہ مستقبل کا نہ سوچیں۔ مگر خواہشات کا بے لگام گھوڑا عقل خبط کر دیتا ہے۔ پھر کوئی کچھ بھی کرے۔"

"یہی تو سمجھانا ہے اسے کہ خواہشات کو لگام دے۔ فیملی بنائے۔"

"آپ سمجھائیں گی اور وہ مان لیں گے۔ جس شخص نے اپنے ماں باپ کی پروا نہ کی۔ ان کو راضی کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ آپ کی نصیحت پر توجہ دے گا؟ کیا ان میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ ماں باپ کو راضی کر لیتے۔ اور سب کی مرضی سے شادی کرتے۔ مگر وہ۔ اس کو اہم کیوں سمجھتے۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر ڈرنے کی بات ہی کیا ہے؟ اسما ہی قسمت میں بھی تو سب کی خوشامد کر لیتے تھے۔ اس کو سب سے چھڑا لیا۔ اب دیکھیے گا' کسی دن بیوی کو چھوڑ کر ماں باپ کے گلے لگ جائیں گے۔ خود غرض' خود پسند انسان۔" عائشہ سخت غصے میں تھی۔

"توبہ ہے عاشی! بری بات ہے۔ بس حالات ہی ایسے ہو گئے۔ قسمت میں ایسا ہی تھا۔"

"واہ۔ اب حالات کے ذمہ ڈال دیں۔ مگر وہ ہیں ہی خود غرض' بے حس' خواہشوں کے غلام۔"

☆ ☆ ☆

عائشہ نے انہیں عامر سے ملنے سے روک دیا۔ مگر اتفاق سے وہ کسی کام کے سلسلے میں فراز سے ملنے

آگیا۔ مومنہ نے موقع غنیمت جانا۔ جب عامر نے مہنگائی کا رونا رویا۔ تنگی کا ذکر کیا۔

"عامر! تم اپنے اخراجات کم کرلو۔ تو گھر میں تنگی نہ ہو۔ بیٹا! میں اعتراضا" نہیں۔ تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ شادی کے فورا" بعد تم الگ ہوگئے۔ اور ضرورت، شوق کی ہر چیز قرض لے کر جمع کرتے گئے۔ گھر میں تو تنگی ہوگی۔ بڑی بڑی رقمیں تم دکانوں کے سیف میں بھرتے رہوگے۔ تو تنگی تو آئے گی۔"

عامر شرمندہ ہوگیا۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ مجھ میں برداشت نہیں۔ تکلیف سہنے کی عادت نہیں ہے۔ ہمیشہ سے جو چاہا، حاصل کرلیا۔ اب کوشش کروں گا۔"

"ہاں۔ بہت اچھا کروگے صبر اور برداشت تکلیف سہنے کی ہمت پیدا کروے گی۔ سوچ سمجھ کر خرچ کرنا ہی مستقبل کے لیے روشنی کی امید لاتا ہے۔"

"جیسے آپ نے ہمیشہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا۔ دوسروں کو مایوس نہیں کیا۔ یہ تو بچی جبر ہوا۔ اپنی ضرورتیں، آسائشیں پس پشت ڈال کر۔ دوسروں کی خاطر۔"

"دوسرے کون؟ میرا مستقبل، میری اولاد، جبر نہیں، پلاننگ کہتے ہیں اسے۔ تمہاری بھی ایک فیملی ہوگی۔ بچے ہوں گے۔ ان کے لیے تم نے کیا سوچا۔ قرض کا بوجھ، پھر مزید قرض۔ ابھی کیوں نہ بجٹ بناکر۔ سختی سے اس پر عمل کرکے۔ روشن مستقبل کی بنیاد ڈال دو۔"

عامر نے کیا سمجھا۔ اثر ہوا یا نہیں۔ لیکن عائشہ مضطرب تھی۔ اس کے خدشے اکثر درست ہوتے۔ چچی اماں کی تنگ نظری سے کچھ بعید نہ تھا۔ اپنے مطلب کا نتیجہ نکالنے میں ان کا ثانی نہ تھا۔

مومنہ طبعا" نیک تھیں۔ ان کی خوش فہمیاں انہیں اکثر دکھ پہنچاتی تھیں پھر بھی وہ کسی سے بدظن یا بدگمان نہ ہوتیں۔ ڈیڑھ سال پہلے عامر کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ عائشہ کے کالج کی انتظامیہ نے ذہین طالب علموں کے لیے میڈل دینے کا اعلان کیا تھا۔ عائشہ یوں بھی بے حد ذہین تھی۔ بچپن سے ہی اس نے ایک سال میں دو کلاسیں پاس کرکے کم عمری میں ہی میٹرک کرلیا تھا۔

بی اے میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اس نے معرکے سر کیے تھے۔ اسے گولڈ میڈل دیا گیا۔ اخبار میں پڑھ کر سب خاندان والوں کو علم ہوا۔ مبارک بادی کا سلسلہ رہا۔ بھابھی نے مومنہ کو مبارک باد تو دی، ساتھ طنزا" کہا۔

"کوئی پروفیسر مہربان ہوگیا ہوگا۔"

عامر نے اسی وقت ماں کو ٹوکا۔ "امی! کسی پروفیسر کے مہربان ہونے سے گولڈ میڈل نہیں ملا کرتا۔ طالب علم کی لیاقت، قابلیت ہی انعام کی مستحق ہوتی ہے۔ اسے سرٹیفکیٹ بھی ملا ہے تعریفی۔"

عامر نے اور یاسر نے عائشہ کو گفٹ بھی دیے۔ ان کی امی کو ناگوار ہوا، بولیں۔ "بہن کو تو کبھی چار پیسے کا تحفہ نہ دیا۔ عائشہ نے کون سا تیر مار لیا۔ اسے بھی سب پڑھتے ہیں۔"

صدف بھی ماں کی تربیت یافتہ تھی۔ سب کے سامنے ہی بول اٹھی۔ "چچا کے اثر و رسوخ نے بھی کام دکھایا ہے۔ ورنہ۔۔۔ لگتا تو نہیں کہ عائشہ اتنی قابل ہے۔"

پھوپھی موجود تھیں، انہوں نے ڈانٹا۔ "اس کی محنت اور قابلیت کی داد دینے کے بجائے فضول الزام رکھ رہی ہو۔ فراز کو تو یہ بھی علم نہ ہوگا کہ عائشہ ہر سال ٹاپ کرتی ہے۔ کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ محکمہ تعلیم اندھا بہرا ہے۔"

"پھپھو! صدف سے پوچھیں۔ انہوں نے بھی بی اے کیا ہے۔ فیشن کے سوا اور کیا سیکھا۔ کالج سے زیادہ ہوٹلوں اور بیوٹی پارلر میں وقت گزارا ہے۔"

عامر کی سچائی ماں سے ہضم ہوئی نہ بیٹی سے۔ منہ بنا کر رہ گئیں۔ لیکن عائشہ آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ فراز تو عائشہ کے خلاف کچھ سنتا

نہیں چاہتے تھے۔ لاڈلی بیٹی تھی۔ موقعے کی تلاش میں رہیں۔

ابا نے بھی اپنے بیٹے دانیال کے لیے عائشہ کو پسند کیا۔ یہ بات بھی ناگوار گزری آخر صدف انہیں کیوں نظر نہ آئی۔ بھتیجی تو وہ بھی تھی۔ عائشہ میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔ عائشہ کے سب کلاس فیلو اس کی اتنی زبردست کامیابی پر اس سے ٹریٹ مانگ رہے تھے۔ فراز نے سنا تو بہت خوشی سے اجازت دے دی۔

"بیٹا! سب کو گھر پر بلا لو۔"

"ابا۔ سب کو؟" عائشہ کو تعجب ہوا۔

"ہاں۔ ہاں اور بھی جس کو چاہو۔ ہمارا گھر اتنا چھوٹا تو نہیں کہ اس میں تمہارے دوست وغیرہ نہ آسکیں۔"

ابا تو دریا دلی پر مائل تھے۔ عائشہ نے واقعی پوری کلاس کو مدعو کرلیا۔ ساتھ ہی عامر 'یاسر 'دانیال۔ صدف پھپھو کی بیٹی سیما کو بھی بلایا۔ صدف ان دنوں بہت مصروف تھی۔ اسے ماموں کے گھر جانا تھا (پرویز کے پھوپھا تھے۔ گھر بھی نزدیک تھا۔ ماموں کے بہانے اکثر پرویز سے ملنے چلی جاتی تھی) مومنہ نے دو دن لگ کر بہت سی چیزیں تیار کرلیں۔ کچھ خاص کھانے کی اشیا ہوٹل سے منگلنے کا پروگرام تھا۔ عائشہ گھر کی سیٹنگ میں مصروف کہ زیادہ سے زیادہ لوگ بیٹھ سکیں۔ سیما نے بھی معذرت کرلی۔

مقررہ دن اور وقت پر سب لوگ آگئے۔ فراز بھی ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ سب کا تعارف ہوا۔ ایاز 'عامر 'یاسر اور دانیال کا سب سے تعارف کرایا گیا۔ چھ لڑکے اور سات لڑکیاں آئی تھیں۔ سب نے عائشہ کو گفٹ دیے۔ وہ ایک بڑا سا پوسٹر بھی بنا کر لائے تھے۔ جس پر سب کلاس فیلوز نے عاشی کے بارے میں ریمارکس دیے تھے۔ ان لوگوں کی فرمائش پر۔ ایاز نے پوسٹر کی خالی جگہ پر خود بھی ایک لائن لکھی۔ عامر 'یاسر اور دانیال کے سامنے پوسٹر رکھا۔ انہوں نے مزاحیہ انداز میں ایک دو جملے لکھے۔

سب کی آتے ہی فریش جوس سے خاطر کی گئی۔ پھر کچھ دیر پوسٹر پر لکھنے کا سلسلہ رہا۔ آخر میں سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد عامر نے کھڑے ہو کر پوسٹر پر لکھی سب لوگوں کی آرا پڑھ کر سنانی شروع کیں۔

اس وقت وہ ایک مقرر کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر عبارت پڑھ رہا تھا۔ جب چچی اماں اپنے بیٹوں کی تلاش میں (دراصل جاسوسی کے لیے) کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں مومنہ نے بہت تپاک سے ایک صوفے پر بٹھایا۔ سب لڑکے لڑکیاں عامر کے انداز بیان اور لکھی ہوئی تحریر سن کر ہنس رہے تھے۔ مسکرا رہے تھے۔ تالیاں بجائی جارہی تھیں۔

عاشی نے چچی اماں کو دیکھتے ہی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔

کسی نے لکھا تھا۔

"کمپیوٹر پر تیز انگلیاں چلانے والی عائشہ فراز بات کرنے میں سست ہے۔"

کسی نے قابلیت کا اعتراف کیا تھا۔

کسی نے اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والی ذہانت کی تعریف کی تھی۔

لڑکیوں نے اسے بہترین دوست۔ شائستہ مشرقی لڑکی۔ کسی نے خوش نصیب بیٹی۔ نہ جانے کیا کچھ لکھا تھا اور عامر مزاحیہ انداز میں سب کے نام کے ساتھ سنا رہا تھا۔ خوب تالیاں بجیں۔

آخر میں عائشہ نے کشمیری چائے پیش کی اور پھر سب رخصت ہوگئے۔ چچی اماں کو یاسر اور دانیال کی رائے جو انہوں نے بے حد تعریفی انداز میں پیش کی تھی۔ بالکل پسند نہ آئی۔ نہ ہی عامر کا ہنس ہنس کر سب کو ہنسانے کا مزاحیہ انداز۔

مومنہ اور فراز بہت مسرور تھے۔ بے حد دلچسپ محفل تھی۔ فراز نے عامر کا شکریہ بھی ادا کیا۔ جس نے شگفتہ انداز میں محفل کو چار چاند لگادیے۔ عامر 'یاسر 'دانیال کافی دیر سے گئے۔ چچی اماں کو بیٹوں کا اس قدر دلچسپی لینا مشکوک بنا رہا تھا۔ خفگی ان کے چہرے سے ظاہر ہورہی تھی۔ گھر آکر جب پتا چلا 'صدف ابھی واپس نہیں آئی ہے تو بھائیوں کو ناگوار گزرا۔ یاسر نے کہہ دیا۔

"امی! صدف سے پوچھا تو کریں۔ اتنی دیر تک کہاں رہتی ہے۔ ماموں کے ہاں کیا دلچسپی ہے اسے۔ عائشہ نے بلایا۔ تو نہیں آئی۔ گیارہ بج گئے ہیں۔ مامی کو فون کریں۔ کیا کر رہی ہے وہاں۔ اکیلی گئی تھی۔ میں چلا جاؤں لینے۔"

مگر فون کی نوبت نہ آئی۔ وہ خوش و خرم مسکراتی ہوئی واپس آگئی۔ بہانے اس کے پاس موجود تھے۔ ماموں کے ہاں سے ایک سہیلی کے گھر چلی گئی۔ اس کے ساتھ فلم دیکھنے گئی۔ ابھی وہی چھوڑ گئی ہے۔

امی نے قہر آلود نظروں سے بیٹوں کو گھورا اور اندر چلی گئیں۔ مگر اگلے دن نند کے گھر جاکر۔ عائشہ کی بے حیائی، لڑکوں سے دوستی، سب نے اس کی بے باکی سے جو تعریفیں کی تھیں۔

"اف میں تو شرم سے زمین میں گڑ گڑ گئی۔ ماں باپ بے شرمی سے بیٹھے بیٹی کی غیر لڑکوں کی تعریفیں سن رہے تھے۔"

انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ خاصی متاثر ہو گئیں۔ دانیال کو بلایا۔ سوال جواب شروع ہوئے۔

"اچھا۔ بڑی ممانی نے آپ کو رپورٹ دے ہی دی۔ اماں آپ جانتی تو ہیں بڑی ممانی کی راست گوئی۔ چھوٹے ماموں انتہا درجے کے شریف ان کی بیگم اللہ میاں کی گائے۔ اولاد بھی ویسی ہی ہوگی۔ آپ جانتے بوجھتے ان کا یقین کرکے عائشہ سے بدظن ہو گئیں۔" اس نے تفصیل سنائی۔ "عائشہ تو تعریفیں سن سن کر جھینپ رہی تھی۔ اس نے گولڈ میڈل لیا ہے۔ استادوں کی جانب سے ایک تعریفی سرٹیفکیٹ بھی ملا ہے۔ ظاہر ہے سب کو خوشی ہوئی ہے۔ اس میں بے حیائی کدھر سے آگئی۔ اس کے کلاس فیلو اس سے ٹریٹ مانگ رہے تھے۔ بس۔"

"لیکن۔ لڑکوں کو کیوں بلایا۔ بہت معیوب بات ہے۔ جو سنے گا اعتراض کرے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اس نے صدف اور سیما کو بھی بلایا تھا۔ اور امی! اگر مجھے کوئی ایوارڈ ملا ہوتا۔ تو میں تو لڑکیوں کو بھی بلاتا۔ ظاہر ہے کلاس فیلو لڑکے لڑکیاں سب ہی ہوتے ہیں۔ لڑکوں سے کیا؟"

"لڑکے لڑکیوں میں فرق ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو محتاط رہنا چاہیے۔ اب بھابھی کو برا لگا کہ نہیں۔"

"ان کی مثال نہ ہی دیں۔ اللہ سب کو ان کے شر سے بچائے۔ اپنے گھر کی خبر نہیں۔ گیارہ بجے میں نے ان لوگوں کو ڈراپ کیا تھا۔ واپس ادھر آتے ہوئے دیکھا۔ صدف کسی لڑکے کے ساتھ گاڑی پر گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کو فل آزادی ملی ہوئی ہے۔ کیا آپ سیما کو آدھی رات تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت دیتیں؟"

"ہاں۔ میں نے بھی صدف کی آزادی پر تنقید کی تھی لیکن فراز کے گھر کا ماحول مختلف ہے۔"

امی! ماموں ممانی وہیں بیٹھے رہے۔ میں، عامر بھائی، یاسر بھی لڑکے ہیں اور امی! صدف نے بھی اسی کالج سے پڑھا ہے۔ آپ ممانی کی نکتہ چینی پر ان کی ہم نوا نہ ہو جایا کریں۔"

"اچھا بھئی۔ ٹھیک ہے۔ پھر میں ذکر کروں فراز سے۔ تمہارے رشتے کے لیے۔"

"امی! ابھی بہت وقت ہے۔ وہ کمپیوٹر انجینئرنگ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے شوق کو میں راستے میں ہی روکنے کے خلاف ہوں۔ ابھی مجھے بھی کچھ بننا ہے۔ اس کے برابر پہنچنے کے لیے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں ان کے کان میں بات ڈال دوں گی۔ اچھی لڑکیاں زیادہ وقت نہیں لیتیں۔ اگر کوئی اچھا رشتہ آگیا۔ تو فراز انکار نہیں کریں گے۔ شاید ٹائم مانگ لیں۔"

صدف کے سامنے عائشہ کے گھر کے فنکشن کا بڑھا چڑھا کر اعتراض کے ساتھ ذکر ہوا۔ دل میں تو صدف جل بھن گئی مگر گہرائی میں گئے بغیر۔ اس نے ماں کے الفاظ کے حوالے سے یہ خبر خوب نشر کی کہ عائشہ کالج کے ایوارڈ ملنے کے بعد خوب پر پرزے نکال رہی ہے۔ لڑکوں سے اس کی دوستی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور وہ تو عامر، یاسر اور دانیال کو بھی دام میں

پھنسا رہی ہے لڑکوں کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ چچا چچی کو بھی سب خبر ہے۔"

افواہیں تو پھیلنے میں لمحہ نہیں لگاتیں۔ خاندان کے لوگ خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے 'فراز اور مومنہ کو "برے وقت" سے بچنے کی نصیحت کرنے آئے۔ "بیٹی پر نظر رکھو۔ کوئی گل نہ کھلا دے۔" فراز کو یہ تکلیف دہ اطلاع بھابھی کی گواہی میں ملی۔ وہ بہت برہم ہوئے مگر... کس کی زبان پر پہرے بٹھاتے۔ بھابھی سے البتہ کھنچ گئے۔

مگر ان دنوں بھابھی اپنے گھر کے اہم معاملے میں مبتلا تھیں۔ صدف اور پرویز کی مجبوراً "شادی۔ اسی لیے انہیں خبر نہ ہوئی کہ بڑی نند صاحبہ نے اپنے بیٹے دانیال کے لیے عائشہ کا رشتہ طلب کیا ہے۔ وہ پہلے بھابھی سے ذکر کر چکی تھیں۔ اسی لیے انہیں نند سے شکوہ تھا کہ وہ صدف کے بجائے عائشہ کو کیوں پسند کرتی ہیں۔ اسی لیے وہ انہیں عائشہ سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ صدف کی ضد اور بدنامی کا خوف 'انہوں نے جھٹ پٹ شادی طے کر کے نمٹا ہی نبٹا دیا۔ لوگوں کے منہ بند کرنے کا صحیح طریقہ۔

بعد میں یہ سن کر کہ دانیال کا رشتہ مومنہ کی بیٹی سے ہونے والا ہے وہ جل بلا گئیں۔ ان کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ اودھر عامر نے من مانی کر کے سب کے سامنے ان کا سر جھکا دیا۔ اپنا سارا غصہ انہوں نے بہو پر اتارا' اور آخر عامر نے اسما کے ساتھ گھر چھوڑ دیا۔ بڑی آپا نے تو بیٹے کا رشتہ پہلے سے پروگرام کے مطابق دیا۔ فراز نے صدف کی پھیلائی ہوئی افواہ سے ڈر کر آپا سے اقرار بھی کر لیا تاکہ بدنامی کی دھول آندھی بن کر عاشی کی زندگی کو' اس کے مستقبل کی خوشیوں کو نگل نہ لے۔

☆ ☆ ☆

امریکا والی بہن کا بیٹا پاکستان آرہا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"جلال تمہارے گھر قیام کرے گا فراز۔ ایاز سے اس کی دوستی بھی ہے۔ اسے جو آرام تمہارے گھر ملے گا۔ بھائی جان یا آپا کے گھر نہیں مل سکتا۔"

فراز نے بخوشی قبول کیا۔ مومنہ کو بھی خوشی ہوئی۔ انہوں نے غور نہیں کیا کہ بھائی جان اور آپا کے گھر اسے آرام کیوں نہیں ملے گا؟ فراز مگر جان چکے تھے۔ بھابھی کی فضول گوئی سے بچنے کے لیے اور آپا کے شوہر جو جلال کے والد سے برسہابرس سے کینہ پال رہے تھے۔ کوئی موقع انہیں ذلیل کرنے کا چھوڑتے نہ تھے۔ ان کی باتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے۔ فراز کے گھر ہی سکون اور تحفظ ملتا۔

جلال آگیا۔ ان کے گھر رونق ہو گئی۔ جلال بے حد خوش مزاج اور سادہ طبیعت کا لڑکا تھا۔ لگتا نہ تھا کہ وہ امریکی شہری ہے۔ امریکا کی یونیورسٹی کا طالب علم 'بلکہ فارغ شدہ' وہ ڈاکٹر تھا۔ ہارٹ اسپیشلسٹ بننا اس کا ارمان تھا۔ اسے ابھی منزل تک پہنچنے کے لیے دو سال اور درکار تھے۔ پاکستان میں اپنے لیے گنجائش دیکھنے آیا تھا۔ دو ہفتے کے لیے۔

ایک دن تو اس نے سو کر گزارا۔ رات کو اس نے کہا۔

"آپ لوگ آرام کریں۔ میری نیند پوری ہو چکی ہے۔ میں پڑھائی کرلوں گا۔ کل سے امید ہے 'میرے سونے جاگنے کے اوقات درست ہو جائیں گے۔"

صبح سویرے مومنہ اٹھیں جھانک کر دیکھا۔ وہ پھر سو چکا تھا۔ ہنسی آگئی۔

سہ پہر کو عامر اس سے ملنے آیا۔ جلال اس وقت نہا رہا تھا۔ مومنہ کو موقع مل گیا۔ عامر کو سمجھانے لگیں۔

"عامر' ماں باپ سے علیحدگی کچھ زیادہ لمبی نہیں ہو گئی؟ بیٹا۔ کبھی کبھی ان کی خیریت معلوم کرنے گھر چلے جایا کرو۔ رفتہ رفتہ وہ بھی نرم ہو جائیں گے۔"

"جی گیا تھا۔ گالیاں کھا کر آگیا۔ اب مار کھانے کی کسر رہ گئی ہے۔" بہت خفا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ ماں باپ کی مار بھی پیار ہوتا ہے۔ غور کرو تو بھابھی کی خفگی انوکھی نہیں ہے۔ ماں

کے بہت ارمان ہوتے ہیں۔ تم نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بھابھی کمزور ہو گئی ہیں۔ بہت اعتماد تھا تم پر۔ اب غصہ نکال رہی ہیں۔"

"چچی۔ میری ماں کمزور نہیں سوئنگ ہیں۔ انہیں میری پروا نہیں۔ دیکھ لیں۔ صدف کی ضد پر اس کی شادی کر دی۔ اسما کا کیا قصور تھا۔ جو کچھ کیا میں نے کیا۔ اسما پر کیوں برس پڑیں۔ میں نے گھر چھوڑ دیا۔ انہیں کوئی پروا نہیں۔ یہ ہے ان کی مجھ سے محبت اور۔۔۔ ان کی فطرت میں محبت ہے ہی نہیں۔"

مومنہ خاموش ہو گئیں۔ بھابھی کی فطرت پر سیر حاصل تبصرہ نہ کر سکیں۔ دبی زبان سے بس اتنا کہا۔

"ماں کی ممتا کمزور ہوتی ہے۔ لچک دار ہوتی ہے۔ پہلے اپنے ابا کو راضی کرو۔ پھر انہیں۔"

عامر ہنس پڑا۔ آپ کہہ رہی ہیں 'ممتا لچک دار ہوتی ہے۔ پھر ابا کو راضی کر کے ان کو کیسے نرم کروں گا۔"

جلال آگیا تھا۔ مومنہ اٹھ گئیں۔ عامر نے پھر بھی چچی کی نصیحت پر عمل کیا۔ مگر۔۔۔ وہ سخت گیر باؤں میں سے تھیں۔ ان کے پندار پر ضرب پڑی تھی۔ لیکن باپ کو منانے میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے وعدہ کیا۔ وہ اور یاسر بلکہ صدف بھی ماں پر دباؤ ڈالیں گے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

جلال کی آمد پر مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب ملنے آئے۔ دعوتوں کا بھی سلسلہ چلا۔ جس کو وہ ٹالتا رہا۔ مگر بڑے ماموں 'بڑی خالہ کو تو ٹالا نہیں جا سکتا۔ دونوں جگہ اسے رہنے روکنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس نے ایاز کا بہانہ کر کے انہیں بھی خاموش کر دیا۔ ایاز اسے مختلف جگہوں پر لے جاتا تھا ہسپتالوں 'اکیڈمیز۔ لوگوں سے ملواتا۔ اس نے کہا کہ ایاز کی معلومات بہت ہیں۔ اس کی واقفیت بھی بہت ہے۔

"چھوٹے ماموں! ایاز تو بہت باخبر اور بارسوخ ہے۔ میں تو اس کی ذہانت اور خلوص کا قائل ہو گیا۔ ایاز نے مجھے ایسے ایسے آئیڈیاز دیے ہیں کہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ ویل ڈن ایاز۔"

"ارے بیٹا۔ ایاز تو خیر ہم حیران ہو گئے عاشی اس قدر ذہین اور قابل ہے۔ اسے کالج کی طرف سے گولڈ میڈل ملا تھا۔ اور تعریفی سرٹیفکیٹ بھی۔"

"اوہ۔ واقعی میں عاشی کو نظر انداز ہی کرتا رہا۔ دراصل۔۔۔ ہم ترقی یافتہ ممالک میں جا بسنے والے لوگ اس شبہ میں مبتلا رہتے ہیں کہ پاکستان کم ترقی یافتہ ہے اور یہاں عورتوں کو حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ وہ تعلیم سے عاری ہیں۔ اور کم فہم۔ سائنسی ایجاد سے نابلد ہیں۔ لیکن چند دن میں ہی مجھے اپنی غلط فہمی کا پتا چل گیا۔ جہاں جہاں میں گیا۔ اعلا تعلیم یافتہ خواتین اونچے عہدوں پر نظر آئیں۔" خاصا مرعوب تھا۔

اس روز اس نے عائشہ کی کلاس لے ڈالی۔ اور بہت متاثر ہوا۔ مہمانوں کی آمد اور عاشی کا سب کی خاطر مدارت میں دوڑنا۔ کبھی شربت کبھی چائے 'ساتھ ہی لوازمات۔ پھر سب کے جانے کے بعد پڑھائی میں غرق ہو جانا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا۔ تم بس۔ کھانا بنانے۔ اور گھر کے کاموں میں ہی ایکسپرٹ ہو۔ پڑھتے ہوئے یا کالج وغیرہ جاتے دیکھا نہیں۔"

"میں یونیورسٹی جاتی ہوں۔ اتفاق سے آج کل چھٹیاں ہیں۔ اور گھر کے کام 'کھانا بنانا وغیرہ تو سب لڑکیوں کو آتا ہی ہے۔ میں تو دراصل اس لیے بھی یہ کام کرتی ہوں۔ تاکہ امی کو کچھ نہ کرنا پڑے۔ انہیں آرام کرنا چاہیے۔ پوری زندگی کرتی رہی ہیں اور یوں بھی ہماری ملازمہ آج کل چھٹی منا رہی ہے۔ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اس لیے مجھے سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔"

"میری وجہ سے تمہیں پڑھائی کا وقت نہیں ملتا۔ سوری۔ لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ کام کا بوجھ تم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ تمہیں موقع ملا تھا۔ چھٹیوں میں اپنی کمی پوری کرنے کا۔ تو میں آگیا۔ اب۔۔۔ اگر کوئی مہمان آیا۔ تو میں خود چائے

وغیرہ بنالوں گا۔ فریج سے مدد لے لوں گا۔ تم اپنا حرج نہ کرنا۔" جلال واقعی شرمندہ تھا' عائشہ کو ہنسی آگئی۔

"آپ کیا کریں گے۔ فریج سے مدد یعنی کہ۔۔۔"

"یعنی کہ' فریزر میں کباب ہیں۔ سموسے یا اسی ٹائپ کی کچھ چیزیں۔ میں فرائی کرلوں گا۔"

"اچھا۔ آپ۔۔۔ مگر ہمارے پاکستان میں مردوں کا کچن کے کام کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ آپ کچن کا رخ کریں گے۔ ادھر امی ہائے ہائے کرتی پہنچ جائیں گی۔"

"وہاں امریکا میں۔۔۔ میں اور ابو کچن کے کام میں امی کی مدد کرتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے؟ میں ہر کھانے کی چیز فرائی کرلیتا ہوں۔ ضرورت پڑے تو کچھ پکا بھی لیتا ہوں۔ یا یوں کہو پکا سکتا ہوں۔ روٹی نہیں پکا سکتا' امی نہ ہوں اور بہت بھوک ہو تو شاید۔ کوشش کرلوں گا۔"

"یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ میں امریکا میں تو ہوں نہیں۔ جو آپ کی کوشش دیکھ کر تا دوں یا دیکھ کر اندازہ لگاؤں کہ آپ کی کوشش کتنی کامیاب ہوئی۔" عائشہ ہنسی۔

"آج کے دور میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ امریکا اتنا بھی دور نہیں کہ تم وہاں آہی نہ سکو۔ میں شرط لگا کر کہتا ہوں۔ تم امریکا آؤ گی۔۔۔ بلکہ تمہیں آنا پڑے گا۔"

عاشی کھلکھلا کر ہنسی۔ "آپ کو روٹی پکاتا دیکھنے کے لیے؟"

جلال نے کندھے اچکائے۔ پھر کہا۔ "اوہو۔ باتوں میں کتنا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ چلو پلیز تم پڑھو۔ اور اب بالکل تکلف نہیں۔ آرام سے۔۔۔ میں کسی کے شوق علم میں خارج ہونے کا قائل نہیں ہوں۔"

"آپ کی اردو۔۔۔ قابل تعریف بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔" عاشی کو اس کی اردو پر حیرت بھی۔

"میں اردو لٹریچر کا بہترین طالب علم رہ چکا ہوں۔"

"امریکا میں اردو لٹریچر کا طالب علم۔" عاشی کو یقین کرنا پڑا۔ امریکا واقعی دور نہیں۔

✡ ✡ ✡

چچی اماں آئی تھیں۔ عاشی کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ اگر جلال کو اس سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو کہانی بنانے میں دیر نہیں لگائیں گی۔ وہ تو اپنے کام سے آئی تھیں۔ عامر اور اسما ان کے گھر واپس آگئے تھے۔ عامر نے اب ایک فرمائش کی تھی۔ جس طرح اسما کو سسرال والوں نے قبول کرلیا تھا۔ اسما کے والدین کو بھی عامر کو بطور داماد قبول کرنا چاہیے۔ عامر نے کہا تھا۔

"امی! چچی کو ساتھ لے کر جائیے۔ وہ نرمی سے بات کریں گی۔ اچھی طرح سمجھائیں گی۔"

اس پر انہوں نے کہا۔ "کیوں ان کو ساتھ جانے کی کیا ضرورت۔ سو میں تیسرا" آنکھوں میں ٹھیکرا۔ میں کیا بات نہیں کرسکتی۔ بھیڑیا ہوں جو اسما کے ماں باپ کو چیر پھاڑ دوں گی۔"

"نہیں امی! اس لیے کہ ان لوگوں کو خبر ہو جائے۔ ہمارے خاندان والے سب اسما کو قبول کرچکے ہیں۔ کئی لوگ جائیں گے تو شاید ان پر کچھ اثر ہوگا۔"

"تم اپنی پھپھو کو جاکر بلالاؤ۔ وہ زوردار آدمی ہیں۔ ان کا اثر زیادہ ہوگا۔"

پھپھو نے صاف انکار کردیا۔ "نا بابا! میں بھابھی کے معاملے میں دخل نہیں دوں گی۔ کل کو میری جان کو آجائیں گی۔ کہہ کر مکر جانا ان کی عادت ہے۔ میری نہیں۔ وہاں جاکر میرے منہ سے کوئی بات ایسی نکل گئی جو انہیں برداشت نہ ہوئی تو۔ عزت اتار کر رکھ دیتی ہیں۔"

پھپھو کے انکار کے بعد امی مجبورا" چچی کی طرف گئیں۔ مومنہ بخوشی تیار ہوگئیں۔ بعد میں عائشہ نے ٹوکا۔

"امی! آپ بھی سب بھول گئیں چچی اماں کی ہرزہ سرائی۔"

ایاز نے مگر مخالفت نہ کی۔ "چچی اماں خود آئی تھیں۔ انکار بھی مناسب نہیں۔"

دو دن بعد چچی اماں عامر اور اسما کے ساتھ مومنہ کو لینے آئیں۔ عامر اور اسما جھجک رہے تھے۔ چچی اماں نے تیکھی آواز میں کہا۔

"دیکھو بھئی۔ تمہارے کہنے پر میں جا تو رہی ہوں۔ اگر انہوں نے میری بے عزتی کی۔ تو۔ بھئی کر بھی سکتے ہیں۔ میرے بیٹے ہو۔ اور میں جہاں تک ہوا' کوشش کروں گی' مان گئے تو ٹھیک نہ مانے تو جائیں بھاڑ میں۔ غلطی تم نے کی ہے۔ تو سزا بھی تم دونوں بھگتو۔"

☆ ☆ ☆

خلاف توقع اسما کے والدین بہت تمیز سے' خوش اخلاقی سے پیش آئے تھے۔ کچھ امید بندھی۔ اسما نے باپ سے رو رو کر معافی مانگی۔ پھر ماں سے لپٹ گئی۔ مومنہ نے بھی اسما کی ماں کو گلے لگایا اور کہا۔

"بہن! بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے۔ کم عمری نا سمجھی' نا تجربے کاری سمجھ لیں۔ مگر بڑوں کو بھی دل بڑا کرنا چاہیے۔ ہمیں بھی اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔ بجائے انہیں سزا دینے کے۔ انہیں غلطی سدھارنے کا موقع دینا چاہیے۔ یہ اپنی جلد بازی کی سزا بھگت چکے ہیں۔ ہم بھی ان سے خفا تھے مگر اب یہ شرمندہ ہیں۔ اور عقل آگئی ہے' اگر سب کو پہلے ہی منا لیتے۔ تب بھی قسمت میں تو یہ شادی ہونی ہی تھی۔ سب کی مرضی سے' خوشی سے ہو جاتی۔ جوڑے تو آسمانوں پر تجویز ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اسما کو خوش دلی سے قبول کر لیا ہے۔ آپ بھی عامر کو معاف کر کے فراخ دلی کا ثبوت دیں۔"

اسما کی امی نے تواتر سے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑا قصور کیا ہے۔ معمولی غلطی نہیں ہے۔ ہم نے اپنی بیٹیوں کی تربیت ایسی تو نہیں کی تھی۔ خاندان میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ آپ سوچیں' کتنا سخت وقت ہم نے گزارا ہے۔ اس کرب کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

"بہن! ہم بیٹیوں والے ہیں۔ آپ کے دکھ اور صدمے کا احساس کر سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے گناہ نہیں کیا' باقاعدہ نکاح کیا ہے۔ ان کو غلط فہمی ہو گئی کہ شاید آپ ان کا رشتہ قبول نہ کریں۔ یہ ان کی کم عقلی تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو قدرت ان کا ساتھ دے رہی تھی تب ہی نکاح ممکن ہوا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی دل بڑا کر کے انہیں معاف کر دیں۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح مل جل کر خوشی منائیں۔ سب سے الگ رہ کر' خاندان سے جدا ہو کر کافی تکلیف اٹھائی ہے۔ چھپ کر چوروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے دونوں۔"

اسما کی ماں نے تفصیل سے اپنی اذیت اور رسوائی کی ذلت۔ ہر کسی کی نظر میں حقارت' طعنے' کیا کچھ برداشت کیا۔ زندگی سے نفرت ہو گئی۔ راتوں کی نیند حرام' دن کا چین حرام ہو گیا۔ کس طرح خوشی منا سکتے ہیں۔ خود سری کی سزا بھی ہونی تو چاہیے۔

کتنی دیر ڈائیلاگ چلے۔ اسما کے ابا بالکل خاموش تھے۔ مگر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ بارے عامر کی امی نے ان کے کھڑے ہوتے ہی (انداز کھڑے ہونے کا یہی تھا کہ بات ختم) خود بھی کھڑے ہو کر ان سے کہا۔ بہت لجاجت کا لہجہ اپنایا۔

"بھائی صاحب! میں آپ سے بڑی ہوں عمر میں۔ صرف یہ کہنا چاہتی ہوں' سانپ گزر گیا۔ لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اپنے بیٹے کی نادانی کے لیے میں آپ سے معافی کی درخواست گار ہوں۔ ساتھ ہی ایک تجویز بھی آپ کی نذر کر رہی ہوں۔ آپ کو جو سزا دینا ہو۔ جس طرح آپ کی تسلی ہو' اسے سزا سنا دیں' ماریں یا بیٹی کو روک لیں۔ اگر یہ بھی نہیں تو میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیں' میری غلط تربیت' لاپروائی' اندھا اعتماد اس منزل تک لے آیا ہے' دراصل سزا کی حق دار میں ہوں' بن رہی ہوں میں' آپ اپنا فیصلہ سنائیں۔ ہر سزا مجھے قبول ہو گی۔ یا پھر رحم کی اپیل منظور کر لیں۔"

عامر اور مومنہ حیران انہیں دیکھ رہے تھے۔ اسما رونے لگی۔ اس کے ابا کا تو عجب حال تھا۔ بے چارے لڑکھڑا گئے۔ حواس باختہ سٹپٹا کر بولے۔

"کیا ابا کہہ رہی ہیں۔ بس! آپ اس طرح مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ نے بھلا... میں تو خود شرمندہ ہوں۔ میری بیٹی نے مجھے سب کی نظروں میں ذلیل اور حقیر کردیا ہے۔ کیسے بھلاؤں اس ذلت کو... آپ بھی مجھے سزا دیں۔ ایسی بیٹی جو رسوائی کا سبب بنے۔ ایسے باپ کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ میں حیران ہوں کہ اب تک زندہ کیوں ہوں؟ مجھے اسی دن مرجانا چاہیے تھا۔ جب یہ میرے گھر سے باہر نکلی۔ اس محفوظ قلعے کی فصیلیں اتنی کمزور نکلیں، کس آسانی سے نقب لگائی اس نے۔ میں نے مجبور ہوکر اپنی چھوٹی بیٹیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے عزت کی خاطر انہیں..."

برداشت نہ کرسکے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اسما کی ماں بھی آنسو بہا رہی تھیں۔ مومنہ اور عامر ہکابکا کھڑے ہوگئے۔

"کاش کہ بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد... انہیں مار دینے کا قانون ہوتا۔ مگر میں نے انہیں جیتے جی مار دیا۔ اپنے ہاتھوں سے۔"

اسما کے والد کا ضبط جواب دے گیا۔ نڈھال ہوگئے۔ اسما کانپ رہی تھی۔ اس کی امی نے اس کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور حیران پریشان مہمانوں سے کہا۔

"یہ بہت گھبرا گئے تھے۔ غصہ اور جلال ان کی فطرت میں ہے۔ بغیر سوچے سمجھے غصے میں کچھ بھی کردیتے ہیں۔ اسما کے اقدام سے ڈر گئے... انہوں نے اپنے نکمے میٹرک فیل بھانجوں کے ساتھ نکاح کرکے رخصت کردیا۔ وہ روتی رہیں، خوشامد کرتی رہیں کہ یہ ظلم نہ کریں۔ میری بی اے پاس بیٹیاں نکمے، نکھٹو، جاہل لڑکوں سے بیاہ دیں عزت کے نام پر۔ یہاں غیرت کے نام پر قتل ہوجاتے ہیں۔ میری بیٹیاں ایک نادان لڑکی کے غلط قدم اٹھانے پر عزت کی خاطر... بے قصور، بے گناہ اس کی بہنیں... ساری عمر بڑی بہن کی خودسری کی سزا بھگتیں گی۔"

مومنہ نے ان کو ساتھ لگالیا۔ تاسف اور دکھ کے بے پایاں احساس نے ان کی آواز بھی سلب کرلی۔ اب اسما اس کی ماں اور باپ تینوں رو رہے تھے۔ کچھ دیر سناٹے میں گزرے پھر اسما کے والد نے خود پر قابو پاکر بھابھی سے کہا۔

"آپ نے درست کہا۔ سانپ گزر گیا۔ لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ میں بھی اب اسی نتیجے پر پہنچا ہوں جو ہوگیا۔ اس پر پچھتانا، خود کو اذیت دینا ہے۔ بہت اذیت اٹھاچکا تھا میں۔ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ میں اپنے غصے اور جلال پر شرمندہ ہوں۔ جلد بازی کے فیصلے پر بھی شرمندہ ہوں۔ آپ لوگ آئے۔ آپ نے میری بیٹی کو معاف کردیا۔ قبول کرلیا۔ میرے لیے یہ کسی احسان سے کم نہیں، شاید میں کم ظرف ہوں۔ تنگ دل ہوں۔ آپ کی فراخ دلی کا ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے سبق دیا ہے آپ کا شکریہ۔"

انہوں نے اسما کو گلے لگالیا۔ عامر کو بھی لپٹالیا، پھر سب کچھ ٹھیک ہوگیا، اور سب خوش خوش واپس آگئے۔ بڑا معرکہ سر ہوا تھا۔ مومنہ کے خیال میں اس کا سہرا بھابھی کے سر بندھا۔ مگر اسما رنجیدہ تھی، عامر بھی۔ ان کے کیے جرم کی سزا بے چاری اسما کی بہنیں تاحیات قید کی طرح گزاریں گی۔"

✡ ✡ ✡

چچا ابا نے ولیمہ کا انتظام کیا۔ خاصا اچھا فنکشن تھا۔ اسما کے والدین بھی شریک ہوئے اور اسما کی بہنیں بھی۔ جلال واپس چلا گیا تھا۔ ولیمہ میں صدف آئی تھی مگر خوش نہ تھی۔ اس کا شوہر تو آیا ہی نہیں۔ اس کی غیر موجودگی نے سب کو چونکا دیا۔

ایاز کو بہت ہی زبردست جاب مل گئی تھی۔ غیر ملکی کمپنی تھی۔ مومنہ تو خوش تھیں ہی ابا جان بھی آخر کار مان گئے۔ ایاز ابا کے کمرے کے لیے اے سی لے آیا۔ جو ابا نے خاصے نخروں سے لگوایا۔

اگلے ماہ نیا فریج آگیا۔ قسطوں پر گاڑی لے لی۔ چچی نے اب پھر دیور سے ناتا جوڑ لیا تھا اکثر آکر شام کی چائے ان کے ساتھ پی کر ممنون احسان کرتیں۔ ایاز کی جاب، گھر کے بدلتے حالات انہیں حسد میں مبتلا کرچکے تھے۔

"تمہارے بیٹوں کو کوئی ہوش نہیں۔ ایک نے بیوی
پال لی' دوسرے کے اپنے شوق پورے نہیں ہو رہے۔
تو گھر کے لیے کیا کریں گے۔ باپ کے بڑھاپے کی بھی
فکر نہیں۔ ارے ماں کی پروا نہیں۔"
"چچی اماں' بہت مہربان ہو رہی ہیں۔ اللہ خیر کرے۔
گھر شاید بھابھی کے حوالے کر دیا ہے۔"
"صدف بھی تو ہیں۔" عاشی نے یاد دلایا۔
"ہاں بالآخر لو میرج کے غبارے سے ہوا نکلی۔ یہ
ہوتا ہے اپنی مرضی کے گھوڑے پر سوار ہونے کا
انجام۔" ایاز کو صدف سے ہمدردی تھی۔
"بھائی! سب کا انجام برا ہی نہیں ہوتا۔ آخر عامر
بھائی بھی تو ہیں۔ اب تو سسرال کے راستے بھی کھل
گئے۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔" عاشی اور ایاز کو
مومنہ نے اسما کے گھر کے حالات نہیں بتائے تھے۔
انہیں تو بہت ہی افسوس ہوا تھا وہاں سے آکر۔
"ارے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ تیل
دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ آگے آگے دیکھیے۔"
"بھائی! اسما بھابھی بہت سمجھ دار اور صابر
ہیں۔ صدف تو اپنی تنک مزاجی اور غرور کی وجہ سے
رشتہ نہ نبھا سکی۔ ورنہ اتنی جلد ناچاقی نہیں ہوتی۔
ولیمہ والے دن دیکھا تھا۔ خواہ مخواہ غصہ کری دکھا رہی
تھیں۔ بھلا عامر بھائی اور اسما بھابھی کا کیا قصور تھا
خیر چھوڑیں یہ ذکر۔ اس مہینے میرے لیے کیا لائیں
گے۔"
"جس چیز کی تمہیں ضرورت ہے۔ بتاؤ۔"
"مجھے ہر چیز کی ضرورت ہے۔ مشہور بوتیک سے
اچھے اچھے سوٹ۔ میچنگ پرس' سینڈل وغیرہ۔"
"خود ہی لے لینا۔ مجھے شاپنگ کی عقل نہیں
ہے۔" ایاز نے اچھی خاصی رقم اسے دے دی۔ وہ
ایک کنجوس بوتیک سے ایک ہی سوٹ لے کر
آئی۔ بقیہ رقم آڑے وقتوں کے لیے بچالی۔ ایاز نے
پوچھ لیا۔
"کون سا آڑا وقت تم پر آنے والا ہے۔ میں پھر بھی
دے سکتا ہوں۔"

"ہائے بھائی۔ اگر تو۔ میرا آڑا وقت آ ہی گیا تو
۔۔۔ آپ سے بھی خاصی رقم بٹورنی پڑے گی۔ اس لیے
آپ کی سہولت کے لیے۔ میں بھی جمع کر رہی ہوں
تاکہ آپ پر بوجھ کم پڑے۔"
"اچھا۔ تو اب بتا ہی دو۔ کون سا آڑا وقت ہے وہ۔"
"میری امریکا روانگی۔" اطمینان تھا لہجے میں۔
"کیا؟ امریکا؟ کب؟ کیوں؟"
"اعلا تعلیم کے لیے سوچ رہی ہوں۔ یہاں کمپیوٹر
انجینئرنگ کمپلیٹ ہو جائے۔ تو امریکا جا کر وہاں کسی
یونیورسٹی کی ڈگری بھی لے لوں۔ چند ماہ پڑھنا ہی پڑے
گا۔ بس۔"
"اور وہاں کی ڈگری لے کر کرو گی کیا؟ فائدہ کیا
ہو گا۔"
"خاندان والوں پر رعب ڈالوں گی۔ اور شاید اپنی
اکیڈمی کی داغ بیل بھی ڈالوں گی۔ مجھے بہت سارا پڑھنا
ہے اور بہت سا کام کرنا ہے تعلیم۔ ابو کا پیسہ ضائع
نہیں کروں گی۔ حق ادا کروں گی۔"
"خیر یہ تو تمہارا حق ہے فرض ہے لیکن کیا تمہیں
اس کی اجازت ملے گی؟ سسرال سے۔"
سوال تیکھا تھا۔ عاشی ایک منٹ چپ رہی۔
"ترقی تو میرا ارمان ہے بھائی! سب کا ہی فائدہ ہے
اس میں۔ جلال بھائی کہہ رہے تھے۔ اب بھی مجھے
وہاں کسی بھی یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا ہے
۔ کوشش تو کرنی چاہیے۔ وہ خود بھی معلومات حاصل
کرنے کے بعد مجھے بتائیں گے۔"
"جلال بہت گریٹ ہے۔ بے حد قابل اور حساس
وہ یہاں ایک اسپتال تعمیر کر کے اپنے وطن کو تحفہ دینا
چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں تو آیا تھا مگر تمہیں اجازت
ملے گی۔ اس میں مجھے شک ہے' اندازہ لگانے کے لیے
ابو سے ہی پوچھ لو یا صرف ذکر ہی کر دو۔"

✲ ✲ ✲

چچی اماں اس بار آئیں تو پوچھنے لگیں۔ "اس مہینے
ایاز کیا لایا؟"

"بھابھی! گرمی بہت ہے اور آپ کو پتا ہے' آپ کے دیور کس قدر نازک مزاج ہیں۔ لوڈشیڈنگ نے زندگی عذاب کردی ہے تو میں نے ایاز سے کہا۔ بیٹا ایک جنریٹر کی ضرورت ہے۔ بس وہ فوراً" لے آیا۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ گیٹ کے پاس لگایا ہے۔"

ان کو تو مومنہ کا لہجہ فاتحانہ لگا تھا۔ تلملا گئیں۔ مگر مومنہ بہت انکساری سے بات کرتی تھیں۔

گھر جاکر انہوں نے بیٹوں کو بلایا۔ ان کے والد کے بڑھاپے کا ذکر کرکے اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ ایاز کی کارکردگی پر تبصرہ کیا۔ اپنی ضروریات کی تفصیل بتائی۔

"امی! مجھ سے تو امید نہ ہی رکھیں۔" عامر نے صاف جواب دیا۔ جو حقیقت تھی۔ "مجھ پر تو آفس کا قرضہ ہی بہت ہے۔ سوچا تھا کرائے کے گھر سے چھٹکارا ملے گا۔ کرایہ بچے گا۔ وہاں جو اخراجات تھے۔ ان میں کمی ہوگی مگر ایسا کب ہوسکا۔ ابا کا واقعی آرام کرنے کا وقت ہے۔ انہوں نے جاب چھوڑ دی۔ اچھا کیا۔ جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے انہیں کیا ضرورت کیسے... بڑھاپا خوار کریں۔ میری تنخواہ گھر میں ہی خرچ ہوتی ہے۔ بچت ہوتی ہی نہیں۔"

عامر تو دامن جھاڑ بیٹھے۔ یاسر نے بھی جتا دیا۔

"امی۔ دوسروں سے مقابلہ نہ کیا کریں۔ ایاز کی تعلیم مجھ سے زیادہ' اس کی جاب مجھ سے بہتر' اس کا اپنا کوئی خرچا نہیں۔ نہ وہ سگریٹ پیئے' نہ فلمیں دیکھے' نہ دوستوں کے ساتھ ہوٹلنگ کرے۔ اس کی تو بچت ہی بچت ہے۔"

امی ہاتھ ملنے لگیں۔ یاسر نے یاد دلایا۔ "آپ ہمیشہ اعتراض کرتی تھیں۔ ایاز کے دوست اس کے کمرے میں ڈیرہ جمائے رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا کرتے ہیں۔ گھر میں بہن کا بھی خیال نہیں۔ دیکھ لیں۔ ہمیں آپ نے کھلا چھوڑ دیا۔ باہر دوستوں کے ساتھ کچھ بھی کرتے پھریں۔ بس گھر میں دوست نہ آنے پائے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ وہاں چچی ایاز پر چیک رکھتی تھیں۔ لڑکے پڑھ کر سب تتر بتر ہوگئے۔ یہاں جو ہوا۔ آپ دیکھ رہی ہیں' صدف کے پرزے نکالے

آپ نے پروا نہ کی۔ آپ تو دوسروں کے عیب ڈھونڈ ہی ڈسکس کرتی رہیں۔ کاش آپ نے بھی چچی جیسی تربیت ہماری کی ہوتی۔ ہم پر چیک رکھا ہوتا۔ تو آج ہاتھ نہ ملتیں۔"

چچی آگ بگولہ بنی سنتی رہیں۔ پھر دانت کچکچا کر چپل کھینچ ماری۔ جو اس نے کیچ کرلی سہولت سے۔ اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ چیختی رہیں۔

"ارے بدبخت! میری چپل تو دے جا۔"

باہر سے یاسر کی آواز آئی۔

"اب پچھتائے کیا ہوت۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" سُر سے گا رہا تھا۔ امی سر تھام کر رہ گئیں۔

"نالائق اولاد' چپ ہوجا' دو انڈے' دونوں گندے۔"

"گندے انڈوں کو ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ اپنی بیٹی کی فکر کریں۔ اعلا و ارفع داماد اب دوسری شادی کے چکر میں ہیں۔"

باہر سے آواز آئی۔ ساتھ ہی چپل بھی اڑ کر عین ان کے قدموں میں۔ خوفناک خبر۔ وہ صدف کو پکارنے لگیں۔ وہ فوراً" آئی۔ مرجھائی ہوئی۔ ستا ہوا چہرہ نم آنکھیں انہوں نے نظر جرالی۔ ہاہ کیا تروتازہ شاداب چہرہ تھا میری بچی کا۔ خدا غارت کرے پرویز کے گھر والوں کو۔"

"چلو تیار ہوجاؤ۔ آج عارف کی طرف چلیں۔ میں روحی سے پوچھوں تو سہی۔ ان کے بھائی بھتیجے کے ارادے۔"

"بھائی کے ولیمے میں ملی تھیں آپ۔ پوچھ لیا ہوتا۔" تیز لہجہ تھا۔

"پوچھا تھا' آئیں بائیں شائیں کرکے ٹال گئیں۔ موقع نہ تھا کہ کرید تی۔ اب عارف کے سامنے بات کروں گی۔ عارف سے بھی کہوں گی' اپنا کردار ادا کرے۔"

"کیا فائدہ.... ماموں نے تو گارنٹی نہیں دی تھی۔ میرا اپنا فیصلہ تھا' سزا بھی مجھے ملے گی۔ امی میں تو نا سمجھ' ناپختہ عقل تھی۔ آپ ہی مجھے زبردستی' سختی سے منع

کردیتیں۔ اگر وہ آپ کو پسند نہ تھے۔ تو مجھے مجبور کرتیں۔ دنیا کی ہر ماں ایسا کرتی ہے تو آپ کیوں نہیں کرسکیں۔ آپ نے بھی جھٹ پٹ مجھ سے جان چھڑائی۔"

صدف اٹھ کر چلی گئی۔ وہ چپ رہ گئیں مگر بیاسر کی خبر ایسی نہ تھی کہ چپ رہتیں۔ اکیلی ہی بھائی کے گھر جا پہنچیں۔ ان کے سامنے صدف کے لیے اپیل کی "کچھ کرو عارف! میری بچی کا کیا قصور ہے بھائی رنجیدہ ہوگئے۔

"آپا! قصور شاید اس کی قسمت پر ڈال کر مطمئن ہوجاتے۔ اگر اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ ہوتا۔ کہتے ہیں نا کہ خود کردہ را علاج نیست۔ بے جوڑ شادیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ آپ نے اس وقت تو نہ کسی سے پوچھا۔ نہ صلاح لی۔ مجھ سے ہی ذکر کرتیں۔ آپ روحی سے تو واقف تھیں۔ ان کا گھرانہ خاصا بیک ورڈ ہے۔ خصوصاً" روحی کی بھابھی، صدف کی ساس، جو ایک مولوی کی بیٹی ہیں۔ میں ان کو بھی الزام نہیں دے سکتا۔ بہت معقول طور طریقے والی خاتون ہیں۔"

بمن سر جھکائے بستر کا ان دیکھا دھاگا نوچنے کا تاثر دیتی ہوئی، سوچتی ہوئی، فکر مند لگیں۔

"میں نے تو بیٹی کی خوشی اس کی مرضی دیکھی۔ رسوائی سے بچنے کی کوشش....."

"آپا! بچوں کی ہر خواہش آنکھ بند کرکے پوری کرنے کا نتیجہ یہ ہی ہوتا ہے۔ کاش کہ اسے کچھ عقل سکھائی ہوتی۔ مائیں تو بیٹیوں کو بہت نصیحتیں کرتی ہیں لیکن ہوا یہ کہ اس نے بھی وہی طریقہ اپنایا۔ جو معاف کیجئے آپ کا ہے۔ سسرال کو کم تر سمجھنا۔ زبان اس کی بھی وہی ہے۔ جو آپ کی ہے۔ خود پر غرور کرنا۔ آپا ان جاہی بہو کو تو بہت احتیاط سے سسرال والوں کے دل میں جگہ بنانی پڑتی ہے۔" عارف کا لہجہ دھیما مگر بات تلخ تھی۔

روحی بھی آکر گفتگو میں شریک ہوگئیں۔

"آپا... معاف کیجئے، صدف نے خود کوشش ہی نہ کی۔ رہنے کی۔ نہ بسنے کی، ورنہ میری بھابھی دشمن نہیں، جب ہنسی خوشی بارات لے آئیں، بیٹے کی خوشی کی خاطر، انہوں نے اپنی پسند اور خواہش کو پس پشت ڈال دیا۔ تو... صدف کچھ تو احترام کرتی۔"

"روحی! تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ کیا اکیلی صدف قصور وار ہے، تم میرے رشتے سے نہ سہی۔ پرویز کی پھوپھی ہونے کے ناتے تو صدف کو سمجھاتیں۔ ان لوگوں کے طور طریقے۔"

"بہت سمجھایا آپ کو شاید صدف نے نہ بتایا ہو... آپا! آپ نے بھی تو ان چاہی بہو کو قبول کرلیا۔"

"ہاں تو ہم نے تو قبول کرلیا۔ مگر تمہاری بھابھی... انہوں نے کیا کیا؟ میری بچی کو نکال باہر کیا۔"

"انہوں نے نہیں نکالا۔ آپا یہ کام آپ نے پہلے اسما کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن پھر لے آئیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ لیکن صدف کے معاملے میں بھابھی کا قصور نہیں۔ صدف کی بدزبانی، ضد اور خود پرستی بھابھی نے تو بخوشی شادی کی تھی یہ سمجھ کر کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ لیکن صدف نے پرویز سے ہی ضد باندھ لی۔ پرویز کا صدف سے ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ اس کے ماں باپ کو احترام اور عزت سے مخاطب کرے۔ اپنے ماں باپ کی طرح سمجھے۔ مگر صدف کو سب سے چڑ ہے۔ کسی کو گردانتی نہیں۔ سب کو ذلیل اور کمتر سمجھتی ہے۔ اب اس نے الگ گھر کا مطالبہ کردیا۔ پرویز نے بہت سمجھایا، مگر اس کی ضد اور ہٹ دھرمی نے گھر کا سکون تباہ کردیا۔ خود ہی گئی ہے، کسی نے جانے کا نہیں کہا۔"

"صدف نے تو مجھے یہ نہیں بتایا۔" وہ کچھ حیران ہوئیں۔ "عارف! تم کیا کہتے ہو۔"

"میں کیا کہوں۔" عارف ہچکچائے۔ "وہ مجھے بھی اپنا ماموں نہیں سسرالی سمجھتی رہی۔ آپا! میں آپ کے گھر گیا تھا، آپ کی بہو نے سلام کیا، بٹھایا، چائے بنالائی، آپ تھیں نہیں، وہ پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ بہت تمیز اور اخلاق سے۔ مجھ سے میرے بچوں کا پوچھا۔ روحی سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ آپ کی تعریف کرتی رہی۔ میں تو حیران ہوا۔ خوشی ہوئی۔ عامر نے جلد

بازی کی لیکن اچھے خاندان کی شائستہ لڑکی کو ہماری بہو بنایا ہے۔ آپا! میں آپ کو آج بتا رہا ہوں۔ صدف نے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ صرف اپنی سسرال سمجھا۔ لاتعلق۔ پھر آپ سوچیں اپنی ساس نندوں سے کیا سلوک ہوگا۔ خیر مجھے اس سے بھی غرض نہیں۔ لیکن میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ جب ان کے گھر جاکر صدف کی بدزبانی اور ہٹ دھرمی دیکھتا ہوں۔ لگتا نہیں کہ اس کا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہے۔ بھابھی کہتے ہوئے شرما جاتا ہوں۔"

"اور وہ جو دوسری شادی کرنے والا ہے۔" آپا کو نئی شکایت یاد آئی۔ جس کا سن کر آئی تھیں۔

"دیکھو عارف! بری بھلی ہے۔ جیسی بھی ہے۔ تم اس کا گھر اجڑتے دیکھ کر بھی خاموش رہو گے؟" آنسو بھر آئے آخر ماں تھیں۔ بھائی بھابھی متاثر ہو گئے۔

"ٹھیک ہے آپا! آپ کے حکم کو ٹالنا۔ میرا منصب نہیں۔ کوشش کروں گا' لیکن کامیابی کا دارومدار صدف کے رویے پر ہے۔ آپ اس سے پوچھیں کیا وہ معافی مانگ لے گی ساس سے بدتمیزی کی۔ کیا پرویز کو منانے پر سنجیدہ بھی ہے؟ وہ سب کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہے۔ آپا! کچھ پانے کے لیے تھوڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں۔ وہ خوش رہے۔ اس کا گھر آباد ہو۔ کوئی بھی لڑکی میکے میں کب تک رہ سکتی ہے۔ لیکن اسے یہ بات سمجھانے میں آپ کامیاب ہو گئیں۔ تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ پرویز کو سیدھا کرنا مشکل نہیں۔"

عارف کی بات درست تھی۔ مگر وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔ وہ تو خود صدف کو الگ رہنے کی تلقین کرتی رہی تھیں۔

"آپا! آپ صدف کو ساتھ لے آتیں تو ابھی ہم بھائی جان کے گھر جاکر معاملات طے کر لیتے۔ وہ میرا بھتیجا ہے۔ کچھ سرپھرا مگر ہٹ دھرم نہیں۔ اگر بھائی' بھابھی کی خواہش ہے کہ سب ساتھ رہیں۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ اس نے ضد کرکے اپنی پسند کی شادی کی۔ لیکن گھر والوں کو منانے کے بعد۔ ان کا گھر بھی کافی بڑا ہے

۔ کس لیے صدف الگ گھر کی ضد کر رہی ہے؟ سب کا سلوک اس کے ساتھ بہت محبت بھرا ہے۔ ان کے گھر میں نوکر ہیں۔ صدف نے تو کبھی چائے بھی نہیں بنائی۔ ضرورت بھی نہیں۔ بس بھابھی "آزاد روش پسند نہیں کرتیں۔ ان کے گھر کے سب لوگ نمازی ہیں۔ مین دوران نماز صدف ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ بھابھی کو بھی اس پر ہی اعتراض ہوتا ہے۔"

روحی کی باتیں بھی پسندیدہ نہ تھیں لیکن۔ روحی یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کی نند میں ظرف نام کی کوئی شے نہیں۔ پھر بھی چپ رہیں۔ ڈر رہی تھیں کہ روحی کی زبان زیادہ کھلی تو۔ اگر وہ کہہ دے عامر نے تو بارات میں ماں باپ کو لے جانے کی بھی زحمت نہیں کی۔ پرویز کم از کم سب کو لے کر تو آیا تھا۔ مثل ہے کہ اپنا گھٹنا کھولوں آپ ہی لاجوں مروں۔

"میں چاہتی ہوں' تم اپنی بھابھی سے کہو۔ وہ صدف کو بیٹی سمجھ کر بات کریں بہو نہیں۔"

"ٹھیک ہے آپا! میں انہیں سمجھاؤں گی۔ آپ صدف سے کہیں وہ بھی ذرا زبان قابو میں رکھے۔ بھابھی تو بہت نرم مزاج ہیں۔ صدف بھی اپنے اخلاق اور محبت سے ان کو اپنا گرویدہ بنا سکتی تھی۔ جو کہ..... اس نے ضروری نہیں سمجھا۔" روحی روکھے لہجے میں بولیں۔

صدف کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے حمایت حاصل کرنے آئی تھیں۔ اس لیے چپ رہیں۔ ورنہ اس روحی کی مجال تھی۔ اس لہجے میں بات کرتی؟ غصے میں کھولتی گھر آئیں۔

☆ ☆ ☆

امریکا سے فراز کی بہن کا فون آیا تھا۔ جلال کا خیال رکھنے۔ اس کی خاطر تواضع اور تحائف جو مومنہ نے بھیجے تھے۔ سب کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔

"مومنہ..... وہ تمہاری بہت تعریف کر رہا تھا اور ایاز کی تو خصوصی مدح سرائی۔ اتنی زیادہ کہ میں حیران رہ گئی' اچھا ہاں' میں تم سے' عائشہ کے متعلق کے

متعلق کہنا چاہتی ہوں۔ اس کی تعلیم پوری ہو جائے تو میں اسے لے آؤں گی' یہاں امریکا' یہ ابھی سے بات اس لیے کر رہی ہوں کہ۔۔۔ جلال کو بھی دو سال لگیں گے اور شاید عائشہ کو بھی۔۔۔ پھر وہ میری ہو جائے گی۔ میں اسے جلال کے لیے مانگتی ہوں تم سے۔"

"آپا!" مومنہ کو خوشی ہوئی۔ "آپ کو شاید کسی نے بتایا نہیں۔ عاشی کو تو بڑی آپا۔۔۔ دانیال کے لیے مانگ چکی ہیں۔ ابھی باقاعدہ تو نہیں۔۔۔ مگر زبانی رشتہ ہو گیا ہے۔"

"کیا؟ آپا نے دانیال۔۔۔ مگر انہوں نے تو مجھے بتایا نہیں۔ جلال بھی ان کے گھر کئی بار گیا' اس کو بھی۔۔۔" مومنہ کو افسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسما کا فون آیا تھا۔ مومنہ کو محسوس ہوا۔ وہ پریشان ہے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ جیسے چھپ کر سب سے پوشیدہ بات کر رہی ہو۔

"بات کیا ہے بیٹا۔۔۔ کیا پریشانی ہے۔"

"چچی۔۔۔ وہ صدف۔۔۔ اور امی بھی۔۔۔ سب۔ مجھ پر۔۔۔ یہ لوگ مجھے گھر سے نکل جانے کا کہہ رہے ہیں۔ میں کہاں جاؤں۔۔۔ چچی۔۔۔ آپ کچھ کریں۔" رو رہی تھی۔

"اب کیا ہو گیا؟" مومنہ کا حساس دل بے چین ہو گیا۔

"وہ صدف کہتی ہے کہ میں بغیر شادی' نکاح کے آئی ہوں' مجھے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

"ثامر کہاں ہے۔ وہ کیا کر رہا ہے' بولتا نہیں۔"

"وہ گھر میں نہیں ہیں' یہ مجھ پر الزام۔۔۔ اووف۔۔۔"

لائن بے جان ہو گئی تھی۔ مومنہ گھبرا گئیں۔ کسی نے فون اس سے چھین کر بند کر دیا تھا۔ نہ جانے اس گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ فراز کو بتایا۔ وہ بھی فکرمند ہو گئے۔ مگر کرتے کیا۔ مومنہ کا جذبہ ہمدردی بیدار ہو چکا تھا۔ وہ بہت سوچ کر بھائی جان کی خیریت معلوم کرنے پہنچ گئیں۔ بھابھی نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ صدف کی بدقسمتی کی باتیں کرنے لگیں۔ مومنہ نے تسلی دی۔

"بھابھی۔۔۔ دونوں ضدی ہیں۔ اپنے بھائی سے کہیے۔ پرویز کو کسی دوسری جگہ صدف سے ملنے کا موقع دیں۔ آمنے سامنے دونوں بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل تلاش کریں۔ گھر بسانے کے لیے۔ دل بھی صاف ہونے لگے۔ تب ہی کوئی حل نکلے گا۔"

"کہتی تو صحیح ہو تم۔۔۔ مگر۔۔۔ اب صدف کو چڑ ہو گئی ہے کہ جو آتا ہے۔ صدف کا پوچھتا ہے کہ سسرال کیوں نہیں گئی۔ صحت خراب لگ رہی ہے' بھئی لوگوں سے بھی چڑنے لگی ہے اب۔ دیکھو تم سے ملنے بھی نہیں آئی۔ حالانکہ میں نے بتا دیا تھا تمہارا۔"

"کوئی بات نہیں بھابھی۔۔۔ بھائی جان کی طبیعت اب کیسی ہے۔ انہیں دیکھنے آئی تھی۔ آپ کے دیور نے مجھے بھیجا ہے۔ خود اچانک کسی کام میں پھنس گئے۔ میں بھائی جان کو دیکھ لوں؟ ان کا حال پھر آپ کے دیور کو بھی بتانا ہے۔ آئیں گے کسی دن وہ۔"

"لو۔۔۔ تو تمہارے جیٹھ بھی ان سے کم کہاں ہیں۔ ذرا طبیعت بہتر ہوئی اور نکل گئے۔"

انہوں نے بہانا بنایا۔ مومنہ نے اصرار نہ کیا۔ ملازمہ چائے لائی۔ اسما کی انہوں نے جھلک دیکھی۔ مگر کچھ کہا نہیں۔ ابھی بیٹھی تھیں کہ بڑی آپا بھی بھائی کا حال پوچھنے' ان کو دیکھنے آگئیں۔ کچھ دیر بعد مومنہ واپسی کے لیے کھڑی ہوئیں تو سرسری سا پوچھ لیا۔

"اسما نظر نہیں آ رہی کیا میکے گئی ہے۔"

"ارے نہیں' بیٹھی ہوں گی کمرہ بند کیے۔" بھابھی چیخ کر بولیں۔ "میکے سے تعلقات بحال کیا ہوئے کہ اب تو کبھی ماں' کبھی بہن آجاتی ہیں۔ ان کا میکے جانے کا دل نہیں چاہتا۔ جب ملنے کو دل چاہا' ماں کو بلا لیا' بہن کو بلا لیا اور تو اور خالہ بھی آجاتی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ چلیں کوئی بات نہیں۔ لڑکیاں سسرال میں ہی اچھی لگتی ہیں۔" مومنہ کہہ کر پچھتائیں۔ بھابھی کی تیوری چڑھ گئی۔ غالباً انہیں صدف پر چوٹ لگی۔ مگر نند کی موجودگی میں کچھ بولیں نہیں۔ صدف

ملنے آئی نہ اسما ہی' سوچا بعد میں آپا سے پوچھ لوں گی۔

☆ ☆ ☆

اسما کا فون نہیں آیا جو پتا چلتا کہ معاملات کہاں پہنچے' سدھرے کہ بگڑے' اللہ نہ کرے۔

ایک دن آپا آگئیں۔ کچھ الجھی ہوئی سی لگیں' مومنہ تو ہمیشہ ان کی آمد پر بے حد خوش ہوتی تھیں۔ آپا طبیعتاً" نرم اور مہربان فطرت کی تھیں۔ مومنہ کو ہمیشہ اپنی دونوں نندوں کی پر خلوص چاہت کا اعتراف رہا ان سے تعلقات بڑھانے میں جھجک نہیں ہوتی تھی اور اب تو آپا نے نیا رشتہ قائم کرکے انہیں ممنون احسان کردیا تھا۔

جبکہ جیٹھانی صاحبہ نے تو اسے بدنام کرنے میں کسر نہیں رکھی تھی۔

آپا شروع سے مومنہ کی قدردان تھیں۔ کئی موقعے ایسے بھی آئے جب انہوں نے بھابھی پر مومنہ کو ترجیح دی۔ مومنہ کی معصوم اور سادہ فطرت ان لوگوں کی اس عنایت پر سرشار ہوجاتی۔ مومنہ میں انکساری تھی۔ بھابھی میں تفاخر تھا۔ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ عائشہ چائے لے کر اندر گئی۔ تو مومنہ کو چپ چپ سا دیکھا۔ وہ گود میں رکھے آنچل کو مسل رہی تھیں۔ بلاسبب' پھپھو نے عاشی سے پوچھا۔

"تم نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا۔ کیا فارغ ہوگئی ہو؟"

"نہیں پھپھو! چھٹیاں ہیں۔ پچھلے دنوں ہنگامے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی بند کردی۔ ورنہ پڑھائی کا حرج نہ ہوتا۔"

"اچھا۔۔۔ ابھی پڑھائی باقی ہے؟ پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہو؟ آخر کب ختم ہوگی تمہاری اعلا تعلیم؟"

لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔ وہ کھٹک گئی۔ جواب نہ دیا' بلکہ ماں سے کہا۔

"امی! آپ بھی چائے لے لیں' ٹھنڈی ہوجائے گی۔ پھپھو چٹنی کباب آپ کیچپ کے ساتھ لیں تو زیادہ مزا آئے گا۔ میں حلوہ لاتی ہوں۔"

مگر انہوں نے صرف چائے پی۔ عاشی حلوہ لائی تو وہ کھڑی ہوگئی تھیں۔

"اچھا مومنہ! میں چلتی ہوں۔" وہ فوراً" چل پڑیں۔ عاشی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سلام کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

"پھپھو کیا کرنے آئی تھیں امی! جلدی چلی گئیں۔ عجیب لگ رہا ہے مجھے۔" حلوہ میز پر رکھ کر وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ یقیناً" کوئی تکلیف دہ بات ہوچکی تھی۔ مومنہ گم صم تھیں۔

"ہاں۔۔۔ بہت جلدی تھی انہیں۔" کھوئے کھوئے انداز میں انہوں نے کہا۔ "واپسی کی جلدی۔"

"امی۔۔۔ کیا بات ہے' پھپھو کیا کہہ گئی ہیں۔"

"وہی۔۔۔ جو ان کے خیال میں' میں کرتی رہی ہوں۔ بھائی جان کے گھر کے معاملات میں دخل اندازی۔ ان ساس' بہو کے درمیان غلط فہمی۔ ان کے گھر میں جھگڑے۔ صدف کی طلاق کی وجہ میں ہوں۔"

عاشی حیرت سے دم بخود تھی۔ "کیسے۔۔۔؟" امی کی آواز میں نمی کی بھراہٹ' چہرے کی زردی ان کے صدمے کی انتہا آشکار کررہی تھی۔

"میری عادت ہی یہ ہے' ان لوگوں کو میری چاپلوسی کی وجہ سے اندازہ ہی نہ ہوا۔" وہ اب آنسو بہا رہی تھیں۔ "یہ سب لوگ اتنے معصوم تھے کہ میری چالاکی اور سازشوں کو سمجھ ہی نہ سکے۔" خواب کے عالم میں تھیں شاید۔

آہٹ ہوئی' دانیال اندر داخل ہوا۔

"آہا۔۔۔ خوشبو' السلام علیکم ماں۔۔۔ واہ یہاں تو دعوت خاص کا اہتمام ہے۔" اس نے کباب اٹھا کر منہ میں رکھا۔ پھر چمچہ بھر کر حلوہ منہ میں بھرلیا۔ "سنا ہے میری عزت مآب والدہ تشریف لائی تھیں اور سنا ہے کسی خاص سلسلے میں۔ پتا نہیں کیا کارنامہ کرکے گئی ہیں۔" چمچہ بھر بھر کر حلوہ کھا رہا تھا۔

"ہاں آئی تھیں۔۔۔ امی کو ذلیل و خوار کرنے۔" عاشی غرائی' دانیال کے ہاتھ سے حلوہ گرا' مگر اس نے

دیکھا۔

"کیا... ہو گیا بھئی؟" بہت گھبرا گیا تھا۔

"بتایا تو ہے۔ امی کو ذلیل کرنے۔ ان کے ناکردہ گناہوں کی فہرست لائی تھیں۔ وہی جو ہمارے خاندان والوں کا وتیرہ ہے' الزام' بہتان وہ بھی صرف ہم لوگوں پہ..."

"مجھے... یقین نہیں آتا۔ میرا خیال تھا۔ وہ شادی کی تاریخ لینے آئی ہیں۔"

"وہ... یہ رشتہ ختم کر گئی ہیں۔" مومنہ نے صاف آواز میں کہا۔ تیز بلند آواز' عاشی ٹھٹکی۔ دانیال نے منہ کھولا' مومنہ کو' پھر عاشی کو دیکھا۔ عاشی نے خود ابھی یہ خبر سنی تھی' دم بخود تھی۔

"کل بڑی ممانی آئی تھیں۔ بند کمرے میں دیر تک مذاکرات۔ میں سمجھا۔ صدف کی طلاق کی خبر دینے آئی ہیں۔ میں ابھی جا کر پوچھتا ہوں۔ امی... فکر نہ کریں۔ میں انہیں منالوں گا۔" کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

عاشی نے ماں کو گلے لگالیا۔ "امی... آپ فکر نہ کریں۔ آپ تو ایسی تہمتیں بہت دفعہ سن چکی ہیں۔"

"لیکن اس کا نقصان تو نہیں ہوا۔ میرا نام لے کر میرے بچوں کا نقصان... سزا مجھے ملنی چاہیے' تم کو نہیں۔" آنسو تواتر سے دوپٹے میں گر رہے تھے۔ عاشی کو ترس آگیا۔

"اچھا... اس لیے رو رہی ہیں آپ' تو آنسو پونچھ لیں۔ مجھے کوئی سزا نہیں ملی۔ بلکہ چھٹکارا ملا ہے۔" یقین کرلیں میں ایسے بدگمان لوگوں سے رشتہ مضبوط کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ چلیں اب اٹھیں۔"

مومنہ تو یوں ایک جگہ بے حرکت بیٹھی تھیں۔ جیسے منجمد ہو گئی ہوں۔ عاشی انہیں تسلی دیتی ہوئی ان کے کمرے میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد ایاز آیا۔ ماں کو بے سدھ بستر پر لیٹا دیکھا۔ اشارے سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟" عاشی نے بتادیا۔

"دیکھا امی! کیا کہتا تھا میں' کسی کو آپ کی ہمدردی کا فائدہ نہیں۔ نہ اپنے دل کو دوسروں کے لیے دکھایا کریں۔ عاشی کی فکر نہ کریں۔ اس نے ابھی شادی کی نہیں تعلیم مکمل کرنے کی ضرورت ہے اور میں اس کا داخلہ امریکن یونیورسٹی میں کروں گا۔"

"ایاز تم... بیٹا! عاشی لڑکی ہے۔ اس کو اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک سال میں اپنا کورس پورا کرلے۔ تو پھر اور تم اتنا خرچ کرو گے کیسے۔ بیٹا کچھ اپنے بارے میں بھی سوچو۔"

مومنہ کو ایاز کے ارادے سے کوئی خوشی نہیں' کوفت ہوئی۔

"ایک سال یہاں پورا ہو جائے' پھر امریکا جا کر پڑھ لے۔ میرا آپ سوچیں۔ آپ لوگ کیوں سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کو اعلا تعلیم کی' ترقی کی ضرورت نہیں' اچھا تو... بچت کی ایک صورت ہے' وہ یہ کہ میری شادی کے دن عائشہ کی مہندی' میرے ولیمہ کے دن عاشی کی رخصتی' کفایت کی کفایت بچت کی بچت۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری۔"

مومنہ کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ "بیٹا... تم مرد ہو۔ تمہیں اندازا نہیں۔ بات طے ہونے کے بعد اچانک... رشتہ ختم ہو جانا لڑکی کے اوپر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ جبکہ رشتے دار ہوں۔"

"تو رشتے داروں کو بھی سوچنا چاہیے اور یہ بہت پرانی بات ہے۔ آج کل لوگ تعلیم یافتہ لڑکی پسند کرتے ہیں۔ رشتہ ختم ہونے سے لڑکی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

☼ ☼ ☼

فراز نے آکر سنا۔ یقین نہ آیا۔ بہن کو فون کھڑکھڑایا' جواب ملا۔

"ہاں... میں نے رشتہ ختم کر دیا۔"

"کوئی وجہ... کوئی سبب نہیں۔ میری مرضی' میں نے جوڑا تھا' میں نے ہی توڑ دیا۔"

دانیال نے بہت خوشامد کی' دھمکی دی' مگر نہ جانے بڑی ممانی کون سی پراسرار کہانی سنا گئیں کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ مومنہ کو چپ لگ گئی تھی۔ عاشی

پڑھائی میں منہمک ایاز حسب معمول۔

فراز خود آپا کے گھر گئے۔ وہاں سب کا خشک روّیہ' گویا ان تلوں میں تیل نہیں' ایاز کو سمجھا رہا تھا۔

"آپ کو وہاں جانے کیا ضرورت تھی۔ آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان کے دست نگر ہیں۔ وہ رشتہ کریں گے تو ہوگا۔ ورنہ عاشی بیٹھی رہے گی۔ ابا! ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے کہ خاندان میں مفادات کی۔ برتری کی جنگ جاری ہے۔ کبھی چچی اماں غالب ہو جاتی ہیں' کبھی پھپھو' ہم رعایا ہیں' جویر غمال بنائی جاتی ہے۔ ان کی طرف دیکھنا بند کردیں۔ دانیال دنیا کا واحد رشتہ نہیں ہے۔ دنیا بڑی ہے' ہر طرف رشتے مل جائیں گے۔"

"کہنا آسان ہے۔ عمل مشکل' تم ابھی بچہ ہو' ناتجربے کار ہو۔ خاندان سے کٹ کر رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تنہا ہو جاتا ہے بندہ۔"

فراز دل گرفتہ تھے۔ لاڈلی بیٹی کا مستقبل؟ سوالیہ نشان تھا۔

"میں کٹ کر رہنے کا نہیں کہہ رہا۔ ہم کیوں کسی کو چھوڑیں گے۔ مان لیں کہ آج بھی چچی اماں کی حکومت ہی ہے خاندان پر۔ وہ جو چاہتی ہیں' کسی سے بھی کروا لیتی ہیں۔ کرنے دیں' ہم بھی صبر کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کریں گے۔ عاشی کو اس سے بہتر رشتہ ملے گا ان شاء اللہ۔"

امریکا سے جلال کا فون آگیا۔ ایاز نے بات کرکے عاشی کو ریسیور پکڑا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"پرسوں میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ صدف کو طلاق ہوگئی۔ بہت افسوس ہوا۔"

"عاشی حیران ہوئی۔" لو مجھے کیوں... افسوس کرنے کے لیے صدف کو فون کرنا چاہیے۔ اس نے کہہ بھی دیا۔

"ہاں... ہاں کروں گا۔ اصل میں تم سے تو یہ بات کرنی تھی کہ میں تمہارے یہاں داخلے کے لیے معلومات لے رہا ہوں۔ اللہ کرے جلد کسی بہت عمدہ یونیورسٹی سے رابطہ ہو جائے تو بتاؤں گا۔"

عاشی خوش ہوگئی۔ "اچھا... شکریہ... بھائی بھی کوشش کررہے ہیں۔ کامیابی ہوگی تو بھائی کو بتادیں' بھائی کو کہیں کامیابی ہوئی تو وہ آپ کو بتادیں گے۔ اب تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ دو لوگ مل کر تلاش کررہے ہیں۔ کاش میرا داخلہ آسانی سے ہو جائے۔"

صدف کو طلاق کی خبر سے سب کو افسوس ہوا۔ اس رشتے کے ختم ہونے سے صدف کے ماموں بھی لپیٹ میں آگئے اور بہن' بھائی میں ناچاقی ہوگئی۔ ایک دوسرے سے منسلک رشتے فضول رواج کی زد میں آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ محبت کی اپنائیت کی۔ یگانگت کی داستان رہ جاتی ہے انسان اتنا بھلکڑ کیوں ہوتا ہے۔ سارے قریبی تعلق بھلا دیتا ہے۔ کس لیے؟ شاید اپنے مفاد کے لیے۔

فراز' صدف کے تکلیف دہ واقعے کے بعد بھائی سے افسوس کرنے جانا چاہتے تھے۔ مگر بھابھی سے ملنے کو بالکل دل نہیں چاہتا تھا۔ دل پر جبر کرکے بیٹھے رہے۔ بھابھی نے ان کی محبت' خلوص اور تعظیم کا یہ صلہ دیا۔ پہلے بھی عاشی کے خلاف باتیں پھیلائیں اور اب آپا کو ورغلایا۔ مومنہ کے خلاف۔

ایاز کے بارے میں تو شروع سے ہی فراز کے کان بھرے' بدظن کیا۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں' غور کیا تو ان کے بہت سے کارنامے یاد آتے گئے۔

سب سے پہلے مومنہ کو بدنام کرنے کی انہوں نے کوشش کی تھی۔ جب فراز کی شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے تو اپنی سادگی میں دلی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اسے "عاشقی کا چکر" مشہور کردیا۔

✲ ✲ ✲

"بہت ابتر حالت میں اسما آئی تھی۔ فراز نے مومنہ کو بلایا۔ رو رہی تھی۔ "اسے پانی پلاؤ' تسلی دو۔" وہ مومنہ سے لپٹ گئی۔

"چچی... میں مصیبت میں ہوں۔ آپ ہی بچا سکتی ہیں' پلیز چچی..."

مومنہ نے تسلی دی' پاس بٹھایا۔ "ہاں... اب

کہو۔" یہ کہہ کر دل نہ توڑا کہ میں اب کچھ نہیں کرسکتی۔

"چچی! سب نے میرے خلاف محاذ بنالیا ہے۔ میں اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ عامر کے ساتھ۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ظاہر ہے، عامر ہی کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

"مگر۔۔۔ وہ لوگ ہر بات میں مجھ پر شک کرتے ہیں۔ صدف کا میں نے کیا بگاڑا ہے۔ وہ سب سے زیادہ میرے خلاف ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر نکتہ چینی اور امی کے کان بھرتی ہے۔"

"بیٹا! صبر سے کام لو، عامر سے کہو، وہ صدف کو سمجھائے۔ صدف ابھی صدمے سے گزر رہی ہے۔ چڑچڑی ہوگئی ہوگی۔ تم بھابھی سے ہدایات لو، جیسا وہ کہیں ویسا کرو۔"

"عامر بھی۔۔۔ ان کے جیسے ہیں، کہتے ہیں غلطی تمہاری ہے۔ سب تو غلط بیانی نہیں کرسکتے۔ میری غلطی نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں معافی مانگ لیتی ہوں تو اس پر بھی مجھے چالاک کا خطاب ملتا ہے۔ میں کس طرح ان سب کو راضی کروں۔ چچی مجھے بتائیے۔"

"بیٹا! میرا تو مشورہ یہی ہے کہ تم بھابھی سے ہر بات پوچھ لیا کرو۔ وہ تمہیں خود لے کر آئی ہیں۔ تمہارے گھر جاکر تمہارے ماں، باپ کو منایا ہے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ ان کی بات مانو۔"

"ہر بات ان ہی کی مانتی ہوں چچی۔ کوئی مجھ سے بات کرے تو کیا ان سے پوچھوں کہ کیا جواب دوں؟"

مومنہ کو ہنسی آگئی۔ ارے کتنی معصوم ہے یہ۔

"بس بھابھی جیسا چاہتی ہیں، ویسی بن جاؤ۔"

"ویسی ہی بننا چاہتی ہوں۔ لیکن کوئی بننے بھی دے۔ گھر کا جو کام کروں اس میں میم میخ نکالنا ضروری، نہ کروں تو۔۔۔ ہڈ حرام۔۔۔ عامر سے کہوں تو چغل خور، چچی! اب آپ ہی میری مدد کریں۔ آپ نے ہمیشہ میری رہنمائی کی ہے۔ عامر کہتے ہیں۔ تمہیں رشتے برتنے نہیں آتے۔ کبھی کہتے ہیں تم بڑے گھر کے طور طریقوں سے ناواقف ہو۔ اس لیے غلطیاں کرتی ہو۔ آپ اگر عامر سے میری سفارش کریں گی تو وہ سمجھ جائیں گے۔"

فراز نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں سمجھ سکتا ہوں تمہیں وہاں کیا پریشانی ہے، لیکن بیٹا! ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ بھابھی کو خبر ہوگی کہ تم یہاں آئی ہو۔ تو وہ ہم لوگوں پر الزام لگادیں گی کہ ہم نے تمہیں ان کے خلاف بھڑکایا ہے یا کچھ بھی کہہ دیں گی، اس لیے جو عامر کہے۔ تم اس پر عمل کرو، تمہیں سب کے مزاج اور خواہش کے مطابق رہنا چاہیے۔"

اسما بے چاری حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"چچا! میں اب تک یہی کررہی ہوں۔ مگر۔۔۔ امی کو جب موقع ملتا ہے۔ میرے میکے والوں کی تذلیل کرتی ہیں۔ میری وجہ سے میری بہنوں کو ابا نے غلط ہاتھوں میں دے دیا۔ کب تک یہ سنوں۔ ابا، امی تو یہ بھول گئے ہیں۔ اپنی اور میری غلطی کا تدارک کررہے ہیں۔ لیکن۔۔۔ صدف اور امی بار بار مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔۔۔ یہی دستور ہے دنیا کا۔ خود کسی فعل پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ دوسروں کو ان کی غلطی یاد دلانے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ میں پھر تم سے کہتا ہوں۔ اپنے گھر کے معاملات تم خود سلجھاؤ۔"

اسما سر جھکائے رونے آنسو بہانے کا شغل کرتی رہی۔ پھر چپکے سے اٹھ کر چلی گئی۔

"دیکھا آپ نے امی!" عاشی نے مومنہ سے کہا۔ "آپ کی ہمدردیاں اور عامر بھائی کی خود غرضیاں۔ وہ بیوی کو تحفظ نہیں دے سکتے۔ تو شادی کی ہی کیوں۔۔۔ ابھی نہیں، کچھ دن بعد دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔"

مومنہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب اور کیا ہونا باقی ہے۔ اسما کی بے بسی پر ترس آگیا۔ ایاز سے ذکر کیا۔ اس نے فوراً ٹوک دیا۔

"ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو چاہیں کریں۔ یہ ہمارے گھر کا نہیں۔ عامر بھائی کے گھر کا معاملہ ہے۔ کل کو عامر بھائی اپنی والدہ کے کہنے پر آپ

سے لڑنے آگئے 'تو گیا عزت وہ جائے گی آپ کی۔"

"بیٹا! اگر ذرا سی مدد سے 'کسی بے قصور لڑکی کا گھر بچ جائے تو اللہ کے گھر اس کا بڑا اجر ہے۔"

"تو اس اجر کو... عامر بھائی یا ان کی والدہ ہی سمیٹ لیں۔ امی! آپ کی نیکی بھی ان کی نظر میں بدی بن جاتی ہے۔ چھوڑ دیں ان کے حال پر۔ یہ وہ زمانہ نہیں رہا کہ کوئی کسی کی نصیحت قبول کرے۔ آپ نے وہ مثل سنی ہوگی۔ سیکھ واکو دیجیے 'جاکو سیکھ سہائے۔ سیکھ نہ دیجیے باندرا کہ بئے کا بھی گھر جائے۔ کسی نے بندر کو نصیحت کی۔ اس نے غصے اور ضد میں بئے کا گھونسلا نوچ کھسوٹ دیا۔ یہ ہیں اس زمانے کے قاعدے۔ مدد اسی کی کرنی چاہیے جو اس کا اہل ہو۔ ہم بھابھی کی بھلائی چاہیں۔ ان کی بربادی ہو جائے 'فائدہ۔"

مومنہ کو اداس دیکھ کر ایاز کا دل دکھا۔ اس نے پھر کہا۔

"ابھی اتنا عرصہ تو نہیں گزرا کہ آپ سب کچھ بھول گئیں۔ ابھی تو چچی اماں کے لگائے زخم پر کھرنڈ بھی نہیں آیا۔ آپ دوسری چوٹ کھانے کو تیار ہیں۔"

مومنہ فکر مند تھیں۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ ورنہ اسما میکے کا بہانا کر کے یہاں نہ آتی 'ہم نے اسے مایوس کر دیا۔ آج میں کسی لڑکی کا گھر ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کروں گی۔ کل کو میری بیٹی کا گھر بسے گا۔ یہ اللہ کے گھر سے انعام ہوگا۔ اجر اسی کو کہتے ہیں 'کہتے ہیں 'اس ہاتھ دے 'اس ہاتھ لے۔"

"جو ہمارے بس میں ہے۔ ہمیں وہی کرنا چاہیے۔ دعا ان کے لیے بھی 'اپنے لیے بھی 'عاشی کے لیے بھی۔ اللہ کا وعدہ ہے۔ آپ جو مانگیں گے 'اللہ دے گا' مایوسی کیوں 'ایک در بند ہوتا ہے 'ستر در کھلتے ہیں اور یہ کام قدرت کے سپرد ہے 'ہم انسان بے بس... امی کیوں پریشان ہوتی ہیں 'عاشی کی عمر تو نہیں نکلی جا رہی۔"

"خاندان میں اس کے جوڑ کے لڑکے تو نکلے جا رہے ہیں۔"

"ہمیں خاندان میں لڑکے تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں 'اب اس وسیع دنیا میں جو عاشی کا نصیب ہے 'اسے مل جائے گا۔"

مومنہ بتا نہ سکیں۔ لوگوں کی ذہنیت کتنی گری ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں پڑوس میں مہمان خاتون کسی کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔

"ائے چھبیس سال سے کم میں بھلا ایم اے ہوتا ہے؟ جو لوگ لڑکی کی عمر کم کرنے کے چکر میں اکیس بائیس سال میں ایم اے کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ سب جھوٹ 'بھئی یا تو لڑکی کو اتنا پڑھاؤ نہیں کہ عمر کا بھید کھل جائے یا پھر سچ بتا کر اس کی عمر کے مطابق بر تلاش کر لو 'پکی عمر کا۔"

وہ تب سے ہی فکر مند تھیں۔ عاشی نے تو تیزی سے ایک سال میں دو 'دو کلاسیں پار کی تھیں۔ کس کس سے وضاحت کریں گے۔ عزیز رشتے داروں کو تو علم ہوتا ہے۔ مگر غیروں سے کون کہے گا اور یقین بھی کون کرے گا؟ دانیال سے رشتہ ہوا تو مومنہ اور فراز دونوں مطمئن تھے۔ دانیال انہیں پسند تھا۔ امن پسند' صلح جو' دوسرے لڑکوں کی نسبت وہ نیک اطوار تھا۔ گو کہ عاشی کی نسبت تعلیم کم تھی۔ لیکن شریف خون' نیک ماں کی اولاد۔

ایاز کو اس رشتے پر اعتراض تھا۔ خاندان کی آپس کی چپقلش' پھپھو اور چچی اماں کا باہمی التفات کوئی نہ کوئی گل کھلا سکتا تھا۔ لیکن اس کے اعتراض کو فراز نے گردانا ہی نہیں۔ اب... دانیال سے رشتہ ختم ہونے کے بعد عاشی کی فکر ہوئی۔ اس سے پوچھ لیا۔

"تمہیں دکھ تو ہوا ہوگا۔" اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر کچھ دیر بعد سر اٹھا کر کہا۔

"پتا نہیں 'دکھ کیسا ہوتا ہے۔ ابا' امی کی مرضی تھی' تو میں چپ رہی 'اب پھر ان کی مرضی' مجھے تو کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ نہ انسانوں کی پہچان ہے۔"

"ہاں... سمجھتا ہوں' دراصل ہمارے معاشرے میں آپس کے تعلقات کچھ یوں ہو گئے ہی کہ چہرہ جو کہہ رہا ہوتا ہے۔ آنکھیں اس کی نفی کرتی ہیں۔ زبان پر جو

شہد میں ڈوبے الفاظ موتیوں کی طرح برس رہے ہوتے ہیں۔ دل میں انگاروں کی راکھ سلگ رہی ہوتی ہے۔ لیکن دیکھنے پرکھنے کے لیے دیدۂ بینا کسی کے پاس نہیں ہوتا۔"

"تو بھائی... غیروں میں بھی امکانات ایسے ہی ہوسکتے ہیں۔"

"ہاں بے شک... لیکن اپنے پرائے کا فرق بھی ہوتا ہے۔ غیروں سے ہم ہربات کی توقع کرسکتے ہیں۔ اپنوں کا پہنچایا ہوا دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ اذیت ناک زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

عاشی سوچنے لگی۔ اپنوں سے باندھی امیدیں پوری نہ ہوں تو افسوس کی حد ختم ہوجاتی ہے۔ غیروں کا دیا ہوا دکھ... برداشت کی حد ختم کردیتا ہے۔ میں اتنی بھی اہم ارفع اعلا نہیں ہوں کہ اپنا یا پرایا میری ساری امیدوں پر پورا اتر کر میرے لیے خوشیاں جمع کرے۔ کیا پچھتاوے میرا نصیب بنیں گے۔ پھر وہ اذیت ناک زندگی نہیں ہوگی؟ کیسے بچا جاسکتا ہے اس...

"کیا سوچ رہی ہو' عاشی... میں اتنی تو امید کرسکتا ہوں کہ میری نیک نیت قناعت پسند بہن کو اس کا ہم پلہ نیت سیر اولوالعزم شریک زندگی مل جائے گا۔ یہ میرا ارمان اور خواہش ہے۔ ان شاء اللہ پورا ہوگا۔ مجھے فکر بالکل نہیں۔ تم بھی اطمینان رکھو' میں تمہیں کسی بھی آزمائش سے بچانا اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں۔" ایاز کے لہجے میں محبت کی چاشنی تھی۔

عاشی اپنے پیارے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر یقین کی روشنی تھی۔ وہ اس کے ذہن کی رسائی کی قائل تھی۔ مگر وہ تو اس کے دل کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ وہ مسکرادی۔ دل بالکل ہلکا ہوگیا تھا۔ البتہ مومنہ اور فراز فکرمند تھے اور گھر میں خاموشی بھی تھی۔ جیسے خزاں نے پنجے گاڑ دیے تھے۔ عاشی کو ماں' باپ کے تفکر اور پریشانی کا احساس تھا۔ کیسے ان کی فکریں دور کرے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ عاشی کی فکر اور کچھ دنیا کی' لوگ کیا کہیں گے۔ اچانک رشتہ ٹوٹ جانا... لوگ شبہات کا اظہار کرتے ڈرتے نہیں۔ فراز کی پریشانی' اپنے خون کے رشتوں سے دوری' وہ جو ہمیشہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اب یک دم ہی کوسوں دور چلے گئے۔ بدگمانی' رنجش' کبھی تصور نہیں کیا کہ سگے بہن' بھائی ذہنی فاصلے طے کرنے کے لیے... کسی اور کے محتاج ہوں گے۔ کبھی سوچتے امریکا والی آپا سے رابطہ کرکے ان سے سفارش کی درخواست کروں' کبھی' دانیال کے والد کا خیال آتا۔ لیکن ہمت نہ پڑتی۔ عاشی نے گھر کو چمکانے کا سلسلہ شروع کردیا روز کہیں نہ کہیں۔ جھاڑ پونچھ' سیٹنگ کی تبدیلی۔ کبھی پردے بدلے' کبھی کشن' یہ صوفہ ادھر' وہ کرسی ادھر' پردے دھوئے' کشن کور تبدیل ہوئے۔ مومنہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

"عاشی! یہ کیا سلسلہ شروع کردیا تم نے۔ امتحان میں چند دن رہ گئے ہیں۔ پڑھائی زیادہ اہم ہے۔ وقت ضائع نہ کرو۔ یہ کام پھر کرلینا۔"

عاشی کا جواب سن نہ سکیں کہ اس نے دل میں کہا تھا۔ جب دل اچاٹ ہوجائے تو کیا اہم کیا غیر اہم۔ پتا نہیں ابا کی فکریں کب ختم ہوں گی اور بھائی کی امید کب بار آور ہوگی۔ امتحان نزدیک ہے۔ زندگی تو مسلسل امتحان لے رہی ہے' پھر کیسا ڈر۔

☼ ☼ ☼
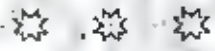
موسم عجب رنگ بدل رہا تھا۔ طوفان کی خاموشی' خطرے کی وارننگ' ابالان میں کرسی پر نیم دراز بادلوں کا شمار کرتے رہتے۔ بادل جو باران رحمت کی نوید ہوتے ہیں' مگر بارش روٹھے ساجن کی طرح نخرے دکھا رہی تھی۔ خزاں دور تھی۔ مگر گھر پر عملاً "خزاں کا دور چھایا ہوا تھا۔ ایک دن اسما کا فون آگیا۔ ایاز نے فون سنا۔ پھر بند کردیا۔

"امی... اسما بھابھی کا فون ہے۔ آپ اس نمبر پر ان سے بات کرلیں پانچ منٹ بعد۔"

ایک چٹ انہیں دی۔ "وہ... اپنے ابا کے گھر میں ہیں۔" مومنہ نے کچھ ٹھہر کر نمبر ملایا۔

اسما رو رہی تھی۔ بمشکل اس نے تفصیل سنائی۔

لیے سسرال سے نکال دیا گیا تھا۔ اسما کی معافیاں خوشامدیں۔ کسی پر اثر انداز نہیں ہوئیں۔ وہ والدین سے شرمندہ تھی۔ عامر بھی خفا تھا۔ ابو بات کرنا چاہتے۔ فون نہیں اٹھاتا۔ آفس گئے تو ملا نہیں۔ وہی ساس جو ابو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اس سے متنفر ہو چکی تھیں۔ اپنی مرضی کی بہو لانے کی وارننگ کے ساتھ۔

"میں عامر سے کہتی رہی' میں نے کوئی غلطی نہیں کی' پھر سزا کیوں' عامر کے منہ میں اپنی ماں کی زبان ہے' پلیز چچی... ایک بار پھر آپ میری مدد کریں۔ عامر سے بات کریں' وہ آپ کی سن لیتے ہیں۔"

"آخر جرم کیا ہے' کچھ تو بتاتے ہوں گے۔"

"جرم بے شمار' اب ایک نیا شوشا چھوڑا ہے' بدگمانی کی حد' چچی' ابو نے میری وجہ سے میری بہنوں کو کم پڑھے لکھے' معمولی حیثیت کے لڑکوں سے بیاہ دیا تھا۔ اب انہوں نے دونوں کو سمجھا بجھا کر آگے پڑھنے پر تیار کیا اور انہیں سویڈن بھیج دیا۔ سویڈن میں میرے ایک چچا ہیں۔ انہوں نے ذمے داری لی ہے۔ وہاں ابھی اسکول میں داخلہ ہوا ہے۔ پھر کالج میں پڑھیں گے۔ چچا نے امید دلائی ہے کہ سویڈن کی زبان سیکھ لینے کے بعد انہیں وہاں بہت اچھی جاب مل جائے گی۔ فیملی کو بلا سکیں گے۔ عامر کی امی نے الزام لگایا ہے کہ سویڈن میں دونوں کے اخراجات عامر کے پیسے سے پورے ہوں گے۔ چچی عامر نے مجھے کبھی اتنی رقم دی ہی نہیں کہ میں کچھ بچاتی اور کسی کی مدد کرتی' مگر عامر بھی ان کی بات سنتے ہیں' میری نہیں۔ اب میں ابو سے کیا کہوں۔ غلطی میں نے کی ہے' مگر میں پچھتانا نہیں چاہتی۔"

مومنہ نے ایاز سے کہا۔ "بس ایاز... تم عامر کا نمبر ملاؤ۔ میں ضروری بات کروں گی۔"

"امی مجھے بھی اسما بھابھی سے ہمدردی ہے۔ مگر... آپ کہیں مزید الزامات کے چکر میں نہ آجائیں۔ عامر بھائی کا کچھ بھروسا نہیں' آپ کی بھی نہ مانے۔ تو..."

"جانتی ہوں۔ مگر الزامات میرا کچھ نقصان نہیں کرتے۔ عامر کو علم ہے کہ میرا اس معاملے میں کوئی مفاد نہیں۔ اگر مفاد ہے تو وہ عامر کا ہے۔ بھٹک جانے والے کو سیدھا راستہ دکھانا ہمارا فرض ہے۔"

"امی سیدھا راستہ کہیں ٹیڑھا نہ ہو جائے۔ خیر... نیک نیتی سے کیے کسی اقدام پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ عامر بھائی کو آپ کا پیغام دے دوں گا۔"

اگلے دن عامر کا فون آگیا۔ جھجک رہا تھا۔ شاید دل کے چور نے ڈرا دیا تھا۔

"عامر... تم جانتے ہو' میرا اپنا کوئی مفاد شامل نہیں۔ اس لیے تم کو سمجھانا چاہتی ہوں۔" کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے' اپنا محاسبہ ضرور کرلینا۔ تم اور اسما دونوں کی مرضی سے شادی ہوئی۔ وہ اکیلی تو نہیں تھی۔ تم ساتھ تھے۔ پھر تم نے گھر لیا۔ تم دونوں ساتھ تھے۔ پھر واپس اپنے گھر آئے۔ اسما ساتھ' اسما نے تو نقصان ہی اٹھایا۔ بے قصور کو تنہا کر دینا تمہارا حق نہیں۔ اپنی زیادتیوں کا شمار کرلینا' سوچنا' تم نے اسما کو اب تک کیا دیا۔ ناانصافی بہت بڑا جرم ہے اور تم اسما کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے اور جب اس بڑی قوت کا انصاف ہوگا تو کس کس زیادتی' کس کس غلطی کا اعتراف کرو گے۔ وہ اپنے ماں' باپ کے گھر کیا کر رہی ہے؟ تدبیر کرو بیٹا۔ غلطیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ اپنی زندگی کو مشکل نہ بناؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جو شکایت ہے دونوں مل کر دور کرو۔" انہوں نے اسما کی۔ وہ شکایت ظاہر نہ کی۔ ہاں فراز صاحب کو رازدار بنالیا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر ایک روشن صبح طلوع ہوئی۔ چمکتی دھوپ' تیز گرم' ہائے مون سون کہاں غائب ہو گئے؟ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ ابا نے اسے بلوایا۔ کمپیوٹر بند کرکے وہ ابا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مومنہ متفکر سامنے بیٹھی تھیں۔ (کوئی نئی اور خاص بات) وہ ٹھٹک گئی۔

"آؤ بیٹا۔ بیٹھو۔" ابا نے اسے اپنے پاس کرسی پر اشارہ کیا' وہ بیٹھ گئی۔ "مجھے تم سے کچھ خاص باتیں

کرتی ہیں۔" ابا نے گلا صاف کیا۔ الٰہی خیر۔ اب یہ کس قسم کی تمہید ہے۔

"تمہاری امی کا خیال ہے کہ یہ بات تمہارے امتحانوں سے فارغ ہونے کے بعد کی جائے۔ لیکن... میں کچھ بے صبر ہوں اور یہ بھی کہ مجھے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔ وہ کسی بات سے نہ تو متاثر ہوگی' نہ پریشان۔" اسے لگا ابا ہچکچا رہے ہیں۔

"ابا... آپ کہیے... میں کسی بات پر پریشان نہیں ہوتی۔ بھائی کا خیال ہے میں بہادر بھی ہوں اور ڈھیٹ بھی۔ میں نے برساتی میں محفوظ ہو کر ژالہ باری۔ طوفانی بارش سے ہی نہیں۔ دنیا کی گولہ باری سے بھی پناہ لے رکھی ہے۔ دراصل ابا میں تو بس اللہ کے حکم کے تابع ہوں۔ اس کے حکم کے بغیر تو پتا نہیں ہلتا۔ جو وہ چاہے کر سکتا ہے۔ پھر تردد کس بات کا' واویلا کیوں؟"

"شاباش... ویسے تم بھی اپنی ماں کا نمونہ ہو۔ نڈر' تمہیں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اللہ کے حکم کے تابع۔"

وہ کچھ رکے۔ شاید الفاظ جمع کر رہے تھے۔ "میں چاہتا ہوں' میری صابر' پاکیزہ خیالات رکھنے والی بیٹی' آسان زندگی گزارے۔ اس کو کسی الجھن' پریشانی سے سابقہ نہ ہو۔ یوں تو ہم سب اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اللہ سے مانگتے ہیں اور وہ دیتا بھی ہے۔ شکر ہے اس کا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کس قسم کی آسانی چاہتے ہیں۔ زندگی خود ایک مشکل امتحان ہے۔ اس سے زیادہ کیا مشکل ہوگی۔"

☆ ☆ ☆

"خیر... پرسوں... مسجد میں بھائی جان ملے۔ میری کوتاہی کہ میں صدف کے الیے پر ان سے افسوس کرنے نہیں گیا۔ اسی لیے شاید وہ میرے گھر نہیں آئے۔ ورنہ اصولاً" تو انہوں نے جو سوال کیا۔ وہ گھر آکر کرنا چاہیے تھا۔ خیر... آمدم بر سر مطلب... وہ تمہارے لیے پریشان ہیں اور میری پریشانی کے ازالے کے طور پر... مجھ سے خاص طور پر مسجد میں ملنے

آئے۔ انہوں نے کہا عامر اور یاسر دونوں میں سے کسی سے بھی' عائشہ کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔" عاشی سانس روک کر خود کو چیخنے سے بچ سکی' ورنہ... بال نوچنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"پوری بات سن لو۔ عامر نہیں تو یاسر' انہیں تو تمہارا رشتہ چاہیے۔ ان کے خیال میں تو اسما سے چھٹکارا مل گیا ہے۔" عاشی نے ماں کی طرف نظر ڈالی۔ ہر سمت ویرانی تھی۔ مومنہ کا چہرہ اسی ویرانی کا غماز تھا۔

"میں نے ان سے کہا۔ میں عائشہ کی مرضی معلوم کیے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ بیٹا یہ تو معمولی آزمائش ہے۔ زندگی میں تو اس سے بھی زیادہ آزمائشیں مقدر سے ملتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے بھائی جان کے گھر میں کسی بھی لڑکی کو آسان زندگی گزارنے کے موقع کم ملیں گے۔ بھابھی کے زیر سایہ' صدف کی جلن حسد سے مقابلہ۔ چھوڑو' خیر میرا مقصد تمہیں خوف زدہ کرنا نہیں' کل شام میں لان میں تھا۔ دانیال میرے پاس آیا۔"

انہوں نے گردن گھما کر مومنہ کو دیکھا' جو کسمسا رہی تھیں۔

"اس نے مجھ سے کہا۔ وہ اپنی ماں کے فیصلے کا پابند نہیں۔ وہ بالغ ہے' اپنا اچھا برا سمجھتا ہے۔ ماں کی اجازت یا ان کی مرضی' کوئی اہم نہیں۔ ہاں زندگی گزارنے کے لیے اپنی خوشی' خواہشات کا تابع ہے۔ وہ اکیلا آکر شادی کر سکتا ہے۔ دوسرا گھر لے کر رہ سکتا ہے۔ اسے صرف اپنی خوشی درکار ہے۔ اسے ماں سے خطرہ نہیں' بہت چاہتی ہیں اسے۔ کچھ دن بعد وہ قبول کر ہی لیں گی۔ اب تم فیصلہ کر سکتی ہو۔" ابا چپ ہو گئے۔ کمرہ سناٹے سے بھر گیا۔

عاشی... وقت طلب سوال نامے کے درمیان... گویا سزا سننے کے لیے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی رہ گئی۔ ابا نے بڑے سکون سے سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ بھی کوئی آسان زندگی نہیں ہوگی۔ مگر بیٹا! زندگی میں اس سے بھی زیادہ مشکل

سوالوں سے سابقہ پڑے گا۔ میں اندازا کر سکتا ہوں۔ آپا کو اپنی شکست قبول کرنا ہرگز منظور نہ ہوگا۔ وہ بہرحال ایک ماں ہیں۔ لیکن دانیال کے اس دعوے کا مطلب' اگر آپا اس شادی کو قبول کر کے انہیں معاف کردیں۔ کیا گارنٹی ہے کہ وہ مجھے اور تمہاری امی کو بھی معاف کردیں گی۔ کیونکہ ظاہر ہے اس جرم میں ہم بھی شریک ہوں گے۔ دانیال دو' تین دن بعد جواب لینے آئے گا۔ تم کو ابھی جواب دینا ہے' سوچ کر مجھے جواب دو۔"

"ابا۔۔۔!" اس نے صاف آواز میں کہا۔ "میری طرف سے انکار ہے۔ میں ہر مشکل برداشت کرلوں گی۔ لیکن میری وجہ سے آپ لوگوں کو تکلیف ہو۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ اس کے علاوہ خاندان میں چپقلش مجھے پسند نہیں۔"

"شاباش۔۔۔ مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔ میں مطمئن ہوں۔ تمہارا ان شاء اللہ کمپیوٹر انجینئرنگ کا امتحان ختم ہوجائے گا۔ تو ہم تمہیں ایک بہت اچھی خبر دیں گے۔ ایک خوش خبری تو یہ ہے کہ جلال کی کوشش سے تمہارا یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا ہے۔ اگلی خوش خبری امتحانوں کے بعد۔۔۔ ایک اچھے شان دار مستقبل کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

☆ ☆ ☆
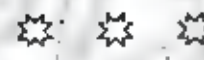
مومنہ منہ پر دوپٹا رکھے کھلکھلا رہی تھیں۔ ابا بے حد پرسکون انداز میں آنکھیں بند کیے نیم دراز تھے۔ آس پاس گلابوں کی مہک نے بہار کا مژدہ سنا دیا تھا۔ یونیورسٹی 'امریکا' واہ۔۔۔ جلال بھائی نے وعدہ پورا کردیا تھا۔ اب انہیں شکریہ کیسے کہوں۔۔۔ خوشی و انبساط نے گھر کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ امریکا سے چھوٹی آپا کا فون۔۔۔ انہیں بڑی آپا نے دانیال کا رشتہ ٹوٹنے کی اطلاع دی تھی۔ انہوں نے اب دیر نہ کرتے ہوئے فوراً" جلال کا رشتہ مانگ لیا۔ مومنہ اور فراز اسی لیے مطمئن تھے۔ ایاز نے آکر دھماکا کردیا۔

"امی! مبارک ہو۔ عامر بھائی' اسما بھابھی کو گھر لے آئے ہیں۔ دراصل وہ پہلی بار باپ بننے جارہے ہیں۔ اکلوتے باپ' پہلوٹھی کے والد صاحب' پہلوٹھی کے بیٹے نے سارے شکوے شکایتیں سمیٹ لی ہیں اور وہ اس کا کریڈٹ آپ کو دے رہے ہیں۔" ایاز مطمئن اور خوش تھا۔

"اوئی اللہ۔۔۔ میں۔۔۔ کیوں۔۔۔ پاگل تو نہیں ہوگیا عامر۔" وہ سٹپٹا گئیں۔

"نہیں۔۔۔ مطلب شکوے شکایتیں دور کرنے کا سہرا آپ کے سر بندھا ہے۔ آپ اصل میں ان کے لیے خضر راہ بن گئی ہیں۔ اسما بھابھی اور عامر بھائی کل آپ کا شکریہ ادا کرنے آئیں گے۔"

"اے ہے۔۔۔ میں کیوں۔۔۔ اللہ کا شکر ادا کریں اور یہاں آنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ بھابھی کچھ اور کل پھندنے لگائیں گی۔" مومنہ لب ڈٹ گئی تھیں اور کسی نئے شاخسانے کے لیے ہرگز تیار نہ تھیں۔

"میں مبارک باد دے آیا ہوں۔ ان کے گھر جاکر۔ کیونکہ انہوں نے بھی سب سے پہلے مجھے یہ خوش خبری سنائی تھی۔ چچی اماں مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئیں۔ لیکن ناخوش بھی نہ تھیں۔ کیونکہ انہیں بھی ایک خوش خبری ملی ہے۔ عامر بھائی کی خوش خبری کے علاوہ۔۔۔ پتا ہے کیا؟ بڑی پھپھو نے دانیال کا رشتہ دیا ہے۔ صدف کے لیے۔ کیسا؟"

"اور۔۔۔ دانیال۔۔۔ وہ مان گیا؟ ہائیں۔۔۔ کل تو۔۔۔" وہ بے چین ہوگئیں۔

"جی۔۔۔ یہ آج صبح کا کارنامہ ہے۔ چچی اماں کی کوششیں' پھپھو پر دباؤ۔۔۔ چلیے اب سارے خدشے دور ہوگئے۔" وہ مطمئن تھا۔ مومنہ اسے جلال کے سلسلے کی خبر سنانے کو بے چین تھیں۔ اصل خوش ہونے والا وہی تھا۔

بہار تو اب کھل کر برس رہی تھی۔ ہر سمت ہریالی' یک لخت کالے بادل چھاگئے اور باران رحمت کا نزول ہوگیا۔ سوکھی زمین سیراب ہوگئی۔ درختوں پتوں نے بارش میں نہا کر گویا نئے کپڑے پہن لیے تھے۔

☆

حیا بخاری

اس دفعہ رمضان میں گرمی کچھ زیادہ ہی پڑ رہی تھی۔ بادل' بارش' ہوا سب جیسے ناراض تھے۔ آتے اور تن من کو سرور دیے بغیر ہی چلے جاتے۔ باغ' جامن اور ٹاہلی کے درختوں اور رنگ برنگے پھولوں کے پودوں سے بھرا تھا۔ اودے' گلابی' مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجی بیلوں نے باغ کی اونچی چار دیواری کو ڈھانپا ہوا تھا۔ مشرق کی طرف گیٹ کے قریب سے لے کر باغ کے درمیان میں بنی چھوٹی سی بارہ دری تک اور پھر وہاں سے مزید تینوں اطراف سفید پتھروں کی خوب صورت روش بچھائی گئی تھی۔ مغرب کی طرف آموں کا حصہ تھا۔ اس قدر سنہری اور میٹھے آم لگتے کہ دوسری طرف سے جھلک دیکھ کر دیوار کی اونچائی کی پروا کیے بغیر کئی نوجوان ایک بار اوپر جانے کی کوشش تو ضرور ہی کرتے۔

شمال کی طرف مالٹوں کا حصہ تھا۔ جونی الحال ہرے بھرے پتوں سے سجے درختوں پہ محیط تھا۔ ورنہ تو سردیوں میں بھی اس طرف کی خاصی رکھوالی کرنی پڑتی تھی اسے۔

مغرب کی طرف شہتوت' انار' جامن' ٹاہلی' سفیدے اور دیگر انواع واقسام کو پودے تھے۔

ہوا چلنے لگی تھی۔ جھونکوں نے تھکے ہارے وجود کو

نیند کی جھپکی دی اور خوب صورت سنہری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"دھپ۔" زوردار دھماکا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساتھ پڑی بانس کی لمبی سی چھڑی اٹھائی اور آواز کی سمت کا تعین کرنے لگی۔ آموں کے حصے میں دیوار کے بالکل قریب اس نے آسانی کرتے کی جھلک دیکھ لی تھی۔

"تیری تو..." چھلاوے کی طرح صرف دو تین قلانچیں بھر کر وہ چھپنے کی کوشش کرتے وجود کے قریب تھی۔

"اللہ۔ باجی معاف کردیں اوئی۔ وائی...." نہ جانے کس کی قسمت پھوٹی تھی جو گل پرو کے ہاتھ لگا تھا۔

"معاف کردوں! سارا سال میں اور چاچا تم لوگوں کے لیے محنت کرتے ہیں نا۔" اس نے اور تیزی سے بانس کی چھڑی گھمائی۔ دیوار کے اس پار تیز دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

"پورا لشکر لے کر آیا تھا میرا ٹارزن۔ رک تجھے بتاتی ہوں۔" وہ بھاگ اٹھا تھا۔ گل پرو چھڑی سنبھالے اس کے پیچھے بھاگی۔ تب ہی مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا۔ وہ لڑکا تیزی سے دروازہ کراس کر گیا۔ وہ بھی نکلنے لگی تھی کہ کسی نے مضبوطی سے اس کی نازک کلائی تھام لی۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔ آج اس کی ٹانگیں توڑ کے دم لوں گی۔" وہ تڑپی۔

"توبہ گل پرو۔ تم تو پوری مولا جٹ ہو۔ اب جانے بھی دو اس بے چارے کو۔ اور کتنا پیٹو گی۔" آنے والا اسے اندر کھینچ لایا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"ہاں تو کیوں نہ بنوں مولا جٹ۔ میرے چاچا کا باغ ہے۔ ان مفت خوروں کا تھوڑی ہے۔" اس نے بازو سے ناک رگڑ کے صاف کی۔ طحہ... مسکراتے ہوئے اسے دیکھے گیا۔

"آج آنے دو ابا کو۔ بات کرتا ہوں ان سے۔ یہ کیا جوان جہان لڑکی کو اکیلا باغ کی نگرانی پہ چھوڑ جاتے ہیں۔" وہ وہیں ٹاہلی کے نیچے بیٹھ گیا۔ جہاں کچھ دیر پہلے وہ آرام کر رہی تھی۔

"تم جانتے ہو اس بات کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں صرف چاچا ہیں جو بس میری مانتے ہیں۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔

"کوئی اور بھی ہے۔ جو صرف تمہاری مانتا ہے۔ مگر تم شاید سمجھنا نہیں چاہتیں۔" طحہ کا بوجھل لہجہ... گل پرو دور مالٹوں کے درختوں کے جھنڈ کو دیکھنے لگی۔

"نہیں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں کم از کم میری طرف سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ خیر' میری کتابیں لائے۔" وہ اس کی طرف مڑی۔

"تم جانتی ہو میں تمہارا کام کبھی نہیں بھولتا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"جتایا مت کرو ہر وقت۔" وہ منہ بنا گئی۔

"تمہارے کمرے میں رکھ آیا ہوں۔ جا کر دیکھ لینا۔"

"اور اگر جو چاچی نے دیکھ لیں۔" وہ پریشان ہوئی۔

"پلنگ کے گدے کے نیچے چھپائی ہیں۔ اماں کم از کم گدا اٹھانے کی تکلیف کرنے سے تو رہیں۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا۔" وہ خوش ہوئی۔ "پھر میرا ایک کام کرو۔" طحہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"چاچا شہر گئے ہیں کام سے' آنے والے ہوں گے۔ تب تک تم باغ کا دھیان رکھ لو۔ میں بس سلسلے وار ناول پڑھ کر واپس آئی۔" تیز تیز بولتی وہ اس کے دل میں اترنے لگی۔

"اور اگر اماں نے تمہیں پھر دو تین کام بتا دیے تو؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"کر لوں گی' تم فکر مت کرو۔ بس خیال رہے کہ ایک آم بھی کوئی نہ چرانے پائے ورنہ قیامت کے دن تم پکڑے جاؤ گے۔" اس بات پر طحہ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ گل پرو نے کندھے اچکائے۔

"فکر مت کرو۔ آم تو کیا ایک گٹھلی بھی نہیں جائے گی باغ سے باہر۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ گل پرو مطمئن ہوگئی۔

"چلو پھر میں ناول پڑھ کر ابھی آئی۔" اس نے بانس کی چھڑی طحہ کو پکڑائی۔ اور چھلاوے کی طرح یہ جا وہ جا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو تکتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"کل افطاری میں کچھ زیادہ چیزیں بنالینا۔" رحمت علی نے کندھے پہ پڑی سفید چادر سے گیلے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے صغریٰ بی بی کو ہدایت کی۔

"وہ کس لیے؟" حسب توقع ان کا منہ بن گیا۔

"ظفری کا بیٹا آرہا ہے ولایت سے۔ اس کے لیے۔" سیدھا جواب آیا۔

"کون ظفری؟ وہی آپ کا دوست۔"

"ہاں ظفری اس کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں ہے۔ جو ہمارے گاؤں کی ہی ہو۔ اور پڑھی لکھی سمجھ دار ہو۔ میں نے تب ہی اس سے گل پرو کے بارے میں اشارتاً" بات کی ہے۔ اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا ہے' بس لڑکے کو ہمارا ماحول پسند آجائے۔" رحمت علی نے سامنے رکھی چنگیر سے روٹی اٹھاتے ہوئے کہا۔ صغریٰ بی بی کا تو منہ کھل گیا۔

"آپ اتنے بے وقوف ہیں؟" وہ بمشکل بولنے کے قابل ہوئیں۔

"کیوں کیا کردیا ایسا میں نے۔" رحمت علی اسی مطمئن انداز میں کھانا کھاتے رہے۔

"اتنا اچھا رشتہ آیا۔ اور آپ کو اپنی دو سگی بیٹیاں یاد نہ رہیں۔ وہ ڈائن یاد رہی۔" صغراں بی بی کی آواز غم کے مارے پھٹنے کو تھی۔

"اچھا رشتہ کسی اچھی لڑکی کا طلب گار ہے۔"

"میری بچیوں میں کیا برائی ہے؟" وہ تڑپ گئیں۔

"کوئی کام تو سکھلایا نہیں۔ سارا دن چارپائی توڑتی رہتی ہیں۔ اوپر سے تعلیم بھی ادھوری۔" انہوں نے آئینہ دکھایا۔

"کام بھی سیکھ جائیں گی۔ گل پرو کو بھی تو میں نے سکھایا ہے۔"

"تم نے نہیں۔ اس بے چاری کو تو وقت نے سب کچھ سکھادیا۔" فوراً" تصحیح کی گئی۔ "شاید اسی لیے ظفری نے جیسے ہی کسی اچھی لڑکی کا کہا' اس کا نام آگیا میرے لبوں پر۔"

"اور پھر ویسے بھی میرا ارادہ طحہ کے لیے تھا لیکن وہاں بھی تمہیں ہی عذر تھے۔ سو اب معاملہ باہر کا ہے۔ اور میں تمہاری ایک نہیں چلنے دوں گا۔ سو جو کہا ہے۔ اس پہ عمل کرو۔ اور ہاں طحہ کے کمرے کے ساتھ والا کمرہ سیٹ کروا دینا۔" وہ برتن میز پہ رکھ کر آرام سے لیٹ گئے۔ صغریٰ بی بی بے چینی سے انگلیاں چٹخانے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"ابا! آپ یوں کسی انجان بندے کو گھر میں رہنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟" صغریٰ بی بی نے فی الحال بات طحہ کے کان میں ڈال دی تھی۔ انہیں ہر صورت اس طوفان کا منہ موڑنا تھا۔ جو ان کے بچوں کے مستقبل کی ایک اچھی امید ان سے چھیننے کے درپے تھا۔ طحہ فوراً" باپ کے پاس آیا تھا۔ جو زمینوں کے حساب کتاب میں مصروف تھے۔

"کس نے کہہ دیا تم سے کہ وہ انجان آدمی ہے۔ یوں سمجھو تمہارا سگا چچا زاد آرہا ہے۔" انہوں نے محبت سے بتایا۔

"ابا! سمجھنے اور ہونے میں کافی فرق ہے۔"

"فرق مٹادینے میں کافی آسانی ہوتی ہے بیٹا۔ ورنہ گل پرو کے معاملے کو ہی دیکھ لو۔ تمہاری ماں اس میں اور بیٹیوں میں فرق نہ کرتی تو مجھے یوں باہر حیلہ نہ کرنا پڑتا۔" دلیل ٹھوس تھی۔ وہ چپ رہ گیا۔ رحمت علی اٹھ کر اس کے پاس آگئے۔

"ظفری کی خواہش ہے کہ اس کا بیٹا میرے گھر میں رہے۔ یہاں کے ماحول کو دیکھے اور اپنے لوگوں کو جانے۔ تاکہ نئے رشتے بنانے میں وہ صحیح فیصلہ خود کر

سکے۔ ظفری میرا قابل اعتماد دوست اور عزیز تر بھائی ہے۔ صرف اس لیے میں نے حامی بھری اور گل پرو کے بارے میں میری سوچ صرف اور صرف تمہاری اماں کے رویے کی دین ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری آنکھیں بند ہوتے ہی اس پہ یہ چار دیواری تنگ ہوجائے۔ اور وہ کسی بھی ایرے غیرے سے بیاہ دی جائے۔" وہ اسے سمجھا رہے تھے۔

"آپ میرے بارے میں بھی تو سوچ سکتے تھے بابا؟" اس نے گلہ کیا۔

"سب سے پہلے یہی سوچا تھا۔ لیکن تمہاری ماں، وہ کسی صورت برداشت نہیں کرے گی گل پرو کو تمہاری بیوی کی صورت میں، پھر جو رویہ تمہاری ماں نے گل پرو کے ساتھ روا رکھا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ دل سے اس رشتے پہ راضی ہوگی۔ تب ہی میں نے اس سے بات نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا کہ صرف اور صرف میری خواہش کو مقدم جان کر وہ اپنی ذات اور عزت نفس کو پس پشت ڈال دے۔"

ان کی باتوں میں وزن تھا۔ اور وہ خود بھی کئی بار اسے اپنے دل کی حالت بتا چکا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اس کی بات ٹال جاتی۔ بدل جاتی۔ واقعی جس طرح کا سلوک اماں نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اس کے بعد کس طرح وہ اس کے حق میں فیصلہ کر سکتی تھی۔ ایسے میں باہر سے اس طرح کا اچھا رشتہ واقعی گل پرو کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوتا۔ قسمت جو بہترین موقع فراہم کر رہی تھی۔ گل پرو جیسی سمجھ دار لڑکی بھلا اسے کہاں کھونے والی تھی۔ وہ مایوسی سے بس سوچتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"اف انکل۔۔۔ آپ کی یہ بیٹی تو کافی ڈراؤنی ہے۔ دن کے اکثر اوقات میں انہیں چار فٹ لمبی ڈنڈی کے ساتھ ہی دیکھا ہے۔" اسامہ کی بات پہ سب ہی ہنس دیے تھے۔ دور کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈالتی گل پرو البتہ بے خبر کھڑی تھی۔ طلحہ نے اداس سی نظر اس کے سادہ ڈھکے وجود پہ ڈالی تھی۔ جب سے اسامہ یہاں آیا تھا، وہ گھر میں بھی بڑی سی چادر لینے لگی تھی۔

"بیٹی کہاں، یہ تو میرا بیٹا ہے بیٹا۔ بازو ہے میرا گل پرو۔" رحمت علی کے لہجے میں غرور امڈ آیا اور صغریٰ بی بی کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"ویسے سچ کہوں، نیچر کے بہت قریب ہیں آپ لوگ۔ بہت خوب صورت۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ بابا اتنی خوب صورت جگہ رہتے تھے۔ میں تو اب واپس جا کر بابا کو یہیں آنے کے لیے فورس کروں گا۔ اپنی تعلیم اور قابلیت سے اس گاؤں کی ترقی کے لیے کام کروں گا۔" اسامہ کے لہجے میں جوش بول رہا تھا۔

رحمت علی اور طلحہ کو وہ سادہ فطرت لڑکا بہت پسند آیا تھا۔ اچانک ہی طلحہ کی نظر گل پرو پہ پڑی تھی۔ وہ حیران سی اسامہ کو دیکھے جا رہی تھی۔ طلحہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

دسترخوان کے درمیان میں مٹی سے بنی سرخ رنگ کی پرات دھری تھی۔ جس میں کے پی کے کی ایک روایتی ڈش ثوبت (پہلے سالن میں روٹی کے خشک ٹکڑے ڈبو کر اوپر سنہرے تیل کی تہ تھی) پرات کے درمیان میں روٹی کے اوپر مچھلی مسالا لگا گوشت اور ساتھ سلاد اور رائتے کے برتن رکھے تھے۔ ایک پلیٹ میں گھر کے بنے شامی کباب، لسی اور ساتھ میں پسے ہوئے چاولوں کی کھیر۔

"اتنا لذیذ کھانا آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں کھایا۔" بدیسی کھانوں کا عادی اسامہ دیسی کھانوں کی مرچ مسالوں سے سوں سوں کرنے کے باوجود تعریف کیے بنا نہ رہ سکا تھا۔ سب ہی مسکرا دیے۔

"یہ سب گل آپی نے بنایا ہے۔ کھانا ہمیشہ وہی بناتی ہیں۔" اقصیٰ نے فوراً بتانا فرض سمجھا۔ اماں اشارے کرتی رہ گئیں۔

"واؤ۔ حیرت ہے بھئی۔۔۔ آپ تو کمال ہو۔۔۔" اور اس بار وہ براہ راست گل پرو سے مخاطب ہوا تھا۔ طلحہ نے چونک کر پہلے اسامہ کی طرف دیکھا۔ جو گل پرو کو

دیکھے جارہا تھا۔ پھر اس نے گل پرو کی طرف نگاہ کی۔ وہ خاموشی سے افطاری کے برتن سمیٹ رہی تھی۔

"اور آپ عجیب بھی ہیں گل۔۔۔ بلکہ الگ سی۔۔۔ کیا گاؤں کی سب ہی لڑکیاں ایسا سوچتی ہیں اس عمر میں رحمت چاچا۔۔۔" اسامہ' رحمت علی کی طرف مڑا تھا۔ جن کے ہونٹوں پہ شفیق سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

"نہیں۔" صغریٰ بی بی بول اٹھی تھیں۔

"سب لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں بیٹا! صرف وہی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو پیدا ہوتے ہی اپنے ماں باپ کو سالم نگل جائیں۔" سفاکی کی حد کردی تھی صغریٰ بی بی نے۔۔۔ کوئی بھی بولنے کے قابل نہ رہا تھا۔ گل پرو منہ چھپا کے چل دی تھی۔ طلحہ نے البتہ اس کا گال پہ لڑھکتا آنسو صاف دیکھ لیا تھا۔ وہ بے بسی سے لب کاٹتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

آج موسم خوش گوار تھا۔ لطیف سی ہواؤں نے بادلوں بھرے دن کو مزید حسن بخشا تھا۔ ویسے بھی ان پانچ دنوں میں طلحہ کی رہنمائی میں اسے راستوں سے اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی۔ بڑے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھول کے وہ باغ میں آیا تو رم جھم شروع ہو چکی تھی۔

"رحمت چاچا۔۔۔" رحمت علی کو آوازیں دیتا وہ آم کے درختوں کی طرف آگیا۔ جس کے سامنے ہی بارہ دری تھی۔

"رحمت چاچا!" اس نے دوبارہ آواز دی۔

"کوئی کام ہے ان سے۔۔۔ وہ گھر آرام کرنے گئے ہیں۔" جواب موصول ہوا تو وہ حیران سا باہر آسمان میں جھانکنے لگا۔

"کون ہے وہاں۔۔۔" اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔

"میں ہوں۔" سامنے لگے آم کے پیڑ کے پتوں نے حرکت کی اور اسامہ دنگ رہ گیا۔ قدرے نیچی' موٹی شاخ پہ ٹیک لگا کر بیٹھی وہ مطمئن سی لڑکی گل پرو ہی تھی۔ اس کا ہر روپ نرالا تھا۔ ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے میں ٹک (سوراخ) لگے آم کے ساتھ وہ سنہری لال آنکھیں اسے دیکھے گئیں۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"آپ سے مطلب۔۔۔" صاف جواب آیا۔

"رات سوئیں نہیں تم؟" طلحہ نہ جانے کب وہاں آیا تھا۔ گل پرو نرم پڑ گئی۔

"نیند نہیں آئی۔ طبیعت الٹی ہونے لگی اور سر درد بھی۔۔۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"تب ہی روزہ بھی۔۔۔" اس کی آواز میں تاسف تھا۔

"اسی لیے چھپ کر آم تناول فرما رہی ہو۔" وہ مسکرایا۔ گل پرو سر ہلا گئی۔

"جاؤ۔۔۔ گھر جاکر آرام کرو' میں ہوں یہاں۔" اور وہ خاموشی سے آم پھینک کے چل دی۔

"ان کے ماں' بابا۔۔۔"

"گل کی پیدائش کے ایک سال کے اندر ہی دونوں کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔"

"اوہ تب ہی صغریٰ آنٹی۔۔۔" اسامہ جیسے سب سمجھ گیا۔

"کوئی منحوس نہیں ہوتا' سب قدرت کے کام ہیں۔۔۔ لیکن لوگوں کو کون سمجھائے۔" طلحہ کو افسوس تھا اور شرمندگی بھی۔۔۔

"ویسے سچ بتاؤں' مجھے آپ سب سے مل کر بہت اچھا لگا۔" اسامہ نے اس کی خفت کا تدارک کرنا چاہا۔

"مجھے خوب۔۔۔ بلکہ میں تو خواہش رکھتا ہوں کہ آپ سے تعلقات بنے رہیں۔"

"ان شاء اللہ۔۔۔" وہ مسکرا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسامہ پہلے سے زیادہ گل پرو کی دلجوئی کرنے میں لگ گیا تھا۔ کوئی بھی موقع ہوتا' اس کی تعریف کرنے میں بخل نہ کرتا۔ صغریٰ چاچی لاکھ برائیاں کرتیں۔ وہ کوئی نہ کوئی چٹکلہ چھوڑ کر بات بدل دیتا' چھوٹی اقصیٰ بھی اس کی ہمنوا تھی۔ فرح البتہ کم گو سی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی۔ ٹی وی یا موبائل بس

یہ دو ہی مشغلے تھے ابن کے... باہر کیا ہو رہا ہے' اماں کیا سوچ رہی ہیں' اسے کچھ دلچسپی نہ تھی۔
"اتنا پیارا لڑکا ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں باپ دشمن بن رہا ہے تو تم خود تو عقل کے ناخن لو۔" ابھی بھی وہ ایئر فون کانوں میں دیے بے فکر لیٹی تھی کہ اچانک ہی اماں نے دھاوا بول دیا۔
"کیا ہے اماں؟"
"ہائے ہائے... کہاں مقدر پھوڑ بیٹھی۔ ادھر وہ میسنی ہے۔ دو دو لڑکوں کو ہاتھ میں کیے بیٹھی ہے اور ادھر میرے والی..."
"توبہ کریں اماں... ہر وقت گل کے پیچھے پڑی رہتی ہیں آپ تو..." فرح کو برا لگا۔
"تو... اب اس پہ بھی جادو چڑھ گیا' اس منحوس کا۔" اماں نے کمر میں دو زور کی لگا دیں۔ وہ بے چاری سسک کے رہ گئی۔
"حق مار رہی ہے تم بہنوں کا۔ اسامہ جیسا لڑکا مقدر سے ملتا ہے۔"
"تو یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں اماں... مقدر میں ہے تو کوئی کیسے لے سکتا ہے مجھ سے... آپ خود کو نہ جلائیں۔" وہ باز نہ آئی۔ دو جھانپڑ مزید لگے۔ بیڈ سے اترتے ہی بنی۔
"ٹی وی دیکھ دیکھ کے ڈائیلاگ سیکھ گئی ہے۔ مجھے پڑھائے گی۔ ٹھہر جا... تجھے تو میں بتاتی ہوں۔" اماں تو پیچھے ہی پڑ گئیں۔ وہ ابا کے کمرے کی طرف بھاگی۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہو؟" نہر کنارے آم کی جڑوں میں پیر جمائے نہ جانے وہ کن سوچوں میں گم تھی۔ طلحہ کی آواز پہ چونک گئی۔
"اسامہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" طلحہ نے چونک کے اسے دیکھا تھا۔ وہ کتنی صاف گو تھی۔ جو دل میں ہوتا' وہی زبان پہ...
"اچھا... ویسے کافی اچھا بندہ ہے 'تئیں۔" وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔ گل پروگی نظریں دور نہر میں تیرتی بطخوں کے جوڑے پہ جمی تھیں۔ جن کے پیچھے چار بچے تیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بار بار ڈبکی لگاتے۔ توازن کھو دیتے اور ماں یا باپ کوئی انہیں پیار سے سیدھا کر دیتا۔
"اچھا بھی ہے اور میچور بھی... حالانکہ اس عمر میں لڑکے کافی فلرٹی ہوتے ہیں۔" سنجیدہ لہجے میں جواب آیا تھا۔ طلحہ مسکرایا۔
"تمہارا اشارہ میری طرف تو نہیں۔" شوخ کالی آنکھوں میں اداسی مسکرائی تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔
"تم فلرٹ بھی کرتے ہو؟" پوچھا گیا۔
"میں سمجھا شاید تم سوچتی ہو۔" وہ کندھے اچکا گیا۔
"تمہارے بارے میں... میں اتنا برا کبھی نہیں سوچ سکتی۔"
"اتنا اچھا بھی تو نہیں سوچا نا کبھی۔ جتنا اتنے کم عرصے میں تم نے اسامہ کے بارے میں جان لیا۔" وہ خفا تھا شاید... گل مسکرا دی۔

"تم جیلس ہو رہے ہو۔"
"حق بنتا ہے میرا... تمہارے سامنے میری پوزیشن کلیئر ہے۔" وہ بھی صاف گو تھا۔ گل پروا ٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے دیکھ کر طلحہ بھی...
"کبھی تو کسی خواب کا سرا تھما دیا کرو۔ کہانی شروع کرنے لگتا ہوں' تم دی اینڈ لگا دیتی ہو۔"
"تبدیلی کا اختیار نہیں ہے میرے پاس کہ درمیان کی کہانی' کردار' سچویشنز سب اپنی مرضی سے بیان کروں۔ تب تک آغاز اور اختتام کے حاشیے ہی رہنے دو۔" نرمی سے کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کی سبز دھانی دار چنری سے کناری کی ایک بوٹی (پھول) نہ جانے کیسے اکھڑ کر کچی گیلی مٹی پر گر گئی۔ طلحہ نے وہ بوٹی اٹھا کر مٹھی میں جکڑ لی تھی۔

ظفری چاچا آ رہے تھے۔ نہ جانے اسامہ نے نہیں کیا سگنل دیا تھا کہ انہوں نے اچانک ہی رحمت علی کو اپنے آنے کی خبر دی تھی۔ رحمت علی سمیت ان کی دونوں بیٹیاں بھی خوش تھیں کہ کسی کے نصیب

اسے یہی ان کے گھر میں بھی خوشی کے شادیانے بجیں گے۔ گل پرونے سب اللہ پہ چھوڑ رکھا تھا۔ اور یوں مطمئن تھی جیسے فیصلہ اس کی پسند کے مطابق ہی ہونا تھا۔ بے چین تھا تو طحہ..... اسے اپنی منزل کھونے کا ڈر ستا رہا تھا۔

مضطرب تھیں تو صغریٰ..... انہیں گل پرو کا روشن نصیب ڈرا رہا تھا۔ ایک چھت کے نیچے رہنے والے افراد' ایک ہی اللہ کے بندے' فطرت' سوچ اور چاہت سب کی ایسے الگ جیسے واقعی باہم کوئی رشتہ نہ ہو۔ یہ ہی تو ہیں میرے رب سوہنے دے رنگ..... کہہ دیا کہ سب خالی۔ تو پھر کیا حیرت..... یا حیرت.....

عبادتوں کی رات تھی..... رحمتوں کی رات..... ظفری چاچا آگئے تھے۔ ساری رات جاگ جاگ کر اللہ کے حضور سر بسجود رہا ہر فرد..... سارے سوالی رہے۔ کسی نے بھی بے لوث عبادت نہ کی تھی۔

سب مانگنے آئے تھے۔ دعاؤں کے لیے' حاجتوں کے لیے نیند قربان کی تھی۔ قسمت کے لیے روئے تھے۔ مقدر کی جیت کے لیے دعا کی تھی۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ خاکی بدن تھکنے لگے تھے۔ آنسو خشک ہو گئے اور ہاتھ اور زبان تھکن سے چور نہ جانے مقدر میں کیا کچھ بدلا گیا تھا۔ کس کی دعا رد ہوئی تھی۔ کس کی دعا مقبول۔ وقت جلد یا بدیر سب دکھانے والا تھا۔

"رحمت علی....." رحمت علی سر جھکائے منتظر تھے کہ ظفری کوئی بات کریں۔ ان کے پکارنے پر انہوں نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔

"اسامہ تیرا بھی بیٹا ہے' ہے نا؟"

"بے شک..... مجھے طحہ کی طرح ہی عزیز ہے۔" انہوں نے اعتراف کیا۔

"اس نے بھی تمہارے فرماں بردار بیٹے کی طرح فیصلہ مجھ پہ چھوڑا ہے۔ اسے اس گھر کا ماحول' اطوار' سب بہت پسند آگئے ہیں۔ اسی لیے اس نے آخری فیصلہ ہم پہ چھوڑا ہے۔ اب آخری فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ تمہاری تینوں بیٹیاں میرے لیے برابر ہیں۔ جس کے بھی قابل اسامہ کو سمجھو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" کس قدر عزت بھرا سوال اٹھایا تھا ظفری نے۔ اس نے آخر میں بھی دوستی نبھادی۔ رحمت علی بے اختیار اٹھ کر ان کے گلے لگ گئے۔

☆ ☆ ☆

آج آخری روزہ تھا۔ قوی امکان تھا کہ آج چاند نظر آجائے گا۔ تب ہی اس نے افطاری میں گلاب جامن اور جلیبیاں بھی بنالی تھیں تاکہ خوشی کے موقع پر چاند نظر آتے ہی سب کا منہ میٹھا کرا سکے۔

سب کچھ تیار کر کے وہ وضو کرنے کمرے میں آئی تو بابا کو اپنا منتظر پایا۔

"چاچا آپ....." وہ حیران ہوئی۔

"ادھر آؤ..... میرے پاس بیٹھو۔" وہ خاموشی سے ان کے قریب بیٹھ گئی۔ چاچا نے ظفر علی کی ساری بات اسے بتادی۔

"اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے بیٹا۔ میرا بس چلے تو میں تمہیں ایک پل کے لیے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"لیکن میرا ضمیر..... اسامہ صاحب روزگار ہے۔ اچھے علاقے میں سیٹل ہے۔ نیک ہے۔ اور طحہ..... میری دلی خواہش تھی کہ تم اور طحہ..... مگر تمہاری چاچی کے سلوک نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ میں تمہارے سامنے دست سوال دراز کرسکوں۔" وہ شرمندہ تھے۔

"میں بھی یہ ہی سمجھتی تھی چاچا..... کہ چاچی نہ سہی آپ تو میرے اپنے ہیں۔ مجھے خود سے دور کبھی نہیں کریں گے۔" وہ نم لہجے میں بولی تھی۔

"گل پرو....." رحمت علی دنگ رہ گئے۔

"انسان ہمیشہ ایک سا کہاں رہتا ہے چاچا..... وقت بدل جاتا ہے۔ رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ چاچی بھی بدل ہی جاتی۔" وہ دبی آواز میں رو رہی تھی۔

"لیکن کب تک بیٹا۔ میں کب تک تجھے ذلیل ہوتا دیکھوں۔"

"میں انتظار کرلیتی چاچا۔" اور رحمت علی چپ

ہو گئے۔

"میں یہاں چاچی کی ڈانٹ ڈپٹ تو سہ سکتی ہوں مگر فرح کے حق پہ ڈاکے کے طعنے نہیں چاچا۔ میرا اللہ وارث ہے۔ آپ فرح کے لیے ہاں کر دیں۔" وہ اٹھ گئی تھی اور رحمت علی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں نے فیصلہ کیا ہے۔ اسامہ کے لیے فرح کا نام ٹھیک رہے گا۔" وہ افطاری کے لیے چاچا' چاچی کو بلانے ان کے کمرے کی طرف آرہی تھی۔ جب رحمت علی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ مطمئن ہو کر مسکرادی۔

"اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ کو بھی عقل آئی ہے۔" چاچی بولیں۔

"اور میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر طحہ اور گل پرد کی بات بھی طے ہو جائے۔"

"کیا...." چاچی پھٹ پڑیں۔ گل پرد کی آنکھوں میں نمی جھلکی۔

"ورنہ تمہاری مرضی.... میں نام بدل دوں گا۔ طحہ نہ سہی اسامہ سہی۔ گل پرو بہر حال میری بڑی بیٹی ہے اور رہے گی۔"

"نہیں' نہیں.... مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ گھر کی بچی ہے۔ دیکھی بھالی ہے۔ باہر والوں کا کیا پتا جی.... وقت واقعی بدل جاتا ہے۔ وہ طحہ کو بلانے چل دی۔

☼ ☼ ☼

روزہ کھلنے میں تھوڑی دیر باقی تھی اور طحہ کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ وہ سب کو دستر خوان پہ بلا کر کھجور کی ایک پلیٹ ہاتھ میں اٹھائے گھر کی پچھلی طرف نہر والے حصے میں آگئی۔ حسب توقع طحہ نہر میں پاؤں ڈبوئے بیٹھا تھا۔

"مجھے پتا تھا تم یہیں ملو گے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں تو گھر والوں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔" طحہ دور ڈوبتے سورج کو گھورتے ہوئے بولا۔

"کوئی کام ہو گا تو یہاں ہوں نا...." وہ خاموش رہا۔

"ایک بات بتاؤ طحہ...." طحہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"دوسرے کی مرضی کو مقدم جاننے والے ایک دم سے ان کے بارے میں سب کچھ خود کیوں فرض کر لیتے ہیں۔" وہ بولی تو طحہ نظریں پھیر گیا۔

"اگر یہ سوال میرے بارے میں ہے تو میں نے کچھ بھی فرض نہیں کیا۔ صرف خود کو تمہاری راہ کا کانٹا بننے سے روکا ہے بس.... کیونکہ میری راہ سے زیادہ وہ راہ سہل ہے تمہارے لیے...." وہ صاف گوئی سے بولا۔

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟" ایک اور سوال۔

"صرف سوچتا ہوں۔" وہ پانی پہ انگلیاں پھیرنے لگا۔

"تو کیوں سوچتے ہو۔ خود کو خوار کرتے ہو۔ اللہ پہ چھوڑ دو نا۔ یہ زیادہ آسان نہیں۔" سائرن بجا۔ اذان ہونے لگی۔ اس نے کھجور کی پلیٹ ایک موٹی جڑ پہ جمائی اور دعا مانگنے لگی۔ طحہ بھی روزہ کھولنے لگا۔ گل پرو نے دونوں پیر نہر میں ڈال دیے اور نظریں آسمان پہ....

"کیونکہ جب بھی ہم سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیتے ہیں تو وہ ہی دے دیتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔" طحہ اسے دیکھنے لگا۔

"وہ دیکھو.... چاند نظر آگیا۔" طحہ نے اس کی یہ بات نہ سنی۔

"تم مجھے پھر سے امید دلا رہی ہو؟" وہ حیران تھا۔

"امید نہیں' یقین دلا رہی ہوں۔ آگے جو تم سمجھو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ طحہ حیران سا بیٹھا رہ گیا۔ وہ دور ہوتی گئی۔ پٹاخے کی آواز بلند ہوئی۔ وہ چونکا.... اٹھا.... چلایا۔

"رکو.... سنو تو...." طحہ خوشی سے چلاتا' اچھلتا اس کا ہم قدم ہوا۔ گل پرو نے مسکراتے ہوئے نظر اٹھا کر دیکھا.... چاند بھی اس کا ہمنوا ہوا تھا۔

☼

عطیہ خالد

گزشتہ کئی دنوں سے ڈیجیٹل ڈائری کے اندر درج یہ اوراق میں لاتعداد مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اپنی انگلیوں سے ان الفاظ کو چھو چھو کر محسوس کرتا کوئی مجذوب ہی تھا میں!

"فروری 2011ء"

"میں نے سنا تم محبت کے گیت گا رہے تھے۔ سرخ اور گلابی کلیوں کو گوندھ کر تراشے گئے تھے اس کے بول جیسے۔ بدھ بھرے اور امید بخش۔ عجب مہارت سے تمہاری انگلیاں پیانو پر رقص کر رہی تھیں۔ میری محبت آمیز گنگناہٹ نے اس گیت کو مزید میٹھا اور راحت بخش بنا دیا تھا۔ تم نے پہلے خدائے واحد کے کچھ نام لیے اور پھر اس کی عطا کے ذکر کو بصد نیاز گایا۔ محبت کی عنایت کے ذکر پر تم ٹھہر گئے.... اور دہرانے لگے بار بار۔ محبت مچل کر تمہارے لبوں سے چھوٹتی تھی۔ دیر تک ہم نے گنگنایا۔ گیت ختم ہوا تو جیسے سحر ٹوٹ گیا اور مجھ میں سما گیا خمار بن کر۔"

میں تمہارے قریب اسٹول پر بیٹھی تھی تم سے ٹیک لگا کر مجھے ایسے بیٹھنا پسند ہے۔ گیت ختم ہوا تو جیسے سحر ٹوٹ گیا اور ہم میں سما گیا خمار بن کر۔ تم نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اور میرے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کر کے ان کو اپنے گرم ہاتھوں سے رگڑ کر گرم کرنے لگے۔

"اب تو سردی ختم ہو چکی ہے۔" میں اٹھلائی اور تم مسکرا کر کافی پینے لگے۔ تمہیں کافی پیے بغیر سونا پسند نہیں۔ کچھ چیک کر کے واپس آئی تو تم کو فون پر مصروف دیکھا اور تمہاری فراغت کا انتظار کرتی لیٹ گئی۔ دن بھر کی تھکی نجانے کس وقت سو گئی۔

صبح جب ناشتا کرنے تم کچن میں ٹیبل پر آئے تو میں نے بے ساختہ داد دی۔ سیاہ پینٹ کوٹ اور سرخ شرٹ۔ ماتھے پر گھرے بھورے بال، روشن چمک دار پیشانی۔ میں بھاگ کر گئی اور سرخ کلی توڑ لائی اور اسے تمہارے لباس میں ٹانک دیا۔ مسکرا کر غنچے کی طرح کھل گئی وہ اس پذیرائی پر۔

ناشتے کے بعد میں ـــ اپنی چائے میز پر چھوڑ کر آئی تمہیں رخصت کرنے۔ تم بائیک پر بیٹھے اور فوراً" ہی یہ جا وہ جا۔ بنا مڑے، بنا میری طرف دیکھے۔ میرے خدا حافظ! کا جواب بھی نہیں دیا شاید.... یہ آج تیسرا دن تھا۔ دل پر ایک بوجھ سا آگرا، وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں گلاب کی کلیوں کو دیکھنے لگی۔ امرود پر چڑیوں کا ایک جوڑا لاڈ کر رہا تھا۔ زرد چنبیلی کی کلیاں میرے اوپر ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اور ان کی مہک ارد گرد چکرا رہی تھی۔ یہ پھول اور پتے اور موسم یونہی دیوانہ کرتے ہیں مجھے۔

ان سے دامن بچا کر اندر چلی آئی۔ صفائی ستھرائی کر کے کپڑے دھوئے۔ پھر بہت دل لگا کر پلاؤ بنایا۔ رائتہ کے لیے چیزیں تیار کیں۔ رنگین پھولوں سے سجی شیفون کی ساڑھی اٹھا کر غسل کرنے چل دی۔ تیاری پر خاص توجہ دی، خوشبوؤں میں بس کر باہر آئی ہی تھی کہ موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ تیزی سے باہر آکر دیکھا تو تم تھے، مگر تمہارے پیچھے ایک لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ میں تھم سی گئی۔ تم نے تعارف کرایا۔ تمہاری دوست۔ نام تو تم سے سنا تھا، مگر اس قدر بے تکلفی کا اندازہ نہ تھا۔ خیر مہمان سے خیر سگالی کی کلمات ادا کر کے اس کو تمہارے ساتھ چھوڑا اور خود کچن میں

چلی آئی' کھانے میں کچھ اضافہ کرنے۔ جلدی سے
چکن کا سالن چڑھایا' روٹیاں بنانے اور آئس کریم کو
فروٹ کیوبز سے سجانے تک خوش رنگ سالن تیار

تھا۔ ٹیبل سیٹ کر کے چلی آئی تم کو بلانے تو دیکھا تم
دونوں آ ہی رہے تھے۔ تمہارے بازو سے انجلی لپٹی
ہوئی تھی۔ اسکائی بلیو اسکرٹ بلاؤز میں اس کا سنہری سراپا
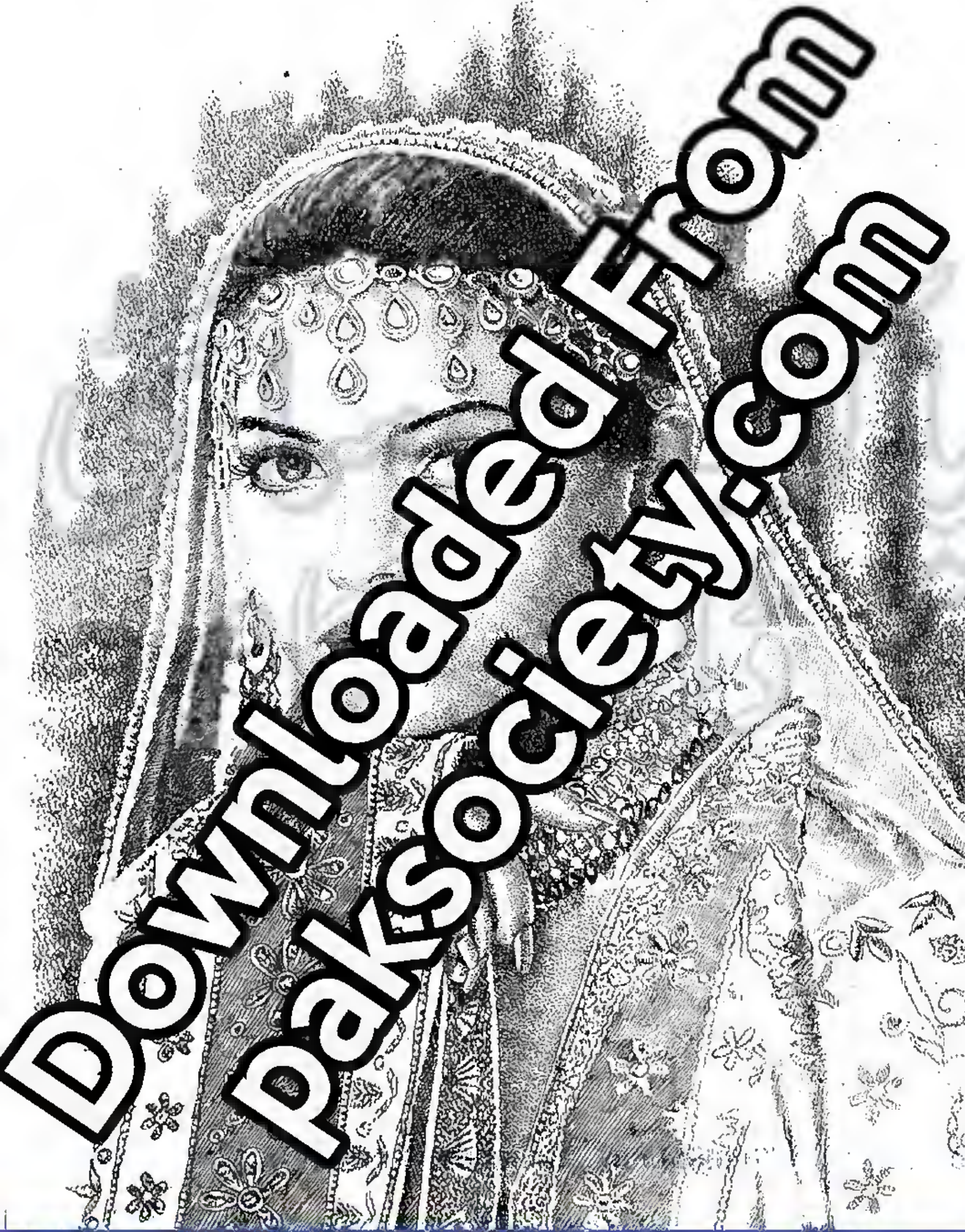
دیک رہا تھا۔ سنہرے تم بالوں کے گچھے پشت پر لہرا رہے تھے۔ میں نے بلاوجہ ہی اپنا آنچل درست کیا اور سامنے لگے آئینے میں خود پر نظر ڈالی۔ پہلے ایسے موازنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی' نہ ہی ایسی بے چینی سے میں نے آئینہ دیکھا تھا۔

انجلی نے قاب دیکھتے ہی کہا۔ "واؤ! پلاؤ۔" اور جھٹ سے نکال لیا۔ پہلے تمہاری پلیٹ میں پھر اپنی میں۔ تم کبھی پلاؤ کے ساتھ سالن نہیں کھاتے' مگر آج کھا رہے تھے۔

"تمہاری بیوی کھانے پر تمہارا انتظار نہیں کرتی؟" اس نے انگلش میں پوچھا اور تمہاری پلیٹ سے نوالہ لیا۔

تم نے ایک لحظے کے لیے دیکھا اور بولے "تم بھی کھاؤ نا' یار!"

وہ بول رہی تھی اور تم سن رہے تھے۔ چند لمحے مزید گزرے تو مجھے لگا کہ میرے آنسو پلکوں سے باہر آجائیں گے۔ میں میٹھا لینے کے بہانے سبھاؤ سے اٹھ گئی۔ سرخ گلاب مرجھانے لگے' زرد کلیوں کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ ہر رات تم نغمہ سرا ہوتے۔ وہ تمہارے ساتھ بیٹھ جاتی۔ میں سامنے دریچے سے ٹیک لگالیتی' تمہارے گیتوں سے تمہارا عکس گم ہونے لگا۔ محبت مچل کر تمہارے ہونٹوں سے باہر آتی تھی' مگر میں نے سُر ملانا چھوڑ دیا۔ ستارے اب روشنیاں لے کر نہیں اترتے تھے۔ میں تمہارے من پسند رنگوں سے خود کو سجاتی۔ اودا' ہرا' سرخ اور کبھی صندلی.... مگر تم دیکھتے ہی نہ تھے۔ رات گئے تک تم دونوں محفل لگاتے اور شاموں کو بھی باغ میں ساتھ ٹہلتے۔ میرے خدایا یہ زندگی کا کون سا باب تھا۔ یہ کیسی دوستی تھی۔ رات دیر تک تمہارا انتظار کرتی۔ اور تم کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیتے۔ میں اپنی گزشتہ زندگی پر بار بار نظر ڈالتی اور اپنی غلطی تلاش کرنے میں ناکام ہوتی۔

میرے سجدے طویل ہونے لگے اور پھر طویل تر۔ تم جوں جوں مجھ سے بے رخی برتتے گئے' میں معبود کی پناہ تلاشنے میں جی جان سے جت گئی۔ تمہاری نوکری کی وجہ سے ہم اپنے بزرگوں سے دور رہنے پر مجبور تھے۔ بہت بار فون اٹھاتی اور والدین سے مشورہ لینا چاہتی' مگر حیا آڑے آتی کہ کیا کہوں۔ تمہاری دوست تو اس خطے سے آئی تھی' جہاں ایسی دوستیوں کا رواج ہے' مگر تم.... اس بات کو سوچ سوچ کر دل ہولتا کہ تم کو کیا ہو گیا؟ تم تو ایک مشرقی گھرانے کے فرد تھے.... اور یہ بھی تو واپس جانے کا نام نہیں لیتی۔ اس سارے معاملے کو ایک ماہ کا عرصہ ہونے کو آیا تھا۔ گلاب' بیلے اور چنبیلی کی کلیاں میرے ساتھ ہی مرجھا رہی تھیں۔ کوئل کی کوک میں یہ کیسی چیخ در آئی تھی.... میں تمام تر آزردگی کے باوجود پہلے سے بڑھ کر اس در پر جھکنے لگی کہ دعا پر ایمان میری گھٹی میں پڑا تھا۔

شاید میں نے اپنے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رکھا اس لیے بہت کمزور ہو رہی تھی۔ چکر بہت آ رہے تھے۔ کیا آج چھٹی کا دن ہے۔ تم ناشتے کے لیے بنا تیار ہوئے آ رہے ہو۔ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ ایک دم سب گول گول گھومنے لگا.... اور شاید میں گر گئی' مگر نہیں تم نے مجھے تھام لیا اور کمرے میں لے آئے۔ ہمارے پڑوس میں ڈاکٹر فاطمہ رہتی ہیں۔ تم ان کو لے آئے تھے۔ کچھ بنیادی سوالات کرنے اور بی پی وغیرہ چیک کرنے کے بعد انہوں نے کہا ہم نے اب تک پریگنینسی ٹیسٹ کیوں نہیں کروایا۔ اور تمہارے کان کھینچے کہ تم نے میرا خیال کیوں نہیں رکھا۔

میں سب بھول گئی۔ انجلی بھی۔ تمہاری بے رخی بھی۔ میری آنکھوں سے شکرانے کے آنسو بہنے لگے۔ یہ قبولیت کا دن تھا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں ایک دن بریک کے دوران آسیہ سے واٹس ایپ پر بات کر رہا تھا کہ فیس بک پر انجلی کی فرینڈ ریکوئسٹ آئی۔ پروفائل کو غور سے دیکھا۔ واقعی وہی تھی۔ بڑی حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ تقریباً" چار سال

بعد رابطہ ہورہا تھا۔ بہت مزہ آیا اس سے بات کرکے۔
مانچسٹر یونیورسٹی میں اکاؤنٹس کی کلاس میں انجلی میری کلاس فیلو تھی۔ اس کی ماں عیسائی تھی اور باپ پاکستانی نژاد مسلمان تھا۔ اس لیے وہ کافی حد تک اردو بولنے سے آگاہ تھی۔ یہی وجہ ہماری دوستی کا سبب بھی بن گئی تھی۔ انجلی کی طبیعت میں عجیب سا "جنون" اور حاکمیت سی تھی۔ وہ مجھے اپنے تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ میں کسی اور سے بات بھی کرتا تو وہ ناراض ہوجاتی۔ بڑی مشکلوں سے مانتی۔ امیر ماں باپ کی بگڑی ہوئی شہزادی تھی وہ۔

"آسو... آسی... آسیہ..." میں نے اپنی بیوی کو آواز دی لیکن بہت ڈل ہوگئی ہے یہ لڑکی تو۔ مجھے انجلی پر بھی غصہ آیا کہ بلاوجہ مجھے مصروف کرلیا اور میری بیوی سوگئی۔ خیر کل سہی۔ الارم سیٹ کرکے سرہانے رکھا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح جلدی تیار ہوتے بھی دیر ہوگئی۔ یہ آسیہ کھوجاتی ہے جانے کہاں...

"سنو لڑکی! چند دن تک مجھے آفس آدھ گھنٹہ پہلے پہنچنا ہے۔"

"تو آپ مجھے اب بتا رہے ہیں۔ رات میں بتانا چاہیے تھا ناں!"

"فوراً" نکلوں تو پہنچ ہی جاؤں گا..." میں ناشتا کرتے ہی بھاگ نکلا...

رات بستر پر پہنچا ہی تھا کہ انجلی آن لائن بلنک کرنے لگا۔ آسیہ کے آنے تک ذرا دیر حال احوال پوچھ لوں۔ اس سے باتیں ختم ہوئیں تو دیکھا آسیہ سوچکی تھی۔ زیادتی ہی ہورہی ہے چند دنوں سے آسیہ کے ساتھ... خیر کل منالوں گا اپنی پیاری سی بیوی کو۔ نجانے کیوں اس کو اس قدر نیند آنے لگی ہے۔ دیر تک میں اس کے ملیح، روشن چہرے کو دیکھتا رہا۔

آفس میں آج کل آؤٹ ہورہا تھا۔ سخت ٹف شیڈول اور تھکاوٹ بے حد۔ درمیان میں جہاں موبائل پر نظر پڑتی، انجلی کا کوئی مزے دار سا میسج مسکرانے پر مجبور کردیتا۔

"بہت فارغ ہوتی ہو آج کل۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"یو نو ناٹ کہ میں مینیج کرسکتی ہوں۔"

ہمیشہ کی حاضر جواب تھی وہ۔ روز سوچتا تھا کہ آسیہ کو لے کر ذرا باہر نکلوں۔ گھر میں قید ہی ہو کر رہ گئی وہ تو۔ مگر آفس سے واپسی تک سب خیال ہوا ہوجاتے۔ شاور کے بعد کھانا اور کچھ دیر کے لیے پیانو... کتنا خوش ہوتی ہے آس میرا گانا سن کر۔ کل تو گانا سنتے سنتے ہی سوچکی تھی۔ آسیہ کا چہرہ میری نگاہوں میں پھول کی طرح کھلا ہوا تھا کہ فون کی رنگ ہوئی... انجلی کالنگ... انجلی کالنگ... حیران ہوتے ہوئے فون آن کرلیا...

"کیا...؟ یار ایسا مذاق تو نہ کر!"

واقعی وہ تو آچکی تھی... میرے شہر بلکہ میرے آفس کے باہر... میں بریف کیس سمیٹتا ہوا تیزی سے باہر آیا تو واقعی ایک چھوٹا سا بیگ پیٹھ پر لادے براؤن پینٹ اور پنک شرٹ میں انجلی موجود تھی...

"حیران کردیا تم نے تو..."

"بلکہ پریشان بھی"... اس نے ٹکڑا لگایا... "گھر لے چلو اپنے فوراً" میں بھوک سے مرنے والی ہوں۔"

میں مرتا کیا نہ کرتا بٹھا کر لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک یا دو دن کی مہمان ہوگی وہ۔ مگر وہ تو رک ہی گئی۔ وہی حاکمیت بھرا، قابو میں کرنے والا انداز۔ وہ جابر بھی اور حاکم بھی۔ ایسے کرو، یہاں چلتے ہیں... یہ گانا سناؤ... ٹھہرو، میں یہ دھن بجاتی ہوں۔ آس کی آنکھوں کے جگنو مدھم پڑنے لگے تھے۔ روز سوچتا کہ رات میں اس کو منالوں گا... مگر انجلی تو بلا کی طرح وارد ہوچکی تھی۔ رات دیر تک جاگتی۔ آس میرا انتظار کرتے کرتے سوجاتی۔ میری پیاری آس۔

انجلی صبح اٹھ کر میرے ساتھ ہی نکل جاتی۔ جب تک میں آفس میں رہتا، شہر کی خاک چھانتی واپسی پر پھر

میرے ساتھ۔

"یار! تمہاری بیوی بہت ڈل ہے۔۔۔ کیسی زندگی ہے تمہاری جس میں کوئی تھرل ہے نہ ایڈونچر۔۔۔" اس نے جیسے ترس کھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"تمہارا مشاہدہ کمزور ہے۔۔۔"

"میری عقل تم سے تیز ہے۔ اب دیکھو نا کیا پہنتی ہے تمہاری بیوی۔۔۔ ساڑھیاں۔۔۔ پہننے میں ہی ٹائم لگ جاتا ہے۔۔۔ ٹھیک ہے، شکل اچھی ہے۔۔۔ برا مت ماننا لیکن مجھے یہ کہہ لینے دو کہ آسیہ بہت ہی بورنگ ہے۔ وہ تمہیں ڈیزرو نہیں کرتی۔۔۔ بلکہ وہ تو۔۔۔"

"بس بہت ہو گیا مس انجلی۔۔۔" انجلی کے جملہ مکمل ہونے سے قبل آسیہ کمرے میں داخل ہو گئی اور سخت آواز میں بولی۔ "مجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں عشق ہے۔ بہت فائدہ اٹھالیا تم نے میری خاموشی اور مروت کا۔ خاموشی سے اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔" اور مڑ کر مجھ سے بولی۔

"تمہارا شہر ہوٹلوں سے بھرا پڑا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر دوست کو اٹھا کر گھر لے آیا جائے۔ میں اس خاتون کو اب ایک اور منٹ بھی اپنے گھر میں رکھنے کی روادار نہیں ہوں۔"

✲ ✲ ✲

ہماری شادی کو تیسرا سال تھا کہ ہمارے گھر ننھے مہمان کی امید ہوئی۔ میں بہت خوش تھا۔ اور آسیہ بھی۔ اس کی امی ہمارے پاس آنا چاہ رہی تھیں مگر میں نے روک دیا۔ کیونکہ آفس نے اکاؤنٹس کے چند شارٹ کورسز کے لیے مجھے انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہمارے آفس کی ایک برانچ وہاں بھی تھی۔ "آسیہ بہت کمزور ہو رہی تھی۔ میں یوں بھی اس کو پنڈی اس کے والدین کے پاس بھیجنا چاہ رہا تھا۔ اس سے بات کی تو وہ میرے جانے کے خیال سے گھبرا کر رونے لگی۔

"صرف تین چار مہینوں کی تو بات ہے آسیہ۔"

"کم تو تین چار دن بھی نہیں ہوتے۔"

"تمہاری فیملی بڑھ رہی ہے' یہ تھوڑی سی جدائی آنے والے دنوں میں بہت سی سہولتیں بھی لائے گی یار۔" میں نے اس کے آنسو چن لیے۔

لندن پہنچا تو ڈھیروں مصروفیت نے گھیر لیا۔ آفس نے پے انگ گیسٹ کے طور پر میری رہائش کا انتظام ایک انڈین نژاد فیملی کے ساتھ کر دیا تھا۔ جہاں سے آفس قریب ہی تھا۔ صبح سات بجے سے رات نو بجے تک آفس میں کام' کام اور کام۔ لنچ بریک میں آسیہ سے واٹس ایپ پر بات کرتا۔ اس کا پانچواں مہینہ شروع تھا لیکن ہیموگلوبن کم تھا۔ مجھے اس کی بہت فکر تھی۔

ایک رات آفس میں ہی تھا کہ انجلی کا میسج آیا خوشی کے ساتھ اس نے مجھے مسیج کیا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ کیا واقعی میں انگلینڈ میں ہوں۔ میرے اثبات میں جواب دیتے ہی تواتر سے میسج آنے لگے۔ اس نے میری رہائش کا پوچھا۔ اگلے دن ہفتہ تھا۔ میرا آفس سے آف تھا۔ وہ صبح ہی میرے پاس پہنچ چکی تھی۔

حیرت انگیز طور پر اس نے آسیہ کے رویے کا برا نہیں مانا تھا لیکن میں اس سے زیادہ رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ انجلی ہی کیا جو پیچھے ہٹ جاتی۔ میری قسمت وہ ان دنوں کوئی جاب نہیں کر رہی تھی بس پھر آفس ختم ہوتا اور انجلی شروع ہوتی۔ چھٹیوں میں تو ہم نے پورا لندن چھان مارا۔ مجھے لگتا کہ یونیورسٹی کے دن لوٹ آئے ہوں۔ لندن آئی سے شروع ہو کر برٹش میوزیم' یونیورسٹی کے قریب پرانے کافی ہاؤس' شاپنگ مالز' سینٹرل لندن کے ٹی ہاؤسز' پزا ہٹس۔ آدھی آدھی رات تک ہم پھرتے۔

میری واپسی میں ابھی دس دن تھے۔ میرے تینوں کورسز ختم ہو چکے تھے۔ انجلی نے مجھے پیرس چلنے کی آفر کی۔ میرا ڈریم لینڈ پیرس۔ آسیہ کی ڈلیوری میں ابھی تقریباً" ایک ماہ تھا۔ لیکن اب وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔ بار بار کہہ رہی تھی کہ میں واپس آجاؤں۔ لیکن پیرس۔۔۔ مجھے زندگی کب ایسا موقع دے گی۔۔۔ شاید

کبھی نہیں اور اگر دیا بھی تو بہت گزر دے کے بعد دے۔

"بس دس دن' پھر اس کے ساتھ ہوں گا۔۔۔۔" میں نے خود کو تسلی دی۔

اگلی صبح میں اور انجلی پیرس پہنچ گئے۔ ایک بار تو آسیہ مجھے بہت یاد آئی۔ لیکن وہاں کی فسوں ساز فضا اور انجلی کی دل ربا صحبت نے مجھے گھیر سا لیا تھا۔ غضب کی ڈریسنگ کر رہی تھی انجلی تو یہاں۔ میں اس کو دیکھتا کہ پیرس کو!! دریائے سین کے کنارے ٹہلتے ہوئے' بلیک ریشمی میکسی میں وہ لہرا رہی تھی بل کھا رہی تھی۔ اس پر لگے نگوں میں جیسے روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں اور اس کی سنہری رنگت کو مزید دلفریب بنا رہی تھیں۔

"میں کسی کے ساتھ ہوں۔ پھر بھی میں کسی کی یاد میں ہوں۔"

مجھے یوں معلوم ہوا جیسے آس میرے ساتھ گنگنانا چاہتی ہو۔۔۔۔

"کوئی قرار ہے۔۔۔ یاد ہے۔۔۔ پیار ہے۔۔۔"

جس روز ہم رائل اکیڈمی آف آرٹ دیکھنے کے لیے نکلے تو اس نے قدیم شہزادیوں کا روپ دھارا تھا۔ اولیو گرین بلاوز کے ساتھ سیاہ اسکرٹ۔ اسکرٹ لمبا تھا اور بہت گھیر دار۔ قدیمی طرز کے موتیوں کا بڑا سا ہار اور لمبے آویزے نمایاں کرنے کے لیے اس نے سنہری بالوں کے گچھوں کو اونچی پونی میں باندھا ہوا تھا۔ میک اپ کی تو ضرورت ہی نہیں تھی اسے۔ آسیہ کے لیے بھی ایسا ہی ہار آویزے خریدوں گا میں۔ ہم آرٹ میوزیم بھی گئے اور ڈزنی لینڈ میں تو بہت لطف آیا۔ بڑے بڑے کی ماوس سے سجی ہوئی ایک جیسی ٹی شرٹس لائی تھی انجلی۔ اور اس کے اصرار پر مجھے پہننی ہی پڑی۔

اور آخری دن تو اس نے مجھے حیران ہی کر دیا تھا۔ وہ شیشوں کے کام کا میرون کرتا پہن کر آئی تھی جو میں نے اس کو یونیورسٹی کے دنوں میں گفٹ کیا تھا۔ اس کے ساتھ موجود اجرک کو اس نے میرے گرد مفلر کی طرح لپیٹ دیا۔ ایسا ہی کرتا آسیہ کے پاس بھی تھا۔

"گورجئیس" میں نے جیسے آسیہ کو کہا۔

"مائی پلیژر" انجلی نے لہرا کر اسے وصول کیا اور میرے بازو سے لپٹ کر سیلفی لینے لگی۔

آٹھ دن پیرس میں گھومتے ہوئے' ہر ہر پل سے خوشی کشید کرتے ہوئے میں نے آسیہ کو بہت کم میسجز کیے۔ البتہ میں نے اس کے لیے بہت سی شاپنگ کی تھی۔ انجلی کی پسند بہت کلاسیکل تھی۔ واپس لندن آکر میں نے پیکنگ مکمل کی۔ آج مجھے انجلی کے اپارٹمنٹ پر ڈنر کرنا تھا' کیب لے کر اس کے گھر پہنچا۔ اور کیب والے سے طے کر لیا کہ وہ مجھے دو گھنٹے کے بعد وہیں سے پک کر لے۔

انجلی کا اپارٹمنٹ اسی کی طرح خوب صورت تھا۔ لائٹ بلو اور گرے رنگ سے سجا ہوا۔ بہت سکون بخش ماحول تھا۔ انجلی نے بہت مزے دار کھانا بنایا ہوا تھا۔ میں اس کے لیے ایک پل اوور اور کچھ شرٹس تحفے میں لے گیا تھا۔ وہ بے حد خوش ہوئی۔ کھانا کھا کر ہم نے کافی پی۔ اب میں رخصت ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے رک جانے پر اصرار کرنے لگی۔ کافی کے مگ کچن میں رکھ کر جب وہ واپس آئی تو سرخ بلاوز میں تھی۔ میں نے نظریں جھکالیں۔ اس نے میرے بازو سے لپٹ کر سیلفی لی اور میرے کان کے قریب ہو کر رک جانے کے لیے سرگوشی کی۔ اس کے منہ سے آتی ہوئی ناگوار بدبو نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں ایک لمحے میں اس سے بازو چھڑاتا اپنا اوور کوٹ اٹھا کر اس کے گھر سے بھاگ نکلا۔ اور کچھ دور بھاگتا ہی چلا گیا۔۔۔۔

"اف میرے خدایا!" میرے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے اور دل شرمساری کے گڑھے میں جا گرا تھا۔ کچھ دیر میں سڑک پر ہی ٹہلتا رہا۔ یہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ صبح چار بجے میری فلائٹ تھی۔ دوران سفر بھی سکون نہ ملا۔ آسیہ بھی آن لائن نہیں تھی۔ کال کی تو اس کا موبائل آف تھا۔

"واپس آجاؤ۔" یہ اس کا آخری میسج تھا۔ میں بار بار اسی کو دیکھتا۔ واپسی کی مصدقہ اطلاع نہیں دی تھی میں نے۔ ایئرپورٹ سے کیب پکڑی اور سیدھا آسیہ کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کل صبح اس کا بی پی شوٹ ہوجانے کی وجہ سے فوراً" آپریشن کرنا پڑا تھا۔ پھر بھی بچے کو بچایا نہ جاسکا تھا اور آسیہ آئی سی یو میں تھی۔

آپا گھر سے کچھ سامان لینے آئی تھیں' ان ہی سے مجھے یہ معلومات ملیں۔ ان کے بہت چاہنے کے باوجود مجھ سے چائے تک نہیں پی گئی اور میں ان ہی کے ساتھ اسپتال چلا آیا۔ حسان (اس کا بھائی) اور امی وہیں تھے۔ آئی سی یو کے باہر سے ہی ایک نظر میں نے آسیہ کو دیکھا اور پھر وہیں کوریڈور کے ایک کونے میں کپڑا بچھا کر نوافل میں مشغول ہوگیا۔ خدا نے کرم کردیا۔

اگلے چھ گھنٹوں کے بعد اسے ہوش آگیا۔ ڈاکٹر نے اس کو دیکھنے کی اجازت دے دی۔ اس کے پاس پہنچا تو مجھے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا۔۔۔

رات کو اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا گیا۔ اسے غالباً" اپنی خالی گود کا احساس ہوگیا تھا۔ اور وہ بار بار اپنے بچے کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ امی نے بہت پیار اور طریقے سے اسے بتایا کہ بچہ نہیں رہا۔ تو وہ اتنا روئی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اسے سکون آور انجکشن دے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ سوگئی۔ حسان کی زبردستی کے باوجود میں گھر نہیں آیا۔ آسیہ ابھی سو رہی تھی۔ امی بھی بہت تھک چکی تھیں۔ انہیں بھی لیٹنے کا کہہ کر میں آسیہ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ امی نے آسیہ کا پرس اور اپنا پرس میرے حوالے کیا اور لیٹ گئیں۔

میری اپنے والٹ اور موبائل اور ڈیجیٹل ڈائری پر نظر پڑی۔ موبائل کی تو چارجنگ ختم تھی۔ ڈائری نکال کر میں دیکھنے لگا پاس ورڈ آس تھا۔ مجھے معلوم تھا میں نے ہی سیٹ کیا تھا۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی مجھے ڈائری پڑھتے ہوئے کہ آسیہ کی کراہ سنائی دی۔ وہ جاگ گئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے آس؟" اس نے پوچھا۔

میری آواز سے امی بھی اٹھ گئیں۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ سہارے سے میں نے اسے بٹھادیا۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ حسان اور آپا ہمارا ناشتہ لے کر آئے۔ ناشتے کے بعد حسان بولا۔

"آسیہ! اب تم اپنے میاں سے کہو کہ وہ گھر جائیں اور نہائیں دھوئیں اور آرام کریں۔"

"ہاں بیٹا اب میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ان شاء اللہ دوپہر تک ہم دوبارہ آجائیں گے۔"

آسیہ نے بھی اثبات میں سرہلایا۔ تو میں امی کو لے کر گھر چلا آیا۔

"بیٹا اب تم نہا دھولو اور کچھ دیر سو جاؤ اور یہ آسیہ کا پرس اس کی الماری میں رکھ دینا۔"

انہوں نے مجھے پرس پکڑایا۔ میں کمرے میں چلا آیا۔ ہم جب بھی پنڈی آتے تھے تو اسی کمرے میں ٹھہرتے تھے۔ میں نے موبائل نکال کر چارجنگ پر لگایا اور خود نہانے چلا گیا۔ نہا کر آیا تو دستک ہوئی۔ امی چائے لے کر آئی تھیں۔ ان ہی کے توجہ دلانے پر مجھے گھر فون کرنے کا خیال آیا۔ چائے پی کر میں نے امی کو کال کی۔ امی تو گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتی تھیں۔ ان کی بے چینی کا اندازہ مجھے ان کے رونے سے ہو رہا تھا۔ میں ان کا بڑا بیٹا تھا اور آسیہ ان کی لاڈلی بہو۔

ان کو تسلی دیتے ہوئے مجھے بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رہا۔ فون بند کرکے میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ سامنے "آس" کی تصویر تھی' کھلکھلا کر ہنستی ہوئی۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا کہ اس کے موبائل کی ٹوں ٹوں نے مجھے متوجہ کرلیا۔ آن کیا تو کمپنی کا میسج تھا۔ سامنے وال پیپر پر وہ مسکرا رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ۔ ہماری شادی کی تصویر تھی۔ میں اس کی تصویریں دیکھنے لگا۔ ایک دم مجھے جیسے کرنٹ لگا۔ یہ تو میری اور انجلی کی تصویر تھی؟!۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ ایفل ٹاور تھا۔ میرے بازو سے لپٹی ہوئی انجلی۔ میرون کرتے میں۔۔۔ میں بے قراری سے انگلی آگے پیچھے پھیر کر

دیکھنے لگا۔ انجلی نے ہر ہر پل کی لی ہوئی سیلفیز اس کو بھیج دی تھیں۔ اور آخری تصویر سرخ بلاؤز میں شعلہ بنی ہوئی انجلی مجھ سے چپکی ہوئی...... میرا دم گھٹ رہا تھا۔ دل کو کچل رہا تھا کوئی جیسے۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ آسیہ کو بہت اسٹریس تھا۔ وہ کوئی سخت ٹینشن چھپائے ہوئی تھی کہ اس کا بی پی خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ آہ! ندامت سی ندامت تھی۔

☆ ☆ ☆

یقیناً "تم سب جان چکے تھے (امی نے موبائل تم کو دے دیا تھا)۔ تمہاری خاموشی اور شکستگی مجھے نظر آرہی تھی۔ عیادت کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ اور تم کو واپس جانا تھا۔ آفس رپورٹ کرنی تھی۔ تم چلے گئے بنا کچھ کہے۔

محبت جیسے روٹھ گئی تھی' دن ویران اور راتیں اداس۔ کیا تم واقعی مجھے چھوڑنا چاہتے تھے؟ کیا انجلی کامیاب ہوچکی تھی؟ کیا محبت کی ٹرائی اینگل اور برمودہ ٹرائی اینگل میں کوئی فرق نہیں۔ سب اس اینگل میں آتے ہی غرقاب ہوجاتا تھا؟ یہ تمام تصویریں مجھے انجلی نے بھیجی تھیں۔ جبکہ انگلینڈ سے آنے والا تمہارا آخری میسج بھی محبتوں بھرا تھا...... میں الجھ گئی تھی۔ ایک گھٹن سارے ماحول میں محسوس ہوتی تھی۔ امی اور حسان کے بہلاووں سے بھی میں تنگ ہورہی تھی۔ حسان سمجھتا تھا کہ میں بچے کو کھونے کی وجہ سے تم سے ناراض ہوں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم میرے بلانے کے باوجود جلدی نہیں آئے۔ وہ مجھے بار بار سمجھاتا کہ ایسی باتوں کو بھلادینا چاہیے۔ زندگی میں بہت وسیع نظر اور دل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ حسان کو کیا خبر تھی؟ اس کی بات پر میں چیخ پڑی۔

"خاموش ہوجاؤ۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ بات صرف اتنی نہیں ہے۔" میں نے موبائل حسان کے سامنے پٹخ دیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ تصویریں دیکھو......"

اس نے میرا موبائل آف کرکے مجھے ساتھ لگالیا۔ اور بولا۔ "دیکھ چکا ہوں۔ سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔"

"پھر بھی تم کہتے ہو۔" میری آواز شدت غم سے بند ہورہی تھی۔

"ہاں کیونکہ میں ان میں موجود بعض نہ نظر آنے والی چیزیں بھی دیکھ چکا ہوں۔ اور میں فریق ثانی سے مل کر ہر بات کی تصدیق کرچکا ہوں۔ قسم سے۔ بہت بری حالت ہے ان کی۔"

"میری بات کا یقین کرو میری پیاری بہن یہ تصویر کا صرف ایک رخ نہیں۔ اس رخ کا بھی مسخ شدہ حصہ ہے۔ انجلی نے محض تم سے انتقام لینے کی خاطر ان تصویروں اور ویڈیو کو ایڈیٹ کیا۔"

"میں تمہاری بات مان بھی لوں حسان کہ میں تمہاری نظر کی فراست کو جانتی ہوں۔ مگر وہ کچھ کہتے کیوں نہیں آخر؟"

"تو کہنے ہی تو آرہے ہیں؟ اچھی طرح نکیل ڈال لو۔" اس نے کہتے ہوئے میرے سر پر بوسہ دیا۔

"ہمیشہ شاد رہو' آباد رہو۔" اس نے ابا کی طرح دعا دی اور سہیلی کی طرح چھیڑا۔

کمرے کے باہر مخصوص چاپ ابھری تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ تم نے اندر آکر مجھے سمیٹ لیا تھا۔ بے ساختہ امڈ آنے والوں آنسوؤں کی یلغار نے کثافت کو دھونا شروع کردیا تھا۔ حبس گھٹ رہا تھا اور ہوا چل پڑی تھی۔ میرے کان تمہارا اعتراف سن رہے تھے کہ محض بے ضرر دوستی کے خیال نے تمہیں دوبارہ رابطے پر آمادہ کرلیا تھا۔ صرف چند دن کی تو بات تھی۔ تم میرے آنسو چنتے ہوئے بار بار کہہ رہے تھے کہ تم بہکے نہیں تھے۔ بس غلطی ہوگئی تھی۔ تم بے حد شرمندہ تھے اور خود احتسابی کی عدالت میں گھرے ہوئے' کچھ سمجھ نہیں پار ہے تھے۔

میری انا کا پرچم کبھی بھی اتنا بلند نہیں رہا کہ کسی کے شرمندہ ہونے پر اس کی طرف مسکرا کر ہاتھ نہ بڑھاؤں...... اور یہ تو تم تھے۔ میرے ہمنوا! میرے ہم سفر!

☆

فریدہ فرید

"ہانی تم....." یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ ان ماہ و سال میں یقیناً "بہت بدل گیا تھا۔ قدرے فربہ مگر ہمیشہ کی طرح جاذب نظر' وہ سرمئی گہری آنکھیں بھی چشمے کی آڑ لے چکی تھیں۔ کنپٹی پر چمکتے سفید بال اور لباس کی نفاست اور ترتیب یہ باور کرا رہی تھی کہ وہ عمر کا بہت سا فاصلہ طے کرچکا ہے۔ میرے لیے اسے پہلی ہی نگاہ میں پہچاننا اتنا آسان نہ ہوتا اگر وہ مجھے ہانی کہہ کر مخاطب نہ کرتا' کیونکہ مجھے ہانیہ کے بجائے ہانی پکارنے والا "عمر ایاز" کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

"عمر! تم یہاں' مائی گاڈ یقین نہیں آتا۔" میری حیرت اور مسرت میں گم آواز اور بے ترتیب جملے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بن کے بکھر گئے۔

"ارے..... یقین نہ کرنے کی وجہ؟ اگر پیرنٹس میٹنگ میں تم ایز اے مدر آسکتی ہو تو ایز اے فادر آنے میں مجھے کیا عار ہے؟"

وہی شگفتہ انداز اور دلچسپ پیرایہ بیان۔ وہ ظاہر کے سوا ذرا بھی نہ بدلا تھا کمال یہ تھا کہ اس کی یادداشت بھی غضب کی تھی' ورنہ پندرہ سال بعد مجھے پہچاننا کوئی اتنا آسان نہ تھا۔ ہانیہ احسان جو اب محض میڈم یا میم کے نام سے پکاری جاتی تھی' اس کی نہ تو رنگت سرخی مائل رہی تھی نہ آنکھوں کی چمک اور کچھ کر گزرنے کا عزم ہی وہ تھا۔

"کہاں ہو ہانی! یہ بات بات پر کھو جانے والی سقراطی عادت کہاں سے آگئی تم میں' بھئی تم تو حال کو چلنا اور ماضی کو رکنا سکھانے والی تھیں۔ خود رکنا اور سنبھل سنبھل کے چلنا کہاں سے سیکھ لیا؟" عمر ایاز سابقہ بے تکلفی کے ساتھ گویا تھا بلکہ اب تو وہ مجھے بازو سے تھامے کرسی پر بٹھا چکا تھا اور میری آنکھوں میں جھانکے بنا' کچھ پوچھے اور بنا میرے کہے جیسے پندرہ سالوں کی روداد سفر جان لینا چاہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"باادب' باملاحظہ' ذرا راستہ دیجیے' نگاہ جھکا لیجیے' خیر منا لیجیے کیونکہ مس ٹاپ آف آل تشریف لانے کے انتہائی قریب آچکی ہیں۔"

شوخ و چنچل آواز نے اس کے سنجیدہ اور متانت سے بھرپور چہرے پر مسکراہٹ کی کئی کرنیں بکھیر دی تھیں۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی ہر روز ہانیہ احسان کا یونیورسٹی میں داخل ہونے پر ایسا ہی شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کوئی بہت ہی اعلا اور مشہور ہستی تھی' وجہ صرف عمر ایاز تھا جسے نہ جانے کیسے اس کی آمد کی اطلاع ہو جاتی تھی اور وہ یوں ہی اس کا خیر مقدم کرتا تھا۔ دیگر کلاس فیلوز بھی یونیورسٹی کی ٹاپ اسٹوڈنٹ کے لیے کھلے دل سے عمر کی پکار پر لبیک کہتے تھے۔

"اور مس ٹاپ آف آل! اس بار کیا توپ چلانے کا ارادہ ہے۔" پنجاب یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں گرم گرم سموسوں اور کچھ بے ذائقہ سی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے عمر شرارت سے بولا۔

"عمر صاحب! یہ سوال بار بار مجھ سے کرنے کے بجائے تم خود کیوں نہیں کچھ کرتے' توپ نہ سہی ایک آدھ بلٹ ہی ماردو۔" وہ کمال لاپروائی اور سموسوں سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بولی۔

"ارے! مجھے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ابا

جان نے ساری زندگی کھپا کے میرے لیے اتنا کچھ اکٹھا کیا ہے۔ اب اگر میں مزید کوشش کرتا پھروں گا تو یہ لالچ اور گستاخی ہوگی کہ نہیں۔"

ایک تو شرارت اور شوخی اس کی رگ رگ میں رواں تھی' وہ کسی بات کو سیدھے پیرائے میں کہنا ہی نہیں جانتا تھا اور پھر مانیہ کے ساتھ تو وہ زیادہ تر غیر سنجیدہ ہی رہتا تھا' کیونکہ سنجیدگی کی صورت میں اسے طویل لیکچرز اور نان اسٹاپ دلائل کی صورت ہمپائی اختیار کرنی پڑتی تھی۔

ان دونوں کے مشترکہ احباب اس بات پر کافی حد تک متعجب تھے کہ دونوں میں یہ گٹھ جوڑ ممکن کیونکر ہوا' ایک جوکر نما تھا تو دوسری کتابی کیڑا۔

ایک کی ٹیبل' میگزین سے فل ہوتی تو دوسری کے پاس ادب و تاریخ کا کون کون سا ذخیرہ نہ تھا۔ وہ منفرد سوچ کی حامل ہی نہ تھی بلکہ بیان و انداز کے گر سے واقف بھی تھی' عمر کے لیے اس کی ہر بات میں ہاں سے ہاں

ملانا ناگزیر ہی ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہانیہ احسان ' احسان احمد ایڈووکیٹ کی بڑی بیٹی تھی۔ دو بیٹیوں کے بعد بیٹے کی خواہش پوری نہ ہونے کو انہوں نے روگ نہیں بنایا تھا بلکہ اپنی تمام تر خواہشات کا مرکز ہانیہ کو بنایا تھا۔ اس پر اپنے علم و فن اور تجربات کی بھٹی کو وا کر دیا تھا جہاں سے وہ کندن بن کر نکلی تھی۔

اسکول پھر کالج اور اب یونیورسٹی ' وہ ہر جگہ ٹاپ پر رہی تھی۔ قانون و معاشرت کو اس نے پڑھا ہی نہیں تھا بلکہ گھول کر پی لیا تھا اور اب تو وہ پڑھانے لائق بن گئی تھی۔

آنکھیں اور چہرے کے مناسب و جاذب نظر نقوش اسے سب میں ممتاز ضرور کرتے تھے۔ یہ سچ تھا کہ وہ محفل میں نمایاں رہنے کا گر جانتی تھی۔

اس کے برعکس عمر ایاز نے پاکستانی وزرا کا گھرانہ پایا تھا۔ دولت کی فراوانی اور آسائشات نے اس کی فطرت و مزاج میں لاپروائی ' شوخی اور کسی حد تک اکھڑپن پیدا کر دیا تھا تاہم ہانیہ کے مقابلے میں وہ ہمیشہ خود کو ایک سیڑھی نیچے گردانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہانیہ سے کسی بات پر بحث کرنا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

یونیورسٹی فیلوز تو اسے ہانیہ سے مرعوب ہونے کا طعنہ بھی دیتے تھے جس کی وہ قطعاً" تردید نہیں کرتا تھا کیونکہ بات کسی حد تک سچ بھی تھی۔ لیکن یہ کہنا بھی بے جا نہ تھا کہ ہانیہ سے جس بے تکلفی سے اور سچائی سے وہ مخاطب ہوتا وہ عمر ایاز کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"حد ہو گئی ' آج تم لوگوں نے جس طرح سے اپنا تماشا بنایا ہے اگر ذرا سی بھی غیرت باقی ہے تو ڈوب مرو یا دوبارہ یہ سڑی ہوئی شکلیں لے کر یونیورسٹی نہ آنا۔"

گرجتی برستی آواز اور شعلے اگلتی وہ یقیناً" ہانیہ تھی۔ عمر ایاز کے لیے اس کا طوفانی جلوہ ذرا سا نیا تھا۔ وہ غصے کی تیز تو تھی مگر آج کی کیفیت کچھ سوا تھی ' سو وہ سب کام چھوڑ کر اس کی طرف لپکا اور یہ دیکھ کر ٹھٹکا کہ یونیورسٹی فیلوز نیلم اور صبا جھکے سروں سے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ معاملہ سمجھ چکا تھا۔ کیونکہ یہ اطلاع اس تک پہنچ گئی تھی کہ آج کیفے میں نیلم اور صبا کسی بات پر مشتعل ہو کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں اور یہ منظر نہ صرف بے شمار طلباء طالبات ملاحظہ نے براہ راست ملاحظہ کیا تھا بلکہ اپنے موبائل میں محفوظ بھی کیا تھا اور یہی بات ان کی گروپ لیڈر ہانیہ کے شدید ردعمل کا باعث تھی۔

"تم لوگ اگر یہ بات ہر بار بھول جاتی ہے تو آؤ میں ایک چٹ لکھ کر تمہارے ماتھے پر سجا دوں کہ تم عورت ہو۔ تم کو اپنی نسوانیت ' وقار اور عزت نفس کا خیال نہیں ہی تو کم سے کم اپنی صنف کے احترام کو ہی ملحوظ خاطر رکھ لو کیا حاصل ہوا تمہیں یوں خود کو تماشا بنوا کر۔ کیا بہتر نہ ہوتا کہ اس پرفارمنس سے پہلے ایک آدھ شو ارینج کر لیتیں اور چند روپے کا ٹکٹ لگا لیتیں ' ارے یہ مرد تو عورتوں کو بس تماشے کے طور پر لیتے ہیں یا پھر تھرڈ کلاس تھیٹر ڈراموں میں تیسرے درجے کے ذہنوں کی گھٹیا بولیوں کا نشانہ بنتے دیکھنا پسند کرتے ہیں اور واہ واہ ' ونس مور کی تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں اور ——— اور دوسری طرف اپنے گھر کی خواتین کو کبھی شک کی آڑ لے کر تو کبھی زمین و جائیداد کے لالچ کی وجہ سے قتل اور کارو کاری جیسی رسوم کی سزا سناتے ہیں مگر قصور ان مردوں کا ہی نہیں ہم جیسی نا سمجھ عورتوں کا بھی ہے جو ان کی ذہنی و جسمانی تسکین کا ہمیشہ سامان مہیا کرتی ہو کسی نہ کسی صورت میں۔"

"اسٹاپ اٹ ہانی ' جسٹ لیو اٹ ' بہت ہو گیا۔ کلوز

کرو اس ٹاپک کو۔" اس کی نان اسٹاپ بمباری کو روکنے کے لیے عمر کو آگے آنا پڑا اور تقریباً" دھکیلتے ہوئے ان دونوں سے دور بھی لے جانا پڑا۔

"پاگل پن ختم ہے تم پر ہانی!" وہ اسے ریلیکس کرنے کو نرمی اور شگفتگی سے گویا ہوا۔

"ہاں پاگل پن۔ بالکل ٹھیک۔ اس معاشرے میں جہاں عورت کو بولنا کیا سانس لیتے دیکھنا بھی تم مردوں کو گوارا نہیں، وہاں کوئی تمہیں آئینہ دکھائے اسے تم پاگل پن ہی کہو گے۔" وہ سابقہ تلخ رویے کو ہنوز برقرار رکھے ہوئے تھی اور عمر جانتا تھا کہ وہ اس کا پسندیدہ ترین موضوع ہے جس پر وہ گھنٹوں بے تکان بول سکتی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا موڈ کیسے ٹھیک کرنا ہے؟

"پاگل پن اس لحاظ سے کہ عورت لفظ کی ڈیفینیشن ________ ہر مرد کے ذہن میں الگ الگ ہے۔ تم سب کو ایک لاٹھی سے کیوں ہانکتی ہو؟" وہ مدبرانہ انداز میں کہنے لگا باوجود اس کے کہ اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخیوں کا جہاں آباد تھا۔

"تم سب مرد ایک سی منزل کے متمنی ہوتے ہو۔ بظاہر رستے جدا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے' سوچ ایک سی ہے تم سب کی۔" وہ اس وقت بحث کے موڈ میں تھی اور آستینیں چڑھائے لڑنے کے لیے تیار تھی۔

"قطعاً" نہیں۔ اوروں کو چھوڑو' میرے نزدیک تو عورت کو..." وہ سنجیدگی سے کہتے کہتے یکدم اٹکتے ہوئے رک گیا۔

"کیا عورت کو گونگی بہری' عقل سے اندھی تمہارے اشاروں پر چلنے والی ہونا چاہیے؟" وہ اس کی ادھوری بات کو اپنے طور پر مکمل کرتے ہوئے آتش فشانی لہجے میں بولتی گئی۔

"ارے نہیں بلکہ عورت کو۔" دوبارہ ادھورا جملہ شرارت سے مسکراتے لبوں سے نکلا تھا۔

"کیا عورت کو؟" وہ مکمل طور پر بلکہ حد سے زیادہ سلگ چکی تھی۔

"ہاں عورت کو... غبارہ ہونا چاہیے۔" اس کے منہ سے غیر متوقع اور عجیب سی بات سن کر وہ چند لمحوں کے لیے دنگ رہ گئی۔

"غبارہ... وہ کیوں؟" وہ حیرت کی انتہا پر سوال کر گئی۔ وہ بات اس کی عقل سے واقعی اوپر تھی اور لفظ غبارہ الگ ناقابل برداشت تھا۔"

"ہاں لمبا والا غبارہ جس میں جب دل چاہے' جس طرح کا موڈ ہو من پسند لیول تک ہوا بھر لی جائے امیزنگ یار! اگر عورت میں ایسی کوالٹی ہو تو لائف کتنی کلر فل ہو جائے' جب دل کرے دلی امنگوں کے مطابق عورت حاضر! ایسی کوالٹی وائز بیوی کو چھوڑ کر مرد بھلا دوسری عورتوں کو کیوں دیکھے گا۔" یہ بات اس نے جس پیرائے اور جس سنجیدگی سے کہی تھی باوجود اس کے کہ ہانیہ کس موڈ اور کس ماحول میں تھی سوائے اسے گھورنے کے کچھ نہ کر سکی وہ یوں پچکی کھڑی تھی گویا غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

ہانیہ احسان جس کے بارے میں اسے کروڑہا درجے یقین تھا کہ اس کی زندگی میں کسی مرد کی پرچھائیں بھی نہ ہو گی۔ بوجہ صنف مخالف سے اس کا جارحانہ' نفرت انگیز رویہ تھا مگر کتنی کاری ضرب اس کے یقین پر لگی تھی جب وہی ہانیہ احسان کیوپڈ کے تیر کا شکار ہو گئی۔

ہاں ہانیہ کے لیے سینئر اسٹوڈنٹ احمد رضا کے لیے خاص توجہ اور پہروں متواتر اس کا ذکر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی اور ہانیہ کے لبوں پر سجی دل کش مسکراہٹ بھی بھید کا پتا دیے جا رہی تھی۔

عمر ایاز کیوں حیران تھا؟

اس کی بے ریا اور انوکھی دوستانہ چاہت کے لیے یہ بات فکر انگیز تو نہ تھی تاہم بحیثیت واقف کار فطرت

وہ متعجب ضرور تھا اور من ہی من اسے سدا کھلکھلاتے رہنے کی دعائیں دیتا تھا۔ دونوں کے باہم روابط ویسے ہی پرخلوص، شوخی بھرے اور "سب کہہ دو" کا راگ الاپتے تھے۔ ہانیہ نے کئی بار اسے حال دل سنایا تھا۔ احمد رضا سے پہلی ملاقات سے لے کر دلوں کے ایک ساتھ دھڑکنے کی ادا تک، ابتدائے چاہت کی گرامرسے لے کر آرزوئے وصال کی تھیوری تک وہ سب — بخوبی جانتا تھا۔

اسے آج تک یاد تھا کہ ایک سال کی یہ بہار کہانی کتنے کٹھن اور دشوار مراحل کے بعد عین ہانیہ کے والدین کی مرضی و رضامندی کے تحت جبکہ احمد رضا کے والدین کے بالآخر مان جانے کی امید کے ساتھ اپنی اصل ڈگر پر رواں ہوئی تھی۔ ایک نئے سفر کا آغاز ہوا تھا لیکن عمر ایاز کے لیے ماسوا ہانیہ کی شادی میں شرکت کے مزید منسلک رہنا ممکن نہ رہا تھا، بیرون ملک جانے کے بعد زندگی کے نت نئے جھمیلوں نے دونوں کی دوستی کو ماضی کا حصہ بنا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہانی کم آن یار! ہوش میں آیئے، نظر کرم فرمایئے، حال دل یا حال سفر کچھ تو ارشاد فرمایئے۔"

عمر ایاز آج بھی ویسا ہی شوخ و چنچل تھا۔ حتیٰ کہ گفتگو کی روانی اور ترنم میں بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔

ہانیہ کو لگا کہ آج اسے — دل کھول کے مسکرانا چاہیے جو کہ پچھلے دس برس سے وہ تقریباً" فراموش ہی کر چکی تھی مگر نجانے کیوں دل کی شدید خواہش کے باوجود لبوں پر ایک دم توڑتی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ ٹھہر سکا اور یہی بات عمر ایاز کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔

وہ یک دم ایک سنجیدہ مدبرانہ روپ کے ساتھ گویا ہوا۔

"ہانی! تم صرف ظاہرا" نہیں فطرتا" بھی بہت بدل گئی ہو۔ ٹاپ آف آل اور "جو سوچا کر دکھایا" والی ہانیہ احسان اب ایسی کیوں لگ رہی ہے جیسے پاپیادہ طویل مسافت طے کی ہو اور شاید زاد راہ سے بھی محروم ہو گئی ہو حالانکہ ہانیہ احسان سے ہانیہ احمد رضا کا سفر اتنا کٹھن تو نہ تھا۔" وہ اس کا دوست، ہمراز، دم ساز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، ہاتھوں کو مضبوط ہاتھوں کا سہارا دیے اسے جبرا" جواب دہی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ہانی کے لب مزید خاموشی کی آڑ نہ لے سکے۔

"ہاں عمر! ہانیہ احسان سے ہانیہ احمد رضا تک کا مرحلہ میں نے گویا خواب میں طے کر لیا تھا، مگر اس سے آگے زندگی میرے لیے سراب سے کم ثابت نہ ہوئی، میں آج تک محض اس سراب کی چمک دیکھ رہی ہوں مگر نہ تو وہ نگاہ میں سچائی بن کر اترتی اور نہ میں اس کے قرب کا راستہ پا سکی۔" وہ کرب کی انتہا پر تھی باوجود اس کے کہ لبوں نے ابھی ابتدا ہی کی تھی۔

"ہمیشہ کچھ کر گزرنے والی ہانیہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ تم جانتے ہو کہ احمد رضا سے میری ملاقات یونیورسٹی کی لائبریری میں ہوئی تھی، کتابوں سے عشق کرنے والی کو کتابوں کی دنیا ہی میں وہ ملا تھا جس نے مجھے، ہانیہ کو یہ بھلانے پر مجبور کر دیا کہ وہ نہ صرف اسی معاشرے کا مرد ہے بلکہ جاگیردارانہ نظام کا پروردہ بھی ہے، جہاں انتہا پسندی کو جوہر مانا جاتا ہے میں نجانے کیوں اس کی جانب بڑھتے اپنے قدم روک نہ پائی۔ اس کی فطرت بھی تو میری رہنما ہوئی تھی۔ وہ کہاں عام جاگیرداروں کی مانند لگتا تھا۔ اسے تو علم سے لگاؤ تھا، کتابوں سے پیار تھا اور تم جانتے ہو کہ ہانیہ کے لیے کتاب سے چاہت رکھنے والے سے نفرت کرنا کہاں ممکن تھا؟ اس کے ساتھ گزارے وہ چند سال، وہ حسین لمحات میرے ہر خیال کو تقویت دیتے تھے۔ اس کی چاہت کے رنگوں میں رنگ کر "ٹاپ آف آل" ہانیہ احسان کو نہ تو اپنی زندگی کے تعمیری مقاصد یاد رہے تھے نہ مردوں کے اس معاشرے میں کچھ انوکھا کر گزرنے کا عزم ہی وہ رہا تھا۔ میں تو بس ایک عورت تھی۔ ایک عام عورت، جو ایک گھر، ایک محبوب ہم سفر اور ایک بچے کا خواب دیکھتی ہے۔ احمد رضا کی رفاقت نے میرے خوابوں کو تعبیر دی تھی۔ ایک گھروندہ بنایا تھا، جس کے

چاروں جانب میری مترنم کھلکھلاہٹ اور اس کی گدگداتی سرگوشیاں جگمگاتی تھیں۔ ہانیہ ایسے میں کچھ سوچتی بھی تو کیا؟

وہ پاس ہوتا تو ہر پل اس کا لمس، نرم نرم سرگوشیاں، کھٹی میٹھی شرارتیں ایک نیا جہان آباد کیے رکھتیں اور دور ہوتا تو بھی اس کا احساس، رگ و پے میں دوڑتا رہتا، مجھے لگتا تھا کہ زندگی محض ایک میلہ ہے اور ہم دونوں یہاں خوشیوں کے لمحات کشید کرنے آئے ہیں مجھے نہ اپنے ارادوں کے ادھورے پن کی فکر تھی نہ تعلیم و ہنر کے رائیگاں جانے کی۔ زندگی میں جو ایک کمی تھی وہ بھی جلد پوری ہو گئی۔

احمد رضا کی فیملی نے مجھے بحیثیت بہو تسلیم کر لیا تھا۔ احمد رضا کی اپنوں میں لوٹ جانے کی خواہش پوری ہو گئی تھی مگر ہزار ہا گز پر مشتمل حویلی کے مکینوں کے دل سوئی کی نوک سے بھی تنگ تھے۔ وہاں تحفظ اور چار دیواری تو تھی مگر محبت و احساس و خلوص جیسے جذبات ناپید تھے۔ وہاں ہر رنگ و نسل کا گھوڑا اور ملازم تو رکھا جا سکتا تھا مگر غیر برادری کی عورت ناقابل قبول تھی۔

احمد رضا کی محبت کا ساتھ نہ ہوتا تو ان ترچھی نگاہوں اور طنزیہ جملوں کو جو میرے ان لاز کی سوغات تھی۔ میرے لیے سہنا۔ اتنا آسان نہ ہوتا۔ میں ہر چیز کو آزمائش محبت کا نام دے کر در گزر کیے جاتی تھی۔ مجھے اپنی تعلیم اپنی اہلیت پر اعتماد تھا کہ ایک نہ ایک دن میرے لیے راستہ بھی سہل ہو جائے گا۔ احمد رضا کی چاہت بھری سنگت نے میری زبان سے کبھی حرف شکایت ادا نہ ہونے دیا اور شاید زندگی کچھ پُرسکون ہو بھی چلی تھی مگر ایک ایسی آزمائش سے سامنا ہوا کہ ہانیہ احمد رضا صبر کا دامن چھوڑے اپنی چاہت، اپنی محبت کے سامنے چلا اٹھی۔"

"احمد رضا تم ہوش میں تو ہو۔ یہ الفاظ تم ہی نے ادا کیے ہیں یا مجھے کوئی دھوکا ہوا ہے؟" جس رفتار سے اس کی زبان کانپ رہی تھی اس سے کہیں بڑھ کر اس کا دل ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ دماغ الگ طوفانوں کی زد میں تھا۔

"ہاں ہانیہ! یہ درست ہے۔ تمہیں اس فضول جذباتیت کے بجائے ہوشمندی کے ساتھ میری بات کو سمجھنا چاہیے۔ میں ایک طویل مدت کے بعد اپنی فیملی میں واپس آیا ہوں۔ اس لیے مزید کسی رسک یا غلطی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر تم مجھ سے چاہت کے دعوے میں مخلص ہو تو فیصلہ کرو۔ جلد از جلد۔" وہ الفاظ نہیں تھے۔ کرچیاں تھیں، چند سپنوں کی، ایک عورت کے معصوم خوابوں کی، ہانیہ احسان نے جو اپنے مقاصد، عزائم، اپنی صلاحیتوں کو خاک کر دیا تھا، اسے ان تمناؤں کا خون کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا جو اس کی جبلت، فطرت حتیٰ کہ خون کا حصہ تھیں۔ ایک ماں کو اپنی کوکھ میں جنم لینے والی خوشی کا گلا گھونٹنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

"عمر ایاز! میں نے احمد رضا کو پا لیا تھا۔ ایک گھروندہ بنا لیا تھا۔ محدود خوشیوں پر قناعت کا ہنر بھی پا لیا تھا مگر پھر بھی بد نصیب تھی کہ ماں کا درجہ پانے کے لائق نہ سمجھی گئی۔"

احمد رضا کی فیملی کو مجھ سے اولاد یا وارث قبول نہیں تھا۔ احمد رضا کو مجھ سے رغبت ضرور تھی مگر ہمارے پیار کی نشانی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

احمد رضا کو میرے فیصلے کا انتظار تھا کہ اس کی رفاقت پر سب قربان کر دوں گی۔ یا اپنے بدن کے ٹکڑے کو اپنی محبت پر ترجیح دوں گی، میں کوئی بھی فیصلہ کیسے کر سکتی تھی کشمکش کے طوفان میں میری کشتی ڈول رہی تھی۔ میں نے احمد رضا کو، اس کے خاندان کے ہر فرد کو کن کن واسطوں سے نہیں سمجھایا، کون کون سی التجائیں میرے لبوں سے نہیں نکلیں مگر وہ قاتل بننا چاہتے تھے۔ اس آرزو کے جو ازل سے ہستی بنت آدم میں نمو پاتی رہی ہے۔ مجھے لگتا تھا میں کبھی آر یا پار کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی مگر..... میں نے احمد رضا کے گھر کی دہلیز عبور کر لی، ہاں میں نے اپنے چاہت، اپنے محبوب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، کیونکہ میری ناتواں

ہستی ان لفظوں کا بوجھ نہ سہار سکی جو احمد رضا کے لبوں سے آزاد ہوئے تھے۔

"ہانیہ! مجھے صرف تم سے لگاؤ ہے' مجھے تم سے اولاد نہیں چاہیے' یہ فیصلہ میرا تم سے شادی سے قبل کا تھا۔ تم یہ بچہ ختم کرا دو' اسے یہاں کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔"

"لیکن تم تو تسلیم کرتے ہو ناں؟ یہ تمہارا بچہ ہے۔ تمہاری وراثت کا حق دار۔"

"میرے تسلیم کرنے سے صدیوں پرانے اصول نہیں بدل سکتے۔ ہمارے ہاں بچے صرف خاندانی بیوی سے ہی ہوتے ہیں اور انہیں ہی وارث تسلیم کیا جاتا ہے۔"

"اور ان الفاظ کا سننا تھا کہ تم احمد رضا کی زندگی' اس کی حویلی سے نکل گئیں؟" عمر ایاز نے پرسوچ انداز میں اس کی بیان کردہ آپ بیتی کو مکمل کیا۔

ہانیہ کے لیے ماضی کے پرپیچ اور تکلیف دہ سفر سے لوٹنا مشکل ہوتا اگر عمر کے لہجے میں محسوس کن تلخی کا عنصر نہ پایا جاتا۔ وہ قدرے چونک کر اپنی بھیگتی نگاہیں اس کی سمت اٹھا پائی جہاں اسے ہمدردی یا پھر اپنے دکھ میں شرکت کا یا اپنی قربانی پر اداسی کا کوئی عنصر دکھائی نہ دیا۔

"ہاں! اتنے برسوں میں ... تمہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ تم نے احمد رضا کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی بیٹی کی شناخت' اسکی پہچان کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔" عمر ایاز کے لبوں سے ادا ہوئے الفاظ انتہائی غیر متوقع اور ناقابل یقین تھے۔ ہانیہ کے لیے چند لمحوں تک سوائے خاموشی کے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا تھا۔

"عمر! یہ عمل میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا اور جان لیوا بھی۔ مگر اپنی بچی کو ایک گالی کی طرح جنم دینا مجھے کسی طور گوارہ نہیں تھا اور جس شخص کو میں نے روح کی گہرائی سے چاہا تھا اس کے لبوں سے یہ طعنہ میں کیسے برداشت کرلیتی مجھے لگا کہ ....."

"اور تمہیں لگا کہ تم اپنی بچی کی خاطر بہت بڑی قربانی دیے جا رہی ہو۔ اپنی اولاد کی خاطر اپنے پیار کی قربانی' ہے ناں' یہی کہنا چاہتی ہو ناں تم۔" عمر ایاز نے اس کی بات کو درمیان سے اچک کر مکمل کیا اور کاٹ دار نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"عمر تم ایسے کیوں بی ہیو کر رہے ہو' کیا تمہارے خیال میں' میں نے غلط کیا؟" وہ آنسوؤں کو بدقت اندر اتار کر اس سے سوال کرنے لگی۔

"نہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنی بیٹی کو ان جاگیرداروں کی مشکوک نگاہوں اور گھٹیا ذہنیت سے دور لے آئیں اور اس کی خاطر پچھلے دس برسوں سے ایک جہد مسلسل سے نبرد آزما ہو' تن تنہا اس کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہو' کیا بات ہے مس ٹاپ آف آل' کیا ہمت ہے؟" عمر ایاز نے باقاعدہ تالیاں پیٹ کر اسے داد دی' مگر ساغر طنز میں ڈبو کر۔ ہانیہ کے لیے اس کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ وہ ہنوز حق دق اسے عجیب و غریب انداز میں دیکھے جا رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عمر کو اعتراض کس بات پر ہے۔

"عمر آر یو آل رائٹ؟"

"آف کورس آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ! بٹ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم نے جس رد عمل کا اظہار کیا اس میں نیا کیا تھا۔ اگر تمہاری جگہ رشیدہ ماسی' عائشہ اسکول ٹیچر' شبو جھاڑو دینے والی یا پھر کسی دور دراز علاقے کی ان پڑھ دنیا کی اونچ نیچ سے ناآشنا گل بانو ہوتی تو وہ بھی اپنے کردار پر لگائی گئی اس کیچڑ اور اپنی اولاد کی محبت میں ایسا ہی کرتی پھر اگر ڈگری ہولڈر..... ماسٹرز آف سائیکالوجی' سوشل ورکر' ہیومن رائٹس کی علم بردار مس ٹاپ آف آل ہانیہ احسان نے بھی یہی کیا تو پھر تم میں اور ان سادہ جاہل عورتوں میں کون سا فرق رہا؟" ہانیہ کے لب باوجود کوشش کے ایک انچ بھی نہ ہل سکے۔ بات بات پر بحث کرنے والی' دلائل کے انبار لگا دینے والی ہانیہ کے پاس یوں لگتا تھا جیسے کہنے کو کچھ بھی نہ ہو' اس کے برعکس ہانیہ کی اہلیت اور تعلیمی

قابلیت سے ہمیشہ مرعوب رہنے والے عمر ایاز کے پاس گویا آج کہنے کو بہت کچھ تھا۔

"ہانی! تم نے سمجھا کہ وہ حویلی چھوڑ دینے سے' احمد رضا سے علیحدگی اختیار کرلینے سے' اپنی بیٹی کو اعلا تعلیم و تربیت دینے سے تم نے اپنا فرض ادا کردیا' مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اپنی بیٹی کی ولدیت کے خانے میں کیا نام لکھتی ہو۔ پیرنٹس میٹنگ میں اس کے فادر کے شریک نہ ہونے پر کیا ریزن پیش کرتی ہو۔ اپنی بیٹی کو اس کی ذات' اس کے خاندان' اس کے حسب نسب سے متعلق کیا کہانیاں سناتی ہو اور کل جب وہ ان باتوں کا شعور اور فہم لے کر تمہارے روبرو ہوگی' تو اسے اپنے اس دانشمندانہ فیصلے کا کیا جواز دو گی؟" وہ کچھ دیر خاموش ہو کر اس کے جواب کا منتظر رہا' پھر ایک گہرا سانس لے کر متاسفانہ انداز میں گویا ہوا۔

"ہانی! تم نے اس بات سے قطع نظر کہ تم درست تھیں یا نہیں' تم نے ایک معصوم جان کو جس کا کوئی قصور نہیں تھا کس پاداش میں بے نام و نشان ٹھہرا کر بنا کسی شناخت و سہارے کے اس دنیا کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ تم نے کمال ضبط و حوصلے سے میدان ہی چھوڑ دیا' بجائے اس کے کہ تم فائٹ کرتیں۔ اپنی بیٹی کے حق کے لیے' اس کی اصل' اس کی حقیقت کو منوانے کے لیے۔

ہانی کیا یہ تھی تمہاری اہلیت' تمہارا عزم و حوصلہ' یہ تھی وہ سمجھ بوجھ' وہ شعور جو تمہیں دوسری عورتوں سے ممتاز کرتا تھا۔ کیا انوکھا کارنامہ انجام دیا تم جیسی جینئس خاتون نے' تم تو وہ تھیں ناں جس نے صبا اور نیلم کے واقعے کے بعد نہ صرف انہیں سخت سست کہا تھا بلکہ ایک ہارڈ الیفرٹ کے بعد نہ صرف تمام میل اسٹوڈنٹس کے موبائل سے اس ویڈیو کو ڈیلیٹ کیا تھا بلکہ آئندہ کے لیے یونیورسٹی میں موبائل کیمرے کی ممانعت بھی منظور کروالی تھی آئی کانٹ بلیواٹ کہ معمولی سے معمولی بات پر وومن رائٹس کے لیے کھڑے ہونے والی ہانیہ احسان نے اپنی۔۔۔ بچی کے لیے معمولی سی جدوجہد بھی نہیں کی' ان جاگیرداروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر' ان کی غلط سوچ کو غلط ثابت کیوں نہیں کیا' ڈٹ جاتیں' تم جاتیں' اڑ جاتیں کبھی نہ کبھی تو احمد رضا کو اپنی بیٹی کے وجود کی سچائی کا یقین آتا اور تمہاری بیٹی ایک اعلا نسب اور خاندانی شناخت و تشخص کے ساتھ زندگی گزارتی' ناکہ یوں تاویل در تاویل کے گورکھ دھندے میں الجھی ہوتی۔

"افسوس ہانی! میں تمہیں ناقابل تسخیر سمجھتا تھا' عام عورتوں سے ہٹ کر ایک الگ اور منفرد حیثیت دیتا تھا۔ تمہارے سامنے کبھی کسی ٹاپک پر بات کرنے سے گریز کرتا تھا کیونکہ مجھے لاجواب ہونے کا ڈر ہوتا تھا' مگر آج..... آج مجھے معلوم ہوا کہ تم ایک عام عورت سے بھی زیادہ عام عورت ہو۔ قوت فیصلہ سے محروم' کمزور ارادوں کی حامل عورت' آج مجھے یقین ہوا کہ اسلام میں عورت کو مرد سے ایک درجہ کم کیوں دیا گیا ہے' اس لیے کہ عورت فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ جذبات میں آکر شعور سے بیگانہ ہوجاتی ہے۔ نازک مزاجی میں وقتی ردعمل کی آڑ لے کر ہمیشہ کے لیے اپنی نسلوں کو محرومیوں کے خلا میں معلق کردیتی ہے۔ سوری ٹو سے ہانی! عورت جسمانی لحاظ سے آزاد ہوسکتی ہے مگر اپنی فطرت کے باعث ذہنی طور پر کبھی بلند پرواز نہیں ہوسکتی' آئی ایم رائٹ آرناٹ؟ فیصلہ ایک بار پھر عورت پر ہے۔"

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ایشا نور
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بنت سحر

"مجھے اہلی سے ہی شادی کرنی ہے۔" میں نے اطمینان سے چائے پیتے ابا کو شاک کے عالم میں دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ میں نے کون سا پٹاخہ پھوڑا تھا جو وہ یوں حواس باختہ ہوئے جا رہے تھے۔ مگر خیر وہ میرے والد محترم تھے۔ مان ہی گئے اور دوپہر کے وقت ہم نانا' نانی کے دربار میں حاضر ہو چکے تھے اور ابا نے نانا سے میرا مدعا مہذب لفظوں میں بیان کر دیا تھا۔ اور نانا پرسوچ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے میرا انٹرویو لے رہے تھے۔ میں دنیا جہان کا مؤدب ترین "لڑکا" بن گیا۔

"کیا تم واقعی اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ میں جھنجلا گیا

"جی بالکل۔" میں نے پر زور الفاظ میں کہا۔ وہ میری بات کا یقین نہیں کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا۔

وہ بھی اپنی جگہ سچے تھے۔ میں ایک ویل ایجوکیٹڈ۔ خوش شکل لڑکا تھا۔ مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ مجھے ہزاروں لڑکیاں مل جاتیں۔ مل سکتی تھیں۔ مگر وہ "اہلی" جیسی تو نہیں ہوتیں۔ اور "اہلی" تو خاص تھی۔ کھٹی سی۔ مگر وہ کھٹاس کے سانچے میں ڈلی بھربھری مٹھاس جیسی تھی۔ وہ سرسوں کے کھیت میں اگنے والے زرد پھول جیسی تھی۔ ہاں وہ تو نایاب تھی۔ میرے لیے لاکھوں میں ایک۔

پہلی بار۔ ہاں پہلی بار میں نے اسے نانا کے بنائے گئے سویٹ ہوم میں لوگوں کے دکھ' درد بانٹتے دیکھا تھا۔ وہ ہنستی نہیں تھی۔ گھنٹیاں بجاتی تھی۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔

وہ میری طرف پشت کیے شکور چاچا کی بیٹی کو دوا کھلا رہی تھی۔ جو مسلسل دوا کھانے سے انکاری تھی۔ اور اہلی تو انکار کو "اقرار" میں بدلنے والوں میں سے تھی۔

"دیکھو نسیم۔ تمہاری ساس نے تمہیں جلانے کی کوشش کی' اس کا مطلب اپنی قبر میں انگارے بھرے۔ خود جلے گی' سڑے گی۔ مگر تمہیں تو اپنے حصے کی زندگی جینی ہے نا۔ اپنے لیے نہ سہی اپنے بچے کے لیے ہی سہی۔ چلو میری پیاری بہن دوا پی لو۔" اور نسیم اگلے ہی لمحے دوا کھا کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کپڑا منہ پر ڈال کر آنسو چھپا لیے تھے۔ نسیم ہمارے معاشرے کا ہی ایک بے بس و مجبور کردار تھی۔ جو اب نانا کے سویٹ ہوم میں رہائش پذیر تھی۔ جانے یہ معاشرتی مسائل ہمیشہ بڑھتے ہی کیوں رہتے ہیں؟

اگلے لمحے وہ زرتاب کے پاس کھڑی اسے خود سے لپٹائے ہوئے تسلیاں دلاسے دے رہی تھی۔ اور وہ کتنے اچھے دلاسے دیتی تھی' میں اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ہیرا ہے۔ قیمتی۔ ان مول۔ اہلی نے زرتاب کو اپنے پاس بٹھایا تھا۔ اور اس کے آنسو پونچھے تھے۔ سیما کوریڈور میں پونچھا لگاتی ہوئی گنگنا رہی تھی۔

"ساڈا چڑیاں دا چنبا وے

بابل اسی اڈ جاناں

ساڈی لمبی اڈاری وے"

سیما کی آواز میں لوچ اور اداسی رچی بسی تھی۔ جانے اسے کون سے دکھ' کون سے روگ تھے؟ اہلی نے تو اسے جب بھی دیکھا تھا' وہ گنگناتی ہوئی نظر آئی تھی۔ اور اہلی کو اس کی آواز جکڑ لیتی۔ پتھر کر دیتی۔ سیما جب صفائی کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو اہلی نے گفتگو کے سلسلے کو نئے سرے سے جوڑا تھا۔

"دیکھو زرتاب۔ اگر زندگی میں انسان سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ غلطیوں کے ڈھیر لگاتے جائیں۔ اور ہم لڑکیاں تو کانچ کی مانند ہیں ٹوٹ جائیں۔ جڑ نہ پائیں۔ والدین کو دھوکا' فریب دینا گناہ ہے۔ اور تم یہ گناہ کر چکی ہو۔"

اہلی اسے سمجھا رہی تھی۔ ہاں۔ وہ اچھی "سمجھانے" والی تھی۔

"صرف ایک شخص کے لیے والدین کی محبت' والدین کا آنگن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ جو ماں' باپ ہوتے ہیں' ان کی جان اولاد نامی طوطے میں بند ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بے وفا طوطے ہی اڑ جائیں تو۔؟"

وہ سوال کرتی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے لمبے بال جوڑے میں قید تھے۔ اس نے کاٹن کی قمیص

پہنی ہوئی تھی اور پاؤں میں سادہ چپل تھی۔ پاؤں کی گوری ایڑیاں نمایاں تھیں۔

"تو ماں' باپ کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ زندہ ہو کر بھی "زندوں" میں شمار نہیں ہوتے۔" اللی کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ کمرے میں نمی پھیلنے لگی تھی۔

زرتاب نے اپنے گال پیٹ ڈالے تھے۔ اس کے گھنے بال بکھر گئے تھے۔ "میں نے نادانی میں ایسا قدم اٹھالیا اللی... احمد نے مجھے بیچ راستے میں چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے ٹشو پیپر کی طرح سمجھا... استعمال کیا اور پھینک دیا۔" زرتاب کی چیخوں نے اللی کو لرزا دیا تھا۔

"دیکھو زرتاب... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا' اب لکیر پیٹنے سے کیا ہو گا۔ دونوں طرف سے نقصان تمہارا ہے... اور تمہیں ہی ثابت قدم رہنا ہو گا۔ معاشرے میں اہم مقام بنانا ہو گا... تاکہ قدم جما سکو... تم نے جو بھی کیا بہت غلط کیا... مگر میں اتنا کہوں گی آج کی عورت کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے۔" اللی نے اس کے گھنے بال سمیٹ کر ان میں کیچر لگا دیا اور اس کے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھ ڈالے... اور زرتاب سمجھ گئی تھی جو بھی اللی نے اسے سمجھایا تھا۔

اللی دروازے کی طرف بڑھی... تھمی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ "ماں' باپ چاہے کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں' وہ اولاد نامی طوطے کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ پار کر گئی۔ کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر دھوپ کمرے میں گر رہی تھی۔ زرتاب اٹھ کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اب پہلے سے زیادہ اطمینان جھلکتا تھا۔

"یہ اللی بھی نا... بس نام کی کھٹی ہے۔ کتنی ڈیسنٹ اور سمجھ دار ہے۔" اور دھوپ کے ذرے دھیمے سے مسکرا دیے۔ ہاں... ہماری اللی ایسی ہے کہ پیٹھ پیچھے بھی اس کی تعریف کی جاتی ہے... اور اللی تعریف کے لائق نہیں' بلکہ تعریف اللی کے لائق ہے۔

☼ ☼ ☼

بلھیا کی جاناں میں کون

نہ میں مومن وچ مسیتاں
نہ میں وچ کفر دی ریتاں
نہ میں آبی' نامیں خاکی
نہ میں اندر بھید کتاباں
نہ کوئی دوجا ہور پچھانا

سیما کی گنگناتی آواز سویٹ ہوم میں رنگ بھر دیتی تھی... اور آج تو سیما بلھے شاہ کا کلام گا رہی تھی۔ وہ جونٹ کے پاس تخت پر بیٹھی تھی... وہ دونوں سیما کی آواز کے سحر میں گم تھیں۔ جونٹ عیسائی کمیونٹی سے تھیں۔ وہ اکیلی تھیں' ان کا کوئی رشتہ دار نہ تھا تو وہ یہیں رہائش پذیر تھیں۔ سویٹ ہوم کے سارے افراد ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ان سب میں ایک رشتہ تھا اور وہ تھا انسانیت کا... وہ انسانیت کی تسبیح میں پروئے ہوئے موتی تھے اور انہیں جوڑنے والی اللی تھی اور ہاں وہ اچھا جوڑنے والوں میں سے تھی۔

اللی کئی دن سے اس خوبرو جوان کو دیکھ رہی تھی جو وقفے وقفے سے سویٹ ہوم کا چکر لگا رہا تھا۔ وہ روشن پیشانی' ستواں ناک' سیاہ بالوں والا خوب صورت شخص تھا... اللی اسے دوسری بار دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی... ہاں... وہ ایسا تھا کہ پہلی غیر ارادی نظر دوسری ارادی نظر کا سبب بنتی تھی۔

"یہ کون ہے... میں اسے کب سے دیکھ رہی ہوں۔" اللی نے خیام کی طرف اشارہ کر کے جونٹ کو مخاطب کیا تھا۔ جونٹ نے تسبیح مکمل کر کے ایک لمبی پھونک اللی کی طرف ماری... پھر دور سیما کو دیکھا جو پھونک سے کافی فاصلے پر تھی... خیر...

"یہ تقی صاحب کا نواسا ہے خیام... بہت اچھا لڑکا ہے... اور ڈاکٹر بھی ہے..." جونٹ نے معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اللی نے متاثر ہو کر اسے تیسری بار دیکھا تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو خیام ہولے سے ہنس دیا۔ اللی نے گڑبڑا کر نظریں ہٹالی تھیں... بند دریچے سے روشنیاں ترچھے رخ پہ گر رہی تھیں۔ پھر اکثر وہ آنے لگا تھا اور کبھی کبھار چوری چوری نظر اس پر بھی ڈال لیتا تھا اور اللی تو سویٹ ہوم کی رونق تھی۔ ولاسے' تسلیاں

دینے والی۔ دوسروں کے غم میں غمگین ہونے والی اور خوشی میں خوش ہونے والی۔ ہاں... وہ ایسی ہی تو تھی... پھولوں میں شان سے کھڑا ایک گلابی پھول...
ہر انسان کی زندگی قصے کہانیوں کے رتھ پر سفر کرتی ہے۔ وہ کیسے یہاں آئی تھی... کیوں آئی تھی؟
یہ سب باتیں تقی صاحب ہی جانتے تھے۔ خیام کے پوچھنے پر انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔
"ارے... وہ بن ماں باپ کی غریب بچی تھی۔ چچا مکان ہڑپ کر گئے۔ بے چاری جاب مانگنے آئی تھی تو میں نے اسے رکھ لیا۔ عزت' مان سب دیا۔ تمہیں پتا ہے نا کہ یہ جو غریب لوگ ہوتے ہیں نا' بڑے خوددار ہوتے ہیں اور آج دیکھو۔ سارا سویٹ ہوم اس کی ذمہ داری بن گیا ہے' جسے وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے۔ ہاں... ثابت ہوا... امل کریم... خوددار لوگوں کے گروہ میں سے ایک بہت اچھی خوددار لڑکی ہے۔"
خیام نے پوچھا۔ "اس کا نام عجیب سا نہیں' املی...؟"
تقی صاحب مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔
"جیسے کھٹاس... ذائقہ برداشت کرنے کو آنکھیں جھپکی جائیں... بند کی جائیں..." خیام کو واقعی اس کا نام عجیب وغریب ہی لگا تھا۔
تقی صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا۔ "یہ جو نام کے کھٹے لوگ ہوتے ہیں نا... یہ دل کے بڑے ہی میٹھے ہوتے ہیں۔" ہاں... وہ میٹھی تھی... برفی کی ڈلی جیسی" اور دوسری بات اس کا نام امل کریم ہے... سب کو نام لیتے ہوئے مشکل ہوتی تھی' تو میں نے نک نیم "املی" دے دیا۔" وہ محظوظ ہوئے اور خیام حیران ہوا تھا۔
"آپ نے مجھے تو کبھی نک نیم سے نہیں بلایا۔"
نانا نے اونچا قہقہہ لگایا تھا۔ "چھوڑو... خومی ڈیئر... تمہارا نام تو سیدھا سا ہے جو ہر کسی کو ازبر ہو جاتا ہے۔" خیام ہنس دیا تھا۔
اور پھر جب بھی خیام آتا تھا تو اس نام کی کھٹی... دل کی میٹھی پر نظر رکھتا تھا۔ وہ کیا کر رہی ہے... وہ کیا کرتی ہے؟
املی سویٹ ہوم کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی ہے... ارے... وہ اتنی جلدی آؤٹ کیوں ہو جاتی ہے' کیا وہ ایک اچھی کھیلنے والی نہیں ہے؟ مگر وہ اچھی کھیلنے والی تھی۔ اپنی ہار پر دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ مالی بابا کے ساتھ پودوں کی کاٹ چھانٹ کر رہی ہے... مشورے... بحث... پودوں پر تفصیلی گفتگو... کھاد کب ڈالی جائے؟ مٹی کب بدلی جائے؟
سیما کے ساتھ مل کر وہ نانا کے آفس روم کے جالے اتار رہی ہے۔ اس کوشش میں بھوت بن جاتی ہے۔ بچے اس سے نہیں ڈرتے... وہ تو ہاتھ ملا کر تالیاں بجاتے ہوئے اسے دیکھتے ہیں۔ شریر ہنسی...
"املی باجی... ہم سے دھوکا...؟" اور وہ جو دھوکا دینے والوں میں سے نہیں ہے' وہ ہنسی میں یہ بات اڑا دیتی ہے۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا کوئی نہیں... مگر یہ سچ نہیں تھا۔ سچ ایسے ہوتے بھی نہیں۔ "سارا سویٹ ہوم... سارے افراد امل کریم کے تھے۔ اور وہ اچھے ساتھی تھے۔
املی نانا کی لائبریری میں گھسی صفائی کر کے ہر روز ایک نئی کتاب اٹھا کر لے جاتی ہے' جو وہ اور زرتاب مل کر عقبی لان کے بینچ پر بیٹھ کر پڑھتی ہیں۔ بحث کرتی ہیں اور وہ پہلی بحث ہوتی ہے جہاں املی جیت جاتی ہے۔ اور زرتاب کھلے دل سے ہار تسلیم کرتی اور جب وہ دونوں سہ پہر کے اترنے کے بعد سفیدوں کے درختوں کے سائے میں چہل قدمی کر رہی ہوتی ہیں تو زرتاب اسے روک کر کہتی ہے۔
"تمہارے لفظ' تمہارا وجود' تمہاری سوچ صنوبر کی خوشبو جیسی ہے' جو ہر کسی کو مہکا دیتی ہے۔"
اور ثابت ہوا۔ "املی خوشبوؤں کے ڈھیر میں اچھی خوشبو جیسی ہے۔" اور املی کی ہی وجہ سے سویٹ ہوم کی ساری خواتین کو روزگار ملا تھا۔ وہ ساری مل کر امبرائیڈری اور پیکو کا کام کرنے لگی تھیں... اور زرتاب ان کی ہیڈ تھی... اور تقی صاحب نے زرتاب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کے گھر والوں سے معافی

دلا میں گے... اور اب زرتاب بہت خوش تھی۔

کھانا اکثر زرتاب اور املی بناتی تھیں۔ املی کے پکائے ہوئے کھانوں کا ذائقہ خیام کو بہت اچھا لگا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا۔ "کیا یہ فائیو اسٹار ہوٹل سے منگوایا ہے؟" اور سیما کل کل کرتی ہنسی تھی۔

"نا... جی... یہ تو املی باجی نے بنایا ہے۔"

"اوہ! یہ املی تو ہر فن مولا تھی۔ واہ بھئی خوب...."

اور یہ ہی قصہ ہے... کہانی ہے... بے شک امل کریم اتنی خاص ہے کہ اسے چاہا جائے۔ سوچا جائے اور اپنایا جائے... خیام نے یہ فیصلہ یوں ہی تو نہیں کیا تھا۔ وہ لاکھوں میں ممتاز نظر آتی لڑکی بڑی خاص تھی۔ خالص، پاک شہد جیسی... شیریں...

اور خیام نے ساری دلیلیں، وضاحتیں پیش کر کے ڈیڈ، نانا، نانی کو قائل کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ باغ کے باہر والی روش پر اکٹھے بیٹھے تھے۔ درمیانی راتوں کا چاند تک چھپ رہا تھا۔ ہلکی ہوا سے فضا میں سفیدے کی مہک اڑنے لگتی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے ہی تو تقی صاحب نے املی کو خیام کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا اور املی تو جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔ وہ یتیم تھی... لاوارث بھی... اس کے پاس ایسا کیا تھا جو ڈاکٹر خیام نے اس کے ساتھ کی خواہش کی تھی؟ یہ ہی سوال اس نے تقی صاحب سے کیا تھا اور وہ پیپرویٹ گھماتے ہوئے غور سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ جب کوئی بات سمجھانا مقصود ہوتی تو وہ اس کا پورا نام لیتے تھے۔

"پتا ہے امل کریم... میرے لیے انسانوں کو سمجھانا کبھی بھی مشکل نہیں رہا... مگر مجھے دو انسانوں نے اس مشکل سے دوچار کر دیا ہے... تم اور میرا نواسا خیام... اور اس نے ہمیں، تم میں وہ کچھ دکھایا ہے جو ہم کبھی بھی، چاہ کر بھی نہ دیکھ سکتے تھے اور اس نے تمہیں دیکھنے والی آنکھ سے دیکھا ہے۔ جو محبت کی آنکھ ہوتی ہے اور وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس سے ملو... پرکھو... پھر فیصلہ کرو... تمہارا ہر فیصلہ قابل قبول ہوگا۔ تم پر کوئی دباؤ نہیں۔" اور اس نے ان کی بات پر سر ہلا دیا تھا۔

اور اب وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ ڈیوٹی سے سیدھا یہیں آرہا تھا۔ وہ نسیم کا روزانہ چیک اپ کرنے آتا تھا۔ اس کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ ڈریس کوٹ اور نیلی جینز کے ساتھ وہ شان دار ہونے کے ساتھ ساتھ کافی تھکا ہوا بھی لگ رہا تھا۔

امل نے پہلا سوال اس کے سامنے رکھا تھا۔ "آپ مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں؟" اچھا سوال تھا۔ وہ جی بھر کے محظوظ ہوا تھا۔

"میں نے اپنی یونی لائف میں لوگوں کو محبت کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر بہت مذاق اڑایا ہے... مگر آج محبت میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ میں کبھی کسی سے اتنی جلدی متاثر نہیں ہوا، مگر آپ کو دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ جیسے برسوں کی شناسائی ہو... کوئی ان کہا تعلق ہو۔ جو باندھ کر رکھ دے۔ میری روح آپ کی روح سے بندھ گئی ہے۔" چاند کی مدھم روشنی میں املی کو وہ بہت بے بس لگا تھا... اداس...

"آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟" یہ دوسرا سوال تھا جو کہ امل کریم کی طرف سے آیا تھا۔

"آپ یہ پوچھیں کہ میں آپ کے بارے میں کیا کچھ نہیں جانتا... میں نے آج کے دور میں ایسی لڑکی نہیں دیکھی جو آپ کے جیسے اطوار کی ہو... مہذب... شریر... نٹ کھٹ... مجھے خوددار لوگوں سے عشق ہے... آپ کی خودداری نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ آپ کی ہنسی جل ترنگ جیسی ہے۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا... اور املی ساکت... جامد... اور شاید... مسحور بھی...

"آپ کا دل کتنا خوب صورت اور پیارا ہے... میں نے اپنی اٹھائیس سالہ زندگی میں بہت کوشش کی کہ میں ایسا شخص بنوں جو دوسروں کی خوشی میں خوش ہوتا ہو... دوسروں کے غم سے غمگین ہوتا ہو... اور میں چاہ کر بھی... ہزار کوشش کے باوجود بھی ایسا نہیں بن سکتا۔ مگر آج جب مجھے ایسا شخص نظر آرہا ہے تو اسے

میں اپنی زندگی سے جانے نہیں دے سکتا۔" خیام نے ہر طرف پھیلے اجالے کو دیکھا اور پھر اسے.... جو اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اور ڈاکٹر خیام کو غور سے سن رہی تھی۔

"آپ جانتے ہیں نا.... میں ایک لاوارث اور یتیم لڑکی ہوں۔" ٹپ.... ٹپ.... پہلا آنسو.... دوسرا.... پھر ہاتھ بھیگنے لگے.... اور چاند.... رشک سے جلنے لگا.... اہلی چاند سے زیادہ "روشن" تھی۔

"کتنی آسانی سے آپ نے اپنے آپ کو لاوارث کہہ دیا.... میرے دل کی سلطنت پر اہل کریم کا نام آپ کو نظر آجانا چاہیے تھا۔" وہ شاک کے عالم میں دیکھنے لگا۔ ہاں.... وہ محبت زادہ تھا۔

"میں حقیقتوں میں زندہ رہتی ہوں ڈاکٹر خیام.... مجھے لفظوں کے جال میں قید نہ کیا جائے۔" اہل نے تیسرا کوئی سوال نہیں کیا تھا.... مگر جو کہا تھا اس نے خیام کو غصہ دلا دیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کو لگ رہا ہے میں اس وقت آپ سے فلرٹ کررہا ہوں۔ آپ پاگل ہیں یا پھر میں.... مجھے آپ کی سوچ سونے نہیں دیتی.... آپ کی ہنسی مجھے راستوں سے بھٹکا دیتی ہے.... پاگلوں کی طرح آپ کا چہرہ ہر چہرے میں ڈھونڈتا ہوں.... ہاں.... میں پاگل ہوں.... دیوانہ ہوں.... جو ایک نظر آپ کو دیکھنے دوڑا چلا آتا ہوں۔ اب بھی.... اگر اب بھی مجھ پر اجنبیت کا فتویٰ لگایا جائے تو میں کیا کروں.... کدھر جاؤں؟" خیام کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے.... سفیدے کی مہک چاروں اطراف میں پھیلنے لگی تھی.... پھیل رہی تھی۔

وہ شال برابر کرتی اس کے سامنے آئی تھی.... سنہری آنکھیں....

"میں دل اور دماغ، دونوں کے راستے پر چلنے والوں میں سے ہوں ڈاکٹر خیام.... میں اپنی اور آپ کی حیثیت سے اچھی طرح آگاہ ہوں.... مگر زندگی میں کبھی کبھی کسی موڑ پر دل کی راہ پر چلنا ضروری ہوتا ہے.... چلو.... میں بھی یہ کوشش کرکے دیکھتی ہوں۔" وہ اہل کا انداز تھا۔ وہ خیام کی آنکھوں میں صداقت پڑھ چکی تھی۔

اور ثابت ہوا.... اہل کریم.... صداقتوں کی قدر کرنے والی ہے۔

چاند کی روشنی خیام کے حیران چہرے پر پڑی تھی۔ سفیدے کی مہک.... بھیگا اجالا.... نمی سے لبریز ہوا۔

"اس کا مطلب یہ کہ آپ راضی ہیں؟" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

وہ ہنسی تھی۔ یہ محبت بھی نا.... اچھے بھلے انسان کو بچہ بنا دیتی ہے۔

وہ شریر انداز میں دیکھ رہی تھی۔ "میں نے کب کہا میں راضی ہوں...."

وہ گڑبڑایا تھا۔ "ابھی تو آپ نے خود کہا تھا۔"

وہ مڑ کے جارہی تھی.... جاتے جاتے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "اہل کریم راضی ہے ڈاکٹر خیام...." سارے رنگوں نے ظاہر ہو کر گلال اڑایا تھا۔ وہ خوش خوش نانو کا نمبر ملا رہا تھا۔

"نانو.... وہ مان گئی ہے.... سچ کہہ رہا ہوں.... مجھے خود بھی یقین نہیں آرہا.... مگر چٹکی کاٹ کر دیکھ لیا ہے یہ سب سچ ہے۔" اور اہلی نے اندرونی دروازہ کھولتے ہوئے پیچھے دیکھا تھا۔ وہ چاند کی روشنی میں کھڑا کال پہ بات کرتا ہوا بہت خوش لگ رہا تھا۔ وہ ہنس دی تھی اور چاند کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

"ہاں.... یہ سچ ہے ڈاکٹر خیام، اہل کریم کے دل کا وارث ہے اور اہل کریم، ڈاکٹر خیام کے دل کی وارث ہے.... اور دلوں کی بادشاہت ہمارا اللہ عطا کرتا ہے اور وہ بہت اچھا عطا کرنے والا ہے۔"

وہ روشن پیشانی والا شخص بیرونی گیٹ کی طرف چلتا جارہا ہے۔ مسکراتا جارہا ہے۔

میں زندگی کا ساز بجاتا چلا گیا
ہر سانحہ زمین کا بھلاتا چلا گیا

بربادیوں کی تند ہوا کچھ نہ کر سکی
میں آندھیوں میں دیپ جلاتا چلا گیا

حالاتِ حاضرہ کا تو رونا فضول تھا
جو نوحہ گر تھے، اُن کو ہنساتا چلا گیا

اس وقت کے سفر میں کوئی ہمسفر نہیں
تنہائیوں کا بوجھ اُٹھاتا چلا گیا

اب کل کی فکر ہے نہ صبحِ نو کی فکر ہے
ہر فکر کو ہنسی میں اُڑاتا چلا گیا

دشمن نہیں ہے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں
میں ہر عدو کو دوست بناتا چلا گیا

رازق خوشی کو، دُکھ کو مقدر سمجھ لیا
ہر حرفِ غم کو روز مٹاتا چلا گیا

رازق عزیز

تجھ سے بڑھ کر کوئی پیارا بھی نہیں ہو سکتا
پر تیرا ساتھ گوارا بھی نہیں ہو سکتا

راستہ بھی غلط ہو سکتا ہے منزل بھی غلط
ہر ستارا تو ستارا بھی نہیں ہو سکتا

پہلے ہی لذتِ انکار سے واقف نہیں جو
اس سے انکار دوبارہ بھی نہیں ہو سکتا

چلیے وہ شخص ہمارا تو کبھی تھا ہی نہیں
دُکھ تو یہ ہے کہ تمہارا بھی نہیں ہو سکتا

دُنیا اچھی بھی نہیں لگتی ہم ایسوں کو سلیم
اور دُنیا سے کنارا بھی نہیں ہو سکتا

سلیم کوثر

اُجڑا سا جزیرہ

زخم جیسے کہ زباں رکھتے ہیں
رات بھر حال سناتے ہیں مجھے
جاگتے رہتے ہیں سارے
میرے کمرے کے چراغ درد میرا بانٹتے ہیں
یک بہ یک دل میں اُتر آتا ہے
کوئی اُجڑا سا جزیرہ اور پھر
سسکیاں شور مچاتی ہیں ہواؤں کی طرح
اور بڑھتی ہے تیری یاد کی شدت مجھ میں
غم کا ادراک میرے ہوش بُھلا دیتا ہے
کچھ بگولے میرے آنگن میں بکھر جاتے ہیں
میں انہیں دیکھوں تو وہ آنکھوں میں سمٹ
آتے ہیں
نیند پلکوں سے اُلجھتی ہے، چلی جاتی ہے
اور چپکے سے پھر آنکھوں میں نمی آتی ہے
اتنا پھیلا ہوا صحرا ہے غموں کا مجھ میں
کوئی قطرہ، کوئی دریا، کوئی قلزم بھی جسے
کبھی سیراب نہیں کر سکتا
کوئی چاہے بھی اگر
میرے سنسان شبستان کو آباد نہیں کر سکتا

نبیل احمد

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آلگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صہبا کو تہ رکھو
ذرا ٹھہرو غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

خُمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے

نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئینہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

فیض احمد فیض

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے فرماتے سنا۔
"جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کا رزق کشادہ ہو اس کی عمر لمبی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ رشتہ داروں سے حسن سلوک کرے۔"

(بخاری)

عقل کی بھی ایک حد ہے،

حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ کا فرمان ہے۔
"ایسے علاقے میں نہیں رہنا چاہیے' جہاں دینی مسئلہ بتلانے والا عالم اور جسم کا علاج کرنے والا طبیب نہ ہو۔

انسانوں کو قابو رکھنا جانوروں کے قابو رکھنے سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ جس طرح نگاہ کی ایک حد ہے' جس سے آگے وہ کام نہیں کرتی، اسی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے' جس سے آگے وہ بے کار ہے۔
شرک کے علاوہ ہر گناہ کی مغفرت کی امید ہے لیکن گمراہی کا معاملہ بہت سخت ہے۔

(بحوالہ: ملفوظات امام شافعیؒ)

حافظے کی کمزوری،

امام شافعی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار شہر کے بازار میں کسی اجنبی عورت کی پنڈلی پر نظر پڑی۔ فوراً انہیں اپنے حافظے کی کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ پریشان ہو کر ہلکے ہوئے استاد وکیع کے پاس گئے اور اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی۔

استاد نے گناہ کے ترک کرنے کی وصیت کی اور فرمایا۔
"حافظہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ کا فضل گناہ گاروں کو نصیب نہیں ہو سکتا ہے۔"
یہی وجہ ہے کہ پوری پوری کتابیں ایک دفعہ سن کر حرف کا حرف سنا دینا کبھی کسی غیر مسلم کے بارے میں نہیں سنا گیا۔

مصروفیت،

اپنی مصروفیت کا جائزہ لو...
کیونکہ آپ کی مصروفیت گمراہی بھی ہو سکتی ہے اور آپ کی مصروفیت عبادت بھی ہو سکتی ہے۔

(واصف علی واصف)
نوال افضل گلشن۔ کراچی

فن،

اچھی زندگی گزارنے کا ایک فن ہے۔ یہ فن ہے چیزیں کھو جانے پر صبر کرنے کا فن۔ کچھ چیزیں عارضی طور پر "گم" ہو جاتی ہیں۔ کچھ چیزیں مستقل طور پر ہم سے "جدا" ہو جاتی ہیں۔ صبر کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تو بہتر یہ ہے کہ ہم چیزیں کھو کر بھی خوش رہنے کا فن سیکھیں۔

حوریہ زینب۔ کہروڑپکا

تکبر کا علاج،

"اگر تم تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو کسی غریب اور مفلس

کو سلام کرو اور پوری توجہ کے ساتھ اس سے مصافحہ کرو۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

کون کم بخت؟

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔

"آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟"

"یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کنجوس اتنے ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔"

بیوی نے شکایت کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

"کون کم بخت اس بدذات، کمینی اور گھٹیا عورت کو گالیاں دیتا ہے۔ بکواس کرتی ہے اور سارے پیسے اس کو دیتا ہوں، خواہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

تعریف؟

اپنے حسن کی تعریف سنتے ہی عورت کا دل یہی پہلی گواہی دے گا کہ آدمی بے شک بے ہودہ ہے لیکن جوہری کی نظر رکھتا ہے۔ کتنا صحیح ہے اور نگاہوں کا بڑا سچا ہے۔

(شوکت تھانوی)

حرا قریشی۔ ملتان

مہارت؟

ایک بادشاہ کے داڑھی کے بال بہت بڑھ گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ حجاموں سے بال کٹوانے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور طبعاً بھی اسے کٹواتے میں وحشت ہوتی تھی۔ وزیر نے ایک ماہر حجام سے رابطہ کرکے اسے سمجھایا کہ جب بادشاہ گہری نیند سو جائے تو تم اس کے بال اس طرح کاٹنا کہ اسے خبر نہ ہو اور جب بادشاہ نیند سے جاگے تو آئینہ دیکھ کر اسے حیرت ہو کہ ایسا کون سا حجام ہے جس نے اس مہارت سے اس کے بال صاف کردیے۔ آخر حجام نے یہ کام بڑی مہارت سے کیا اور داڑھی بنادی۔ بادشاہ نے اس حجام کو بلا کر اس کی تعریف کی اور اسے انعام سے نوازا۔ حجام انعام لے کر گھر آیا۔ اور اپنی بیوی کو اپنی مہارت کا قصہ سنایا۔ اور کہا۔

"میری مہارت کی بادشاہ نے بہت تعریف کی ہے۔"

بیوی نے جو جواب دیا وہی اس حکایت کا اصل مقصد ہے۔ بیوی نے کہا۔

"بادشاہ کی تعریف سے کیا ہوتا ہے۔ اگر کسی ماہر حجام نے تعریف کی ہوتی تو وہ اصل تعریف ہوتی۔ بادشاہ حجامت کے فن کو کیا جانے؟"

عذرا ناصر۔ افضل ناصر۔ کراچی

ادیب؟

- کئی ادیب اپنے پارہ پارہ خیالات کو ڈکشنریوں کے پیوند لگا کر مرمت کرتے ہیں۔
- وہ ادیب جو اپنا مواد کسی کتاب سے لیتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو قرض پر چلانے کے لیے دولت ادھار لیتا ہے۔
- جو آزادی تحریر اور تقریر کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے پاس نہ تو کہنے کو کچھ ہے نہ ہی تحریر کرنے کے لیے۔
- قلم عصائے سلطانی ہے لیکن قلم کاروں میں کتنے کم شہنشاہ ہوتے۔

(خلیل جبران)

عائشہ رباب۔ کراچی

غلام قوم؟

ہاتھی کے بچے کو پیر میں زنجیر ڈال کر پالا جاتا ہے۔ وہ زنجیر توڑنے کی کافی دن تک کوشش کرتا ہے لیکن ہمت ہار کے چھوڑ دیتا ہے۔ بڑا اور طاقت ور ہو جاتا ہے تو وہی زنجیر ہوتی ہے جو ہلکی سی کوشش سے ٹوٹ سکتی ہے مگر ہاتھی کے دماغ میں وہی ہوتا ہے کہ زنجیر نہیں ٹوٹے گی اور وہ ساری زندگی غلام رہتا ہے۔ ہماری قوم کی طرح۔ ذرا سوچیے۔

فائزہ، الوینہ۔ حیدرآباد

جلدی،

آٹھ سردار جوا کھیل رہے تھے کہ پولیس نے چھاپہ مار دیا۔ سردار جلدی سے پولیس کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

ایک سپاہی نے کہا۔ "آپ بھاگنے کے بجائے گاڑی میں کیوں آ گئے؟"

سردار بولا۔ "جب پچھلے ہفتے آپ نے چھاپہ مارا تو مجھے سیٹ نہیں ملی تھی۔"

اریبہ، منیبہ۔ آزاد کشمیر

قرارداد،

"ہیلو ہیلو ریجنرز ہیلپ لائن۔"

ہیلپ لائن: "جی جی میں انسپکٹر پاکستان بات کر رہا ہوں۔ فرمائیے ہم آپ کے کیا کام آ سکتے ہیں؟"

"دیکھیں... دیکھیں۔ ہمارے محلے میں چار دہشت گرد گھس آئے ہیں۔"

ہیلپ لائن: "کیا وہ کسی گاڑی میں ہیں؟"

"جی سفید کار ہے۔"

ہیلپ لائن: "کار کی نمبر پلیٹ سرکاری تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"کار کے بونٹ پر کسی پارٹی کا جھنڈا ہے؟"

"نہیں۔"

ہیلپ لائن: "وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"ایک سرکاری اسکول میں۔"

ہیلپ لائن: "ہم معذرت چاہتے ہیں اسمبلی کی قرارداد کے بعد ہم کسی سرکاری عمارت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ پہلے وزیر اعلا سے تحریری اجازت لینا ہو گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

عائشہ۔ گوجرہ

ستم ظریفی،

ایک صاحب اپنے پڑوس کے جنرل اسٹور پر پہنچے اور مالک سے پوچھا۔

"آپ نے میرے کتے کو تو نہیں دیکھا؟"

"دیکھا...؟" اسٹور کا مالک بھنا کر بولا۔ "میں نے صبح اسے ایک گھنٹہ تک بھگتا ہے... وہ اسٹور میں آ گھسا تھا۔ کاؤنٹر پر چڑھ کر اس نے جام، شربت اور کیچپ کی بوتلیں گرا دیں۔ وہاں سے اس نے سیدھے انڈوں کے کریٹ پر چھلانگ لگائی جس سے انڈے ٹوٹ گئے۔ انڈوں سے پھسل کر ایک گاہک گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ پورے اسٹور کو تہس نہس کر دیا اس نے۔"

"اوہ ہو... بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر۔" ان صاحب نے رسمی سے لہجے میں کہا اور پھر وہ مالک کر سے لکھا ہوا ایک پوسٹر دکان دار کو دکھاتے ہوئے بولے۔ "یہ میں اس کتے کا "اعلان گمشدہ" لکھ کر لایا ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ کے اسٹور کے باہر شیشے پر لگا دوں؟"

حورین زینب۔ کہروڑ پکا

نقصان،

ایک ہزار قابل انسان مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک "احمق" کے صاحب اختیار ہو جانے سے ہوتا ہے۔

(مولانا جلال الدین رومی)

ایمان فہمید۔ کراچی

سانحہ ارتحال

بہن بشریٰ سعید کے والد طویل علالت کے بعد دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک بہت باعلم شخصیت تھے ان کی وفات ان کے اہل خانہ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

امت الصبور

یادوں کی ڈائری

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی شاعری پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جگنوؤں اور تتلیوں کے خوابوں کے درمیان زندگی کی ان ساری سچائیوں کا عکس ہے جنہیں عرف عام میں غم دوراں کہا جاتا ہے۔ خواہشوں کی سوندھی بکھری خوشبو کو اجاگر کرتی یہ غزل آپ سب کے نام۔

ہر ذرۂ امید سے خوشبو نکل آئے
تنہائی کے صحرا میں اگر تو نکل آئے

کیسا لگے اس بار اگر موسم گل میں
تتلی کا بدن اوڑھ کے جگنو نکل آئے

پھر دن تیری یادوں کی منڈیروں پہ گزارا
پھر شام ہوئی آنکھ سے آنسو نکل آئے

بے چین کیے رہتا ہے دھڑکا یہی جی کو
تجھ میں نہ زمانے کی کوئی خو نکل آئے

پھر دل نے کیا ترک تعلق کا ارادہ
پھر تجھ سے ملاقات کے پہلو نکل آئے

شفق راجپوت کی ڈائری سے

فراق گورکھپوری کی یہ غزل محبت و عقیدت کا حسین امتزاج ہے۔ اشعار کی معنویت اور اشاراتی پہلو کو اجاگر کرتی یہ خوب صورت غزل تمام قارئین کے لیے۔

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب، مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن، پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

تیری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اتر گیا رگ جاں میں یہ نشتر پھر بھی

اگرچہ بے خودیٔ عشق کو زمانہ ہوا
فراق کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

فرزانہ مغل کی ڈائری سے

گو داغ دہلوی کی شاعری میں وہی باتیں ملتی ہیں جو شعراء کے ہاں عام ہیں۔ مگر ان کا انداز بیان اور لب و لہجہ سب سے جدا گانہ ہے۔ بہنوں کے لیے اپنی ڈائری سے داغ دہلوی کی ایک خوبصورت غزل منتخب کی ہے پڑھیے اور بے تکلف گفتگو کا مزہ اٹھائیے۔

اس جفا کا جب ہی مزا ملتا
کوئی مجھ کو اگر برا ملتا

غیر سے مل کے کیا لیا تم نے
ہم سے ملتے تو کچھ مزا ملتا

عاشقی سے ملے گا اے زاہد
بندگی سے خدا نہیں ملتا

دوستوں سے کچھ نہ نکلا کام
کوئی دشمن ہی کام کا ملتا

تم کو یہ مل گیا ہے قسمت سے
داغ سا ورنہ دوسرا ملتا

شبنم شمشاد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم مجھے بہت پسند ہے
آپ سب بہنوں کے لیے۔

ایسا بھی ہوتا ہے
بہت کہنے کی چاہت ہو
قلم کو تھام بھی لیں تو

حرف گمنام ہوتے ہیں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
بیاں مدعا کرلو، بہت سی گفتگو کرلو
تو کچھ حاصل نہیں ہوتا
کہ لفظوں کا اثاثہ بھی یونہی بے کار جاتا ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

فرح عالی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محمود غزنوی کی یہ غزل
آپ سب بہنوں کے لیے۔

بھول تو جائیں ہم تجھے لیکن
زخم تازہ ہے، درد زندہ ہے

جس کو دل میں بسا لیا ہے
چند وعدوں کا نادہندہ ہے

سچ تو یہ ہے کہ کارِ عشق تمام
ہجر اور وصل ہی کا دھندہ ہے

صرف جذبے بدل گئے ورنہ
میں ابھی زندہ ہوں تو وہ بھی زندہ ہے

دل تو محمود غزنوی صاحب
خواہشوں کا ہی ایک پلندہ ہے

خالدہ جیلانی

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا

پریت کی تھی تو عمر بھر نبھاتے سجن
یوں بیچ راہ میں تو چھوڑ کے نہ جاتے سجن
دے گئے ہو آنسو، آہیں اور غم کی راتیں
عید آئی ہے کاش تم بھی چلے آتے سجن

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

ہم کو تو غم کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدوخال بھی

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

یہ دعا مانگتے ہیں ہم عید کے دن
باقی نہ رہے آپ کا کوئی غم عید کے دن
آپ کے آنگن میں اترے خوشیوں بھرا چاند
اور مہکتا رہے پھولوں سے چمن عید کے دن

الوینہ دانش، فائزہ، نوشین ——— حیدرآباد

وفا کا سندیس لے کر اترے تمہارے آنگن میں
گواہ رفاقتوں کا، محبتوں کا بن کر ہلال عید

صائمہ حبیبی ——— کراچی

راز ہستی کچھ نہیں اکثر یہی دیکھا ہے
بے خبر ہنستے رہے باخبر روتے رہے

عظمیٰ شفیق ——— جڑانوالہ

جب بھی ٹھہرا ہے ذرا آ کے تیری دید کا رنگ
دور تک پھیل گیا ہے میری جاں عید کا رنگ

تسنیم کوثر ——— کراچی

نظر جو چاند پہ کی دل میں مسکرائے تم
دعا کو ہاتھ اٹھائے تو یاد آئے تم
بہار آئی، صبا آئی، ہر خوشی آئی
سب آئے عید کے مہماں مگر نہ آئے تم

افشاں خان، عطیہ حق نواز ——— شاہ پور چاکر

سدا ہنستے رہو جیسے ہنستے ہیں پھول
دنیا کے سارے غم تمہیں جائیں بھول
چاروں طرف پھیلاؤ خوشیوں کے گیت
اسی امید کے ساتھ تمہیں مبارک ہو عید

کوثر خالد ——— جڑانوالہ

ہنسی خوشی تیرے جیون کا ہر سفر گزرے
میری دعا ہے کہ تیری عید خوب تر گزرے

عالیہ سعید ——— سیالکوٹ

بڑی باتوں کو خاطر میں نہ لانا اس کی عادت ہے
ذرا سی بات پہ طوفان اٹھانا اس کی عادت ہے
محبت میں وہ سنجیدہ ہے کتنا دیکھتے رہنا
محبت ہر کسی سے یوں جتانا اس کی عادت ہے

ریحانہ کوکب ——— کسووال

ہیں بظاہر مطمئن یوں تو سب اپنی جگہ
ہاں مگر اک نام یہ ہے بے کلی اپنی جگہ
لاکھ یہ چاہا کہ اس کو بھول جاؤں پر قتیل
حوصلے اپنی جگہ ہیں بے بسی اپنی جگہ

سیدہ حنا بخاری ——— دیپال پور

نام لے لے کر نہ میرا شہر کی نظروں میں آ
مجھ سے ملنا ہے تو میرے دل کے صحراؤں میں آ
اس سفر میں دیکھ گھل جاتا ہے مٹی کا بدن
مجھ سے ملنے کی نہ خواہش کر نہ برساتوں میں آ

حنا رانا ——— سیالکوٹ

آبلے پاؤں کے مہکیں تو مگر درد نہ دیں
دشت میں ریت کے ذروں کو بتانا ہوگا
گھاؤ کتنا بھی پرانا ہو بہر حال اسے
کچے موسم کی شرارت سے بچانا ہوگا

حیا بخاری - ڈی آئی خان

مجھے خط لکھنا کبھی نہیں آیا شاید کبھی سیکھ بھی نہ پاؤں لیکن میں نے زندگی میں ہمیشہ کوشش اور بار بار کوشش کی پالیسی اپنائے رکھی ہے۔

عید کے دونوں شمارے بہترین تھے۔ خاص کر افسانوں کی تعداد دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کوزے میں بند دریا۔ اس کے بعد شاہین رشید جی کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جنہوں نے میری فرمائش اتنی جلدی پوری کر دی اور بالآخر جن لکھنے والوں کے متعلق ہم جاننا چاہتے تھے۔ ان کے شب و روز ان صفحات کی زینت بنے۔ بہت سی دعائیں شاہین جی۔ شاعری میں اس دفعہ شعاع میں ثمینہ اکرم اور خواتین میں فہمیدہ کوثر کا انتخاب بہترین تھا۔

خطوط میں مجھے ثمینہ اکرم (جن سے نہ جانے کیوں مجھے دلی عقیدت ہے) عائشہ خان 'حرا قریشی' فوزیہ ثمروث 'ثمینہ کوثر عطاری' کے تبصرے بے حد پسند ہیں اور خواتین شعاع کی ایک ایسی ہی ذہین قاری اور تبصرہ جادی عمر بھی ہیں۔ لیکن وہ صرف سوشل میڈیا پہ کیوں ایکٹیو ہیں۔ یہاں خط کیوں نہیں لکھتیں' یہ بات باعث حیرت ہے۔ انہیں ضرور لکھنا چاہیے۔

میں ان بہنوں کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہوں گی۔ جنہوں نے میری تحاریر کو سراہا اور قیمتی رائے سے نوازا' خاص طور پہ فیصل آباد سے بہن خالدہ قمر الدین کا خط روح تک میں سرشاری بھر گیا' ان کے الفاظ "بہت عرصے بعد لکھا" یقین کریں پچھلے سال کی ساری تکلیف دہ ساعتوں کی یادیں دھندلا دیں۔

اس ماہ کے شعاع میں کوثر خالد جڑانوالہ سے بہن نے ایک چھوٹا سا سوال کیا۔ "اشک ندامت" حیا کا واقعی اپنا نانا تھا؟ تو اس کا سادہ سا جواب ہے نہیں اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ یہ نانا میری اماں کی کسی جاننے والی کا ہے۔

میرا' میرے سسرال سے رشتہ بڑا انوکھا ہے۔ محبت بھرا' خلوص سے گندھا۔ یقین کریں اگر میں نے اپنا نانا بھجوا دیا تو شاید کسی کو بھی یقین نہ آئے کہ ایسا حقیقت میں بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسی مکمل زندگی ممکن ہے اور اس کی کنجی بہت چھوٹی سی ہے۔ برداشت' صبر اور مثبت سوچ' جو دوستی رکھے اس سے دوستی رکھو۔ جو دشمنی رکھے۔ اس کے خلاف سوچ سوچ کر کڑھنے سے ہزار درجے بہتر ہے کہ اللہ

نادیدہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: Info@khawateendigest.com

پہ چھوڑ دو۔ لڈو کی بات پہ دل خوش ہوا کہ قارئین کو یہ بات بھی یاد رہی (smiling) سمائلنگ لیکن دل میں دکھ بھی بھر گیا' کیونکہ اب میں اماں کے ساتھ لڈو نہیں کھیلتی۔ نومبر کی ایک ٹھنڈی بھیگی شام اماں مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔ آپ سب سے دعائے مغفرت کی التماس ہے۔

ج : پیاری حیا! بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہماری محفل کو رونق بخشی۔ اس میں شک نہیں کہ خط لکھنا واقعی بہت مشکل لگتا ہے۔ لیکن سیل فون نے آج کل یہ مشکل کسی حد تک آسان کر دی ہے۔ آپ اپنی رائے ہمیں مسیج کر سکتی ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی مصنفین کی رائے بھی جاننا چاہتے ہیں۔ ایمل رضا اور سمیرا حمید اکثر شعاع کی تحریروں اور سلسلوں کے بارے میں اپنی رائے ایس ایم ایس کرتی ہیں تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔

صبر' برداشت اور مثبت سوچ واقعی خوش گوار زندگی کی

کنجی ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن سے واسطہ پڑے وہ کچھ عقل سمجھ رکھتے ہوں ورنہ ان رشتوں میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی نے صبر برداشت کا مظاہرہ کیا تو اسے اس کی کمزوری سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ سارا بوجھ اس پر لاد دیا۔ زندگی بہت عجیب چیز ہے۔ یہاں کوئی بھی کلیہ ہمیشہ درست نہیں ہوتا نہ ہی اس کو فارمولوں کے تحت برتا جا سکتا ہے۔ یہاں جو سکہ سب سے زیادہ چلتا ہے وہ قسمت ہے۔ قدرت کبھی کبھی اس طرح اور ایسے ایسے لوگوں کو نوازتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

حادی عمر ہمیں خط لکھیں ہم ان کا خیر مقدم کریں گے۔

ہاجرہ عمران..... لاہور

اپنی جیب ناتواں پر بے جا بوجھ ڈال کر خط کی رجسٹریاں کروانا اس پر بھائیوں یا شوہروں کے نخرے الگ برداشت کرنا بھی ہمارے ہی جیسے اچھے لوگوں کے بس کی بات ہے۔ آپ جیسے اچھے لوگ ان خطوط پر اک نگاہ غلط ڈالتے ہیں اور پھر کئی دلوں کے ارمان حسرت بن کر دلوں میں ہی مقیم رہ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے راشدہ رفعت کے ناولٹ "آگہی کے پل" کی بات کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی مگر انتہائی قیمتی بات جسے مولوی حضرات گھنٹوں اپنے خطبات میں سمجھاتے ہیں۔ اس چھوٹے سے ناولٹ میں راشدہ رفعت نے سمجھا دی ہے۔ اسلام میں قطع رحمی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ انتہائی خوب صورت ناول مکمل کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ کہانی خوب صورتی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بورشے 'سمیرا حمید اپنے مخصوص "وفیری ٹیل" اسٹائل میں لے کر پہنچی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ والٹ ڈزنی میں ایک اور خوب صورت شاہکار کا اضافہ ہو گیا ہو۔ بورشے اور اس کے کردار ماریا اور آسکر ایک ایسی ماورائی دنیا کے باسی لگے جیسا کہ سنڈریلا' بیوٹی اینڈ بیسٹ یا سنو وائٹ..... وغیرہ بورشے... جادوئی بانسری..... ریئلی ریئلی امیزنگ۔

جون کے ماہنامے میں ایک بہن نے خط لکھ کر پوچھا ہے کہ عمیرہ احمد "آب حیات" میں آخر بتانا کیا چاہتی ہیں۔ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ عمیرہ احمد "آب حیات" میں ترقی یافتہ ممالک کی دوغلی پالیسی لے کر اسلامک سوسائٹی کے اندر موجود دورخی زندگی کے پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

میں نے جون کے ماہنامے کی دوسری کہانیاں بھی پڑھیں ہیں جو کہ اچھی تھیں بلکہ بہت اچھی۔ اس بار ماہنامہ واقعی شاندار تھا۔

ج : ہاجرہ! آپ کو ہم سے بہت سی شکایتیں ہیں اور ہمیں آپ سے صرف ایک شکایت ہے وہ یہ کہ آپ نے خط کس کے ذریعے پوسٹ کرائے تھے جو ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ یقین کریں کہ آپ کے خط ہمیں نہیں ملے ورنہ ہم جواب ضرور دیتے۔ خواتین کی پسندیدگی اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

طہٰ مصطفیٰ..... فاروق آباد

نمرہ احمد جی "مصحف" "جنت کے پتے" اور اب "نمل" اللہ آپ کتنا اچھا لکھتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے میں آپ جیسا لکھوں۔ آب حیات بھی سپر ڈوپر چل رہا ہے۔ (نمرہ احمد جی اور عمیرہ احمد بہنیں ہیں کیا؟) وحشت جنوں "آمنہ ریاض" جی! قسم سے آپ کو پہلی دفعہ پڑھ رہی ہوں۔ بہت فینٹسی ناول ہے۔ پیارا خواتین' ٹائٹل سمیت الف سے ی تک بہت اچھا تھا۔

ج : پیاری طہٰ! آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ پڑھ کر ہی رائے دے سکتے ہیں۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد بہنیں نہیں ہیں۔ دونوں کے نام کا آدھا حصہ مشترک ہے اور ایک اور بات مشترک ہے کہ دونوں ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

حیرت ہے آپ نے آمنہ ریاض کی تحریریں پہلے نہیں پڑھیں۔ آمنہ ریاض بہت اچھا لکھتی ہیں اور ہماری تو وہ پسندیدہ مصنفہ ہیں۔

متین ندیم..... ڈھڈی نوالہ فیصل آباد

آپ نے تو مجھے بھلا ہی دیا۔ ویسے آپ سے بھی کیا گلہ کرنا۔ آپ بھی کس کس کو یاد رکھیں گی خواتین کے سب ہی ناولز بہت اچھے چل رہے ہیں۔ میں نے سب سے پہلا ناول "میری ذات ذرہ بے نشاں" پڑھا تھا۔ تب میں نہم کے سالانہ امتحانات دے رہی تھی۔ میرا کیمسٹری کا پیپر تھا اور میں نے رات بارہ بجے تک وہ مکمل پڑھا۔ تب سے لے کر اب تک خواتین ڈائجسٹ کی قاری ہوں۔ نمرہ احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ نمرہ سے ریکویسٹ ہے کہ "جنت کے پتے" کا دوسرا پارٹ بھی لکھیے۔ میں چاہتی

ہوں کہ نمرہ احمد جیسا لکھوں اگر آپ حوصلہ افزائی کریں تو

ج : عزیز بہن! بھول تو جائیں گے جب آپ ہمیں خط نہیں لکھیں گی اور اتنا طویل وقفہ دیں گی۔ نمرہ احمد آپ کو پسند ہیں آپ کی تعریف ان تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ لکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور لکھیں لیکن نمرہ احمد کی طرح نہیں آپ اپنے انداز سے لکھیں۔ نمرہ احمد کا اپنا انداز ہے۔ ان کی طرح لکھنے کی کوشش نہ کریں۔

سمیرا محمود "یونیورسٹی میرپور آزاد جموں کشمیر"

میں شعاع اور خواتین کی پندرہ سال سے خاموش قاری ہوں آج مجھے جس وجہ نے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے "آب حیات"

عنیزہ جی آپ کو داد دینی پڑے گی کہ کیسے آپ کو ہماری تشنگی کا احساس ہو گیا پیر کامل میں کچھ تشنگی تھی کہ کاش "امامہ اور سالار" کے آگے کی زندگی کے حالات بھی معلوم ہوں کیونکہ وہ دونوں ہی کوئی عام کردار نہ تھے۔

میں شہر میرپور آزاد کشمیر کی رہنے والی ہوں اور اب منگلا ڈیم سے متاثر ہونے کی وجہ سے "نیو سٹی میرپور" میں رہتی ہوں۔ ہمارا شہر "نیو سٹی میرپور" بہت ہی خوب صورت ہے آپ کو جب بھی میرپور آزاد کشمیر آنے کا موقع ملا تو ہمارے شہر نیو سٹی ضرور ضرور آیئے گا۔

ج : سمیرا یقیناً "آپ کا شہر خوب صورت ہوگا۔ کشمیر کو تو جنت نظیر کہا جاتا ہے اور جہانگیر نے کشمیر دیکھ کر کہا تھا کہ اگر جنت زمین پر ہے تو یہی ہے۔ دل تو ہمارا بہت چاہتا ہے کہ آپ کا شہر دیکھیں قسمت نے موقع دیا تو ضرور آئیں گے اور آپ سے ملاقات بھی کریں گے۔ پندرہ سال بعد خط لکھا اور صرف ایک ناول پر تبصرہ...؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

ایمان جلبانی..... گاؤں دریا خان جلبانی

میں ہمیشہ پیچھے سے پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ وہاں سب قاری بہنوں کے اتنے مدلل، مفصل جامع انداز میں تبصرے تعریفیں پڑھ کے میری تو آنکھیں کھلی رہ گئیں ہر خط میں — اتنی مشکل اردو اوپر سے انداز بیان اور تبصرے کہ کہاں ہمارا سیدھا سادہ انداز سب سے پہلے اپنے موسٹ فیورٹ ناول "نمل" کی طرف چھلانگ لگائی اور عبید کے ہاتھوں جواہرات کی "عزت" کو زوم کرکے دیکھا اور نوشیرواں تم تو گڑ کھا کے خودکشی کرلو۔ سمیرا آپ یہ نئے انداز کہاں سے لاتی ہیں کیا سحر انگیز منظر تھا۔ واہ کیا مجھے ایسا بورشے مل سکتا ہے۔ مجھے جگنو بہت پسند ہیں اور بنت سحر سے گزارش ہے بہت لکھ لیے افسانے اب ایک آدھ ناول ہی لکھ لیں۔

ج : ایمان! خوب صورت الفاظ کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن ہمارے لیے اس سے بڑھ کر جس چیز کی اہمیت ہے وہ ہے آپ کا خلوص اور پیار۔ آپ نے اتنی محبت سے خط لکھا ہمیں بہت اچھا لگا۔

سمیرا حمید اور بنت سحر تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

نثار ثمن..... لدھیوالہ وڑائچ گوجرانوالہ

کاغذ قلم تھامے لوگ اسکولوں، کالجوں کا رخ کرتے ہیں میں نے کھیتوں کا کیا ہے۔ صبح کاذب ہے۔ پو پھوٹنے والی ہے۔ گرمی ہے۔ حبس ہے۔ مگر جیسے ہی گاؤں کی چھوٹی سی آبادی سے نکل کر پہلی پگڈنڈی پر قدم رکھا۔ وہ وہاں ذرا دور دیکھیں۔ جو ٹیوب ویل چل رہا ہے، ہوا جب اس کے ٹھنڈے پانی سے ٹکرا کر آئی تو رگ و روپے میں سرائیت کر گئی۔ تاحد نگاہ سبزہ زار، ہوا فضا پر سکون ہے لیکن پرندوں کی تسبیحات عروج پر ہیں جو کانوں کو بھلی لگ رہی ہیں درخت ساکن ہیں۔ کوئی ہوا کا جھونکا آتا ہے تو پتے سرگوشیاں سی کرتے ہیں۔ سرسراہٹ میں صبح کو محسوس کرنا، دن کے نکلنے کا دیکھنا نمرہ کے نمل سے سیکھا۔ صبح جو رب کائنات طلوع کرتا ہے مگر اس کو الفاظ کے روپ میں دلکشی سے نقشہ کھینچ کر ہم تک بیان کرنا کمال ہے نمرہ کا۔ میری پسندیدہ مصنفین سائرہ، سمیرا، ثمینہ رہی ہیں۔ نمرہ کے سارے ناولز پڑھے ہیں مگر "نمل" نے باندھ لیا۔ اس دفعہ جلدی جلدی پڑھا مگر سمیرا کی بورشے رہ گئی۔ سمیرا اور جلدی پڑھ لوں۔ ان کا تو ہر لفظ کہانی ہوتا ہے اس لیے معذرت کہ بورشے پر رائے نہ دے سکی۔ اس دفعہ ناولٹ ہلکے پھلکے، مزاحیہ، کزنز والے تھے جن قارئین کو انتظار تھا، خواہش پوری ہوئی "روشنی کا سفر" صائمہ سے مل کر اچھا لگا۔ خط سب سے مزے کے لگے۔ لطف آگیا آپ کے جواب پڑھ کر۔ وحشت جنوں دلچسپ، عمدہ، تجسس سے بھرپور تحریر ہے۔ خوش نصیب کا کردار فطری سا لگتا ہے، ناول میں آہستہ غیر محسوس طریقے سے بہت سنجیدہ مسئلے کی

طرف لے کر جا رہی ہیں۔ نفسیاتی مسائل کے پہلے خط سے معلوم ہوا کہ عورت آج بھی بے بس ہے۔

ج : پیاری ثنا! آپ نے ماحول کی ایسی جاندار، شاندار اور خوب صورت عکاسی کی ہے کہ تبصرہ تو پیچھے رہ گیا۔ اور بھلا اتنے خوب صورت ماحول میں بیٹھ کر بس دو کہانیوں پر تبصرہ؟

شائستہ اکبر۔۔۔ گڈو کالونی

اس بار جس تحریر نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ سمیرا حمید کا ناول بورشے 'بورشے' بورشے ہے۔ بہت زبردست اور عمدہ تحریر لکھی گئی ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے ایسی کھوئی کہ اس جہاں کی تلخیاں، غم جانے کہاں چھپ گئے بس یاد رہا تو جنگل 'ماریا' جگنو' اسکر' ساز اور رقص۔ اور یہ جملہ کہ جرأت مند ہونے کے لیے کبھی کبھی خود غرض بھی ہونا پڑتا ہے۔" بہت لاجواب رہا دل چاہ رہا تھا بس اسی طلسماتی دنیا میں رہوں۔

ج : پیاری شائستہ ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ بورشے نے آپ کو کتنا متاثر کیا ہے۔ تب ہی تو پورے خط میں صرف ایک ہی کہانی پر تبصرہ کر پائی ہیں۔ سمیرا حمید تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں ان کی جانب سے شکریہ قبول کریں۔

صبا مسکان۔۔۔ فیصل آباد

عید کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ لیکن عید کا شمارہ عید سے پہلے ملنا چاہیے 'مہندی کے ڈیزائن اتنے خوب صورت ہوتے ہیں جو کہ عید کے گزر جانے کے بعد ملتے ہیں۔ اب بات ہو جائے ہمارے ناول کی تو سب رائٹرز تو بہت ہی باکمال لکھ رہی ہیں میں کسی ایک کی تعریف نہیں کروں گی۔ رسالہ ملے تو "نمل" پڑھ کے ہی چین آتا ہے۔ خاور کا انجام کتنا برا ہوا۔ نمرہ آپی نے اس قسط میں لکھا کہ فارس مسجد میں کھڑا ہوا۔ پیر سے پیر ملا لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ پاؤں کے درمیان کم سے کم ایک بالشت کا فاصلہ ہونا چاہیے 'فارس کو پلیز زمر کا رہنے دیجیے گا اور فارس' سعدی کی فیملی کا ہیپی اینڈ ہونا چاہیے۔ عمیرہ احمد کا آب حیات بھی بہت اچھا ہے یہ دونوں میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

ج : پیاری صبا! خط ایڈیٹ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ ورنہ بہت ساری بہنوں کے خط شامل نہ ہو سکیں۔ نماز میں مرد اور عورت دونوں کے پاؤں کے درمیان فاصلہ ہونا ضروری ہے۔ نمرہ نے جو لکھا اس کا مطلب یہ تھا۔ فارس نے جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے اور صف سیدھی رکھنے کے لیے اپنے دونوں سائڈ میں کھڑے نمازیوں کے ساتھ پیر ملائے تھے۔

فریحہ عزیز شیخ۔۔۔ کنڈیارو

مجھے آپ سے بہت شکایتیں ہیں ایک تو یہ کہ آپ نے میرے خط نہیں چھاپے۔ آپ لوگ صرف ان کی ہی کہانیاں اور خط شائع کرتے ہیں جو پرانی لکھنے والی رائٹرز ہیں۔ میں باقاعدگی سے ہر ماہ کی کہانیاں اور خط پڑھتی ہوں۔ ہر بار ایمل رضا ہی کا نام پڑھنے کو ملتا ہے اور رہی بات خط لکھنے والیوں کی تو آپ لوگ صرف ان کے خط شائع کرتے ہیں جو آپ کے ادارے کی تعریف کرتے ہیں اور جو چھچھوری باتیں کرتی ہیں جیسے۔ سعدی کو کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی۔ مجھے فارس کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ یا پھر ہاشم کی خوب صورتی اٹریکٹ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ایک ناولٹ اور ایک مکمل ناول لکھا ہے جو میں بھیجنا چاہتی ہوں۔

ج : پیاری فریحہ! آپ کی تمام شکایتیں سر آنکھوں پر ہم وہی خطوط شائع کرتے ہیں جو ہمیں موصول ہوتے ہیں اور ہماری معصوم سی قارئین جب اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں تو ہمیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اب یہ خطوط آپ کو چھچھورے لگتے ہیں تو کیا کہہ سکتے ہیں۔

آپ اپنے ناول اور کہانیاں ہمیں بھجوا دیں۔ اچھے ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔ اور یہ بھی اطمینان رکھیں۔ اچھی تحریریں ہم کبھی بھی ردی کے ڈھیر میں نہیں ڈالتے اور ہر ماہ ہم کچھ نئے لکھنے والوں کی تحریریں ضرور شامل کرتے ہیں صرف پرانی رائٹرز کی نہیں۔

عائشہ رباب۔۔۔ کراچی

سرورق بہت پیارا لگا۔ خاص کر بیشر اسٹائل 'تینوں ہی ماڈل بڑی پیاری تھیں۔ کہنی سنی پڑھا۔ آپ کو بھی عید مبارک 'کرن کرن روشنی میں عصر کے بعد نوافل یا نمازیں ادا کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں تفصیلی احادیث شائع کریں اور اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے

کیا اقوال ہیں۔ انشاجی کی غزل پڑھی "نہایت دلچسپ" واقعی "آباد رہے آنگن" نہایت ہی باکمال سروے تھا۔ سب کے جوابات عمدہ تھے۔ صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ سارے ہی جوابات تفصیلی تھے۔
اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف "آب حیات" اچھا جا رہا ہے خمین کا تو جواب نہیں "وحشت جنوں" وسامہ کی موت نے بہت دکھی کر دیا۔ منفرا کی غیر موجودگی بہت محسوس ہوئی۔ ایک بات سمجھ نہیں آرہی' آمنہ ریاض پیر بابے کے عقیدے کو فروغ کیوں دے رہی ہیں اور پلیز صفحے بڑھادیں۔ توبہ..... بہت تنقید ہو گئی۔ میری مما کہتی ہیں "تم اتنی تنقید کرتی ہو' اس لیے ادارہ تمہاری کہانی شائع نہیں کرتا۔" واقعی ایسا ہے کیا؟ "بورشے" سمیرا حمید بہت ہی زبردست لکھا ہے۔ کمال کی منظر نگاری کی ہے۔ ہر منظر جذبات کے رنگوں سے مزین تھا۔ حقیقت سے قریب تر' ہر شخص دوسرے سے محبت کرنے والا' اس بار سمیرا حمید نے غیر ضروری الفاظ اور فلسفوں سے قدرے اجتناب برتا ہے' اچھا لگا۔ ناولٹ "آگہی کے پل" بہت عمدہ' مزاحیہ سی کہانی تھی۔ بہت اچھا لگا۔ بہت اچھا سبق دیا ہے۔ "وہ چاند چہرہ" کچھ خاص نہیں لگا۔ افسانے "فل ٹائم" بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ نجیب کی حرکتیں بہت بھائیں "تبائی" زبردست' سائرہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ روشنی کا سفر اور ایک خواب آنکھوں میں بھی اچھے تھے۔ اعتبار ساجد کی نظم اچھی لگی۔

ج: پیاری عائشہ! آپ کی امی کا اندازہ بالکل درست نہیں' کہانی کے شائع ہونے یا نہ ہونے کا خط میں تعریف یا تنقید سے قطعاً" کوئی تعلق نہیں اور ہاں آپ تعریف کریں یا تنقید "جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔" اپنی امی کی خدمت میں ہماری جانب سے سلام بھی عرض کیجیے گا اور انہیں اطمینان دلادیں کہ کہانیاں اچھی ہوں میں تو ضرور شائع ہوں گی۔
آمنہ ریاض کی کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے اس لیے اس کے متعلق یہ اندازہ نہ لگائیں کہ وہ پیر بابوں کو فروغ دے رہی ہیں۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ' ہانیہ عمران' آمنہ میر..... گجرات

خوب صورت سرورق دل کی اداسی کو دور نہ کر سکا۔ اگرچہ کوشش بہت کی دل کو منانے کی' ماہ جولائی کا سارا کا سارا شمارہ اسے دن لگا۔ خاص کر صائمہ چوہدری سے ملاقات کر کے اچھا لگا۔ کہنی سنی ہمیشہ کی طرح سر آنکھوں پر' کرن کرن روشنی کی باتوں سے دل کو سکون ملا یہ سلسلہ بہت اچھا معلوماتی ہے۔
انشاء جی کی غزل نہ بھولنے والی شاعری دل کے تاروں کو چھوتی شاعری۔ آباد رہیں آنگن سب کی باتیں بہت مزے کی لگیں۔
سرفہرست سمیرا حمید کے ناول بورشے کی بے انتہا تعریف پڑھی اور سوچا سب سے پہلے اسی کو پڑھا جائے۔ بیسٹ آف لک سمیرا جی اتنا اچھا ناول لکھنے پر الفاظ نہیں کہ آپ کی تعریف کی جائے۔ ناولٹ آگہی کے پل بہت مزے کا تھا۔ ایک بات ہے' ایسی تلخی اور رنجش والی اسٹوری پڑھ کے لگتا ہے اپنے ہی کوئی گھر کی بات چل رہی ہے۔ ہر ماہ ڈائجسٹ اس لیے خریدا جاتا ہے کہ اس سے اپنی ذرا سی' گھر کی ٹینشن دور کی جائے ایک تصور کی دنیا آباد کریں۔ مگر نہ جی ہماری رائٹرز صاحبہ ہماری قریبی عزیزہ لگتی ہیں۔ جنہیں ہمیں بتا کے ذہنی سکون ملتا ہو' وہ چاند چہرہ' وہی ہزاروں بار پڑھی ہوئی تحریر۔ اس میں راحیل نامی کردار باوفا لگا۔ باقی تو وہی کچھ تھا جو کئی سالوں سے پڑھتے آرہے ہیں۔ افسانوں میں فل ٹائم نمبر ون لگا۔ ہر جملہ مزاحیہ اور طنزیہ لگا۔
میرے خیال میں ایسی فریش اور زندہ دل تحریر ہر ماہ اور ہر ڈائجسٹ میں لازمی ہونی چاہیے۔ ہماری تو تفریح کا واحد ذریعہ ہی ڈائجسٹ ہیں۔ تبائی یہ تحریر ذرا دل کو لگی۔ مگر حقیقت میں ایسا ہوتا بہت کم دیکھا ہے۔ روشنی کا سفر مجھے لگا ہمارے گھر کی کہانی ہے۔ یہ ایمن کس جزیرے سے دریافت کی ہے رائٹر نے' اتنی سمجھ دار کہ شوہر کے ایک بار سمجھانے سے سمجھ گئیں۔

ج: پیاری فوزیہ! آپ نے تعریف اور تنقید کو اس طرح ملا دیا ہے کہ پتا ہی نہیں لگ رہا کہ تعریف ہو رہی ہے یا تنقید۔ اب یہی دیکھ لیں کہ آگہی کے پل آپ کو بہت مزے کا لگا اور ساتھ ہی آپ نے لکھ دیا کہ ناول نے آپ کو بتا دیا۔
بہرحال ہمیں آپ کے خط بہت اچھے لگتے ہیں خاص طور پر یہ بات کہ آپ بہت تفصیلی تبصرہ کرتی ہے اور ہر

کہانی اور ہر سلسلے پر بڑی باریک بینی سے تبصرہ کرتی ہیں۔

یاسمین حنفی... سہراب گوٹھ، کراچی

"نمل" کی اس بار کی قسط بہت اداس کر گئی وجہ؟ غازی کے الفاظ "آدمی تو بہت سے ہوتے ہیں۔ مرد کوئی کوئی ہوتا ہے..." ہم عورتیں یہ الفاظ پڑھ پڑھ کے ایک خاکہ سا ذہن میں بنا لیتی ہیں پھر جب موازنہ اپنے اردگرد کے مردوں سے کرتے ہیں تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ملتا... دل افسردہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ خیر "آب حیات" پڑھنے میں اب اتنا مزہ نہیں آتا... پتا نہیں کیوں۔ "وحشت جنوں" بہت زبردست، بہت اعلا "بورشے" سمیرا احمید کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ بہت بہت خوب صورت انداز تحریر... ایک ایک جملہ دل میں گھر کر گیا... ہمیشہ یاد رہنے والی لازوال تحریر... ناولٹ دونوں زبردست تھے... افسانے ایویں ہی تھے... عاصم محمود سے باتیں اچھی رہیں... سادہ سے لگے بالکل... اور آل باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے تھے...

ج : پیاری یاسمین اداس نہ ہوا کریں۔ حقیقت اور افسانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایسے مرد تو صرف کہانیوں میں ہی ہوتے ہیں۔ جو واقعی مرد ہوں، حقیقت میں تو ہزار میں ایک بھی نہیں ہوتا پھر آپ کے کیا کسی کے بھی حصے میں کیسے آئے۔ زندگی میں تو بس گزارہ کرنے والی بات ہوتی ہے اور اہم بھی یہی ہے کہ عزت کے ساتھ زندگی گزر جائے۔ یہ ہی غنیمت ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

در ثمین... راولپنڈی

سمیرا احمید سے میرا ایک سوال ہے کہ وہ کون سی سوچ یا تحریک تھی جس نے آپ سے کہانی کا نام بورشے رکھوایا۔ بلاشبہ کہانی کا ہر ہر لفظ دل پہ اثر کرنے والا تھا لیکن مجھ سمیت بہت سی قاری بہنوں کے ذہن میں یہ سوچ ابھری ہو گی کہ کہانی کا ٹائٹل کہانی سے میل نہیں کھاتا۔ افسانے اور ناولٹ ٹھیک ہی تھے۔ باقی نمل، پیال ساز اور شہر آشوب ہی کافی ہیں آپ کے پرچے کو چار چاند لگانے کے لیے نہیں بلکہ سات چاند لگانے کے لیے۔ میرا آپ سے بھی سوال نہیں بلکہ کچھ سوالات ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ڈائجسٹ بالکل تکمیل کے مراحل میں داخل ہو چکا ہو اور آپ کو کوئی ایسی کہانی یا خط موصول ہو جائے جو اسے شائع کرنے پر آپ کے ادارے کو مجبور کر دے۔ دوسرا سوال یہ تو ہم سب کو پتا ہے کہ خط ایڈٹ کیے جاتے ہیں لیکن کچھ بہنوں کے خطوط کو اس حد تک ایڈٹ کیا جاتا ہے کہ وہ دو چار لائنیں تو لگتی ہیں لیکن خط کہیں سے نہیں لگتا۔ تیسرا اور آخری سوال کہ وہ کون سی تاریخیں ہیں جن تک کہانی آپ کے ادارے کو موصول ہو جائے۔

ج : پیاری در ثمین! بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی بہترین کہانی یا خط، کاپی پریس میں جانے سے پہلے مل جاتا ہے تو ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اسے جگہ دی جائے مگر کاپی پریس میں چلی جائے تو پھر تو ہمیں بھی افسوس ہوتا ہے۔ مگر کیا کر سکتے ہیں۔ کچھ خطوط آپس کی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے ایڈٹ ہو کر وہ ایسے ہی لگتے ہیں جیسا آپ نے لکھا۔ تیسرے سوال کا جواب خط یا کہانی ایسے بھیجیں کہ ہمیں 20 تاریخ تک موصول ہو جائیں۔ ان سطور کی اشاعت کے ذریعے سمیرا احمید تک آپ کے سوال پہنچا رہے ہیں۔

نفیسہ ستار، مدثرہ ستار، طلعت ریحان... فورٹ عباس

ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے نمل پڑھا۔ یہ قسط بھی شاندار تھی۔ آب حیات بھی بہت زبردست ناول ہے۔ غزالہ روشن کی الانصاف بہت پسند آئی۔ ثمرہ بخاری سے شبلی جوادی پر مکمل ناول لکھوائیں۔

ج : نفیسہ اور مدثرہ! آپ کا خط اس بار بھی لیٹ ملا۔ ہم پچھلے ماہ کا خط اس ماہ شامل کر رہے ہیں۔ ثمرہ بخاری جب سے ٹی وی کو پیاری ہوئی ہیں۔ ہمیں بالکل بھول گئی ہیں یقین کریں ہمیں بھی ان کی کمی بے حد محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ ہماری ایسی مصنفہ ہیں جو بہترین مزاح لکھتی تھیں۔

نیازی سسٹرز... میانوالی

نمل اور آب حیات ہماری فیورٹ ہیں۔ پلیز احسن خان کا انٹرویو لازمی دیں۔ سوال بھی کچھ چینج کریں اب تو ہمیں زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ ذرا نئے اداکاروں کو جگہ دیں۔

ج : نیازی سسٹرز! کہانی آپ نے کس نام سے بھجوائی اور کیا خط کی طرح کہانی بھی آپ نیازی بہنوں نے مل کر

لکھی ہے؟ احسن خان کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

ثوبیہ حبیب گل ۔۔۔ بھکر دریا خان

سب سے پہلے تو "نمل" از دی گریٹ ہاہاہا۔ ہر قسط اعلیٰ اور معلومات سے پر ہوتی ہے۔ عمیرہ جی بھی کافی روانی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ میں نے کئی بار آپ کو اپنی تحاریر بھجوائیں مگر مجھے کوئی خاص ریسپانس نہیں ملتا۔ ابھی حال ہی میں... کرن میں اپنی تحریر دیکھ کر صد حیرت ہوئی کہ اس تحریر کو تو میں نے خواتین میں بھجوایا تھا۔

ج : پیاری ثوبیہ! آپ بہت باصلاحیت ہیں۔ خود پر اعتماد رکھیں۔ آپ کا ایک ناول ہمارے ہاں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا جو ناول کرن میں شائع ہوا' وہ ہمیں پسند آیا تھا۔ تب ہی ہم نے اسے منتخب کیا تھا۔ کرن ہمارے ہی ادارے کا پرچا ہے ہم نے اس میں لگا دیا۔

آپ پورے اعتماد کے ساتھ لکھیں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ ناول کے صفحات بہت زیادہ ہیں تو دونوں سائیڈ پر لکھ سکتی ہیں لیکن سطر ضرور چھوڑیں تاکہ تصحیح کی گنجائش رہے۔

افشین ہاشمی ۔۔۔ کراچی

کچھ لکھاری ذہن بدل رہی ہیں۔ "عہد الست" تنزیلہ ریاض صاحبہ کا ناول غیر معمولی ناول تھا۔ اس کے آخر میں ہم نے وہ ٹیبلو من و عن پیش کیا۔ جو تنزیلہ ریاض صاحبہ کے آخری قسط میں دو بچوں نے کیا تھا۔ آپ نے ہمارا شعور اور ٹیسٹ اتنا بلند کر دیا ہے کہ اب معمولی تحریر اثر نہیں کرتی۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر آئیں تو "خوامخواہ" کا مشورہ حاضر ہے۔ یہ ٹائٹل پر بچیاں نہ بھی ہوں تو آپ کا رسالہ کامیابی کی ضمانت ہے۔ صرف یہ مورتیاں ہی کیوں؟

خیر خوامخواہ کا مشورہ ہے۔

"کرن کرن روشنی" حدیثیں ساری ہی اچھی ہوتی ہیں۔ دو فرشتوں والی بہت متاثر کن تھی۔ "غزل انشاء جی" کیا ہی اچھا ہوتا اگر مشکل لفظ کے معنی بتا دیے جائیں جیسے "مطبر" کے کیا معنی ہیں؟

"آباد رہیں آنگن" نہیں پڑھا محرومی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ جانتی ہوں کیا لکھا ہوگا۔ والدین کی کمی عید پر بے حد محسوس ہوتی ہے۔ لگتا ہے پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ عید کا چاند ہوتے ہی درد دل میں دبائے بچوں کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ اس دفعہ ننھی بھتیجی کے ہاتھوں پر جب "مہندی" لگوائی بیچے پیار لر ہے تو لگا میں اب اس کی دادی ہوں۔ یہ نئی فیلنگز اچھی لگیں۔

"صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات" ان کا سیاہ حاشیہ پڑھا ہے اور زور قلم اور زیادہ کی دعا ہے۔ ان کا کپل اور زندگی متاثر کن ہے۔

"تنہائی" سنعیہ عمیر پختہ سوچ' مختصر افسانے میں بڑا پیغام' جھکے بغیر نماز نہیں ہوتی' سائرہ کا اچھا کردار۔ "آگہی کے پل" راشدہ رفعت۔ عام سے موضوع پر صفحوں کا پیٹ بھرتی درمیانے درجے کی کہانی۔ غازی جاندار کریکٹر' عفرہ اور ولید کی منگنی اچھی لگی۔ جہالتوں والے معاشرے میں چپقلشوں کو مٹانے کی لکھاری کی اچھی کوشش۔ غازی اور فاریہ کی نوک جھونک اچھی لگی۔ غازی کا اس کے ساتھ مل کر افطاری کا اہتمام کروانا بھی اچھا لگا۔

"دشت جنوں" آمنہ ریاض صاحبہ سے میں متاثر نہ ہو سکی۔ شاید آگے آکر اس میں انوالو ہو جاؤں' اس لیے کیا تبصرہ کروں لیکن جملے جو مجھے ایسے مزہ دیتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈا ٹھار ملک شیک۔ جیسی روٹی اور اچار۔ پالک گوشت بیف کے ساتھ تو۔ جملہ ہے کہ نمونوں میں ہمارا خاندان خود کفیل ہے "چوم لوں وہ ہاتھ جو اتنے زرخیز جملے لکھتے ہیں۔

پیاز کے پرت کی طرح کہانی کھلتی جائے گی۔ ابھی بہت پراسرار ہے کہانی۔

اک خواب آنکھوں میں شازیہ الطاف ہاشمی۔ اخلاقی برائیوں میں مبتلا لڑکیوں کو سکھانے کے لیے ایک اچھی تحریر "بورشے" سمیرا حمید۔ بورشے ایسا لگا جیسے لچکوں' لہنگوں' تیز میک اپ سرخ عروسی جوڑے میں سفید سیکسی' باوقار چال امریکہ کی سڑک خوشحالی کی چاند رات

P.C میں کھانا اور بہترین جملے۔

کلائمکس بورشے اتنا بجایا کہ آگ لگ گئی چاروں طرف وہ سین اور آخر اس سین کا مقصد کیا تھا؟ کیا مقصد کے بغیر کوئی بھی تحریر جو صفحات کا پیٹ بھرنے کے لیے ہو کیسی ہو سکتی ہے۔ ساز جو رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ دنیا میں کتنے موسیقار آئے اور امر ہو گئے۔ پر وہ ساز جو روز میری کھڑکی کے باہر بجتا ہے اس کا مقابلہ کوئی کیا

کرے گا۔ اوپر والے نے کتنی مٹھاس رکھ دی ہے "کوئل کی کوک" میں۔

ہلکی پھلکی تحریر کھچڑی کی طرح اس پر سرخ چٹنی نہیں بگھار والا تڑکا نجیب۔ کلائمکس آفس میں بند ہونا اور دو خاندانوں کا ملاپ۔

"تمثل" تمثل ہے کہ کھجل فارس غازی میں جنرل احمد "جنت کے پتے" کی شبیہہ ہے جو دوسروں کی کمزوریاں ہاتھ میں رکھتا ہے۔ تمثل میرے دل میں وہ جگہ نہ بنا سکا جو بننی چاہیے۔

وجہ سنیے۔ نمرہ نے جو آری سے متاثر لگتی ہیں۔ انفارمیشن تو بہت دی۔ لیکن ناولز اتنی زیادہ انفارمیشنز کا شکار بن گیا۔

آخر میں عدنان بھائی کا بھی سلسلہ اچھا ہے۔

مجھ جیسی کاہل 'ست' نکمی 'پوہڑ نے 16 سال کی عمر کے بعد پانچ بچوں کی ماں ہونے کے بعد پہلی دفعہ زبان کھولی ہے۔

محمود ریاض صاحب کو خراج عقیدت۔

ابد جی صاحب کو خراج عقیدت۔

ج : پیاری افشین بہت شان دار تبصرہ 'کاٹ دار جملے' ہر تحریر پر گہری نظر۔ آپ کا خط ہمیں بہت پسند آیا آپ کے مشورہ ہے کہ اپنی اس صلاحیت کو افسانے لکھنے کے لیے استعمال کریں۔

آپ کی تنقید رائٹرز تک اور تعریف عدنان بھائی تک پہنچا رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ خواتین کا ایک ایک سلسلہ آپ کو پسند ہے

نیر خان۔۔۔ کراچی

انشاء جی کے کالم آج کے دور میں بھی یوں لگتے ہیں کہ وہ دور حاضر کا منظر پیش کر رہے ہوں۔ آمنہ الیاس سے ملاقات کی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ والد صاحب کا سایہ نہ رہے تو کیا شوبزنس ہی زندگی کے لیے آب حیات ہوتا ہے۔ انسان کسی اور فیلڈ میں بھی تو نام کما سکتا ہے۔ رزق تو ہر صورت ملنا ہے۔ ذرائع اپنانا آپ کا کام ہے۔ "دشت جنوں" میں معاویہ کی موت کچھ افسردہ کر گئی۔

غزالہ روشن کے انصاف میں جوگی اور پیام بر کا حصہ مجھ ناقص العقل کی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ بظاہر کہانی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ بات چیت بہت پر اثر اور پوری کہانی پر بھاری تھی۔ سائرہ رضا نے پچھلے ماہ جو دل کے تاروں کو چھیڑا تھا اس کا سحر اب تک طاری ہے سو یہ بس آئینہ سو سو رہی۔ اور سب سے آخر میں ثمینہ عظمت اف۔۔۔ واہ۔۔۔ کمال۔۔۔ بہترین یکم جون میری سالگرہ کی تاریخ ہے۔ اور ثمینہ عظمت کا افسانہ میرے لیے برتھ ڈے گفٹ ثابت ہوا۔ ہنسی 'مسکراہٹ' پرلطف احساس "میڈا بھی تے کوئی ہوئے" واہ ایسی تحریروں کی میں شائق ہوں۔ مزہ آگیا۔ نام ہی اتنا مزے کا لگا۔

سب سے مزے کی بات میرے بھائی راغب کی شادی ہوئی ان کی زوجہ مہک نے نہاری بنائی۔ راغب صاحب ہدایت دیے رہے تھے امی 'آپی فوزیہ باجی عینی' سب بہترین نہاری بناتی ہیں۔ تم بھی ایسی ہی بنانا۔ سب کو اچھی لگے۔ مہک نے بازی دل وجان سے جیت لی۔ جب دسترخوان لگا اور راغب صاحب نے منہ میں لقمہ ڈالا تو بالکل "ادل" کی طرح آنکھیں پھیلی تھیں۔ یہ۔۔۔ یہ تو بالکل امی جیسی بنی ہے۔ وہ حیران 'مہک خوش' محنت ٹھکانے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد بھی وہ الجھا رہا۔ آپی سیم اپنے گھر جیسا ذائقہ ہے۔ مگر ہم نے ڈسٹ بن نہیں کھسکایا تھا؟ اپنے پیارے لاج دلارے بھائی کی الجھن دور کردی کہ یہ سب "پیکٹ" کا کمال ہے بچہ! جو ہاتھوں کو ایک جیسا ذائقہ عطا کرتا ہے۔ راغب مزید حیران۔ ہمارے چہروں پر مسکان اسی طرح کے پرلطف قصوں سے مزین ہے ہماری فیملی۔

ج: پیاری نیر! ہر انسان کا رزق لکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس طریقے سے حاصل کرتا ہے سب ہی لوگ تو شوبز میں نہیں جاتے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ پچھلے ماہ تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ اس ماہ شامل ہے۔

خبریں واں کی

واصفہ سہیل

عورت کی حرمت اور کراچی شہر میں کہانی (اب سمجھ میں آیا ہیرو کیوں نہیں ملا ابھی تک.....!)

فراغت

سنگر جنید خان کو جب موسیقی کی دنیا میں بہت زیادہ مواقع نظر نہ آئے تو انہوں نے اداکاری کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ اور یہاں انہیں اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے کے خوب ہی مواقع میسر آئے اور انہوں نے اداکاری میں خوب نام کمایا۔ اب جنید خان اپنے پرانے شوق گلوکاری کی طرف واپس جاتے ہوئے اپنی نئی البم ریلیز کر رہے ہیں (کیا نظر آرہا ہے کہ اداکاری میں اسکوپ ختم.....؟) جنید خان کا کہنا ہے کہ وہ تین سال سے اس البم کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں (تین سال میں تو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تو البم کے گیت.....؟) اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پرانے بینڈ "کال" کے ساتھ بھی ایک البم کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔

ساکھ

لیجیے جناب! ایک اور اداکارہ ثنا جاوید بھی اب ٹی وی کو چھوڑ کر فلم کو پیاری ہو گئیں یہ فلم والے بھی ناں ساری "اچھی" اداکارائیں فلم میں لے جارہے ہیں (ٹی وی والے جو ہوئے..... بھئی اب فلمیں ٹی وی والے ہی تو بنا رہے ہیں) ثنا کو نو آموز اور کم عمر ہدایت کار عامر محی الدین نے اپنی فلم میں کاسٹ کیا ہے۔ فلم کا نام ابھی نہیں رکھا گیا۔ (ہدایت کار کو ڈر ہو گا کہ ثنا کو کوئی اور نہ لے اڑے..... بھئی اپنی فلم میں.....!) ثنا جاوید اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ فلم ایک میوزیکل لو اسٹوری ہوگی۔ جس میں عورت کی حرمت کو پاکستانی معاشرے میں موضوع بنایا گیا ہے۔ اور کراچی کے ماحول میں کہانی کو گھمایا گیا ہے (پھر تو آپ سوچ سمجھ کر اس فلم کو کریں ثنا! کیوں اپنی بنی بنائی ساکھ کا بیڑہ غرق کرنے پر تلی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں

اس البم کی ریلیز سے قبل کال کے فین اس بینڈ کا ایک ویڈیو گیت بھی دیکھ سکیں گے۔ (لگتا ہے جنید کے پاس فراغت زیادہ ہے جب ہی وہ البم پر کام کا وقت ہے ان کے پاس۔)

مہم

فخر عالم نے امجد صابری کے افسوس ناک اور بہیمانہ قتل کے بعد بطور چیئرمین فلم سنسر بورڈ سندھ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ فنکاروں کو بلٹ پروف سیکیورٹی فراہم کرنے کی (ناقابل قبول) مہم شروع کی' اس پر سوشل میڈیا پران کا اور ان کے ساتھ شامل فنکاروں کا کافی مذاق بنایا گیا۔ اس لیے کہ فخر عالم نے جو مطالبہ کیا تھا وہ مضحکہ خیز تھا۔ انہیں قاتل مافیا کو ختم کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔ ڈپٹی اسپیکر سندھ اسمبلی تو اتنا برہم ہوئیں کہ انہوں نے فخر کی نجی اور خاندانی زندگی کو ہی تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔ تاہم ندیم جعفری پر فائرنگ اور موبائل چھینے جانے کے واقعہ پر فخر عالم ایک مرتبہ پھر سراپا احتجاج ہو گئے۔

ادھر ادھر سے

جس ملک میں جنرل رانی کا نواسا اور بھارتی پنجاب

کے سابق وزیر اعلا کیپٹن امریندر سنگھ کی حالیہ بیوی کا بیٹا سنسر بورڈ کا چیئرمین ہو' اس ملک کے اشتہارات اور فلموں میں کیا کیا کچھ نہیں چل رہا ہو گا اس کے لیے زیادہ دماغ لڑائے بغیر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

(سوشل میڈیا سے)

☆ آپ ان کے فیس بک پیج وغیرہ دیکھ لیں تو ان کی نفرت اور غلیظ زبانوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہاں چونکہ یہ چھپے ہوتے ہیں' اس لیے ان کے اندر کا بغض اور غلاظت سامنے آتی ہے۔ اسلام کے اصول و قواعد پر بھی بحث کم کرتے ہیں بس اصل نشانہ مولوی ہوتا ہے۔ مولوی کا تمسخر اڑاؤ' اسے جاہل گنوار' اجڈ' جدید دنیا سے لاعلم اور متشدد ثابت کرو اور پھر آخر میں یہ فقرہ بول دو' یہ ہے ان کا اسلام۔ اگر سیکولرازم یا لبرل ازم ہر مذہب سے انکار اور بے زاری کا نام ہے تو پھر اس ملک میں بننے والے کسی پادری' کسی سکھ گرنتھی یا ہندو پنڈت کے حوالے سے گفتگو کیوں نہیں ہوتی۔ عیسائی راہبہ بھی حجاب پہنتی ہیں' لیکن پردے کی بات آئے گی تو تنقید اسلام پر کریں گے۔

(اوریا مقبول جان۔ وانائے راز)

☆ اینکر سنز اور کالم نگاروں کی اکثریت "خوشامد بٹالین" سے تعلق رکھتی ہے اور معقول نہیں ماورائے معقول "اعزازیہ" بھی اس خدمت کے لیے وصول کرتی ہے۔ اس لیے ان میں کسی نے آج تک نہیں پوچھا کہ شیخ رشید صاحب آپ کی کسی پیش گوئی میں درستگی نہیں ہوتی اور کسی دعوے میں معقولیت نہیں ہوتی تو اس کی وجہ کیا ہے۔ خوشامد پسندوں کی حالت کچھ ایسی انوکھی ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت بھی جلد بازی کرتے ہیں اور "ہدف" پر حملہ کرتے ہوئے بھی۔ پانامہ لیکس کی اصلیت سب پر ظاہر ہو چکی' یہ کہنا اعتراف شکست نہیں تو اور کیا ہے کہ قصور نکلے یا نہ نکلے بس استعفیٰ دیں۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

☆

آپ کا باورچی خانہ

کنول فرہاد حسین ...... جلال پور جٹاں

بڑی باجی کی شادی کے بعد ہماری عقل شریف ٹھکانے آئی' ورنہ پہلے تو زندگی میں صرف "عیش کر کاکا" جملہ گردش کرتا رہتا تھا۔ آج بھی کچن مکمل طور پر تو نہیں' مگر تھوڑا بہت میرا ہے۔ یعنی امی بھی کام کرتی ہیں اور میں بھی.... اور اب کبھی کبھار چھوٹی بہن بھی....

زندگی میں ایک وقت ایسا آیا کہ کچن مکمل طور پر میری ذمہ داری بن کے رہ گیا۔ ڈیڑھ دو سال پہلے امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ میں صبح بھی کچن میں ہوتی' پھر جلدی جلدی صفائی سے فارغ ہو کر کالج.... پھر آکے کچن.... کبھی کبھی شکر ہے امی ہمت کر کے سالن بنا دیتی تھیں۔ وہ وقت ہاں کر کے' نہ کر کے' جیسے تیسے گزار لیا' مگر آج بھی جب میرا اس "تھوڑے" سے وقت کا کچن سنبھال لینا.... میری ماں کسی کے آگے تعریف کے طور پر کہتی ہیں تو میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آجاتے ہیں۔ (کبھی شرم بھی آتی ہے)۔

اب آتے ہیں محفل میں دیے گئے سوالوں کے جوابات کی طرف اور اپنا اور اپنے کچن کا راز کھولتے ہیں۔

1 ۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند' ناپسند' غذائیت؟

ج ۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو ہمارے گھر میں جو بھی پکتا' وہ صرف ذائقے کی بنا پر پکتا تھا۔ تیز مرچ مسالے کا استعمال ہوتا تھا۔ غذائیت اور صحت سے دور دور تک سلام دعا نہ تھی۔ صرف مرچیں' چٹپٹا مسالا.... واہ واہ۔ مگر اب گزشتہ دو ڈھائی سال سے کچن میں جو کچھ پکتا ہے وہ غذائیت' ذائقے اور صحت کے زمرے میں آتا ہے۔ تیز نمک' مرچ اور مسالا جات کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ جب امی سالن بناتیں تو آدھا چمچہ سرخ مرچ اور تین چار بڑی سبز مرچیں پیس کر سالن میں ڈال دیتی تھیں۔ ذائقہ بھی نہایت اچھا اور معدے بھی درست حالت میں رہتے۔ اب بھی "کبھی کبھی" تیز مرچوں والے کھانے پکتے ہیں۔ اب میں جو کچھ بھی بناتی ہوں تو صرف ذائقے کو ہی مدنظر نہیں رکھتی' اپنی اور اپنے سے منسلک ذاتوں کی جانوں کو بھی عزیز از جان رکھتی ہوں۔

2 ۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے' کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیاری کر کے تواضع کر سکیں۔

ج ۔ مہمان اللہ پاک کی خاص رحمت ہوتے ہیں۔ مگر شاید انسان' اس عظیم پیغمبر کی خاک بھی نہیں جو خود اپنے گھر اور دسترخوان کے لیے مہمان ڈھونڈا کرتا تھا۔ آج کل کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں کسی کے پاس شاید ہی "اتنا سا" بھی وقت کسی اور کے لیے نکل آئے تو غنیمت جانیے۔

ہمارے ساتھ زیادہ تر اسی طرح ہوتا ہے کہ مہمان آنے سے ایک یا دو دن پہلے بتا دیتے اس طرح تھوڑی آسانی ہوتی ہے۔ صرف سالن' چاول اور روٹی بنانا پڑتی ہے۔ (جو کبھی بازار سے آجاتی ہے۔) ویسے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ بغیر بتائے کسی کے گھر جانا' کبھی کبھار تو اچھا لگتا ہے کہ آپ اگلے (میزبان) پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے مگر ہر بار یہ اچھا نہیں لگتا ہے۔

چائے کا سامان "اکثر" گھر میں موجود رہتا ہے۔ کباب' نمکو' بسکٹ' چپس تو وہی چل جاتا ہے۔ کولڈ ڈرنک "انکل ٹونی" کی دکان سے آجاتی ہیں۔ ہاں اگر کبھی یہ "چیزیں" گھر میں ختم ہو چکی ہوں تو اماں صاحبہ کی گھوریاں اور ڈانٹ شروع.... کہ.... "مجال ہے کوئی چیز رہنے دیں' میں مہمانوں کے لیے لاتی ہوں اور یہ خود ہی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اب کسی ایسی جگہ چھپاؤں گی جہاں شیشے کے جار میں تالا دیکھتے رہنا منہ اٹھا کے۔"

وغیرہ وغیرہ۔

ویسے آپ ہی انصاف کریں، اگر یہ "چھپی ذائقے" والی چیزیں موجود ہوں اور اتفاق سے دونوں ہفتوں، بلکہ مہینے تک کوئی مہمان نہ آئے، تو اب ہم اتنے بھی "سخت دل اور ظالم" نہیں کہ ان چیزوں کو "باسی" ہونے دیں۔ آخر کو اللہ نے ایک منہ، زبان، حلق اور پیٹ دیا ہے اور پھر "نرالا بیکری" اور "شیزان بیکری" سے خریدی ہوئی اشیا کو حلال بھی تو کرنا ہے نا۔

اب آتے ہیں اس "ڈش" کی جانب جو "فوافٹ" تیار ہو جائے اور کھانے میں بھی مزے دار لگے۔ تو جناب اس "ڈش" کا نام ہے "باتیں" (ہنسی) جناب منہ سے نکلنے والی باتیں ہی وہ ڈش ہے جو فوراً "بغیر کسی وقت سے تیار ہو جاتی ہے۔ اگر مہمانوں کے پاس بیٹھنے کا "وقت" ملے تو باتیں جتنی مرضی کروالو۔

فوراً "تیار" ہونے والی ڈش کو بنانے کے لیے اس کے لیڈر یعنی "دہی" کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرے عوام یعنی نمک، مرچ، ٹماٹر تو ہر وقت گھر میں ہوتا ہے۔ "ڈش" اگر پڑھنے میں "چٹکی بھر کام" والی لگے تو بلکیز بنا کے ضرور دیکھیے گا۔ "عقل" ٹھکانے نہ آئی تو... مذاق کر رہی ہوں۔

مکس سلاد

اشیاء:

تازہ دہی	ایک کلو
پیاز (درمیانی)	دو عدد
پکے سرخ ٹماٹر (درمیانے)	دو عدد
کھیرے (بڑے)	تین عدد
نمک	دو چمچے
کالا زیرہ (موٹا پسا ہوا)	ایک چمچہ
کالی مرچ، چاٹ مسالا	آدھی آدھی چمچہ
ہرا دھنیا (باریک)	آدھی پیالی

ترکیب:

ایک بڑے برتن میں دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ (پانی بالکل نہ ڈالیں)۔ جب دہی پھینٹ جائے تو اس میں نمک، کالی مرچ، چاٹ مسالا اور کالا زیرہ ڈال کر چمچے سے مکس کریں۔ پھر کھیرے اس طرح کاٹیں کہ نہ زیادہ موٹے ہوں نا پتلے، وہ ٹکڑیوں کی شکل میں ہی کے اندر ڈالیں۔ اس کے بعد ٹماٹر بھی اس طرح دہی میں ڈال کر مکس کریں۔ پیاز جو باریک باریک کاٹ کے نمک لگا کے رکھی تھی، اسے بھی اچھی طرح سے دھو کر، ہاتھوں سے دبا کر فالتو پانی نکال کر ڈالیں اور پھر ہرا دھنیا جو کاٹا تھا وہ بھی اس میں ملا کے ہلائیں اور اوپر تھوڑا سا چاٹ مسالا، کالا زیرہ اور دھنیا چھڑک کر فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اشیا میں کمی بیشی آپ مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ یہ خصوصاً" ان افراد کے لیے بھی ہے جنہیں سالن منع ہے۔ بہت ہی مزے دار چیز ہے۔

3 ۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے، آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج ۔ ہم دونوں خواتین بیماری کی وجہ سے تھوڑی لاپروا اور سست ہوگئی تھیں۔ "خواتین" میں صاعقہ اسد قریشی کے جوابات اس محفل میں پڑھے۔ یقین کریں، میرا شرمندگی سے برا حال ہو گیا۔ "بیماری میں اگر رسالے پڑھے جا سکتے ہیں تو دوسرے کام کیوں نہیں؟" بیماری میں کچن کی صفائی کا بوجھ نازک کندھوں پر لاد لیا۔ تمام چیزوں پر لگی دھول مٹی صاف کی۔ اخبار تبدیل کیے تھے اور فریج کو تو میں نے "غصے" سے دھو ہی ڈالا تھا۔ اب بھی چار، آٹھ مہینوں بعد، پیار سے کچن کی مکمل صفائی کرتی ہوں، تاکہ دوسروں کی باتیں نہ سننی پڑیں۔ عورت کا "اصل حسن" کچن اور باتھ روم ہی تو ہوتا ہے۔ (حیرت کی بات ہے۔)

4 ۔ صبح کا ناشتا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں۔ کوئی خصوصی ترکیب؟

ج ۔ صبح کے ناشتے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا۔ ہاں کبھی اتوار کو خوب مزے اڑائے جاتے ہیں۔ پراٹھے، اچار، دہی، سالن، آلو کے پراٹھے، جیم، بریڈ،

مارجرین، میٹھے توس اور چائے۔ ناشتے کے لیے کوئی خاص آئٹم تیار نہیں ہوتا ہے۔

5 ۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج ۔ تبدیلی کسی بھی قسم کی ہو وہ زندگی پر اثر انداز ضرور ہوتی ہے اور اس تبدیلی کے اثرات دیرپا بھی ہوتے ہیں۔ ویسے تو ہم گھر میں ہی کوئی اچھی چیز بنا لیتے ہیں یا پھر باہر سے منگوا کر دل خوش کر لیتے ہیں۔ کسی اچھی جگہ کا چکر سال میں ایک یا دو مرتبہ تو ضرور ہی لگ جاتا ہے، جب کچھ واقعی بہت خاص ہو۔ کوئی ٹریٹ، عید ملن، کوئی الوداعی پارٹی، کھانا، سالگرہ۔۔۔ اس کے لیے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم سب لوگ اکٹھے ہو کر "چکن تنوری جلال پور جٹاں" جائیں۔

قسم سے وہاں خصوصاً" رات کا کھانا (خصوصاً" مجھے) اتنا مزہ دیتا ہے کہ حد کی کوئی حد نہیں۔ فوجی علاقہ ہے تو اتنا سکون ہوتا ہے۔ چھوٹا سا پارک بھی ہے۔ دن میں جائیں تو کافی آگے تک بھی ہو کر آتے ہیں۔ ہم تو جب بھی جاتے ہیں ہر دفعہ نیا مزہ، سکون اور خوش گوار یادیں لے کر آتے ہیں۔ وہاں کا کھانا، عملے کا اخلاق اور سروس سب اچھی ہے۔ آپ بھی چکر لگائیے گا۔

6 ۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج ۔ پہلے تو ہر موسم کا ہم لوگ الگ الگ مزہ لیتے تھے۔ طرح طرح کی ڈشیں تیار کی جاتی تھیں، مگر اب نہ جانے کیوں دل ہی نہیں کرتا ہے۔ (اے دل ناداں) بہت ہوا تو چپس، پکوڑے، چٹنی بنالی بس۔۔۔ پہلے جب بڑے بھائی فیصل یہاں پاکستان میں تھے تو بلا ناغہ ہمارے گھر میں خاص چیزیں بنتی تھیں۔ فیصل بھائی کو اگر ایک چکر بھی ہم لوگ بازار کے لگواتے تو وہ ضرور ہمارے لیے، ہماری خوشی کے لیے لگاتے تھے۔ مگر اب۔۔۔ ایک تو ابو سے کہتے بھی نہیں اور دل بھی کچھ خاص بنانے کو نہیں کرتا ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی جب دماغ خراب ہوتا ہے تو کچھ نیا ضرور کرتی ہوں۔ (کیونکہ اب ضرورت بھی تو ہے۔)

7 ۔ اچھا پکانے کے لیے آپ کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج ۔ دوسروں سے سنتے اور پڑھتے ہوئے میں اس نتیجے پر آئی ہوں کہ کچھ بھی پکانے کے لیے محنت، ہمت اور سمجھ داری سے پہلے ہم لوگوں کو عقل اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ بھی بنانے کے لیے دل و دماغ دونوں کا راضی ہونا بہت ہی ضروری ہے، کیونکہ اختلاف کے باعث بہت سے کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنے دل و دماغ، شوق و لگن کو اکٹھا کر کے کوئی بھی چیز چند گھنٹوں میں بنا لوں ورنہ دوسری صورت میں میں صبح کچن میں جا کر شام کو ہی گھر والوں کو باہر نکل کے منہ دکھاتی ہوں۔

8 ۔ کچن کی کوئی ٹپ جو آپ دینا چاہیں؟

ج ۔ آپ سب لوگ ماشاء اللہ سے اتنی سمجھ دار اور تجربے میں بڑی اور اپنے کچن کے کاموں میں اتنی طاق ہوں گی کہ کسی کو بھی میری دی گئی ایک بھی ٹپ کی ضرورت نہیں۔ ہاں مگر جواب تو دینا ہے، ورنہ شاید آپ لوگ سمجھیں کہ کچن کے کام کر کے بھی مجھے گھریلو ٹوٹکا یا پھر کچن ٹپ نہیں آتی ہے۔ کوشش کروں گی کہ اچھی اچھی ٹپس دوں کہ اگر وہ کہیں نظر سے گزریں تو آپ لوگ بے اختیار کہہ اٹھیں۔ ارے یہ تو کنول فریاد حسین نے خواتین میں باورچی خانے کے سلسلے میں ہمیں بتائی تھی۔ ٹپس مندرجہ ذیل ہیں۔ غور فرمائیں۔

1 ۔ کوشش کریں کہ ہاتھ دھو کر اور بالوں کو لپیٹ کر کچن کی طرف اپنا رخ کیا کریں۔

2 ۔ کچن میں کام کرتے ہوئے گیلے ہو جانے والے ہاتھوں کو زیب تن کیے لباس اور اس کے دوپٹے سے صاف نہ کریں۔ اس سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔ کوئی کپڑا یا تولیہ گیلے ہاتھوں کی صفائی کے لیے کچن میں ضرور رکھیں۔

3 ۔ ابلتے ہوئے دودھ کو گرنے سے بچانے کے لیے اس برتن (جس میں دودھ ابالا جائے گا۔) کے کناروں پر تھوڑا سا گھی یا مکھن لگا دیں۔ ابلتا ہوا دودھ نیچے نہیں گرے گا۔

☆

برسات کے پکوان

خالدہ جیلانی

آئے موسم رنگیلے سہانے.... جی ہاں جناب! جب بادلوں سے ڈھکا آسمان اپنے اندر ساری رنگینی اور دلکشی سموئے ہوئے ہو تو ایسے میں چٹ پٹے کھانوں کے لیے دل للچاہی جاتا ہے۔ تو ہم نے آج کے پکوان میں ایسے ہی کچھ خوش ذائقہ کھانوں کو شامل کیا ہے۔ امید ہے آپ بھی ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

آلو کے پراٹھے

برسات کا موسم ہو ایسے میں آلو بھرے پراٹھے نہ ہوں تو برسات کا مزہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

ضروری اجزا :

آلو	آدھا کلو
ہرا دھنیا	ایک گڈی
ہری مرچ	چار سے پانچ عدد
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
املی / لیموں	حسب پسند
آٹا	پراٹھوں کے لیے
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں پھر اس میں ہرا دھنیا اور ہری مرچوں کو باریک کاٹ کر ملا دیں اور نمک، کٹی سرخ مرچ، زیرہ اور املی یا لیموں ڈال کر اچھی طرح مسل کر یک جان کر لیں۔ پھر آٹے کے دو چھوٹے پیڑے لے کر ان کو روٹی کی طرح بیل لیں۔ پھر ایک روٹی پر آلو کا تھوڑا آمیزہ رکھیں، پھر اس پر دوسری بیلی ہوئی روٹی ڈال دیں۔ اور کناروں سے ہلکا ہلکا دبا دیں پھر ہلکے ہاتھ سے بیل کر گرم گرم توے پر ڈال کر تل لیں جب پراٹھا سنہرا ہو جائے تو توے پر سے اتار لیں۔ رائتے اور چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

بیسن کے پراٹھے

ضروری اجزا :

بیسن	ایک پاؤ
آٹا	ایک پاؤ
تیل	گوندھنے کے لیے
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	دو سے تین عدد
پودینہ	حسب پسند
پسا ہوا لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

بیسن اور آٹے کو اچھی طرح ملا کر اس میں تیل ڈال دیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچوں کو باریک کاٹ لیں اور اوپر دیے گئے تمام اجزا آٹے میں ملا کر گوندھ لیں۔ اب آٹے کے پیڑے بنا لیں اور روٹی کی شکل میں بیل کر گرم گرم توے پر ڈال دیں اور گھی ڈال کر تل لیں۔ سنہرا ہونے پر اتار لیں۔ ٹماٹر کی چٹنی اور اچار سے نوش فرمائیں۔

قیمے کے پکوڑے

ضروری اجزا :

قیمہ	آدھا کپ
بیسن	ایک کپ
ثابت دھنیا	آدھا چمچہ
کٹی مرچ	ایک چمچہ
نمک	آدھا چمچہ

انار دانہ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

بیسن میں اوپر دیے گئے تمام اجزاء قیمے سمیت ملا کر گھول لیں اور چاہیں تو اس میں ہر کلر چپس بھی کاٹ کر ملالیں۔ پھر اس آمیزے کو گرم گرم تیل میں پکوڑوں کی طرح تل لیں۔ چٹنی اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

شاہی ٹوسٹ

ضروری اجزا :

ڈبل روٹی کے سلائس	آٹھ دس عدد
انڈا	ایک عدد
گھی	تلنے کے لیے
دودھ	ایک کلو
چینی	چار کھانے کے چمچے
کھویا	دو کھانے کے چمچے
بادام پسا ناریل	گارنشنگ کے لیے
چاندی کا ورق	گارنشنگ کے لیے

ترکیب :

ڈبل روٹی کے سلائس کے کنارے کاٹ کر پھینٹے انڈے میں ڈبو کر کڑاہی میں گھی گرم کر کے سنہرا ہونے تک تلیں۔

ساس پین میں دودھ، چینی اور کھویا ڈال کر اتنا پکائیں کہ دودھ تھوڑا گاڑھا ہو جائے۔ تلے ہوئے سلائس پلیٹ میں رکھ لیں اوپر سے گرم گرم دودھ ڈال دیں۔ کھویا، پسا ہوا ناریل، بادام، چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔

املی کی میٹھی چٹنی

اجزا :

املی	ایک پاؤ
چینی	ایک پاؤ
کٹی لال مرچ	تین چائے کے چمچے
پانی	ایک گلاس

ترکیب :

املی کو ایک گلاس پانی ڈال کر بھگو دیں۔ ایک گھنٹے بعد املی کا گودا مسل دیں۔ چینی اور کٹی لال مرچ شامل کر کے چولہے پر چڑھا دیں۔ ایک ابال آنے کے بعد آنچ دھیمی کر دیں اور تھوڑا ہلکا گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اس دوران چمچہ چلاتی رہیں۔ ہلکا گاڑھا ہونے پر چولہے سے اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں بھر کر محفوظ کر لیں۔ یہ چٹنی آپ کئی دنوں تک استعمال کر سکتی ہیں۔

نفسیاتی الجھنیں
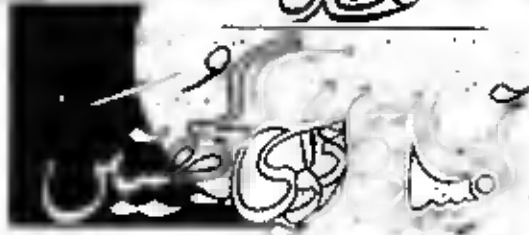
زینب شاہ' کراچی

میری شادی بہت تاخیر سے ہوئی' اب دس سال ہوگئے ہیں۔ بچے نہیں ہیں۔ ہر طرح کا علاج کروالیا ہے۔ شوہر اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میرا خیال بھی رکھتے ہیں اور دل جوئی بھی کرتے ہیں۔ انہیں بچوں کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سسرال والے بھی کچھ نہیں کہتے مگر مجھے عجیب سا خوف لاحق ہے کہ کہیں وہ دوسری شادی نہ کرلیں۔ اس سوچ کی وجہ سے ذہنی سکون برباد ہوگیا ہے۔ ڈپریشن کی مریضہ بنتی جارہی ہوں۔

ج : جب آپ کے شوہر کو بچے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور سسرال والے بھی کچھ نہیں کہتے تو آپ کو کس بات کا خوف ہے؟ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کے نہ ہونے سے آپ خود اس کمی کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ ایک بات سمجھ لیں کہ زندگی میں ہمیں "سب کچھ" کبھی بھی نہیں ملتا کہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ جاتی ہے۔ اس لیے اس کمی کو ذہن پر سوار نہ کریں۔ خوش باش رہیں اور یہ سوچیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی۔

بالفرض محال اگر شوہر دوسری شادی کر لیتے ہیں (اگرچہ انہوں نے کوئی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا ہے) تو بھی یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جسے سوچ کر آپ کی نیندیں حرام ہو جائیں' ضروری نہیں کہ دوسری شادی کی صورت میں شوہر آپ کو چھوڑ دیں۔ آپ ان کی دوسری بیوی کے ساتھ مل کر بھی رہ سکتی ہیں۔ آپ کے شوہر کی اولاد آپ کی بھی ہوگی۔ گھر میں ایک بچہ آنے کی صورت میں گھر میں جو خوشیاں آئیں گی' اس میں آپ بھی شریک ہوں گی۔ آپ کے سونے گھر میں رونق ہوگی۔ ہندوؤں کے ساتھ طویل مدت رہنے سے ان کے رسوم و رواج ہمارے معاشرے میں بھی رواج پاگئے ہیں۔ دوسری شادی بھی ایسا ہی مسئلہ ہے۔ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ایسے ہی حالات کے لیے دی گئی ہے۔ اور دو بیویاں ساتھ خوش رہ سکتی ہیں۔ صرف تھوڑا سا دل بڑا کرنے کی ضرورت ہے۔

ثانیہ علیم..... راولپنڈی

س : میں بچپن ہی سے کئی بیماریوں کا شکار رہی ہوں۔ ذرا سی تیز آواز اور چیخ و پکار برداشت نہیں کرسکتی۔ ہاتھ پاؤں کانپتے ہیں۔ خود اعتمادی کی کمی ہے۔ ذرا سا کام کرنے سے تھک جاتی ہوں۔ گھر والے سمجھتے ہیں کہ بیماری کا بہانہ کررہی ہوں کیونکہ بظاہر صحت مند نظر آتی ہوں۔ مگر ذہنی کیفیت عجیب ہے۔ خوشی کا کوئی احساس باقی نہیں رہا۔

ج : اچھی بہن! آپ اعصابی کمزوری کا شکار ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بچپن کی ان بیماریوں کے اثر سے نکل نہیں پائیں..... بہتر یہ ہے کہ آپ کوئی بھی لگن یا شوق پیدا کریں..... جب ہم اپنے پسند کے کام یا مشغلے میں مصروف ہوتے ہیں تو اردگرد کا ہوش نہیں ہوتا۔ ہم ذہنی طور پر یکسو ہوتے ہیں۔ ہمارا ذہن صرف اس کام پر مرکوز ہوتا ہے اس وقت ہمیں کسی کمزوری کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ ہم اس یکسوئی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کو کس چیز کا شوق ہے۔ سلائی کڑھائی' مطالعہ یا ٹی وی..... اپنے پسندیدہ مشغلے میں کچھ وقت ضرور گزاریں۔ پرسکون نیند ذہن کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ رات سونے سے پہلے نہا کر صاف ڈھیلے کپڑے پہنیں اور جب تک نیند نہ آئے بستر پر نہ جائیں۔ رات کا کھانا ہلکا کھائیں۔ صبح جلد بیدار ہوں اور کھلی ہوا میں چہل قدمی کریں۔ آپ محسوس کریں گی کہ آپ کا ذہن توانا ہو رہا ہے۔

ہاجرہ یوسف زئی۔ اسماعیلہ' صوابی

جولائی کے شمارے میں ف۔ الف کا خط پڑھ کر جتنا دکھ ہوا جواب پڑھ کر اس سے زیادہ ہوا۔ کوئی مشورہ نہیں تھا اس

میں۔ ان کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے باپ سے رازداری میں بات کریں اور ان سے کہیں کہ وہ پھپھو سے بات کریں اور اگر باپ یہ کام بھی نہ کرسکے تو پھر ڈائریکٹ اپنے پھوپھی زاد سے بات کریں۔ اس کے ساتھ ایک کام ضروری کریں اور وہ یہ کہ محلے کے چند معتبر افراد کو بھی اس میں شامل کریں اور ان معتبر افراد سے اپنے باپ کو اعتماد میں لیں تاکہ کوئی پولیس مسئلہ سے بچا جاسکے۔

ہاں یہ کام رازداری سے کرنا ہے اور خود اپنے لیے لڑنا ہے کیونکہ "ہمارا صرف ایک مسیحا ہوتا ہے اور وہ ہم خود ہوتے ہیں۔ جہاد سمجھ کر یہ کام کرنا ہے۔ سمجھ داری سے۔ اور رہی بات پھوپھی زاد کے رکشہ چلانے کی تو یقین کریں بہنا کہ آپ جیسی اچھی لڑکی جس کی بھی بیوی بنے گی وہ بادشاہ بن جائے گا۔

ج :۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو یہ سلسلہ پسند نہیں اور آپ اس سلسلہ میں دیے گئے مشوروں سے اتفاق نہیں کرتیں۔

عرض یہ ہے کہ کسی کو مشورہ دینا نہایت ذمہ داری کا کام ہے اور اس کے لیے تمام حالات' ماحول اور معاشرے کی مروجہ روایات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ کسی کو مشورہ اس کے اردگرد کے لوگوں' ماحول اور روایات کو سامنے رکھ کر ہی دیا جاتا ہے ایسا مشورہ نہیں دیا جاسکتا جس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہو جائے۔

جہاں تک آپ کے مشورہ کا تعلق ہے تو لگتا ہے آپ نے ہمارا جواب غور سے نہیں پڑھا۔ ہم نے ان میں باپ سے ہی بات کرنے کا مشورہ دیا ہے لیکن معذرت کے ساتھ آپ کے مشورے کا دوسرا حصہ درست نہیں ہے۔ پھوپھی اور پھوپھی زاد سے بات کرنے کا مشورہ اس وقت تک نہیں دیا جاسکتا جب تک ان کے مزاج' طبیعت سے آگاہی نہ ہو۔ پھوپھی زاد کے متعلق یہ بھی علم نہیں کہ۔ وہ سمجھ دار اور سلجھا ہوا ذہن رکھتا ہے یا کتنا حوصلہ مند ہے ممکن ہے کہ سارے حالات جان کر وہ پیچھے ہٹ جائے اور پھوپھی یہ سوچیں کہ ایسے گھر میں رشتہ نہ کرنا ہی بہتر ہے جہاں ماں کا کردار مشکوک ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ پھوپھی زاد اس وقت شادی کرلے لیکن بعد میں ساری عمر لڑکی کو شک کی نظر سے دیکھتا رہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ماں اور بہنوئی کا کردار پھوپھی اور پھوپھی زاد کے سامنے نہ آئے۔ محلے والوں کو شریک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو نہیں جانتے وہ بھی جان جائیں کہ اس گھر کے لوگ کیسے ہیں۔ ویسے بھی ان کے محلے کے لوگ تو انہیں پہلے ہی بری نظر سے دیکھتے ہیں کوئی بھی اس مسئلے میں الجھ کر مفت کا جھگڑا مول لینا نہیں چاہے گا۔

اس لیے مناسب یہی ہے کہ باپ خود آگے بڑھ کر خاموشی سے رشتہ کردے اور ہم نے یہی مشورہ دیا تھا جو آپ کو پسند نہیں آیا۔

شاہدہ۔ کراچی

س :۔ میرا بچہ نہایت شریر ہے۔ پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ ذہین ہے مگر اسکول جانے سے گھبراتا ہے۔ چھوٹی بہن کو بھی ہر وقت تنگ کرتا ہے۔ اسے مار پیٹ کر' پیار سے' نرمی سے' ہر طرح سے سمجھالیا مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ اکثر دوسرے بچوں سے بھی جھگڑا کرتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے۔

ج :۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ جن بچوں کو جسمانی سزائیں دی جاتی ہیں یا ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے ان کا رویہ مزید جارحانہ ہو جاتا ہے۔ اور جس کے نتیجے میں والدین مزید سختی سے کام لیتے ہیں۔ یوں رویے میں بہتری آنے کے بجائے مزید معاملات خراب ہو جاتے ہیں' ایسے بچوں کی ذہنی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ مار پیٹ کے بجائے اسے کہانیوں کے ذریعے یا باتوں باتوں میں سمجھایا جائے کہ کیا چیز درست ہے' کیا عمل غلط ہے۔ یہ عمل اگرچہ وقت لے گا مگر نتائج کے اعتبار سے موثر اور دیرپا رہے گا۔

امت الصبور

بیوٹی بکس

ثمینہ تاج... کھروڑپکا

س۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرا مسئلہ عجیب لگے۔ میرے نقش و نگار خوب صورت ہیں۔ وزن بھی زیادہ نہیں' اس کے باوجود میں خوب صورت نظر نہیں آتی۔ شخصیت میں وہ چمک' جاذبیت نہیں ہے۔ جو دوسروں کو متاثر کر سکے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا وجہ ہے۔ کئی قیمتی کریمیں بھی استعمال کی ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔

ج: ظاہری خوب صورتی اہم ہے لیکن شخصیت کی خوب صورتی زیادہ اہم ہے۔ یہ مثبت سوچ سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اچھا سوچیں اور ان کے لیے اچھا گمان رکھیں تو آپ کی شخصیت پر اس کے خوش گوار اثرات ہوں گے۔ اگر آپ مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کریں تو آپ کی شخصیت نکھر آئے گی۔ خواہ رنگ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو اور نقش نگار معمولی ہوں۔

☆ رات کو دس یا گیارہ بجے تک سو جائیں اور صبح پانچ بجے بیدار ہو جائیں۔

☆ فجر کی نماز پڑھ کر کسی ایسی جگہ چہل قدمی کریں جہاں آسمان نظر آتا ہو۔ گھر کا لان' گلی' چھت یا کمرے کی گیلری میں چہل قدمی کر سکتی ہیں۔ اس سے آپ کے چہرے پر چمک پیدا ہو گی۔

☆ چہل قدمی کے بعد ایک گلاس دودھ بغیر بالائی کے پئیں۔

☆ صبح کا ناشتا ہلکا ہونا چاہیے۔ ایک کپ کم شکر کی چائے' ایک ہاف بوائل انڈا' چند بادام' چند کھجوریں اور دودھ کا گلاس صبح کے ناشتے کے لیے ضروری ہے۔

☆ ناشتے اور لنچ کے درمیانی وقفے میں ایک گلاس لیموں کا شربت یا پانی میں شہد ملا کر پئیں۔

☆ دوپہر کو کھانے سے پہلے کچی سبزیاں اور پھل کھائیں' ممکن ہو تو ایک دہی کا پیالہ ضرور لیں۔

☆ رات کے کھانے میں سبزیوں کا استعمال کریں۔ کم تیل یا گھی میں پکی ہوئی سبزیاں چپاتی کے ساتھ کھائیں۔

☆ گوشت کا استعمال کم سے کم کریں۔ چکن اور مچھلی ہفتہ میں دو بار لے سکتی ہیں۔

چہرے کو نکھارنے کے لیے روزانہ چہرے پر بیسن' ہلدی اور ذرا سی بالائی ملا کر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد منہ دھو لیں۔ بالوں کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ ضرور نہائیں اور نہانے سے قبل سرسوں کے تیل کا مساج کریں۔ اگر آپ کے بالوں میں خشکی ہے تو ناریل کے تیل میں لیموں کا عرق ملا کر بالوں میں لگائیں تاکہ آپ کے بال مزید نہ گریں۔ آپ نے ان اصولوں پر عمل کیا تو صحت مند شفاف جلد' چمک دار ریشمی بال اور چمکتی ہوئی آنکھیں آپ کی شخصیت کو جاذب بنا دیں گی۔

صائمہ سلیم... گوجرہ

س: میرے سر کے بال گر رہے ہیں۔ سر میں خشکی بھی بہت ہے۔ مجھے ٹائی فائڈ ہوا تھا۔ اب صحت مند ہوں لیکن بال جھڑنا شروع ہو گئے ہیں۔

ج: بالوں کے گرنے کی وجوہات میں خشکی' بالوں کی ناقص صفائی اور بالوں کو سختی سے باندھنا شامل ہیں۔ چونکہ آپ حال ہی میں بیماری سے اٹھی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ متوازن غذا کھائیں۔ خشکی کے خاتمے کے لیے کھوپرے کے تیل میں کافور کی ٹکیاں حل کر کے اس سے مساج کریں۔ مالش خشکی کو ختم کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ گیلے بالوں کو کبھی نہ باندھیں کیونکہ نمی کی وجہ سے خشکی ہو سکتی ہے۔ دو چمچے دہی میں ایک لیموں کا رس ملا کر اچھی طرح پھینٹیں اور سر پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد سر دھو لیں۔ یہ خشکی کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ بالوں میں چمک بھی پیدا کرے گا۔